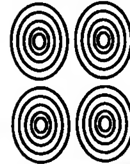
جنوری 2018ء کے شمارے کی ایک جھلک

تیری زلف کے سر ہونے تک	اقرأ صغیر احمد کا سلسلے وار ناول
شب ہجر کی پہلی بارش	نازیہ کنول نازی کا سلسلے وار ناول
جنون سے عشق تک	سمیرا شریف طور کا مکمل ناول
وہ ایک پل	ام ایمان قاضی کا مکمل ناول
آؤ پھول چنیں	صدف ریحان گیلانی کا مکمل ناول

یاسمین نشاط، صدف آصف، خدیجہ جلال، قرۃ العین سکندر، نادیہ فاطمہ رضوی
راشدہ رفعت، حیاء بخاری، ماورا طلحہ، کشور سلطانہ کی تحریریں





women.magazine
womenmagazine
aanchalpk.com

مستقل سلسلوں میں پڑھیے

آپ کی صحت، ڈش مقابلہ، بیوٹی گائیڈ، غزلیں
نظمیں، بیاض دل، دوست کے پیغام آئے ودیگر

ماہنامہ

حجاب کراچی

جنوری 2018ء کے شمارے کی ایک جھلک

میرے خواب زندہ ہیں — نادیہ فاطمہ رضوی کا سلسلے وار ناول

دل کے دریچے — صدف آصف کا سلسلے وار ناول

شب آرزو تیری چاہ میں — نائلہ طارق کا منفرد سلسلے وار ناول

اس کے علاوہ

یمنیٰ اختر، کرن نعمان، شبانہ شوکت، نگہت غفار
آسیہ مظہر چوہدری و دیگر بہنوں کی خوب صورت تحریریں

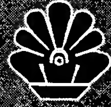
قارئین کے ذوق کے عین مطابق مستقل سلسلوں میں پڑھیے

طب نبوی، بزم سخن، کچن کارنر، آرائش حسن، عالم میں انتخاب
شوخیٔ تحریر، حسن خیال، ہومیو کارنر، شوبز کی دنیا، ٹوٹکے

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں/ (021-35620771/2)

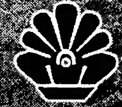
ماہنامہ

نئے اُفق





مدیراعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال بھٹی
گروپ ایڈیٹر
طاہراحمد قریشی
تزئین
نورالدین



جلد	41
شمارہ	12
جنوری	2018



رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رُکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رُکن چیمبر آف کامرس







پاکستان (فی پرچہ)............50روپے
پاکستان (سالانہ)............600روپے



اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242



aanchalpk.com

aanchalnovel.com

f naeyufaqonlinemagzine

aanchal.com.pk/blog

onlinemagazinepk.com/recipes

editorufaq@aanchal.com.pk

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی



















خط وکتابت کا پتہ: ”آنچل“ پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

چلتے ہو تو چین کو چلیئے

گزشتہ دنوں دوستوں کے ساتھ چین جانے کا اتفاق ہوا اتفاق اس لیے کہ چین کے بارے میں پہلی بار غالباً 1950ء میں جب میں چوتھی کلاس میں داخل ہوا تو پہلی نظر جس تحریر پر پڑی جو کلاس کی دیوار پر نمایاں سجی تھی وہ تھی "علم کے حصول کے لیے اگر چین بھی جانا پڑے تو جاؤ" اسے ایک حدیث سے تشبیہ دی گئی تھی جو بہت بعد میں غلط ثابت ہوئی چین کے حوالے سے سب سے پہلے ابن انشا یاد آئے کہ ان کے دلچسپ سفرنامے نے بھی چین کا اشتیاق پیدا کر رکھا تھا اور ابن انشاء کے حوالے سے ان کے نامور بھتیجے عامر محمود کا یاد آنا ضروری تھا عامر محمود نے اس سفر چین کی تیاری میں لحہ لحہ دوستوں کی رہنمائی کی پھر خود بھی تیاری کی اور دوستوں سے کرائی بھی لیکن افسوس آخری لحہ میں وہ ساتھ نہ جاسکے کم از کم میں نے ہر قدم پر ان کی کمی شدید محسوس کی لیکن ان کی کمی کے احساس کو جناب عبدالرحمان منگریو نے اپنی محبت اور محنت سے ہونے نہیں دیا آئے بھی ہم گئے بھی ہم ختم فسانہ ہوگیا چین کا سفر یقیناً ایک بہت یادگار سفر رہا تمام ساتھیوں نے بھرپور علم حاصل کیا قدم قدم پر حیران کن تجربات سے گزرنا پڑا چین کے بارے میں زبانی کلامی جو جو سن رکھا تھا ہو بہو ویسا ہی پایا ساڑھے چھ گھنٹے کی پرواز کے بعد کراچی سے اڑ کر بیجنگ پہنچے جہاں ہمارا شاندار استقبال کیا گیا۔

اسی شام چین میں تعینات پاکستانی سفیر جناب مسعود خان صاحب نے پاکستانی سفارت خانے میں مدعو کیا اور پاکستانی کھانوں سے ضیافت کی ان سے بڑے خوشگوار ماحول میں گفتگو ہوئی اور پاکستان اور چین کے مشترکہ منصوبوں کی تفصیل سے انہوں نے آگاہ کیا انہوں نے یہ بھی بتایا کہ پاکستان میں اگر چین اپنے منصوبوں پر اپنے لوگوں سے کام لے رہا ہے تو وہ پاکستانی لوگوں کو چین میں کام کے مواقع بھی فراہم کر رہا ہے بڑی تعداد میں پاکستانی یہاں چین کے بڑے بڑے منصوبوں میں کام کرنے کے لیے بلائے گئے ہیں اگر پاکستان میں چینی لوگ کام کرنے جا رہے ہیں تو پاکستان سے بھی بڑی تعداد میں لوگ آ رہے ہیں۔ آج یہاں بیجنگ میں ہمارا دوسرا دن ہے آج ہماری ملاقات چینی محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر جنرل زنگ ای اور اعلیٰ حکام سے ہوئی ہے انہوں نے بریفنگ دی چین پاکستان دوستی کے بارے میں مثبت گفتگو کی اور پاکستان سے بھرپور تعاون اور دوستی کا اظہار کیا اور ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی اور پاکستان میں جاری ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں بتایا اور چین پاکستان کے مشترکہ مفادات اور منصوبوں کے بارے میں بھی مطلع کیا اور پھر ہمیں وزارت اطلاعات کے اور چائنا اکنامک سینٹر کے دفتر کا دورہ بھی کرایا صحافی جو کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹر کے وفد میں شریک تھے کو اپنے دفتر دعوت دی اور باہمی مشاورت کا اہتمام کیا میزبان نے اپنے خیالات کا اظہار مترجم کے ذریعے اپنی قومی زبان چینی میں ہی کیا جبکہ پاکستانی اہل صحافت نے انگریزی کو اپنا اظہار خیال کا ذریعہ بنایا انہوں نے بتایا کہ چین کے تمام اخبارات ایک منصوبے کے تحت اور قانون اور ضابطہ میں شائع کیے جاتے ہیں کوئی خبر تصدیق کے بغیر شائع نہیں کی جاسکتی تمام اشاعت گھر کی سرپرستی حکومت کرتی ہے حکومتی پارٹی ہر خبر کی نگرانی کرتی ہے اس لیے کوئی بے بنیاد خبر شائع نہیں ہوتی نہ ہی کی جاسکتی ہے موصوف نے ایک سوال کے جواب میں سی پیک کے بارے میں تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا انہوں نے بتایا کہ پاکستان میں بیک وقت کئی منصوبوں پر کام ہو رہا ہے سی پیک یقیناً ہمارا ایک بڑا اور اہم منصوبہ ہے اس سے جہاں پاکستان کو بے پناہ فائدہ پہنچے گا وہیں چین کے لیے بھی سی پیک کا منصوبہ بڑا اہم اور ضروری ہے یہ منصوبہ یقیناً پاکستان کے لیے اہم ہے اور اتنا ہی چین کے لیے بھی اہم ہے یہ منصوبہ اور اس سے جڑے ہوئے دیگر منصوبے چین کو پاکستان سے جوڑنے کا بڑا ہی اہم کردار ادا کریں گے دنیا دیکھے گی کہ کس طرح چین کی حمایت سے پاکستان دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل کرتا ہے جو ممالک اور لوگ اس کی اہمیت کو سمجھ رہے ہیں وہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں اس کا مطلب ہے کہ وہ پاکستان کو آگے بڑھتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی قافلہ چین کی وزارت خارجہ کے دفتر پہنچا دیا گیا وہاں خارجہ امور کے ڈائریکٹر جناب چن چن ین جو ایشیائی امور کے معاملات کے انچارج نے بھرپور بریفنگ دی وہاں سے ہمیں چائنا کے سب سے بڑے اخبار چائنا ڈیلی کے دفتر لے جایا گیا چائنا ڈیلی آٹھ ممالک سے بیک وقت شائع کیا جاتا ہے اس کی اشاعت ایک ملین سے زیادہ بتائی گئی اور تقریباً ستائیس ملین آن لائن ریڈرشپ بتائی گئی اس کے بعد دوسرے روز صبح صبح قافلہ چین کے صوبے سنکیانگ کے شہر ارمچی تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی پرواز سے پہنچا دیا گیا سنکیانگ کا رقبہ پاکستان سے تین گنا بڑا بتایا گیا یہ علاقہ خود مختار کہلاتا ہے یہاں ہماری ملاقات کمیونسٹ پارٹی چائنا کے مقامی رہنما غیرات سیف ہو سے کرائی گئی انہوں نے سنکیانگ اور اس کے بارے میں مکمل تفصیل سے آگاہ کیا ارمچی پہنچنے پر برف نے ہمارا استقبال کیا ہر طرف برف ہی برف کی چادر اوڑھے یہ شہر اپنی خوب صورتی کا منہ بولتا ثبوت تھا یقیناً پاک چین دوستی پاکستان کے مستقبل کے لیے بہت اہم اور سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہاں میری ملاقات ایک نہیں بلکہ کئی سنگیوں سے ہو جائے گی محترم ابن صفی نے اپنا کردار سنگی غالباً یہی سے لیا ہوگا ہوا یوں کہ جب ہم سنکیانگ کے شہر ارمچی پہنچے تو ہمارے استقبال سے لے کر ہماری رخصتی تک چینی پولیس اور خفیہ کے لوگ بھاری حفاظت و نگہداشت کے لیے سائے کی مانند ہمارے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے میں نے اپنے ہوٹل میں داخل ہونے سے قبل دروازے کے ساتھ کھڑے کالے سوٹ میں ملبوس خفیہ کے سیکورٹی آفیسر کو دیکھا تو یوں ہی چلتے چلتے اپنے مترجم کے توسط سے ان کا نام دریافت کیا تو انہوں نے جو نام بتایا میں اسے سن کر اچھل پڑا نام تھا چن چون سنگی، سنگی کا نام میرے لیے نہ ہی ابن صفی صاحب کے قارئین کے لیے بنا تھا لیکن یوں اچانک سرے راہ سنگی نام سے ملاقات ہو جائے گی تو میرے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے ہوں میں نے مترجم کے ذریعے دریافت کیا کیا آپ واقعی سنگی ہی ہیں پہلے تو انہوں نے اس کا مطلب پوچھا میں نے اس کے جواب میں پوری تفصیل سے ابن صفی صاحب کا تعارف کرایا اور انہیں بتایا کہ سنگی ہی ان کا مشہور زمانہ منفی کردار ہے جو جرائم کی دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتا اور چلتی ہوئی گولیوں سے جس پھرتی اور چالاکی سے بچ جاتا ہے اس کی مثال نہیں اس جواب پر پہلے تو وہ صاحب مسکرائے اور پھر چینی زبان میں ہی انہوں نے بڑی طول طویل تقریر کی جو ہمارے تو سر سے گزر گئی لیکن ان کے خاموش ہونے پر مترجم نے بتایا کہ یہ کہتے ہیں کہ سنکیانگ کا ہر شہری سنگی ہے رہی بات سنگ آرٹ کی تو وہ صرف آپ کے رائٹر کی تصوراتی تخلیق ہے میں خود مارشل آرٹ کا ماہر اور استاد ہوں اور خفیہ پولیس میں ایک بڑے عہدے پر ہوں لیکن مسلسل چلتی گولیوں سے بچ کر نکل جانا کیسے ممکن ہے ویسے کہنے کو میں بھی سنگی ہوں ہمیں بچپن سے ہی مارشل آرٹ کی تعلیم دی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ دوسری ایجوکیشن بھی شروع کر دی جاتی ہے بچپن کی گئی محنت ہماری زندگی کام آتی ہے کیا آپ کو مارشل آرٹ آتا ہے میں نے نفی میں گردن ہلائی وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا میں نے مترجم کے ذریعہ کہا کہ ہمارے ادیب ابن صفی کا کردار سنگی ہی ہے اس میں اور آپ کے نام میں ہی کا فرق ہے اس پر مترجم نے خود ہی جواب دیا کہ آپ پاکستان میں رہتے ہیں میں بھی اسلام آباد اور لاہور کے قونصل خانوں میں رہا ہوں جیسے آپ لاہور کے رہنے والے کو لاہوری اور کشمیر کے رہنے والے کو کشمیری کہتے ہیں ایسے ہی سنگی ہی بھی بولا جا سکتا ہے "ہی" کے معنی رہنے والے کے ہوں گے میں پھر اپنے کمرے میں چلا گیا چونکہ نیند آنے میں کافی دیر تھی اس لیے ذہن ابن صفی کے کرداروں میں مشغول ہو گیا میں سوچتا رہا ابن صفی صاحب کا کردار سنگی ہی یقیناً کبھی نہ کبھی زندہ جاوید رہا ہوگا ابن صفی صاحب سے اکثر ان کے کرداروں کے متعلق گفتگو ہوتی رہی تھی لیکن کبھی بھی انہوں نے نہ تو سنگی اور نہ ہی کسی اور کردار کے بارے میں تفصیل سے وضاحت کی وہ ہمیشہ مسکرا کر ٹال جاتے چین کے سفر نے جہاں نئے جہاں کی سیر کرائی معلومات کا خزانہ دیا چین اور چینی لوگوں کے متعلق بہت سا علم ملا وہیں ابن صفی کی ایسی زندہ یاد سے بھی دوچار کیا۔

⌘

گفتگو

اقبال بھٹی

"حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جس جوان نے کسی بوڑھے شخص کی اس کے بڑھاپے کی وجہ سے تعظیم وتکریم کی تو اللہ تعالیٰ
اس کے بڑھاپے کے وقت ایسے شخص کو مقرر کرے گا جو اس کی تعظیم کرے گا۔" (الترمذی)

عزیزان محترم...... سلامت باشد۔

تمام قارئین کو عیسوی سال نو مبارک ہو۔

جنوری 2018ء کا پہلا شمارہ حاضر ہے پرچے کی آخری تیاریاں جاری تھیں کہ لندن سے ہماری لکھاری محترمہ عشنا کوثر سردار نے اطلاع دی کہ ان کی خالہ اللہ کو پیاری ہوگئی ہیں پھر دو دن بعد اطلاع ملی ان کے جواں سال کزن بھی انتقال کر گئے ان للہ وانا علیہ راجعون اللہ تعالیٰ عشنا کوثر اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل دے اور مرحومین کی بخشش کرے، ادارہ نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز عشنا کوثر کے غم میں برابر کا شریک ہے اس صدمہ کے باعث وہ ایک سو سولہ چاند کی راتیں کی قسط مکمل نہ ارسال کرسکیں، اس لیے ان کی قسط آپ کو مختصر محسوس ہوگی۔

اس ماہ پراسرار کہانیاں پسند کرنے والوں کے لیے چار کہانیاں شائع کی جارہی ہیں چندر گانٹھ، زرین قمر۔ سچی محبت، خلیل جبار۔ بدلہ، عمارہ خان۔ زیگی، سید محمود حسن چاروں ادیب آپ کے جانے پہچانے ہیں پڑھ کر آپ اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔ عمارہ خان پراسرار کہانیاں لکھنے میں یہ طولیٰ رکھتی ہیں وہ نئے افق کے قارئین کے لیے ایک پراسرار ماورائی سلسلے وار کہانی لکھ رہی ہیں جو جلد ہی شائع ہوگی، اس ماہ فن پارے شامل اشاعت نہیں ان شاء اللہ آپ فروری کے شمارے میں اسے دیکھ سکیں گے نئے سال کے پہلے شمارے کے بارے میں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

اب آیئے اپنے تلخ وشیریں محبت ناموں کی طرف پہلا خط ہے **ایم حسن نظامی** کا قبولہ شریف سے آپ لکھتے ہیں سال رواں کا آخری پرچا ہاتھوں میں ہے اور اپنی سابقہ روایت برقرار رکھے ہوئے ہے سب سے پہلے میری طرف سے سبھی احباب کو نیا سال مبارک ہو ساتھیو، جو بیت گیا وہ ماضی تھا اور ماضی بھلانے کے لیے ہی ہوا کرتا ہے شاید، سو ہمیں سبھی نفرتیں ساری کدورتیں برے رویے ترک کرتے ہوئے ہر ایک کے ساتھ الفتوں سے پیش آنا چاہیے نئے سرے سے محبتوں کی آبیاری کرتے ہوئے اس سال کو مسرتوں سے ہمکنار کرنا ہے ہمیں عہد کرنا ہے کہ ہم سدا خوشیوں کو نفرتوں پر ترجیح دے کر ہر اک دل میں اپنی عزت آبرو اور مقام بنائیں گے اور کسی سے بھی زیادتی ہرگز نہیں کریں گے۔ اب آتے ہیں پرچے کی طرف تو سر مشتاق احمد صاحب حرام و حلال کی تمیز انمول اور صاف ستھرے انداز میں اجاگر فرما رہے تھے گفتگو میں سبھی احباب منفرد جذبات لیے حاضر

پائے۔ ریاض حسین قمر، محمد رفاقت، ریاض بٹ، فرح احسان، احسان سحر، عمر فاروق ارشد اور عبدالجبار رومی، سبھی احباب نے نا صرف ایک دوسرے سے دکھ سکھ شیئر کیے بلکہ پرچے پر بھی مدلل اظہار رائے دی اور سبھی دسمبر کے پرچے کے مہمان ٹھہرے۔ (الخالق) جی ہاں طاہر قریشی صاحب خداوند کریم کی وحدانیت الخالق کی روشنی میں ایمان افروز انداز تحریر سے واضح فرمار ہے تھے جیسے پڑھتے ہوئے من کے سبھی جذبے معطر اور شادمان ہو گئے۔ زرین قمر صاحبہ، ریاض بٹ عشنا کوثر سردار، محمد شعیب، عرفان راے، محمد رفاقت، خلیل جبار، حارث حیات، عارف شیخ، سباس گل، نوشین اقبال نوشی، ساحر جمیل سید، احسان سحر سبھی احباب نئے افق کے کہنہ مشق اور منجھے ہوئے لکھاری ہیں جو کہ پرچے کی جان اور پہچان ہیں اور انہی ساتھیوں کے دم سے نئے افق روز بروز نکھار کی طرف گامزن ہے میں انہیں اس قدر عمدہ معیاری اور منفرد مواد فراہم کرنے پر ادارہ کے سبھی کارکنان کو اس قدر سلیکشن، خوب صورت کمپوزنگ اور اچھوتی بائنڈنگ پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں امید ہے سال 2018ء میں بھی اس قدر معیاری دلکش اور اچھوتا مواد پڑھنے کو ملتا رہے گا۔ نئے افق کی پوری ٹیم لکھاری حضرات اور قارئین دوستوں کو ایک بار پھر نیا سال مبارک ہو خوش رہیے خوشیاں بانٹیے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے رہیے۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ۔ محترم جناب اقبال بھٹی صاحب سدا خوش رہیں آپ کو اور نئے افق کے تمام اسٹاف کو السلام علیکم، جناب اقبال بھٹی صاحب اس دفعہ دسمبر کے شمارے نے دل خوش کر دیا اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں میری کہانی شامل تھی محترم اقبال بھٹی صاحب اور آپ کی تمام ٹیم کا بہت بہت شکریہ، مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ اور آپ کی ٹیم کہانیوں کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرتی ہے اور یہ ایک اچھی بات ہے اس سے رسالے کا معیار برقرار رہتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے غریب غربا کی زکواۃ ہم سرکاری حج پر خرچ کر دیتے ہیں مشتاق احمد قریشی نے بہت اچھے انداز میں یہ مسئلہ اٹھایا ہے اس سے بہت سارے غریب مستحق لوگ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں اگر ہماری قوم میں دیانت داری آجائے تو یہ ملک دنیا کا عظیم ملک بن سکتا ہے، آتے ہیں خطوط کی طرف تو ریاض حسین قمر صاحب، ریاض بٹ صاحب، فرح امان صاحب، عمر فاروق ارشد صاحب، ایم حسن نظامی صاحب نے دل سے خط لکھے ہیں اور اپنی اچھی سوچ کو قلم کے ذریعے نئے افق رسالے کی جان بنایا ہے دل کھول کر تبصرہ کرنے پر سب دوستوں کو بہت بہت مبارکباد قبول ہو اور جن دوستوں نے میرے خط کو پسند کیا ہے ان سب کا بھی بہت بہت شکریہ، آتے ہیں کہانیوں کی طرف اس دفعہ سب ہی کہانیاں اچھی تھیں اس کا ذکر میں خط میں کر چکا ہوں اور مزید اپنی رائے دے دیتا ہوں ویسے سب کہانیاں لکھنے والوں کو مبارکباد قبول ہو، کہانیوں میں سرورق کی کہانی زرین قمر صاحبہ نے ''ہرکارہ موت'' بہت خوب صورت انداز میں پیش کی ہے بہت بہت مبارک ہو، دوسری کہانی ریاض بٹ صاحب ''بازگشت'' بہت ہی اچھی کہانی تھی بٹ صاحب کو بہت بہت مبارک ہو، ''بے وفا مرد'' محمد شعیب صاحب کی ''فتنہ گر'' محمد عرفان راے صاحب کی ''خواب یا سراب'' حارث حیات صاحب کی کورٹ کی کہانی محترم خلیل جبار صاحب کی ''اذیت کا شکار'' ''چھری مار'' عارف شیخ صاحب کی بہت خوب کہانیاں تھیں سلسلے وار کہانی ''مرشد'' ساحر جمیل سید صاحب کی بہت اچھی جا رہی ہے اور اسی طرح ''ہیجان'' کا دوسرا حصہ بھی پڑھنے کے لائق ہے فارس مغل صاحب نے بہت محنت کی ہے ذوق آگہی اور کترنیں بھی رسالے کی مہک میں اضافہ کر رہی ہیں میری طرف

سے سب لکھنے والوں کو بہت بہت مبارک ہو اللہ ان کے زور قلم میں اور اضافہ کرے، آمین۔ سب پڑھنے والوں کو بہت بہت سلام قبول ہو۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ مدیر محترم نئے افق سلام شوق امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے خوب صورت ٹائٹل والا دسمبر کا نئے افق موصول ہوا دل باغ باغ ہو گیا، دستک میں محترم ومکرم مشتاق احمد قریشی صاحب جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں لکھنے کا حق ادا کر دیتے ہیں حسب سابق انہوں نے اس بار جس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہے رب کریم انہیں عمر دراز اور صحت مندی عطا فرمائے، آمین۔ اس پر آپ نے مجھے کرسی صدارت پر متمکن فرما کر میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی ہے شکر گزار ہوں محترم جناب ریاض صاحب میرے بارے میں آپ کے نیک جذبات وخیالات کی میں تہہ دل سے قدر کرتا ہوں رب ذوالجلال آپ کو خوش وخرم رکھے آمین، پیارے بھائی عمار ارشد صاحب کی یہ ادا مجھے بہت بھاتی ہے کہ وہ جو محسوس کرتے ہیں اسے لگی لپٹی کے بغیر بیان کر دیتے ہیں ڈیئر آپ کو میرا کلام پسند آتا ہے یہ میرے لیے باعث فخر ہے گزشتہ ماہ میرا کلام آپ کے ذوق کی تسکین نہیں کر سکا، اس کے لیے معذرت آئندہ کوشش کروں گا کہ میرا کلام آپ کو اور آپ جیسے دوسرے باذوق قارئین کو پسند آئے 2 دسمبر کو میری بیٹی کی ہے قارئین سے التماس ہے کہ وہ اس کے اچھے نصیبوں کے لیے دعا فرمائیں اس ماہ کے آخر میں پاک وطن دھرنوں کی لپیٹ میں رہا عوام کو اپنی ان گناہگار آنکھوں سے رلتا دیکھا نہ جانے ہمارے نام نہاد رہنما ہم سے کیا چاہتے ہیں ان کی ہٹ دھرمی کی بھینٹ چڑھنے والے لوگوں کے دلوں سے کیا دعا نکلی ہوگی کاش ہمارے یہ نام نہاد رہنما اپنے اندر ایک مکھی کے دانے کے برابر خوف خدا پیدا کر لیں تو ہمارا یہ ملک جنت کا ایک ٹکڑا بن جائے اے کاش۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر۔ سب سے پہلے تو میری طرف سے آپ کو اور تمام رائٹرز کو نیا سال 2018ء بہت بہت مبارک ہو آپ سب کے لیے کہا گیا۔

تو بول اٹھے تو لفظ خوشبو تو سوچ لے تو خیال خوشبو
تیرے تعلق سے بن گیا ہے سوال خوشبو جواب خوشبو

سرورق دیکھ کر یہ شعر ہونٹوں پر مچلنے لگا۔

تیرے چہرے کے یہ سادہ سے اچھوتے سے نقوش
میرے تخیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں
تیری زلفیں تیری آنکھیں تیرے عارض تیرے ہونٹ
کیسی انجانی سی معصوم خطا کرتے ہیں

سال 2017ء کا آخری شمارہ دسمبر کی طرح اداسیاں بکھیر گیا اللہ کرے 2018ء ہم تمام مسلم ممالک کے لیے خیر وبرکت کا باعث ہو، آمین۔ چار پانچ بار گفتگو کے صفحات پر نظر دوڑائی مگر میرا خط نہیں تھا 31 تاریخ کو بھیجا گیا خط نہ جانے آپ تک کیوں نہیں پہنچا، اس سے پہلے بھی مہینے کی آخری تاریخ کا بھیجا گیا خط آپ نے شائع نہیں فرمایا تھا جبکہ پاکستان بھر میں ڈاک ایک سے دو دنوں میں پہنچ ہی جاتی ہے خیر کوئی بات نہیں اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اسلام آباد میں دھرنا دینے والے تحریک لبیک یا رسول اللہ کے عاشقان رسول تھے اگر حکومت وقت وزیر قانون زاہد حامد کا پہلے ہی سے استعفیٰ لے لیتی تو ملک تین دن تک مفلوج نہ ہوتا

افراتفری نہ ہوتی گفتگو میں پہنچے تو اقبال صاحب آپ درست فرما رہے تھے کہ امریکا اور افغانستان ہمیں بار بار دھمکیاں دے رہا ہے نئے سال میں اللہ تعالیٰ ہمیں اتحاد اتفاق اور محبت سے رہنے کی توفیق دے، آمین۔اس بار صدارت کی کرسی پر ریاض حسین قمر براجمان تھے، ویلڈن قمر بھیا بہترین چٹھی، محمد رفاقت، فرح احسان، محمد اسلم جاوید، چھوٹے چھوٹے خطوط سے کام نہیں چلے گا تفصیل سے خطوط لکھا کریں ریاض بٹ میرا شعر پسند فرمانے کا شکریہ، آپ کا شعر بھی زبردست تھا عمر فاروق ارشد، آپ نے تفصیلی تبصرہ کر کے دل خوش کر دیا آپ کو میری آپی فریدہ جاوید فری کا کلام پسند آیا آپ کی مہربانی ان کی ہر غزل ہر نظم ہی شاندار ہوتی ہے دعا کریں اللہ تعالیٰ میری فری آپی کو مکمل صحت تندرستی عطا فرمائے اور ہم ان کی شاعری سے محظوظ ہوتے رہیں، آمین۔ایم حسن نظامی میرا خط پسند فرمانے پر شکریہ نئے سال کے حوالے سے آپ کی دعائیہ نظم کمال کی تھی عبدالجبار رومی، آپ کا قطعہ بھی زبردست تھا آپ کو گزشتہ سالگرہ مبارک ہو ذوق آگہی میں مہر پرویز دولو، زرینہ الیاس، چوہدری الیاس، ماریہ کنول، شبیر احمد، خوش بوئے سخن میں نوشین اقبال نوشی، شبنم فردوس، سیف الاسلام چھائے رہے کہانیوں پر تبصرہ اس لیے نہیں کر سکتا کہ وہ میں نے ابھی تک پڑھی نہیں ہیں اگر میں کہانیاں پڑھ کر تبصرہ بھیجتا تو خط لیٹ ہو جاتا جیسا کہ پچھلے ماہ ہوا تھا آپ سے گزارش ہے کہ بہترین تبصرے پر کیش انعام کا سلسلہ دوبارہ سے شروع کر دیں تا کہ مقابلے کا رجحان ہو اور ہمیں ان سے بھی زیادہ خوب صورت تبصرے پڑھنے کو ملیں اس کے ساتھ ساتھ ایک لفظ ایک شعر کا سلسلہ شروع کریں جس میں آپ ایک لفظ دیں جس پر ہم رائٹرز، اشعار ارسال کریں اور وہ اشعار آپ سلسلے میں شائع فرمائیں، ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں خدا حافظ۔

عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور۔

رنگ ایک ہی ہے گیسو لباس کا
آنکھوں میں بھرا ہے عکس پر اسرار سا
کس کو تاب ہے اسے نظر بھر کے دیکھے
بلیک میجک ہے ٹائٹل دل فگار سا

نیا سال آ گیا اور تلخ و شیریں یادیں ویسی کی ویسی ہی سامنے کھڑی ہیں پچھلے دنوں ختم نبوت ﷺ کے قانون میں تبدیلی کا معاملہ زور پکڑ گیا حکومت نے تو ٹال مٹول کر کے اسے دبا دیا تھا مگر عاشقان رسول ﷺ اس کو کب گوارا کرتے کہ یہ معاملہ دب جائے یوں اس کے قصورواروں کو منظر عام پر لانے اور انہیں سزا دینے کے مطالبے کے طور پر فیض آباد میں دھرنا دیا گیا جس سے حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی اور جب یہ دھرنا بیسویں روز میں داخل ہوا اور اس کے خلاف آپریشن ہوا تو اس کے اثرات پورے ملک میں پھیل گئے اور بڑے بڑے شہروں میں دھرنا اور ہڑتال ہوگئی یوں حکومت کو بھی گھٹنے ٹیکنے پڑے اب عوام کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مذہب پر سودے بازی کرنے اور مفاد عاملہ کے خلاف چلنے والی ایسی کسی پارٹی اور حکومت کو ہرگز آگے نہ آنے دیا جائے مذہب اسلام سچا اور سچا دین ہے جو ہمیں حکومت سازی سے لے کر عام آدمی تک مکمل قانون اور ضابطہ حیات فراہم کرتا ہے پھر اغیار کے بہکاوے میں آ کر اسلامی شقوں ختم نبوت ﷺ کے معاملے میں ردوبدل کیوں ہو پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور اس کی سالمیت دین اسلام سے جڑی ہے پھر اس پر کوئی آنچ کیوں آئے۔ گفتگو کے محبت ناموں میں ریاض حسین قمر کا بھرپور اور عمدہ تبصرہ بہت اچھا لگا روشن ضمیر قوم کی تو بہت ضرورت ہے اللہ آپ کے دعائیہ کلمات کو

شرف قبولیت دے محمد رفاقت واہ کینٹ کا شکوہ بھی بجا ہے ان کی تحریروں کو بھی جگہ ملنی چاہیے۔ ریاض بٹ کا یار زندہ صحبت باقی خوب صورت تبصرہ بہت اچھا لگا فرح احسان کا تبصرہ صرف دستگیر شہزاد تک ہی محدود تھا اچھا لگتا اگر نئے افق پر بھی کچھ اظہار خیال کر دیتیں باقی دستگیر شہزاد کی فنکارانہ صلاحیتیں بہت اچھی ہیں اور اپنی جگہ پر۔ عمر فاروق ارشد کی سچائی تو بہت ہی کڑوی ہے بہت عمدہ اور مدلل تبصرہ کیا ہے اچھا لگا اور نظم پسند کرنے کا بے حد شکریہ، محبتیں بانٹتے ہوئے ایم حسن نظامی نے بھی اچھا لکھا ہے ذوق آگہی اے ایس حبیب خان، چوہدری الیاس، شبیر احمد اور خوش بوئے سخن سے یاور اقبال، پرنس افضل شاہین اور سیف الاسلام کا کلام وانتخاب عمدہ رہا، کہانیوں میں محترمہ زرین قمر کی ہرکارہ موت اچھی رہی، ڈاکٹر بدر نے کرن عرف ملائیکہ کو نفسیاتی مریض بنا کر حاصل کرنے کی پوری کوشش کی مگر وہ خود ہی نفسیاتی مریض تھا اور مجرم بھی سو اپنے انجام کو پہنچا اور ملائیکہ کو اس کا جیون ساتھی مل گیا شکر ہے نورالعین کی ٹرین بھی پاکستان پہنچی اور پھر اکلوتے بھائی کی محبت جاگ اٹھی تو انہیں بھی جلال کی فکر ہوئی اور تیمور کو اپنی محبت کی فکر لگ گئی دوسری طرف خوشنما کو دلخراش منظر میں حمزہ کو لاش بنتے نظر آیا تو وہ بھی ساکت رہ گئی ایک سو سولہ چاند کی راتیں بھی دل دہلا رہی ہے گہری محبتوں کے سحر میں جکڑی بجان نے تو اس دفعہ کوئٹہ اور آس پاس کے دلکش نظاروں کی سیر کرا دی بہت اچھا لگا اور کہانی بھی ایسی گہری کہ سمجھنا ہی مشکل ہو جائے محترم فارس مغل نے عمدہ تحریر لکھی ہے یہ جاگیردار اور اس کا بیٹا اتنی دیر مرشد کی ماں اور حجاب کی مٹی پلید کرتے رہے اور مرشد کا کچھ پتا ہی نہیں کدھر ہے یہ بھی عجیب معاملہ ہے اب حسن آرا اس کی مدد لینے جا رہی ہے تاکہ زخمی حجاب کو سنبھال سکے اب دیکھو مرشد کے کیا تاثرات ہوں گے بچے کی خواہش میں رجو نے معصوم بچے کو ہی اس کی ماں سے جدا کر دیا اور پھر وہ نگہداشت نہ ہونے سے مر بھی گیا اور اسی جرم میں رجو کو سزا ہوگئی رفاقت کی کہانی بھی لالچ اور بے حسی کا ثبوت تھی بے وفا مرد گھر گرہستی سے وفاداری کون کہتے ہیں مرد بے وفا ہوتے ہیں وطن کی محبت میں جان دینے والے اپنی بیویوں اور ماؤں بہنوں پر بھی جان نثار کرنے والے ہوتے ہیں عمدہ کہانی فن پارے میں حوا کی معصوم بیٹی نے دکھی کر دیا ماں بھی بنت حوا اور اس کی بیٹی بھی بنت حوا اور سارے ظلم بھی بنت حوا پر اللہ ہدایت دے شادو کو پیار کی جاچ کیا سکھائی ڈپٹی انسپکٹر کے اعتبار کے پرندے ہی پرواز کر گئے عمدہ کہانی والسلام۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم، سال 2017ء کا آخری شمارہ 24 نومبر کو بے قرار نگاہوں کے سامنے آیا سرورق اچھا ہے اشتہارات کو بغور دیکھتے ہوئے بڑھے مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک کی طرف اللہ انہیں صحت اور حوصلہ دے کہ وہ اس قسم کے کالم لکھتے رہیں انہوں نے بڑی دلیری سے یہ کالم لکھا ہے اور زکواۃ کے پیسوں سے سرکاری طور پر حج کرنے والوں کو بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ حلال نہیں ہے لیکن جہاں حلال اور حرام میں تمیز کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی جائے وہاں یہ بات بھینس کے آگے بین بجانے والی ہی ہے خدا بزرگ و برتر ہمیں نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اس کے بعد بڑھے خطوط کی محفل گفتگو میں پیارے اور قابل قدر اقبال بھٹی صاحب نے سال 2017ء کے متعلق جو کچھ کہا وہ قابل غور اور قابل تعریف ہے ہم بھی دعا گو ہیں کہ نیا سال ہمارے لیے خوشیاں اور طمانیت لے کر آئے محفل میں سب سے پہلا خط ہے جناب بھائی ریاض حسین قمر کا کیا خوب انداز تحریر ہے کرسی صدارت مبارک ہو جس واقعہ کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ قابل تقلید ہے روشن ضمیر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں ورنہ یہاں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو آنکھیں اور دل بند کیے ہوئے ہیں اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی تمنا میں سب کچھ بھول جاتے ہیں آپ کی محبتوں اور عنایتوں کا

ہمیشہ مقروض رہوں گا میرا خط یعنی تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ، پچھلی بار میری کہانی ڈراپ ہوگئی تھی خیر کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے محمد رفاقت بھائی آپ کا خط بھی مختصر ہونے کے باوجود اچھا ہے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن آپ نے کہاں سے سیکھا ہے خیالات بھی اچھے ہیں خوش رہیں محمد اسلم جاوید کا تبصرہ بھی اپنی مثال آپ ہے واقعی اس مہنگائی کے دور میں ایسا خوب صورت رسالہ اتنی کم قیمت میں دینا صرف نئے افق والوں کا ہی کام ہے ویسے اگر آپ نئے افق کے سالانہ خریدار بن جائیں تو آپ کافی جھنجٹ اور مشکلوں سے بچ جائیں گے اور اس وقت آپ کو ایک خوشگوار احساس ہوگا جب ڈاکیا آپ کے دروازے پر آ کر کہے گا جناب نئے افق لے لیں اگلا خط ہے پیارے بھائی عمر فاروق ارشد صاحب کا آپ کے لیے ایک شعر۔

چوٹ لگی دل پہ تو یہ احساس ہوا
مارا تھا اس نے سنگ گلوں میں لپیٹ کر

بھائی آپ کا تبصرہ قابل تعریف ہے اگر مجھے تبصرہ پسند نہ آتا تو برملا اظہار کردیتا مولا آپ کو خوش رکھے آپ کو ملاپ والی کہانیاں اچھی لگتی ہیں جبکہ مجھے ٹریجڈی کہانیاں بہرحال آپ مجھے لکھاری سمجھتے ہیں جس کے لیے شکر گزار ہوں ایم حسن نظامی بھائی کیسے ہو، آپ بھی بہت اچھے تبصرہ نگار ہیں لفظوں کا انتخاب لاجواب ہے میرے خیال میں سونے کو پیتل کہنا بہت غلط بات ہے مجھے یاد رکھنے کا شکریہ، آپ کی دعاؤں کا شکریہ، واقعی ہی ہمیں نفرتیں، رنجشیں اور کدورتیں بھلا کر نئے سال میں قدم رکھنا چاہیے عبدالجبار رومی آپ کا قطعہ بھی ہمیشہ کی طرح بہت سندر ہے اس بار میں ایک شعر پہلے لکھ چکا ہوں اس لیے آپ کے قطعے کا جواب نہیں لکھ سکتا بہرحال تبصرہ جاندار ہے میرے تبصرے اور کہانی کے متعلق جواب کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ اس طرح محفل کی رونق بڑھاتے رہیے سالگرہ مبارک ہو ویسے آپ کی سالگرہ تو گزر چکی ہوگی اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف زرین قمر کی کہانی بہت عمدہ ہے جیت کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے محمد شعیب کی بے وفا مرد کی کیا تعریف کروں دیئے کے جسم میں خورشید تولا کر نہیں رکھا جاسکتا دھرتی ماں کی خاطر قربان ہوجانے والے مردوں کی کہانی ہے جو صرف ایک یا دو رشتوں کے لیے نہیں جیتے بلکہ پوری انسانیت کو بچانے کے لیے جیئے ہیں محمد عرفان رامے بھی اچھا لکھنے والوں میں ہیں ان کی کہانی فتنہ گر ایک بہترین کہانی ہے بکرے کی ماں ایک وقت تک خیر مناتی ہے پھر ضرور چھری کے نیچے آتی ہے سکندر شہزاد کا انجام بڑا بھیانک ہوا لیکن وہ بھی تو اپنے جرم کو چھپانے کے لیے تین قتل کرچکا تھا اپنی بیوی الماس کا قتل اس کے علاوہ ویسے ایک قانون کے محافظ کا قانون کو ہاتھ میں لینا کسی طرح بھی سراہنے کے قابل نہیں ہے عمر قید محمد رفاقت صاحب کی اپنی سوکنوں کو نیچا دکھانے والی ایک عاقبت نااندیش عورت رجو کی کہانی ہے جو ہر صورت بچہ حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن آ کر پکڑی گئی کہانی اچھی ہے امید ہے آپ کی حوصلہ افزائی (ایڈیٹر صاحب کی) سے یہ مزید اچھی کہانیاں لکھیں گے یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ نئے افق میں نئے لکھنے والوں کو جگہ دی جاتی ہے باقی پرچہ ابھی زیر مطالعہ ہے کیونکہ اپنی نئی تفتیشی کہانی لکھ رہا ہوں تاکہ وقت پر پہنچ جائے مجھے اپنے قارئین کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔

جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ محترم مدیر سلامت السلام علیکم! اچھی خاصی دیر اور خاصا انتظار کے بعد نئے افق کا چاند طلوع ہوا ٹائٹل اور گیٹ اپ دیکھ کر دل خوش ہوگیا بہترین کہانیوں اور گیارہ عدد فن پارے تو دل کو اطمینان دیتے ہیں تبصرے اچھے رہے اور سوچ کی گہرائی، عمدہ تنقید مثبت مشورے اور

حالات حاضرہ پر صحت مند تنقیدی نظر خوب تھی ہمارے ملک کی جو حالت اس وقت ہے کہ اگر ایک حرام کا ذرہ بھی کھالیا تو دعائیں التجائیں سب غارت ہوجاتی ہیں اور قبولیت کا سوچنا بھی شیطان کا ایک اور حربہ ہے نعوذ باللہ۔ آیئے ذرا علامہ اقبالؒ سے رجوع کرتے ہیں آپ نے فرمایا تھا۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہرا

ترجمہ: ''یہ شیخ حرم ہی ہے جو حضرت ابو ذر غفاریؓ کی کملی اور حضرت اویس قرنی کی گدڑی اور سیدہ فاطمۃ الزہرا کی مقدس چادر کو بھی بیچ کھاتا ہے۔''

کیونکہ جب طریقت سلوک اور رشد و ہدایت کے مراکز اور مسند علمی معیار اور اہلیت و قابلیت کے بغیر وراثت بن جائیں تو زوال نوشتہ دیوار ہے پھر سیاسی مسندیں بھی وراثت میں منتقل ہونے لگیں تو زوال کا ایسا سفر شروع ہوا جو ختم ہونے میں بھی نہیں آرہا۔ بربریت، سفاکیت، ظلم کی انتہا کرنا، عورتوں کو برہنہ گاؤں میں پھرانا، اور بے شرمی و بے حیائی کی آخری منزل بھی پھلانگ جانا اوران کو صحیح طرح سے نبٹنے والا بھی نہ ہو صرف اپنی عزت شان و شوکت اور شیطانی خواہشات کے غلام ہوں تو یہ فرمان صحیح ہے کہ ہمیں بارش و دوسری نعمتیں بے زبان چرند کی بدولت خیرات میں ملتی ہیں۔ گفتگو میں ایک خاص صفت کا ذکر ہے جو حدیث شریف میں منقول ہے سبحان اللہ محترم ریاض حسین قمر تبصرہ بڑا جاندار مکمل اور جامع تھا اپنے خطوط میں دوسروں کی عزت نفس کا خیال رکھا کریں بہترین نصیحت ہے۔ ریاض بٹ صاحب کہانی کے ساتھ حاضر ہیں تبصرہ سیر حاصل ہے تفصیلا کہانیوں کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تھا بازگشت ایک بھرپور جاسوسی تحفہ ہے آپ کے منفرد انداز نے دل موہ لیے ہیں قارئین کا حوصلہ بھی آپ خوب بڑھاتے ہیں فرح اسد کی حاضری تبصرہ کے ساتھ اچھی تھی محمد اسلم جاوید بڑے دن کے بعد گفتگو میں شامل ہوئے اچھے لگے، آپ کی غزل بھی حسب معمول بہت ہی زبردست تھی آپ کی لکھی ہوئی دعائیں ضرور قبول ہوں گی۔ حسب معمول عمر فاروق ارشد صاحب کی بھرپور حاضری نے مزہ دے دیا ان کے بچپن کی یاد میں ہم سب کو بھی بچپن کے انمول وقت میں لے گئیں، باقی آپ کا تبصرہ تنقید اور توصیف سب بڑے اچھے انداز میں لکھا گیا تھا اور ہاں تبصرہ میں چائے پکوڑے اور سموسے کا ذکر منہ میں پانی بھر لایا فوراً گھر والوں کو کہہ کر کچھ دیر میں ہی نوش جان بھی کر لیے۔ ایم حسن نظامی کا تبصرہ بھی قابل تعریف تھا اور الوداعی نظم تو واقعی انمول تھی جبار رومی نے تفصیلا تبصرہ لکھا اور کوریج بھی قابل تعریف تھی اور ہاں آپ کو سالگرہ مبارک مگر کون سی سالگرہ۔ محترم مشتاق احمد قریشی کی دستک واقعی چشم کشا تھی نصیحتوں کو قبول کرنے والوں کے بے بہا انمول اور راہ راست پر آنے کے لیے سنہرا موقع دے مگر کاش شیطان کے ہتھے نہ چڑھیں بہت سی بے انتہا چیزیں جو گند سے بھری ہوتی ہیں وہ شیطان بھی سنہری اور پرکشش کور میں دیتا ہے اللہ اپنی امان میں رکھے آمین، محترم طاہر صاحب کا اقرار میں اسماء الحسنٰی کی تشریح اور فوائد قابل تعریف ہیں اور جزاک اللہ کہانیوں میں زرین قمر کی ہرکارہ موت پوری شان و شوکت کے ساتھ نئے افق کے صفحات پر براجمان ہے بہت ہی زبردست اور حسب معمول دل موہ لینے والی اور آخری فقرے تو دل کو خوشی دے گئے ریاض بٹ کی طرز تحریر زبردست ہے اور لمبی بھی تھی اس لیے اور بھی مزہ دے گئی ریاض صاحب کہنہ مشق لکھاریوں میں شامل ہوگئے ہیں اللہ کرے اور زور قلم آمین اور تنویر کی کہی ہوئی بات تو معاشرے کے کرتا دھرتا جو ہیں ان کے چہرے پر ایک تھپڑ ہی پڑا ہے محمد عرفان رامے کی فتنہ گر مختلف ڈگر کی کہانی

اور سبق آموز داستان رہی خیر متوقع انجام بھی قاری کو جھنجوڑ دیتا ہے۔ عمر قید کو محمد رفاقت نے خوب لکھا ہے مگر کچھ واقعات ذرا انہوں نے سے بھی آ گئے ہیں اتنی آسانی سے بچہ اٹھایا نہیں جا سکتا جبکہ کیمرے بھی لگے ہوں بہر حال کاوش اچھی تھی اور خلیل جبار حسب معمول بہترین چیز لائے ہیں اور رپورٹر کی حیثیت سے خلیل کا یہ روپ بہت پسند آیا ہے اور کہانی نے تو بہت ہی لطف دیا چھری مار کراچی میں چھری مارنے والے ملزموں کے واقعات سے متاثر بڑی نصیحت آموز اور زبردست کہانی لکھی گئی ہے عارف شیخ صاحب کا لکھنا خوب تھا ویری گڈ۔ فن پارے میں گیارہ کہانیاں زبردست رہیں چھوٹی چھوٹی اور عام مگر انتہائی توجہ طلب موضوع پر لکھی گئی تھیں، شمسہ نجمی کی جاچ ذرا سی حد سے آگے چلی گئی مہرہ بھی اچھی رہی، باقی سب اچھے قابل مطالعہ فن پارے تھے ابھی سلسلہ وار کہانیاں زیر مطالعہ ہیں کیونکہ 25 کو میگزین موصول ہوا تھا خوش بوئے سخن زبردست رہا نوشین صاحبہ کی اپنی غزل ہی میدان مار گئی باقی انتخاب انتہائی معیاری تھا ریاض قمر واقعی میدان مار گئے ذوق آگہی میں انتخاب بڑی عرق ریزی سے کیا گیا ہے اور مجھے فخر ہے کہ ہمارے میگزین میں انتہائی معیاری مواد دیا جاتا ہے اور یہ بھی خوشی کا مقام ہے کہ ٹائٹل کے اندر، آخر ٹائٹل کے اندر اور باہر خوب صورت اشتہارات کا اضافہ ہوا ہے اور چند اشتہارات اندرونی صفحات میں بھی ہیں اشتہارات کے لیے اور محنت کی ضرورت ہے۔



مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 'تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 'فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

نوٹ: 1:00 تا 2:30 نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوتا ہے لہٰذا اس دوران دفتر ٹیلی فون کرنے سے گریز کریں۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

الباری

(ہر چیز کا موجد)

باری کے معنی ہیں' نکال کھڑا کرنے والا' پیدا کرنے والا' باری اللہ تبارک وتعالٰی کی مخصوص صفت ہے' باری خالق کے ہم معنی ہے گو کہ خالق اور باری ربّ کائنات کی الگ الگ صفات ہیں' ان دونوں میں باہم فرق ہے لیکن ہم معنی ہونے کی صورت میں باری کو خالق کی تاکید سمجھا جاسکتا ہے۔علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ باری وہ ہے جس نے مخلوق کو تفاوت اور اجزا واعضاء کے عدم تناسب سے بری پیدا کیا' یعنی یہ نہیں ہوا کہ ایک ہاتھ تو بہت چھوٹا اور پتلا ہو اور دوسرا بہت بڑا اور موٹا ہو۔اسی طرح خاصیتوں اور شکلوں نیز خوبی اور برائی میں ایک دوسرے سے ممتاز فرمایا۔اس لئے اس اعتبار سے باری خاص ہوا اور خالق عام' یعنی خالق کے معنی صرف پیدا کرنے والے کے ہیں۔(روح المعانی)

امام بیہقیؒ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ حلیمیؒ کا بیان ہے کہ باری کے دو معنی ہو سکتے ہیں' ایک تو اپنے علم کے مطابق طرح طرح کی مخلوقات کو ایجاد کرنے والا' دوسرے یہ کہ ''باری'' سے مراد قلبِ حقیقت اور تبدیلِ ماہیت کرنے والا ہے۔

بعض مفسّرین اور صاحب لسان العرب یوں بھی کہتے ہیں کہ ''خلق'' اور ''بر'' میں ایک بنیادی فرق ہے' یعنی خلق عام اشیاء کی تخلیق کے لئے ہے اور ''بر'' حیوانات کی تخلیق کے لئے مخصوص ہے۔اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالٰی کی صفتِ الباری وہ صفتِ الٰہی ہے جو روح کو پیدا کرنے اور بعض اوقات جواہر اور اعراض کے پیدا کرنے کے بارے میں جس کا استعمال ہوا ہے۔

''خلق'' کے معنی تقدیر یا منصوبہ سازی کے ہیں اور ''برء'' کے معنی چاک کرنا' جدا کرنا' پھاڑ کر الگ کرنا' خالق کے لئے باری کا لفظ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے کہ وہ اپنے سوچے سمجھے ہوئے منصوبے یا نقشے کے مطابق کسی بھی چیز کو عدم سے نکال کر وجود دیتا ہے۔

ترجمہ:۔ وہی اللہ ہے پیدا کرنے والا وجود بخشنے والا۔ (الحشر۔۲۴)

اس عظیم ترین کائنات کے خالقِ عظیم نے اپنے نام اور صفات کا ذکر مختلف انداز میں فرمایا ہے تا کہ انسانی ذہن گمراہی سے بچنے کی کوشش کرے اور قربِ الٰہی حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کا تعارف بہت سی آیات میں فرمایا ہے' تا کہ انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کے بارے میں پوری طرح جان لے' سمجھ لے اور اللہ کی ذاتِ عالی کو پہچان لے اور تمام صفاتِ الٰہی کو اپنے دل میں بٹھالے۔ اللہ تعالیٰ ایسی عظیم الشان قدرت کا مالک ہے کہ وہ نہ صرف انسانوں کو بلکہ تمام کائنات کی تمام مخلوقات کو پھر سے پیدا کرسکتا ہے' انہیں ماربھی سکتا ہے' ان کی نگہبانی و پرورش بھی وہی کرتا ہے اور وہ اپنی مخلوق کے سینوں میں پوشیدہ باتوں' ارادوں اور خیالات تک سے پوری طرح باخبر رہتا ہے۔ وہ حاکم بااختیار ہے' قادرِ مطلق ہے اس نے ہی سب کو پیدا کیا اور ان میں روح ڈالی اور وجود بخشا۔

فضائل:۔ جو شخص ہفتے میں ایک سو بار ''یاباری'' کا ورد کرے تو اللہ تعالیٰ اسے مرنے کے بعد قبر سے ریاضِ قدس کی طرف لے جائے گا۔ جو شخص اس صفتِ عالی ''یاباری'' کا کثرت سے ورد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دعائیں قبول کرتا ہے اور خیر و برکت میں اضافہ فرماتا ہے۔ بخشتا ہے' ہر نماز جمعہ کے بعد اگر ایک تسبیح ''یاباری'' کی پڑھنا اپنا معمول بنالے تو وہ ان شاء اللہ عذاب قبر سے محفوظ رہے گا۔



سایہ دیوار

امجد جاوید

انسان ہر دور میں مجبوریوں کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انسان کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔جو آمائش میں کامیاب ٹھہرتے ہیں، زندگی انہیں نوازتی ہے۔ دوسروں کی مجبوری سی فائدہ اٹھانے والے لوگ بھی اسی جہاں میں ہیں اور اسی دنیا میں دوسروں کو سہارا دینے والے بھی موجود ہیں۔

اپنی ذات، مجبوریوں اور دنیاوی مسائل سے لڑنے والی ایک لڑکی کی کتھا





وہ دونوں سڑک کنارے کھڑی ارد گرد پھیلا ہو سنسان ویرانہ دیکھ کر ششدر رہ گئی تھیں۔ یوں جیسے کچھ کہنے کو لفظ ہی گم ہو گئے ہوں۔ چند لمحے پہلے تک بس کا شور چند لمحے ہوا میں گھلا رہا پھر وہ بھی ختم ہو گیا۔ انہیں ماحول میں سناٹے کا احساس تب ہوا، جب بس انہیں سامان سمیت اُتار کر آگے بڑھ گئی۔ دونوں ہی اپنے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ دور دور تک کہیں فصلیں تھیں اور زیادہ ریتلی زمین تھی۔ چھوٹی چھوٹی خودرُو جھاڑیاں اور درخت تھے۔ آدم زاد نام کی کوئی شے انہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ فارحہ نے گھبرا کر اس طرف دیکھا، جدھر بس گئی تھی۔ سیاہ خالی سڑک نے اس کی گھبراہٹ مزید بڑھا دی۔ اس نے پہلے سے ٹھیک حجاب کو پھر سے درست کیا اور ماورا کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کہاں آ گئے ہم؟'' فارحہ کے لہجے میں احتجاج کے ساتھ ساتھ خوف پوری طرح عیاں تھا۔ مائرہ نے ہوا سے اُڑتے ہوئے اپنے گیسو قابو میں کرتے ہوئے اعتماد سے کہا

''ایسا ہونا تو نہیں چاہئے، ممکن ہے ہم غلط جگہ پر اتر آئی ہوں۔''

''غلط جگہ، کیا مطلب؟'' فارحہ نے دہلتے ہوئے پوچھا

''حوصلہ رکھو، کیا ہو گیا ہے تمہیں۔'' ماورا نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے سکون سے کہا اور پرس میں سے اپنا سیل فون نکال کر نمبر دیکھنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس نے نمبر پش کئے اور رابطے ہوتے ہی بولی

''بھئی کہاں ہو، یہاں تو کوئی سائین بورڈ نہیں لگا ہوا؟'' یہ کہہ کر وہ دوسری طرف سے کچھ سننے لگی، پھر اچھا کہہ کر کال بند کر دی۔

''کیا ہوا؟'' تجسس سے بھرپور لہجے میں فارحہ نے پوچھا تو مائرہ اسے سمجھانے لگی

''یہ جہاں ہم اترے ہیں، بس والے نے ہمیں غلط اتارا ہے، وہ سٹاپ جہاں ہم نے اترنا تھا، وہ یہاں سے دو کلومیٹر آگے ہے۔ وہ شخص......''

''اب کیا ہوگا؟'' اس نے مائرہ کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی

''ریلکس۔! ہونا کیا ہے، وہ شخص، جس نے ہمیں پک کرنا ہے، بس اسے یہاں تک آنا ہے، یہی کوئی پانچ سات منٹ میں اور ہم اس کے ساتھ چلے جائیں گے۔ وہ ہمارے انتظار میں وہاں کھڑا ہے۔''

''اوہ، میں تو ڈر گئی تھی۔'' فارحہ نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا تو مائرہ ہنستے ہوئے بولی

''اس میں تمہارا قصور بھی نہیں ہے میری جان، تم پہلی باریوں باہر نکلی ہو۔ اور ہاں یہ بات بات پر ڈرنا چھوڑ دو، ہم نے یہاں تین ماہ تک رہنا ہے۔ بہادر بنو اور اپنا یہ ڈر اور خوف کسی پر بھی عیاں نہیں ہونے دو، ورنہ تمہیں مزید ڈرایا جائے گا۔''

''او کے۔'' فارحہ نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ چند لمحے بعد وہ بولی، ''دیکھو، کتنا ویران علاقہ ہے، دور دور تک کوئی آدم زاد دکھائی ہی نہیں دے رہا۔ کچھ عجیب سا ماحول نہیں ہے کیا؟''

''اچھا ہے۔'' ماورا نے اپنی رو میں کہا

''کیا مطلب؟'' اس نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا

''مطلب یہ کہ تھوڑی دیر ہی کے لئے سہی، مرد کی آنکھوں سے تو بچے رہیں گے۔ آزادی سے سانس لو، بے دھڑک، کسی خطرے کے بغیر، ورنہ پھر آدم زاد سے چھپتی پھرو گی۔'' مائرہ نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو فارحہ کو اس ویرانے میں بھی زندگی کا احساس ہوا۔ اس لئے مسکراتے ہوئے بولی

''وہی نا، تم اپنے فیمینسٹ ہونے کے اظہار کا موقعہ نہیں جانے دیتی، فٹ سے......''

''اچھا، اپنا سامان دیکھ لو، کہیں کچھ بس میں تو نہیں رہ گیا۔'' مائرہ نے سڑک کنارے پڑے سامان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ اپنے فیمینسٹ ہونے پر بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''پورا ہی ہے۔'' اس بار فارحہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں اعتماد تھا، وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔

ماورا سڑک کے کنارے کھڑی، کبھی ادھر کبھی اُدھر دیکھتے ہوئے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے پاس کھڑی فارحہ بھی خاموشی سے سن رہی تھی۔ تبھی ایک طرف سے سفید کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ان کے پاس آ رکی۔

ادھیڑ عمر ڈرائیور نے تصدیق کرکے ان کا سامان رکھا۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئیں تو ڈرائیور نے کار گھمائی اور چل پڑا۔

کافی سارا ویران راستہ تھا، اس کے بعد ہریالی آنا شروع ہوگئی۔ پھر ایک نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے، یہاں تک کہ وہ ایک تجرباتی فارم میں آ گئے، جس میں ایک ریسٹ ہاؤس بھی تھا۔ جس کے پورچ میں کار آن رکی۔

"جگہ تو کافی شاندار ہے۔" ماورا نے کار سے نکل کر ایک طویل سانس لیتے ہوئے حیرت کہا تو فارحہ نے بھی یہی محسوس کیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے سامان سمیت دونوں لاؤنج میں تھیں۔ ان کے پاس وہاں کی ملازمہ رجاں آن کھڑی ہوئی تھی۔ اپنا تعارف کروانے کے بعد اس نے پوچھا

"آپ ایک ہی کمرے میں رہیں گی یا الگ الگ؟"

"اگر کمرے زیادہ ہیں تو الگ الگ دے دو، ورنہ ایک ہی ٹھیک ہے، لیکن پہلے کھانے کا کچھ کردو۔" ماورا نے تیزی سے کہا

"کھانا بن گیا ہوا ہے، آپ فریش ہو کر آ جائیں۔" رجاں نے کہا اور جتنا سامان اٹھا سکتی تھی وہ اٹھا کر چل دی۔ باقی سامان لئے وہ اس کے پیچھے ہولیں۔

ماورا اور فارحہ، ایک این جی او کے لئے کام کر رہی تھیں۔ اس این جی او کے عورتوں کے حقوق سے متعلق چند بڑے عالمی سطح کے پراجیکٹس تھے۔ این جی او کو اس دور افتادہ علاقے میں ایک سروے کرنا تھا۔ یہاں آنے پر کوئی تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔ پہلے تو فارحہ خود بھی یہاں آنے پر راضی نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن جب سیلری کے علاوہ ایک بڑے پیکج کی آفر ہوئی۔ یہ آفر اس کی زندگی میں کافی حد تک آسانی لا سکتی تھی۔ سو یہ سروے کرنے کے لئے وہ یہاں آ گئی تھی۔ ماورا یہاں کیوں آئی تھی، اس بارے وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔

اگرچہ وہ صحرائی علاقہ تھا۔ ان کے ذہن میں یہی تھا کہ جب وہ یہاں آئیں گیں تو ریت، ٹیلے اور ویرانی سے واسطہ پڑے گا۔ وہ خود کو اس کے لئے تیار بھی کر چکی تھیں مگر یہاں آتے ہی جس ریسٹ ہاؤس میں انہیں رہنے کو جگہ ملی، اسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھیں۔ وہ سرسبز و شاداب ایک تجرباتی فارم تھا جہاں سیاہ ہرن اور تلیر پالے جاتے تھے۔ اس میں مصنوعی جنگل کے ساتھ ایک پارک بھی تھا جو سوا ایکڑ سے بھی زیادہ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ وسیع سرسبز و شاداب لان، ہر طرح کے درخت، پھولوں بھرے پودے، مصنوعی جھیل، اور ان سب کے درمیان ایک خوبصورت، آرام دہ، سہولیات کے ساتھ ریسٹ ہاؤس۔ اردگرد کے علاقوں سے لوگ وہاں پر تفریح کے لئے آتے۔ سارا دن موج مستی کر کے واپس لوٹ جاتے۔ جیسے ہی شام پڑتی پارک میں سناٹا چھا جاتا۔ وہاں ریسٹ ہاؤس کی دیکھ بھال کے لئے مالی، چوکیدار، خانساماں اور اس کی بیوی رجاں سب تھے۔ وہ وہیں بنے کوارٹروں میں رہتے تھے۔ اس ریسٹ ہاؤس کا جو فاریسٹ آفیسر تھا، وہ وہاں سے تھوڑی دور اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ پارک کے لئے مخصوص ملازمین سرِ شام ہی چلے جاتے تھے۔ انہیں یہاں آ کر لگا جیسے شور شرابے والی زندگی سے نکل کر پرسکون مقام پر آ گئی ہوں۔ ماورا بھی بہت خوش تھی۔ این جی او کی طرف سے مہیا کی گئی گاڑی انہیں صبح لے جاتی۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتیں شام کو گاڑی انہیں چھوڑ جاتی۔ انہیں امید تھی کہ تین ماہ میں یہ کام مکمل ہو جائے گا۔ یہی ان کا ٹارگٹ وقت تھا۔ وہ دونوں بہت خوش تھیں۔

ایک شام ریسٹ ہاؤس کے کاریڈور میں بیٹھی وہ باتیں کر رہی تھیں۔ تبھی ماورا نے خوشگوار لہجے میں کہا

"یار ایک ہفتہ ہو گیا ہے یہاں آئے ہوئے۔ پتہ ہی نہیں چلا، کتنا سکون ہے یہاں پر۔"

"میں دیکھ رہی ہوں، تم بہت خوش ہو یہاں پر۔" فارحہ نے کہا تو وہ بولی

"یار بات یہ ہے کہ ہم یہاں خوشی سے تھوڑا آئی ہیں، ہمارا مقصد پیسہ کمانا ہے، ہماری ضرورتیں ہیں۔ جنہیں ہم نے پورا کرنا ہے۔ ورنہ کون گھر کا سکون چھوڑ کر باہر دھکے کھاتا ہے۔ اب کام تو کرنا ہے، جس کے پیسے ملنے ہیں۔ اب اتفاق یہ ہے کہ یہاں ہمیں رہنے کو اچھا مل گیا، یہ قدرت کی طرف سے ہماری مدد ہے۔" ماروا نے تلخی سے کہا

"ہاں، یہ تو ہے، اگر ہماری ضرورتیں نہ ہوتیں، تو شاید اس سے بھی بڑے پیکج پر بھی ہم یہاں نہ آتیں، یا پھر نوکری ہی نہ کرتیں۔" فارحہ نے بے بسی سے کہا

"لیکن ایک بات ہے فارحہ، زندگی جو ہمیں دے رہی

ہیں، جہاں قدرت نے ہمیں رکھا ہوا ہے، اس پر تو ہمارا اختیار نہیں لیکن یہ تو ہمارے بس میں ہے نا کہ ہم خوش رہیں، ان حالات کے ساتھ حوصلے اور صبر کے ساتھ لڑیں۔ حالات کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کرتے رہیں، بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہیں۔" ماروا نے جذباتی لہجے میں کہا

"ہاں یہ تو ہے، ورنہ حالات ہمیں دبا کے رکھ دیں گے۔" فارحہ نے اس کی بات کو سمجھتے ہوئے کہا

"ہم انسانوں کے رویے کو حالات کہہ کر فرار لے لیتے ہیں۔ کتنی بے بسی ہے۔" ماروا نے تلخی سے ہنستے ہوئے کہا۔ ممکن ہے فارحہ کوئی جواب دیتی، انہی لمحات میں اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم سے خوشی آ گئی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فارحہ سے معذرت چاہتے ہوئے کہا

"ارباز ہے۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے تھوڑا دور چلے گئی۔ فارحہ اس کے بارے میں سوچنے لگی۔

ماورا، ایک ایسے سرکاری افسر کی بیٹی تھی، جس نے کبھی کرپشن نہیں کی تھی۔ اس نے کبھی رشوت نہ لی۔ سو وہ اس نظام میں ایک فالتو آفیسر کی طرح ہمیشہ ایسی جگہوں پر رہا جہاں مال بنانے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے وہی سرکاری مراعات لیں، جن پر وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ وہ اپنے بیوی اور چار بچوں کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ بچے پڑھتے لکھتے بڑے ہوتے چلے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ضرورتیں بھی بڑھتی گئیں۔ ماورا سے بڑے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ وہ سب سے چھوٹی تھی۔ ایک خاص طبقہ سے تعلق رکھنے، خاندان کے دوسرے لوگوں کی امارت اور دنیاداری کے تقاضوں کے باعث، وہ خواب بھی بڑے بڑے دیکھنے لگے تھے۔ سبھی بہن بھائی محنت کرتے چلے گئے۔ انہیں اچھی نوکریاں مل گئی تھیں۔ ماورا بھی اسی راہ پر تھی اور کسی اچھے چانس کے لئے محنت کرتی چلی جا رہی تھی۔

وہ اپنے بہن بھائیوں سے تھوڑا الگ تھی۔ اس کی سوچ ان سے ملتی ہی نہیں تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کی کمپنی تھی، جس میں ارباز بھی شامل تھا۔ وہ اس کا کزن تھا اور اسے بہت چاہتا تھا۔ یونیورسٹی تک وہ اکٹھے پڑھے تھے۔ اس نے ہی ماورا کو بولڈ بنایا تھا۔ بہت زیادہ اعتماد دیا تھا۔ زندگی سے لڑنے اور جدوجہد کا درس اسی نے دیا۔ ماورا کی کمپنی ہی ایسی تھی، جس میں عورت ہونے اور بااختیار عورت ہونے کا احساس ان میں بہت زیادہ تھا۔ لڑکیوں کا وہ گروپ "فیمینسٹ" کے نام سے مشہور تھا۔ ارد گرد کے لوگ انہیں 'کھسکی ہوئی لڑکیاں' سمجھتے تھے لیکن انہوں نے کبھی پروا نہیں کی تھی۔

ارباز نے اپنا بزنس شروع کر دیا تھا۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے ان کی منگنی بھی ہو گئی تھی۔ اس لئے اب اس کے فیصلوں میں سب سے زیادہ اثر ارباز ہی کا تھا۔ وہ اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ وہ چاہتی تو بڑے آرام سے اس کے ساتھ شادی کر کے سکون سے زندگی گزار رہی ہوتی۔ لیکن خود کو منوانے کی جو خواہش اس کے اندر تھی، وہ ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ محنت سے اکتائی نہیں تھی اور ارباز بھی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن رہا تھا۔ وہ اس کے سب معاملات میں اس کی مدد کرتا تھا۔ منگنی ہو جانے کے باوجود وہ دونوں ابھی تک ایک دوسرے کے گہرے دوستوں کی طرح تھے۔

فارحہ نے سوچا، جو کچھ بھی ہے، وہ ایک بولڈ، حوصلہ مند اور زندگی سے لڑنے والی لڑکی ہے۔ بندے کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی۔ ماورا فون پر باتیں کرتی چلے جا رہی تھی، تبھی دور ایک مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ فارحہ اٹھ گئی۔ اسے مغرب پڑھنا تھی۔

فارحہ، اس سے تھوڑا مختلف لڑکی تھی۔ ایک غریب گھر کی لڑکی، جس کے باپ نے ساری زندگی کولہو کے بیل کی طرح مزدوری کی تھی لیکن سوائے ایک گروی گھر کے، وہ کچھ نہ بنا سکا تھا۔ ایک بھائی، بیمار ماں اور زندگی کا تھکایا ہوا باپ، یہی اس کا کل سرمایہ تھا۔ بھائی چھوٹا تھا، پڑھنے کے ساتھ ساتھ مزدوری بھی کرتا تھا۔ بس بھلے وقتوں میں ایک مکان بن گیا تھا، جو ان دنوں کافی بہتر علاقے میں آ جانے سے تھوڑا قیمتی ہو گیا تھا۔ مگر گروی ہونے کے باعث وہ بیچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اتنی زیادہ رقم بھی نہیں تھی۔ این جی او کا یہ پیکج ملا تو اس نے اپنا مکان چھڑوانے کا سوچ کر حامی بھر دی تھی۔ مشکل تو تھی، لیکن اس کے بعد ایک طویل سکھ تھا۔ اسے لگا یہ آفر اس

کے رَبّ کی طرف سے ہے۔ وہ ہر نماز کے بعد اپنے اچھے مستقبل کا سوال اپنے رَبّ ہی کرتی تھی۔ وہ مذہبی ذہن رکھتی تھی اور مذہب پر عمل کرنے کی پوری پوری کوشش کرتی تھی۔

ماورا کے ساتھ میں اس کے دن بہت اچھے گذر رہے تھے۔ وہ جہاں کام اکھٹے کرتیں، وہاں فارحہ نے زندگی کے بارے ماورا سے بڑا حوصلہ پایا۔ وہ سونے کے وقت الگ الگ کمروں میں چلی جاتیں۔ ورنہ باقی وقت اکھٹے گذرتا۔ زندگی سے بھرپور ماورا کو دیکھ کر فارحہ میں بھی حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ پُرسکون سے دن گذرتے چلے جارہے تھے۔ وہ بہت اچھے انداز میں کام کررہی تھیں کہ پُرسکون جھیل جیسے حالات میں ایک بھاری پتھر آن پڑا۔

ماورا نے لندن کی کسی یونیورسٹی میں اپلائی کیا ہوا تھا، اسے وہاں سے سپانسر مل گیا۔ ماورا کے بہت سارے خوابوں میں سے ایک خواب یہ بھی تھا۔ وہ سپانسر کا یہ چانس چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اس لئے اس نے فوراً واپس جانے کی تیاری کرلی۔ فارحہ اسے کسی بھی قیمت پر روک نہیں سکتی تھی۔ کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن وہ گھبرا گئی تھی۔ ماورا اس کی یہ حالت بھانپ گئی تھی۔ اسی شام ارباز اسے لینے آگیا۔ ماورا اپنا سامان اکھٹا کرنے لگی اور فارحہ نے لاؤنج میں چائے کا بندوبست کردیا۔

''اچھا، ارباز آپ کھانے میں کیا پسند کریں گے، وہی میں بنوالوں۔'' فارحہ نے پوچھا

''شکریہ۔ ایک تو سفر بھی رات کا ہے اور دوسرا طویل بھی ہے، میں رات رُکوں گا نہیں، ابھی واپس نکلنا ہے۔'' ارباز نے کہا تو لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے ماورا نے کہا

''میں تیار ہوں۔ سامان سب پیک ہے۔''

تبھی اس کی نگاہ اداس اور گھبرائی ہوئی فارحہ پر پڑی، وہ لمحہ بھر خاموش رہی پھر اس کے پاس بیٹھ کر بولی ''ہم سدا ایک ساتھ تو نہیں رہ سکتے نا، اس پراجیکٹ کے بعد بھی تو جدا ہونا تھا۔ تم اداس مت ہو، اپنے آپ کو آزماؤ۔ ہاں جب بھی جہاں بھی میری ضرورت ہوئی، میں تمہاری مدد ضرور کروں گی۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو ماورا، میری دعا ہے، تم بہت ترقی کرو، تمہارا شکریہ کہ تم میرا حوصلہ بڑھا رہی ہو۔'' فارحہ نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا تو ارباز نے کہا

''فارحہ، جب بھی ہماری ضرورت ہو، ہمیں کال ضرور کرنا، اور گھبرانا مت، کوئی بھی مشکل ہو مجھے بتانا، ٹھیک۔''

''یار میں فارن جارہی ہوں، یہ ارباز تو پاکستان ہی میں ہے۔ کوئی مشکل ہو تو اسے بتانا، سمجھو میں ہی ہوں۔'' ماورا نے مسکراتے ہوئے کہا

اوکے۔'' فارحہ دھیمے سے بولی۔

وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ سب وقتی باتیں ہیں۔

''گڈ گرل۔'' ماورا نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا

ریسٹ ہاؤس کے پورچ میں وہاں کے ملازم بھی تھے۔ اس وقت سورج ڈوبنے کو تھا، جب وہ وہاں سے چلے گئے۔ ماورا کو واپس جانا پڑا تھا۔ وہ اپنی اس واپسی پر پرجوش تھی۔



ماورا چلی گئی تو یہ ریسٹ ہاؤس میں اکیلی ہوگئی۔ اکیلے پن کا احساس بڑھنے لگا۔ وہاں کے ملازمین اسے ناشتہ کروا دیتے، گاڑی آتی اور اسے لے جاتی، صحرائی علاقوں میں اکیلے سروے کرتے ہوئے ایک خوف اس پر چھایا رہتا۔ شام ہوتے ہی پلٹتی، فریش ہو کر کھاتی پیتی، اپنی اماں کے ساتھ فون پر باتیں کرکے اپنی خیریت بتاتی۔ رات گئے تک لیپ ٹاپ پر اپنے کام میں مصروف رہتی اور پھر سو جاتی۔ وہ ایک ایسی زندگی میں آگئی، جس میں خوف اور عدم تحفظ کا احساس اس سے لپٹ کر رہ گیا تھا۔

اس کی زندگی میں ہلچل اس وقت ہوئی جب ایک شام وہ جلدی واپس آگئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کھانے کے لئے خود کچھ بنائے۔ وہ کچن میں چلی گئی اور رجاں کے ساتھ کوکنگ کرنے لگی۔ تبھی باہر سے چوکیدار نے آکر بتایا۔

''میڈم جی باہر ایک صاحب آئے ہیں، وہ آپ کا پوچھ رہے ہیں۔''

''مجھے......؟ کون ہے؟ نام پوچھا تم نے؟'' اس نے تجسس سے پوچھا

''احمد جمال نام بتا رہے ہیں، کہہ رہے ہیں آپ کے کولیگ ہیں اور آپ ہی کی این جی او سے آئے ہیں۔''

چوکیدار نے بتایا تو وہ ایک ہی ثانئے میں پہچان گئی۔ تبھی اس نے کہا

''اُواچھا، انہیں لاؤنج میں بٹھاؤ، پانی وغیرہ پلاؤ، میں آتی ہوں۔''

احمد جمال، انہی کے ساتھ کام کرتا تھا۔ بہت اچھا، سمجھدار اور وجیہ نوجوان تھا۔ بہت کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ ہیڈ آفس میں کئی بار اس سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ ممکن ہے کبھی کوئی بات بھی ہوئی ہو۔ ماورا کے چلے جانے کے بعد اسے یقین تھا کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا آئے گا لیکن یہ احمد جمال آ جائے گا، یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ کوکنگ چھوڑ کر فوراً ہی لاؤنج میں چلی گئی۔ اسے دیکھتے ہی جمال کھڑا ہوتے ہوئے خوشگوار لہجے میں بولا

''اسلام علیکم، مس فارحہ، کیسی ہیں آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ سنائیں، آپ کیسے ہیں۔'' دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

''میں ٹھیک ہوں، اور میں مس ماورا کی جگہ آپ کو جوائین کرنے آیا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنے آنے کی وجہ بیان کر دی۔ شاید اس نے فارحہ کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ جہاں پہ الجھنیں ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔

''اوہ۔!'' اس نے بے ساختہ کہا یوں کہا جیسے اسے یقین کرنا ہی پڑا ہو۔ نجانے کیوں وہ ایک دم سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس کی آمد پر کیسا اظہار کرے۔ وہ محض اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی تھی، تبھی احمد جمال نے آہستگی سے کہا

''مس فارحہ۔! کیا آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا؟''

''نن، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، آپ کو ہیڈ آفس نے بھیجا ہے، تو میرا اچھا لگنا یا نہ لگنا، یہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آپ پلیز فریش ہو جائیں۔ میں کھانا لگواتی ہوں، آپ کو بھوک لگی ہو گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر تیزی سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

اگلی صبح تک وہ احمد جمال سے نہیں ملی تھی۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ احمد جمال سے کیسا رویہ رکھے؟ وہ اس کے ساتھ کیسے کام کر پائے گی؟ صبح سویرے جب رجّاں اس کے لئے چائے لے کر اس کے کمرے میں گئی۔ اس نے بتایا کہ احمد جمال کو اسی ریسٹ ہاؤس میں کون سا کمرہ دیا گیا ہے۔ وہاں ان کا سامان سیٹ ہو گیا ہے، جو بہت مختصر سا ہے۔ یہ سب بتانے کے بعد رجّاں نے تجسس سے پوچھا

''میڈم، یہ جو نئے صاحب آئے ہیں، کیا اب یہیں رہیں گے آپ کے ساتھ؟''

''نہیں میرے ساتھ کیوں رہیں گے؟'' اس نے بے خیالی میں تیزی سے کہا۔ اسے رجّاں کا کہا ہوا لفظ ''ساتھ'' بہت عجیب سا لگا تھا، جو اسے پسند نہیں آیا تھا۔ اسی لئے لہجہ بھی کافی حد تک عجیب تلخ ہو گیا تھا۔

تب رجّاں نے کھسیاتے ہوئے جلدی سے صفائی دیتے ہوئے کہا

''نہیں میرا مطلب ہے، جس طرح وہ مس ماورا آپ کے ساتھ کام کرتی تھیں، یہیں اسی ریسٹ ہاؤس میں رہتی تھیں، آپ دونوں رات گئے تک اکٹھے کام کرتی رہتی تھیں، ظاہر ہے اب یہ صاحب انہی کی جگہ آئے ہیں تو...... میں نے پوچھا۔''

''بہت بولتی ہو رجّاں، جاؤ ناشتہ بناؤ۔'' اس نے اتنا ہی کہا اور رجّاں کو کوئی واضح جواب دیئے بغیر کچن میں بھیج دیا لیکن اس کے لاشعور میں جو خوف تھا، وہ اس نے رجّاں کی زبانی سن لیا تھا۔ کیونکہ فارحہ بھی رات بھر یہی سوچتی رہی تھی۔ اس کے سامنے بہت سارے سوال آن ٹھہرے تھے۔ کیا اب مجھے احمد جمال کے ساتھ ایک ہی چھت تلے رہنا پڑے گا؟ کیا اسے اکیلے دور افتادہ علاقوں میں جمال کے ساتھ جانا پڑے گا؟ وہ لاکھ اس کی این جی او کا کارکن تھا لیکن یہاں اس کے ساتھ تنہائی میں نہیں رہ سکتی تھی۔ ابھی تو محض ایک ماہ گذرا ہے، وہ مزید دو ماہ اس کے ساتھ یہاں کیسے گزار سکے گی؟ کئی سوال اس کے سامنے تن گئے تھے۔ وہ انہی سوالوں سے نہ تو پیچھا چھڑا سکتی تھی اور نہ ہی انہیں نظر انداز کر سکتی تھی۔ اس کا کوئی حل تو نکالنا تھا۔ یہ اس لئے بھی تھا کہ ایک ہی رات کی صبح رجّاں اس کے سامنے ایسے سوال لے آئی تھی، آئندہ آنے والی زندگی میں وہ کیسے کیسے سوالوں کا سامنا کر سکے گی؟ رجّاں تو چلی گئی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بارے احمد جمال ہی سے بات کرے گی۔ وہ تیار

ہو کر ناشتے کی میز پر آ گئی۔ جہاں احمد جمال پہلے ہی سے موجود تھا۔ رضیہ نے ناشتہ لگا دیا ہوا تھا۔ اس نے بیٹھتے ہی بڑے اعتماد کے ساتھ احمد جمال سے پوچھا

''کیسا لگا آپ کو یہاں کا ماحول؟''

''بہت اچھا ہے۔'' اس نے بے ساختہ کہا، پھر لمحہ بھر رُک کر بولا،''میری سوچ سے بھی کہیں اچھا، میں یہ سمجھ رہا تھا، یہاں کوئی ویرانہ ہوگا، کوئی ٹوٹا پھوٹا گھر، یا کوئی جھونپڑی......''

''میں بھی ایسا ہی سمجھ رہی تھی، لیکن بہت اچھا ماحول ملا۔'' وہ دھیمے سے بولی

''اب ٹارگٹ ایریا جیسا بھی ہو، رہنے کو پرسکون جگہ تو ہے، یہاں کام کرنے کا لطف آئے گا، میں تو آج ہی سے کام کی ابتدا کر دوں گا۔'' اس نے پرجوش لہجے میں کہا

''کام کے بارے میں بتایا گیا ہے آپ کو؟'' فارحہ نے یوں پوچھا جیسے بے خیالی میں ہو۔

''ظاہر ہے اب آپ سینئر ہیں، یہاں پر جو میرا کام ہوگا اب آپ ہی نے بتانا ہے۔ مجھے میرا کام بتا دیں تو شروعات کروں۔'' احمد جمال نے اسی خوشگوار لہجے میں کہا جیسے اسے یہاں کا ماحول بہت پسند آ گیا ہو اور اس ماحول نے اس پر کافی اچھا اثر ڈالا ہو۔ اس پر فارحہ چند لمحے خاموش رہی، پھر جمال کی طرف دیکھے بغیر بڑا حوصلہ کرتے ہوئے بولی

''اس سے پہلے مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہوں گی۔''

''جی، جیسا آپ چاہیں۔'' جمال نے فوراً کہہ دیا

''ٹھیک ہے، ناشتے کے بعد بات کرتے ہیں۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا اور ناشتہ کرنے لگی۔ وہ جمال سے کس طرح بات کرے گی، اس بارے وہ سوچ چکی تھی۔

وہ دونوں ریسٹ ہاؤس کے کاریڈور میں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان میں پڑی چھوٹی میز پر چائے کے دو سفید کپ رجاں رکھ کر جا چکی تھی۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی ٹھہری ہوئی تھی۔ جمال کاریڈور میں بیٹھا ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ جہاں وہ بیٹھے تھے، اس کے ساتھ ہی ایک سڑک تھی۔ جس کے آگے کافی بڑا لان تھا۔ اس میں پھولوں کی کیاری اور پھر باؤنڈری وال تھی۔ بہت زبردست ماحول تھا۔ لیکن اس ماحول میں بیٹھے ہوئے وہ دونوں ذہنی طور پر دباؤ میں تھے۔ سو اس کے لئے یہ ماحول اور اس کی خوشگواریت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ چند منٹ یونہی گذر گئے تو فارحہ نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا

''جمال صاحب، کیوں نہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں جان لیں، میرا مطلب تعارف......''

وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہوتا ہوا تیزی سے بولا

''جی، جی بالکل، میں بتاتا ہوں اپنے بارے میں۔'' اس نے کہا اور پھر سانس لے کر کہتا چلا گیا،''ایک برس پہلے میں نے ماسٹرز کیا تھا۔ تب سے میں نے یہ این جی او جوائن کر لی تھی۔ کیونکہ مجھے معاشی مسئلہ درپیش تھا۔ میں اپنے والدین کا ایک ہی بیٹا ہوں، میری ایک بہن ہے، جو مجھ سے بڑی ہے۔ مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتا ہوں، میرے والد چھوٹے سے سرکاری ملازم ہیں۔ اب جاب ملی ہے تو گھر والوں کا ساتھ دینے والا بن گیا ہوں۔ میری کوشش ہے کہ مس ماورا کی طرح کوئی سکالرشپ مل جائے اور میں باہر پڑھنے چلا جاؤں۔ لیکن اس سے پہلے میں اپنی بڑی بہن کی شادی کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ میری ہی نہیں میرے والدین کی بھی خواہش ہے۔ میرا تعلیمی کیئریر بہت اچھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مجھے بھی کوئی نہ کوئی سپانسر مل جائے گا اور یہ جو مشکل دن ہیں، یہ ختم ہو جائیں گے۔''

آخری لفظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں نجانے کتنی امیدوں کے چراغ روشن تھے۔ وہ کہہ چکا تو فارحہ چند لمحے خاموش رہی پھر بڑے اعتماد سے بولی

''میں بھی کچھ ایسا ہی فیملی بیک گراؤنڈ رکھتی ہوں۔ میں بھی کام کرنے پر مجبور ہوں۔ میں اگر کسی امیر کھاتے پیتے گھر سے ہوتی نا تو یہاں بالکل بھی نہ ہوتی، مجھے یہ کام نہ کرنا پڑتا اور میں سکون سے اپنے گھر میں ہوتی۔''

''دیکھیں یہ کام......'' جمال نے کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے ٹوکتے ہوئے کہا

''پلیز، میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں، اُسے سنیں۔''

''جی، جی بولیں۔'' اس نے کہا تو فارحہ نے ہمت

کرتے ہوئے ایک طویل سانس لے کر کہا
''میں ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں اور میرے والد ایک معمولی سے ملازم ہیں۔ میرا بھی ایک ہی بھائی ہے۔ میں اپنے والدین کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیں اچھی تعلیم دی۔ جس سے ہم تھوڑا بہت کمانے لگ گئے ہیں۔ لیکن...... لیکن...... اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے والدین کو دُکھ دیں۔''
''آپ کی بات میں سمجھ رہا ہوں۔ مگر یہ بات کہ...... ہم دُکھ دیں، میں یہ دُکھ دینے والی بات، یہ سمجھا نہیں۔'' وہ ہولے سے بولا تو فارحہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
''وہی بتانے جا رہی ہوں، آپ پلیز اسے سمجھنے کی کوشش کیجئے گا۔ میرے یہاں آنے کی وجہ ایک اچھے پیکج کی آفر تھی اور دوسرا میرے ساتھ ماورا تھی۔ وہ چلی گئی اور آپ آ گئے، مجھے آپ کے ساتھ ویسے کوئی مسئلہ نہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ......'' وہ کہتے کہتے رُک گئی
''مسئلہ؟ وہ کیا ہے؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا تو وہ خود پر قابو رکھتے ہوئے بولی
''دیکھیں، ہم ایک چھت تلے رہیں گے، یہ ایک دو دن کی بات نہیں ہے۔ میں لڑکی ہوں، کل میرے ساتھ سو باتیں بن سکتی ہیں۔ اور یہ باتیں تو بلاشبہ ہوں گی، جس کی باز گشت میرے ساتھ زندگی بھر بھی رہ سکتی ہے۔''
''جی یہ تو آپ نے ٹھیک کہا؟'' جمال نے فارحہ کا پوائنٹ آف ویو سمجھتے ہوئے کہا
''لیکن اس کے علاوہ ایک بات جو سب سے اہم ہے، اور وہ یہ کہ آپ میرے لئے نامحرم ہو، میں آپ کے ساتھ ایک چھت تلے نہیں رہ سکتی ہوں۔ مجھے شفٹ ہونا پڑے گا یا آپ کو؟'' فارحہ نے سنجیدگی سے کہا تو جمال نے اس کی طرف غور سے دیکھا، پھر چند لمحے سوچنے کے بعد کہا
''تو اس کا حل کیا نکالتی ہیں آپ؟''
''اس کا حل یہی ہے کہ مجھے واپس جانا ہوگا، یا پھر آپ کو......'' فارحہ نے کہنا چاہا تو جمال سر ہلاتے ہوئے بولا
''یہ تو ہے۔'' یہ کہہ کر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا ''ظاہر ہے اگر میں اپنے رہنے کا کہیں دوسری جگہ بھی بندو بست کر لوں تو پھر بھی کام کے لئے ساتھ جانا ہوگا، اکٹھے کام کرنا ہوگا۔ ہمارا زیادہ وقت اکٹھے ہی گذرنا ہے۔''
''جی۔'' وہ بولی تو جمال نے بات سمجھتے ہوئے کہا
''دیکھیں آپ کو مجھ سے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور نہ پریشانی ہوگی، میں ایک دو دن میں ہیڈ آفس بات کرتا ہوں، کوئی حل نکل آئے گا۔ میں یہ ذمہ داری خود پر لے لوں گا۔''
''آپ بہتر سمجھتے ہیں۔'' فارحہ نے کہا۔
''میں ابھی واپس چلا جاتا لیکن میں ہیڈ آفس کو یہ اطلاع دے چکا ہوں کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ اب انہیں سمجھانے کے لئے ایک معقول بہانہ تو بنانا ہوگا۔'' اس نے کہا
''بہانہ، مجھے افسوس ہے کہ آپ کو......'' فارحہ نے کہنا چاہا، جس پر جمال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا
''آپ کی بات معقول ہے، لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے ابھی یہ نوکری چاہئے، جس طرح آپ ایک اچھے پیکج کے لئے یہاں ہیں، ویسے ہی میں یہاں پر ہوں۔ میں کوشش کروں گا بہانہ بنانے کی تاکہ میری نوکری بچ جائے، اچھا پیکج نہ سہی۔ لیکن، میں کوشش کرتا ہوں۔''
''دیکھیں اگر وہ نہ مانیں تو پھر مجھے کوئی کوشش کرنا ہوگی۔'' فارحہ کو احساس ہوا کہ وہ کس قدر خود غرض ہو کر یہ بات کہہ رہی ہے۔
''آپ جائیں، اپنے معمول کے مطابق کام کریں، جیسے روزانہ جا رہی ہیں۔ میں یہاں رہتے ہوئے کچھ سوچتا ہوں، شام تک کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔'' جمال نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اٹھی اور اندر کی طرف چل دی۔ اسے لینے گاڑی آ چکی تھی۔
سرخ اُفق پر سرمئی بادلوں کی اوٹ میں سورج ڈھلنے کیلئے جھک گیا تھا۔ ایسے میں فارحہ گاڑی میں واپس ریسٹ ہاؤس آ گئی۔ اس نے اپنا سامان کمرے میں رکھا اور کچھ دیر بعد فریش ہو کر کرسی پر آن بیٹھی۔ اگرچہ صبح جمال سے ہونے والی باتوں کے بارے میں وہ سارا دن ہی سوچتی رہی تھی تاہم واپس آ کر وہ تھوڑا بدحواس ہو گئی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جمال کا سامنا کیسے کرے گی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ جس قدر اسے نوکری کی ضرورت ہے

،اسی طرح جمال کو بھی ہے، پرابلم اُس کا اپنا ہے، جس کی سزا جمال کو کیوں ملے؟ وہ کچھ بھی ہیڈ آفس سے کہہ سکتا ہے۔ یا پھر ہیڈ آفس سے کوئی بھی جواب آ سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس میں کوئی بات اچھی نہیں ہوگی۔ انہیں ملازمین کے پرابلم سے کوئی غرض نہیں۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ رجّاں کمرے میں آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ٹرے تھا جس میں چائے کا مگ رکھا ہوا تھا۔

''میڈم چائے۔'' اس نے ہولے سے کہا

''رکھ دو۔'' فارحہ نے بے دلی سے بولی۔

''میڈم ایک بات پوچھوں۔'' اس نے دھیمے سے پوچھا تو فارحہ نے بے خیالی میں کہا

'''ہاں پوچھو۔''

''ایسا کیا ہو گیا ہے، جب سے جمال صاحب یہاں آئے ہیں، آپ بھی پریشان ہیں اور وہ بھی سارا دن کمرے میں سوچتے رہے ہیں۔ حالانکہ جب وہ کل آئے تھے تو بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔''

''اب میں تمہیں کیا بتاؤں رجّاں۔'' اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا اور چائے کا مگ اٹھالیا۔

''مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔ آپ اور وہ ایک جگہ نہیں رہ سکتے ہیں، ظاہر ہیں لوگ باتیں کریں گے اور......'' وہ کہتی چلی گئی تھی۔

''اب مجھے یا انہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔'' اس نے دکھ سے کہا

''کہیں پہلے تو آپ اور ان کے درمیان کوئی ایسا تعلق تو نہیں ہے، جس کی وجہ سے یہ......'' اس نے شک بھرے انداز میں کہا تو فارحہ کا مگ چھلک پڑا۔ اس کا جیسا ذہن تھا، ویسا ہی سوچتا تھا۔ اس لئے تیزی سے بولی

''او خدا کی بندی ایسا کچھ نہیں ہے، تم کہاں کے قلابے ملا رہی ہو۔''

''میڈم ایک بات کہوں، یہاں کچھ نہ ہونے سے لوگ بہت کچھ بنا لیتے ہیں، آپ کا مسئلہ اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر اس کا کوئی حل بھی نہیں۔'' رجّاں نے اپنی طرف سے بڑی بات کہہ دی تھی۔ اس لئے فارحہ نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا

''اچھا، چھوڑو ان باتوں کو، آج کیا بنا رہی ہو؟''

''وہی جو آپ کہہ رہی تھیں کل، مٹن کری۔'' رجّاں نے کہا تو فارحہ چائے کا سپ لے کر بولی

''ٹھیک ہے، پھر بناؤ جلدی سے، مجھے بھوک لگی ہے۔ اور ہاں، جمال سے کہو، لاؤنج میں آئے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ سر ہلاتی ہوئی اٹھ گئی۔

فارحہ لاؤنج میں آئی تو جمال صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر بولی

''آپ نے کی بات؟''

''ہاں کی، لیکن کسی ہیڈ سے نہیں بلکہ اپنے دوست صائم سے بات کی ہے۔'' جمال نے پرسکون لہجے میں کہا تو اسے لگا، ساتھ رہنے کی جو بات وہ چھپانا چاہتی ہے وہ تو سامنے آ گئی۔ صائم سے پتہ نہیں کن کن کو...... یہ سوچتے ہی اس نے حیرت سے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''اس سے کیوں، اور کیا بات کی آپ نے؟ یہ بھی بتایا ہوگا کہ میں......''

''پلیز آپ پریشان نہ ہوں، میں بتاتا ہوں بات کیا ہوئی'' یہ کہہ کر وہ رُکا۔ جس پر وہ خاموش رہی تب وہ کہتا چلا گیا'' میں نے اسے صرف یہ بتایا ہے کہ مجھے جگہ پسند نہیں آئی، وہ اپنے طور پر ایک آدھ دن میں یہ معلوم کرے کہ کوئی لڑکی یہاں آنا چاہتی ہے تو اسے یہاں پر لایا جائے، میری جگہ۔''

''اور اگر کوئی لڑکی تیار نہ ہوئی تو؟'' اس نے فوراً پوچھا، تب جمال نے حتمی لہجے میں کہا

''کل تک پتہ چل جائے گا، پھر جو بھی ہو، ورنہ میں ہیڈ آفس سے وہی کہہ دوں گا جو ہم میں طے ہو گیا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ گئی۔ اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر کوئی لڑکی نہ آئی، اس کی جگہ کو دوسرا مرد آ گیا تو کیا یہ احمد جمال کے ساتھ زیادتی نہیں ہے؟ یہ تو پھر بھی اچھے طریقے سے پیش آیا ہے، نیا آنے والا کیسا ہوگا، اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

فارحہ ڈنر کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کام کرے۔ اس عجیب سی کشمکش نے اس نے اندر ہلچل مچائی ہوئی تھی۔ ایک بار تو اس نے سوچا کہ وہ

خود ہی یہ سب چھوڑ کر چلی جائے۔لیکن اگلی ہی لمحے اسے ان ضروریات کا خیال آنے لگا، جس کے باعث وہ یہاں تک آئی تھی۔ گروی مکان اس کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ایک کے بعد ایک ضرورت اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گئی۔یہ ضرورتیں بھی انسان کو بہت عجیب عجیب فیصلے کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ہم نہ چاہتے ہوئے بھی آبلہ پا ہو جاتے ہیں ۔اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ جس طرح وہ لوگ گذر بسر کر رہے تھے، جتنی آمدنی تھی، اس میں اس کا جہیز بننا تو بہت دور کی بات، گھر کو بھی ٹھیک حالت میں نہیں کر سکتے تھے۔اسے نوکری کرنا پڑی۔یہ اچھا پیکج ملا تو اسے یہ امید ہو گئی کہ گروی گھر چھڑوا لے گی، یا کم از کم وہ اپنے لئے کچھ نہ کچھ بنا لے گی۔شاید اسی باعث اسے کوئی اچھا گھر مل جائے ؟اب اسے لگتا تھا کہ یہ بھی نہ ہو سکے گا۔جہیز بناتے کوئی ایسی بات اس کے ساتھ لگ جائے ، جس سے وہ ساری زندگی پیچھا نہ چھڑا سکے۔

فارحہ کی یہ سوچ یونہی نہیں تھی۔اس کی اماں، ان دونوں سکول ہی میں پڑھتی تھیں، جب ان کے ابا سے انہیں محبت ہو گئی۔ابا کوئی غیر نہیں تھے۔ان کے کزن تھے۔انہوں نے رشتہ بھیجا تو انکار ہو گیا کہ لڑکا کرتا تو کچھ نہیں ،لڑکی کیسے دے دیں۔اماں کا سب سے بڑا جرم یہ ہو گیا کہ اس نے اس رشتے کی حمایت کر دی۔اپنے والدین سے کہہ دیا کہ یہیں شادی کروں گی۔اسی بات پر خاندان میں وہ لے دے ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ذرا سی بات کے وہ افسانے بنے کہ جن کی بازگشت آج تک سنائی دیتی تھی۔شادی کے بعد ابا کو نوکری مل گئی ، انہوں نے پہلے اپنے خاندان کو پالا، پھر اولاد کی باری آئی۔اماں کے میکے سے اس کا ایک ہی ماموں تھا۔کچھ عرصہ اس نے تھوڑا بہت پوچھا، پھر وہ بھی لندن سدھار گیا۔ پلٹ کر نہ پوچھا اور زندگی لشتم پشتم چلتی رہی۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہو۔سوچ سوچ کر اس کا دماغ دُکھنے لگا تھا۔ انہی لمحات میں اس کا فون بج اٹھا ۔اسکرین پر اس کی دوست ماورا کا نمبر تھا۔اس نے جلدی سے کال ریسیو کر لی۔تمہیدی باتوں کے بعد اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا

’’سوری فارحہ،کل میں تمہیں کال نہیں کر سکی۔تم سمجھ نہیں سکتی یہاں میں کس قدر مصروف ہو گئی ہوں۔میں نے تمہارے سارے میسج پڑھ لئے ہیں اور تمہارا پرابلم بھی سمجھ گئی ہوں۔میرے پاس اس کا حل ہے، اگر تم تھوڑی سی ہمت کر و تو۔‘‘

’’تھوڑی سی ہمت ،مطلب؟‘‘ فارحہ نے تجسس سے پوچھا تو وہ بولی

’’جہاں پر میں رہتی ہوں ، یہاں پر دوسرے لوگ تو ویسے ہی ایک ساتھ شیئر کر کے رہ رہے ہیں، انہیں کوئی مسئلہ نہیں۔لیکن یہاں پر رہنے کے لئے ہم جیسی لڑکیاں بہت مشکل میں ہوتی ہیں۔یہاں ایک حل ہے، اور وہ ہے کانٹرکٹ میرج ۔ ایک خاص وقت کے لئے وہ شادی کر لیتے ہیں، اس میں ازدواجی تعلق ہو یا نہ ہو، یہ طے کر لیتے ہیں اور وقت گذر جاتا ہے۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے میں یہاں کانٹریکٹ میرج، یہ کیا بات کر رہی ہو۔‘‘ فارحہ نے انتہائی حیرت سے کہا تو ماروا سمجھاتے ہوئے بولی

’’نہ کرو کانٹریکٹ میرج، ویسے ہی شادی کر لو۔دیکھو، تم نے کہیں نہ کہیں تو شادی کرنی ہے، اسی سے کر لو، اگر نبھ گئی تو بہت اچھا، نہ نبھی تو بھی کوئی بات نہیں۔‘‘

’’ایسا کیسے ممکن ہے؟ شادی کے بعد جو معاملات ہیں، میں انہیں کیسے افورڈ کر پاؤں گی ابھی؟‘‘ اس نے انتہائی پریشانی سے پوچھا

’’ضروری نہیں کہ تم اس سے ازدواجی تعلق بھی رکھو ۔میری بات سمجھ رہی ہو نا، پہلے ہی بات کر لیں گے نا۔‘‘

’’یار یہ کیسے ممکن ہے، میں اسے کیسے سمجھاؤں گی کہ اس طرح کی شادی......‘‘ وہ حیرت سے بولی

’’تمہاری جیسی لڑکیوں کا یہی پرابلم ہے کہ اپنا حق بھی نہیں چھین سکتی ہو۔میں جانتی ہوں جمال کو، بہت اچھا لڑکا ہے، بات مان جائے گا، تم نہ کہو، میں کہہ دیتی ہوں۔‘‘

’’یوں کیسے مان جائے گا؟ تم کہو گی اور وہ مان جائے گا، کمال کرتی ہو؟‘‘ فارحہ نے اکتاہٹ سے کہا

’’میں جانتی ہوں اسے، بہت اچھا انسان ہے۔میرا کچھ وقت گزرا ہے اس کے ساتھ ، اب یہ مت سمجھنا کہ میں نے کوئی کانٹرکٹ اس کے ساتھ کیا ہے، ایک اچھے کو

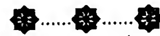
لیگ کے طور پر تھوڑا وقت ہم نے اکٹھے کام کیا ہے۔بہت اچھا ہے وہ۔'' ماورا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا
''وہ کہیں یہ نہ سمجھے کہ یہی سب میں......''
''میں کہہ رہی ہوں نا ساری بات میں کرلوں گی۔جیسے ہی یہ پراجیکٹ ختم ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں اپنے والدین کو راضی کر چکے ہوں گے ۔یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔'' ماورا نے سمجھایا۔
''مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔یہ کوئی گڈے گڈی کا کھیل نہیں ہے جو......'' فارحہ نے کہنا چاہا تو بات کاٹتے ہوئے بولی
''دیکھو، میرے پاس یہی حل ہے اور اس کے لئے پہلے تمہارا رضامند ہونا ضروری ہے، میں تبھی اس سے بات کر پاؤں گی۔اس سے بہتر آپشن کوئی نہیں ہے،کل تک سوچ لو، دو ماہ ہیں، یونہی گزر جائیں گے، اگر جمال سے تمہاری انڈر سٹینڈ نگ ہوگئی تو ایک بڑا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا،جس کے لئے تم اور تمہاری اماں پریشان رہتی ہیں۔'' ماورا نے اسے سمجھایا کیونکہ وہ فارحہ کی سب پریشانیاں جانتی تھی۔ان کے پاس کرنے کو یہی تو باتیں ہوا کرتی تھیں۔وہ لمحہ بھر بعد بولی
''لیکن یہ سب ......'' فارحہ نے کہنا چاہا تو ماورا نے طنزیہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا
''قدرت نے یہ بہت اچھا چانس دیا ہے تمہیں۔پاگل مت بنو،قدرت اگر تمہیں تحفہ دی رہی ہے تو اسے قبول کرو ۔میں تمہاری جگہ ہوتی نا تو اسے ویسے ہی پھنسا لیتی۔یار تم لڑکی ہو،تمہیں شادی تو کرنا ہے نا،کون سا تمہارا منگیتر انتظار کر رہا ہے۔یہ اچھا ہے، دو ماہ ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
''تم اس سے بات کر کے دیکھو، اگر......'' اس نے کہنا چاہا تو ماورا جلدی سے بولی
''وہ میں کر لیتی ہوں بات، آج ہی کرلوں گی، تم فکر نہ کرو۔ٹھیک ہو جائے گا سب۔''
وہ کچھ دیر باتیں کرتی رہیں اور پھر کال بند کر دی۔

☆......☆......☆

تیسرے دن کی شام ریسٹ ہاؤس کے لاؤنج میں کافی رونق تھی ۔ احمد جمال کے ساتھ وہاں ریسٹ ہاؤس کے فاریسٹ آفیسر بیٹھے ہوئے تھے، ان کے ساتھ وہاں کا کلرک ، رجاں کا شوہر اور ایک نکاح خواں موجود تھے۔سامنے کے صوفے پر فاریسٹ آفیسر کی بیوی کے ساتھ فارحہ بیٹھی ہوئی تھی۔ان سے ذرا فاصلے پر رضیہ کھڑی تھی۔
''بسم اللہ کیجئے مولانا صاحب۔'' فاریسٹ آفیسر نے نکاح خواں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
''دلہن کا وکیل کون ہے؟'' نکاح خواں نے پوچھا
''پہلی بات تو یہ ہے کہ دلہا اور دلہن دونوں عاقل اور بالغ ہیں، دوسرا وکیل میں ہوں اور یہ دونوں گواہ ہیں۔آپ شروع کریں۔'' فاریسٹ آفیسر نے کہا
''جی ٹھیک ہے۔'' نکاح خواں نے کہا اور کچھ ہی دیر بعد ان میں ایجاب وقبول ہو گیا۔دونوں نکاح کے پاکیزہ رشتے میں بندھ گئے۔
رات تک ہلچل رہی۔کھانا وغیرہ کھا کر سب لوگ چلے گئے ۔رجاں بھی برتن تک دھو کر چلی گئی ۔تب جمال اور فارحہ دونوں کاریڈور میں آ بیٹھے۔موسم کافی اچھا تھا۔ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی ۔ان دونوں میں خاموشی تھی ۔تبھی بات کرنے میں پہل جمال ہی نے کی۔
'' فارحہ ۔! آپ کو گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے ہمارے پاس یہ دو ماہ ہیں۔میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، میری طرف سے آپ کو پریشانی نہیں ہوگی۔جو ہم میں طے ہو چکا، میں اس کی پوری پابندی کروں گا۔''
''دیکھیں، مجبوری نے ہمیں اس بندھن میں باندھ دیا۔ ہمیں اپنی عزت کا خیال رکھنا ہوگا۔یہی ہماری سمجھداری ہوگی۔'' وہ دھیمے سے لہجے میں بولی
''ہاں ، ابھی ہمیں والدین کو بھی نہیں بتانا چاہئے ۔پھر دیکھا جائے گا۔'' جمال نے سوچتے ہوئے کہا
''جی ، میں بھی یہی چاہتی ہوں۔'' وہ بولی تو ان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ کتنے سارے لمحے یونہی دبے پاؤں گذر گئے۔
''اوکے، اب کل سے آپ مجھے اپنے ساتھ کام پر لے جائیں گی نا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ بھی ہنس دی۔ پھر پرسکون لہجے میں بولی
''جی بالکل، کیوں نہیں۔''

''چلیں پھر آرام کریں، صبح کام پر نکلنا ہے۔'' جمال نے کہا اور اٹھ گیا۔ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ پھر دونوں دھیرے قدموں سے اپنے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

فارحہ اپنے کمرے میں آئی تو عجیب قسم کی مختلف کیفیات میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ شادی شدہ ہو کر بھی شادی شدہ نہیں تھی، ایک ساتھی کی ہو جانے پر بھی تنہا تھی۔ سہاگ رات میں اس نے خود اپنے کو کمرے تک پابند کر لیا تھا۔ کسی کی ہو جانے کے باوجود وہ کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔



دن بڑی تیزی سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ دو ہفتے گذرتے پتہ ہی نہیں چلا۔ جس طرح ماحول بدلتا ہے، اسی طرح سوچ پر بھی اثر ضرور پڑتا ہے یا سوچ بدلنے سے ماحول بھی بدل جاتا ہے۔ فارحہ کی سوچ کیا بدلی، جذبات میں بھی تبدیلی آ گئی۔ اجنبیت سے بے تکلفی کا سفر بڑی تیزی سے طے ہو گیا تھا۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ فارحہ کے دل میں جمال کی عزت بڑھتی گئی۔ عورت کا دل بڑا موم ہوتا ہے۔ وہ جب جمال کی جانب دیکھتی اور یہ احساس اس کے من میں آتا کہ یہ میرا شوہر ہے اور میں اس کی منکوحہ ہوں تو جذبات پگھلتے ہوئے محسوس ہوتے۔ دوسرا جمال کا رویہ ایسا تھا کہ وہ نہ صرف اسے اہمیت دیتا، بلکہ دوستانہ رویے میں بھی احترام کا پہلو ضرور رکھتا۔ جمال چند دن بعد ہی ڈرائیور کی بجائے خود ہی فارحہ کو لے کر نکل جاتا۔ فارحہ کو ایک تحفظ کا احساس، پرسکون کر دیتا۔ جب ضرورت ہوتی وہ ڈرائیور کو لے لیتا۔ زیادہ تر سروے کے لئے وہ خود ہی نکل جاتا۔ باقی کام فارحہ گھر پر کر لیتی۔ روزانہ ایک ساتھ جانے اور نکاح کے مضبوط بندھن کے باعث، ان دونوں میں جھجک نہیں رہی تھی۔ دونوں اچھے دوستوں کی طرح ہر بات شیئر کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے لگے تھے۔ دو ہفتوں میں وہ بہت قریب آ گئے تھے۔

فارحہ جہاں الوہی کیفیات اور خوشگوار جذبات سے آشنا ہوئی تھی۔ وہاں اس پر دباؤ بھی بڑھ گیا تھا۔ ایک طرف جمال کی ذات تھی، جس کی وہ منکوحہ ہو چکی تھی تو دوسری طرف اس کے گھر والے تھے۔ دو ماہ بعد کیا ہوگا؟ یہ سوال اسے چکرا کے رکھ دیتا تھا۔ یہ طے تھا کہ اگر وہ دو ماہ بعد نکاح برقرار نہ رکھ پائے تو بلا جھجک جدا ہو جائیں گے۔ اور اگر حالات ان کے بس میں ہوئے تو ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کی شروعات کریں گے۔ لیکن فارحہ کے اندر بھی ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے کئی مطالبات تھے۔ وہ اپنی منوانا چاہتی تھی۔ جس سے فارحہ کو بہت لڑنا پڑتا تھا۔ لمس سے بہت پہلے، قربت کا احساس ہی پاگل کر دیتا ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔ عورت میں بہت برداشت ہے، لیکن اس برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

ایک صبح وہ کچن میں گئی تو اس کے من میں خیال آیا۔ کیوں نا وہ جمال کے لئے خود ناشتہ بنایا کرے؟ وہ رجاں کے ساتھ ناشتہ بنانے لگی۔ ناشتہ بناتے وقت اس نے شدت سے محسوس کیا کہ ایک الوہی جذبہ اس کے اندر موجود ہے، جس میں موجود یہ چاہت اس سے سب کروا رہی ہے۔ کسی اپنے کے لئے یہ سب کرنا، کتنا خوشگوار ہوتا، یہ تجربہ اسے اس صبح ہوا۔ کومل جذبے جب پھوٹتے ہیں تو اپنا آپ منوا لیتے ہیں۔

اس نے ناشتہ ٹیبل پر لگوایا اور خود بھی وہیں جا بیٹھی۔ ناشتے کے دوران جمال نے خوشگوار حیرت سے پوچھا

''آج ناشتہ کس نے بنایا ہے؟''

''کیوں کیا ہوا؟'' فارحہ نے تیزی سے پوچھا

''پہلے سے کہیں اچھا ہے اور ذائقہ بھی بدلا ہوا ہے؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا

''میں نے بنایا ہے۔'' اس نے ہلکی سی مسکان میں کہا، جس میں حیا گھلی ہوئی تھی۔

''بہت اچھا بنا ہے۔'' اس نے کہا اور ناشتے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس ذرا سی تعریف پر اس کے من میں تسکین اُتر گئی۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ پھر لاشعوری طور پر فارحہ نے روزانہ خود ناشتہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایسا کر کے اسے انجانی خوشی ہوئی تھی۔

وہ جمال کے دیگر چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی دھیان دینے لگی۔ اس کے کپڑے خود پریس کر دیتی۔ اسے تیار ہونے میں مدد دیتی۔

وہ تیسرے ویک اینڈ کی شام تھی۔ وہ اپنے کام سے دوپہر ہی کے وقت لوٹ آئے تھے۔ تبھی سہ پہر کے وقت

چائے پیتے ہوئے جمال نے کہا
"فارحہ، کیا خیال ہے، تھوڑا آؤٹنگ کریں، اچھا سا کھانا کھا آئیں باہر سے۔"
"روزانہ سروے کے لئے باہر ہی جاتے ہیں۔کھانا بھی اچھا ملتا ہے،اس ویرانے میں باہر سے کہاں......" اس نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بولا
"یار، یہاں سے نزدیک ترین شہر آدھے گھنٹے کے فاصلے پر ہے، وہاں کئی اچھے ریسٹوران ہیں، ابھی کچھ دیر بعد نکلتے ہیں، جب دل کیا واپس آجائیں گے۔" اس نے آفر کی تو فارحہ نے اگلے ہی لمحے کہا
"ٹھیک ہے چلیں۔"
"تو پھر تیار ہوجاؤ، نکلتے ہیں۔" اس نے پیار سے کہا تو وہ اندر تک خوشی سے بھر گئی۔
اگرچہ وہ تقریباً روزانہ ہی اس کے ساتھ باہر جاتی تھی، کبھی کبھار ڈرائیور بھی ہوتا تھا لیکن اس شام اس کی کیفیات ہی عجیب تھیں۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پارہی تھی، وہ بہت کچھ سننا چاہتی تھی، لیکن سن نہیں سکتی تھی۔ گدگداتا ہوا من بہت کچھ چاہ رہا تھا، مگر اظہار نہیں کرسکتی تھی۔ان کے درمیان خاموشی تھی۔ بس میوزک سے کار کی فضا بھری ہوئی تھی۔ جس وقت وہ شہر کے مضافات میں پہنچے تو جمال نے یہ خاموشی توڑی
"بس اب پہنچ جانے والے ہیں۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گذرا۔"
"ہوں، مجھے تو یہ سفر بہت طویل لگا۔" وہ بے ساختہ بولی
"ہاں، ایسا ہوتا ہے، مشکل وقت اور مشکل سفر طویل ہی لگتے ہیں، خیر یہ وقت اور سفر بھی گذر ہی جائے گا۔" جمال نے کچھ اور ہی سمجھتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو اس کے اندر بیٹھی عورت گویا چیخ پڑی۔ وہ کہنا چاہتی کہ تم غلط سمجھے ہو، میں تو کچھ اور ہی کہنا چاہتی تھی۔ فارحہ نے اپنے اندر کی عورت کا گلہ دبادیا۔
ریسٹوران کی مدھم روشنی میں وہ آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ جمال تھوڑا بجھ گیا تھا۔ پھر ڈنر کے دوران وہ کام ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ایک بھی بات ایسی نہیں کی، جس سے کسی کومل جذبے کا کوئی خوشگوار احساس ان سے لپٹ جائے۔ ڈنر کے بعد جب وہ ریسٹوران سے نکلے تو جمال نے دھیمے سے کہا
"آؤ تھوڑی شاپنگ ہوجائے، میں تمہارے لئے کچھ خریدنا چاہتا ہوں۔"
"چھوڑو، کیا کرنا ہے فضول پیسے خرچ کرکے، واپس چلتے ہیں۔" اس نے دل پر پتھر رکھ کر کہا تو جمال کاندھے اُچکا کر رہ گیا۔ وہ کار میں آبیٹھے۔ واپسی پر پھر وہی طویل خاموشی ان کے ہم سفر تھی۔ فارحہ ان لمحات کو بہت محسوس کررہی تھی۔ وہ چاہتی تو اپنی باتوں سے، اپنی اداؤں سے، لفظوں سے جمال کو اسیر کرسکتی تھی۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ شاید وہ خود کو اپنی ہی بنائی ہوئی سطح سے نیچے نہیں لانا چاہ رہی تھی۔



وہ تیسرے ہفتے کی چوتھی رات تھی۔ فارحہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ شام ہی سے اس کے سر میں درد تھا۔ اس نے پین کلر لے لی تھی۔ مگر درد تھا کہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ تکلیف سے وہ بے بس ہوکر لوٹ پوٹ ہوگئی۔ رجّاں سونے سے پہلے ایک بار اس کے پاس آئی تھی۔ اسے فارحہ کی طبیعت کے بارے میں پتہ چلا تو اس نے فوراً جمال کو بتایا۔ اس نے کار نکالی، رجّاں کی مدد سے فارحہ کو کار میں ڈالا اور قریب ترین چھوٹے سے اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر اپنے گھر سو رہا تھا۔ اسے جگا کر لایا گیا۔ اس کے پاس بھی سوائے پین کلر انجکشن کے دوسرا کچھ نہ تھا۔
"انہیں تھوڑی دیر میں سکون آجائے گا، آپ چاہیں تو انہیں لے جاسکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے انجکشن لگا کر کہا
"یہ درد ہوا کیسے؟" جمال نے سوال کیا
"یہ تو مریضہ سے بات کرکے پتہ چلے گا۔ خیر اگر آپ رکنا چاہیں تو رکیں۔ میں یہیں گھر پر ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا اور واپس چلا گیا
فارحہ نیند میں چلی گئی تھی۔ جمال ساری رات اس کے پاس بیٹھا رہا۔ صبح ہونے تک اس کی طبیعت سنبھل گئی۔ وہ جاگی تو بہت حد تک فریش تھی۔ ڈاکٹر نے کافی دیر تک فارحہ سے باتیں کرنے کے بعد یہی بتایا کہ زیادہ کام کی وجہ سے اعصاب پر اثر ہوا ہے۔ ایسا کسی بھی دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ فارحہ تو سمجھ رہی تھی کہ ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ

نجانے خود پر ہونے والے کیسے کیسے دباؤ برداشت کر رہی تھی۔ فارحہ جس حد تک اس دباؤ کی شدت کو سمجھتی تھی، جمال اس حد تک کا احساس کیسے کر سکتا تھا۔ وہ صبح صبح واپس آ گئے۔

اگلے دو تین دن تک جمال نے اسے کام نہیں کرنے دیا۔ سبھی کام خود کرتا رہا۔ یوں طبیعت خراب ہونے پر وہ اس کا از حد خیال کرنے لگا تھا۔

اس رات بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ موسم بہت خوش گوار ہو گیا تھا۔ گرمی کی شدت کے بعد بارشوں کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ بارش برسنے کے ساتھ ہی اس کے من میں ایک عجیب بے کلی سی جاگ اٹھی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی، اٹھ کر کھڑکی میں آ گئی۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھی۔ بس من چاہ رہا تھا کہ بارش میں جا کر بھیگ جائے۔ وہ کاریڈور میں تو آ گئی لیکن بارش میں بھیگنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ رات کے دوسرے پہر یوں خاموشی سے کاریڈور میں آ کر بیٹھنے پر وہ خود حیران تھی۔ جس طرح بارش پڑنے پر مٹی کی خوشبو پھیل جاتی ہے، اسی طرح جذبات کی پھوار میں احساس کی خوشبو بھی من میں اپنا آپ منوانے لگتی ہے۔

گھر سے دور، ریسٹ ہاؤس کے اس کاریڈور میں بیٹھی فارحہ خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ فارحہ نے سوچا، اسی ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں جمال بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہوگا؟ کیا مرد کے بھی ویسے ہی جذبات ہوتے ہیں جو ایک تنہا عورت کے ہوتے ہیں؟ اس ایک سوال نے اسے تصوراتی دنیا میں پہنچا دیا۔ یہ ہوتا ہے، ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے۔ ایسے خواب وہ اپنی مرضی سے دیکھتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے ان خوابوں میں دیکھتا ہے، نا آسودہ خواہشیں، بڑا رنگین پیراہن لے لیتی ہیں۔

''تم یہاں بیٹھی ہو، خیریت؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' جمال کی آواز پر اس کا تصور چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ وہ چونک گئی۔ اس نے اپنے بدن میں واضح طور پر ایک نا سمجھ میں آنے والی لہر کو محسوس کیا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پایا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''بس ایسے ہی نیند نہیں آ رہی تھی، سوچا بارش ہی کا نظارہ کروں۔''

''ویسے یہ بارش بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ خاص طور پر اس صحرائی علاقے کے لئے۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا تو فارحہ نے غور سے جمال کے چہرے پر دیکھا، وہاں کسی بھی جذبے کا کوئی دیا روشن نہیں تھا۔ وہ بجھ کر رہ گئی۔ پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔

''ہاں، گرمی کچھ کم ہو گی تو ہم اپنا کام بھی جلدی سمیٹ لیں گے۔''

''مجھے پورا یقین ہے کہ ہم دیئے گئے وقت تک کام پورا کر لیں گے۔ ویسے میرے ایک دوست نے بتایا ہے کہ اسی علاقے میں ایک مزید سروے بھی آ رہا ہے۔ وہ یا تو ہمیں ہی دے دیں گے یا پھر کوئی نئی ٹیم بھیجیں گے۔'' جمال نے بتایا تو فارحہ گھبرا گئی۔ اس نے حیرت اور گھبراہٹ میں تیزی سے پوچھا۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں، مجھے میرے دوست نے بتایا، یہ ہو بھی سکتا ہے یا نہیں بھی لیکن تم کیوں گھبرا گئی ہو؟'' جمال نے پوچھا

''کیا تم نہیں جانتے ہم دونوں نکاح......'' فارحہ کہتے کہتے رُک گئی تو وہ سکون سے بولا۔

''ہاں، اگر مزید لوگ آ گئے تو یہ بات انہیں پتہ چل سکتی ہے۔ مگر اس سے پہلے ہم کچھ نہ کچھ سوچ لیں گے۔''

''ہاں اگر یہ بات سب کو پتہ چل گئی تو......'' اس نے پھر کہتے کہتے خود کو روک لیا۔

''نہ گھبراؤ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا ''ویسے ایک بات ہے، ہم میں اجنبیت زیادہ نہیں ہو گئی؟''

''اجنبیت، میں سمجھی نہیں؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''سوچو، اگر ہم صرف کولیگ رہتے، دوست ہوتے تو زیادہ فرینک ہوتے۔ اب تو ہر بات ناپ تول کر کرتے ہیں، ہم لوگ تنہائی میں کس قدر گھبراتے ہیں، حالانکہ تم میری منکوحہ ہو۔ کیا یہ اجنبیت نہیں ہے؟'' اس نے کہا تو اس کے لہجے میں شکوہ اتر آیا تھا

''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے رکتی ہوئی سانس کے

ساتھ پوچھا
"تعلق میں صرف جسم ہی نہیں ہوتا، اسے اگر ایک طرف رکھ دیں تو یہ چند دن ہمارے لئے خوشیوں سے بھرپور ہو سکتے ہیں۔ یہ ڈر، خوف اور عدم اعتماد کو خود سے دور کر دو۔ دیکھنا اس میں سے کتنا خوشگوار ماحول سامنے آتا ہے۔"اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو فارحہ کا من بھر گیا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا
"کیوں نہیں، مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔"
"وعدہ؟" یہ کہتے ہوئے جمال نے ہاتھ بڑھا دیا۔ فارحہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا تو لمس کا جادو اس کے پورے بدن میں پھیل گیا۔ وہ خود پر قابو رکھے رہی۔ یہاں تک کہ جمال نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ تو وہ بولی۔
"وعدہ۔"
"یہ ہوئی نا بات۔" وہ ایک دم سے خوش ہو گیا۔

"چلیں، اب، رات کافی ہو گئی ہے۔" فارحہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ بارش بہت حد تک کم ہو گئی تھی۔ جمال نے باہر کی جانب دیکھا اور اٹھتے ہوئے بولا
"ہاں، چلیں۔"
وہ دونوں چند قدم ساتھ ساتھ چلتے رہے، پھر اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔
اسی رفاقت میں وہ تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے تھے۔ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ وقت کتنی تیزی سے بیت رہا ہے۔ ایسا حسین وقت جو خوبصورت یادیں بن جایا کرتا ہے۔ آنے والے دنوں سے بے نیاز وہ ایک دوسرے کا پہلے سے کہیں زیادہ خیال رکھنے لگے۔



وہ فارحہ اور جمال کے نکاح کا بیالیسواں دن تھا۔
اس شام ویک اینڈ کی وجہ سے وہ دونوں جلدی واپس آگئے تھے۔ رجاں انہیں چائے دینے آئی تو فارحہ نے بتایا۔
"رجاں۔! ہم چائے پیتے ہی شہر نکل جائیں گے۔ اس لئے رات کا کھانا ہم شہر سے کھا کر ہی آئیں گے۔"
"ٹھیک ہے بی بی جی۔" رجاں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور چلی گئی۔ انہی لمحات میں فارحہ کا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر دیکھا، یہ اس کی امی کی طرف سے کال تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، وہ رات ہی کے وقت کال کرتی تھیں۔ اس لئے اُس نے جلدی سے کال رسیو کی اور اپنا مگ اٹھا کر لاؤنج سے نکل گئی۔
"بولو اماں، آج اس وقت، خیریت تو ہے نا۔" فارحہ نے پریشانی میں پوچھا
"ارے بیٹا، مجھ سے رہا نہیں گیا۔ مجھے خوشی ہی اتنی ہو رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ میں نے سوچا تمہیں فوراً بتا دوں۔" اماں نے چہکتی ہوئی خوشی سے لبریز آواز میں کہا تو اس نے حیرت سے پوچھا
"اماں ایسی کون سی خوشی مل گئی آپ کو؟"
"آخر اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے۔ میں ساری زندگی اپنے بھائی ارسلان کو برا بھلا کہتی رہی۔ لیکن آج اب آیا تو سمجھو میری ساری پریشانیاں ختم کر دی میرے بھائی نے۔ آخر ماں جایا ہی کام آیا۔" اماں نے خوشی سے لہکتے لہجے میں کہا
"ایسا کیا کر دیا ماموں نے، جو ساری زندگی نہیں پوچھا اور آج ایک ہی دن میں سب خوشیاں لٹا دیں، مجھے بھی تو کچھ پتہ چلے۔" اس نے تجسس سے پوچھا تو وہ بولیں
"کیا بتاؤں بیٹی، یہ تو میرے رب نے مجھ پر کرم کیا ہے کہ اس کے دل میں میرا خیال ڈال دیا، اپنے بیٹے سہیل کے ساتھ سیدھا میرے پاس ہی آیا۔ تین دن سے میرے ہاں ہی ٹھہرا ہوا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اب یہیں اس شہر میں اپنا گھر لے گا، اور باقی زندگی یہاں سکون سے رہے گا۔"
"تو اماں اس میں آپ اتنا خوش کیوں ہو رہی ہیں؟ وہ جہاں......" فارحہ نے کہنا چاہا تو اماں اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولیں
"تو سنے گی نا، تو بھی خوش ہو جائے گی۔ اپنا گھر گروی تھا نا، وہ آج ہی تیرے ابا کے ساتھ جا کر اس نے بنک سے چھڑوا دیا ہے۔"
"واہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ پتہ نہیں کیسے رحم آگیا۔" فارحہ نے اب بھی شک کے انداز میں کہا
"اور سن، ارسلان اپنے بیٹے سہیل کو یہیں کاروبار کروانا چاہ رہے، اور اس کے ساتھ تیرا بھائی محسن بھی شامل

ہوگا۔ کہاں دھکے کھا رہا تھا میرا بیٹا، اب اسے بھی کام مل جائے گا۔'' اماں نہال ہوتے ہوئے بولی

''مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی وہ اتنے مہربان کیسے ہو گئے ہیں؟'' فارحہ نے حیرت سے پوچھا

''کہہ رہا تھا کہ باپ کی جائیداد میں سے مجھے کچھ نہیں دیا، ایک ہی بہن ہوں اس کی، آخر میرا ماں جایا ہے، درد آ گیا میرا۔'' اماں کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ فارحہ سمجھ رہی تھی کہ اماں نے یہ بات کہی ہے تو کیوں اس کا لہجہ بھیگ گیا ہے۔ لیکن اس وقت وہ ماضی میں کی ہوئی باتیں یاد کرنے کی بجائے اُس انہونی پر سوچ رہی تھی کہ ماموں ارسلان کے دل میں رحم کیسے آ گیا۔ جس نے کبھی انہیں پوچھا تک نہیں تھا۔

''خیر اماں، اگر ماموں نے ایسا کر دیا ہے تو اس کے پیچھے کوئی اس کا پلان ہوگا، ورنہ اتنی رحم دلی کون دکھاتا ہے۔ اب تک انہوں نے......'' فارحہ نے کہنا چاہا تو اماں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا

''اب تو سن، میں نے تمہیں فون کیوں کیا ہے۔''

''ہاں اماں بولو۔'' اس نے کہا

''تم ایسے کرو، فوراً سب چھوڑ کر واپس گھر آ جاؤ، اب کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں کام کرنے کی۔''

''ایسا کیا ہو گیا اماں؟ ایسے کیسے میں سب چھوڑ کر آ جاؤں۔ بس تھوڑا سا وقت رہتا ہے، اٹھارہ بیس دن، کام ختم کر کے آ جاؤں گی، ورنہ مجھے میرا پیکج نہیں ملے گا، جس کے لئے اتنی محنت کی۔''

''ارے میرے بھائی نے تمہارے اکاؤنٹ میں تیرے جہیز کے لئے روپیہ جمع کروا دیا ہے۔'' اماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

''اتنی رقم، میرے اکاؤنٹ میں، مگر وہ کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا

''تیرے جہیز کے لئے، سمجھ نہیں آ رہی تجھے؟ ارے خوش قسمت ہو تم، بیٹھے بٹھائے گھر میں رشتہ آ گیا۔ ہم نے مل کر سہیل سے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ سارا خرچ تیرا ماموں کرے گا۔ اب تو جلدی سے واپس آ جا۔ نہیں کرنی اب نوکری۔'' اماں کہہ رہی تھی اور وہ سن بھی رہی تھی، لیکن اسے سمجھ کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ اسے لگا کہ جیسے ایک بھونچال آ گیا ہے اور اس کے شور میں اسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا ہے۔ ''ارے تو سن رہی ہے میری بات کہ نہیں، کچھ بولو بھی۔'' اماں کی ڈانٹ نما آواز سنی تو اسے ہوش آیا۔ تبھی وہ جلدی سے بولی

''اماں ایسے نہیں ہو سکتا، میں کام......''

''بھاڑ میں گیا تمہارا کام، بس تم سب سمیٹو اور چلی آؤ واپس گھر۔'' اماں نے نخوت سے کہا

''ارے اماں وہی سمیٹنے ہی کی تو بات کر رہی ہوں، ایسے ایک دم سے نہیں نکلا جاتا، میری بات سمجھو۔'' فارحہ نے سمجھاتے ہوئے کہا

''مجھے کچھ نہیں پتہ، بس تم ایک دو دن میں آ جاؤ۔ ورنہ میں تیرے باپ کو بھیج دوں گی تمہیں لینے کو۔'' اماں نے حکم صادر کر دیا

''میں رات کو فون کروں گی۔ پھر بات کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے؟'' اس نے بحث کرنے کی بجائے کہا۔

''رات کو میں ہی کروں گی۔ پر جو کہا ہے وہی کرو، سمجھی تم؟'' اماں نے تاکید کر دی تو اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔

یہ اچانک کیا ہو گیا؟ اسی سوال نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بت بنی وہیں کھڑی تھی کہ جمال وہیں آ گیا اس نے فارحہ کو یوں بدحواس ہوئی دیدے پھاڑے ایک ہی جانب دیکھتے ہوئے پایا تو پریشانی سے پوچھا

''کیا ہو گیا فارحہ، خیریت تو ہے نا، گھر میں کوئی پرابلم تو نہیں خدانخواستہ؟''

''آں ......ہاں ......وہ کچھ نہیں۔'' فارحہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''تم ایسا کرو، ادھر سکون سے بیٹھو، پھر بتاؤ بات کیا ہے۔'' اس نے فارحہ کو کاندھے سے پکڑ کر قریب پڑی کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا تو فارحہ کو یوں لگا، جیسے وہ اپنے ہمدرد سے دور کہیں بہت دور جا رہی ہے۔ دُکھ کی ایک لہر نے اس کے اندر اذیت بھر دی۔

''جمال، ہم شاید اب شہر نہ جا سکیں۔'' فارحہ بولی

''ٹھیک ہے نہیں جاتے، لیکن اس فون میں ایسا کیا تھا جو.....'' اس نے آرام سے پوچھا۔

''جمال، مجھے تھوڑی دیر کے لئے اکیلا چھوڑ دو، میں بتاتی ہوں، پلیز۔'' اس نے بے چارگی سے کہا تو وہ بولا

''ٹھیک ہے، لیکن ابھی تم اپنے کمرے میں جاؤ، پھر بات کرتے ہیں۔'' اس نے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ پھیلایا تو فارحہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور اٹھ گئی۔

جس وقت رجاں نے اسے ڈنر کے لئے بلایا، تب تک وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جمال سے کیا بات کرنی ہے۔ ڈنر کے بعد جمال کاریڈور میں جا بیٹھا۔ فارحہ نے خود چائے بنائی اور ٹرے میں رکھ کر اس کے پاس چلی گئی۔ رجاں جا چکی تھی۔ بلاشبہ وہ بھی منتظر تھا کہ فارحہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ چائے کا پہلا سپ لیتے ہی فارحہ نے فون پر ہونے والی ساری بات بتا دی۔ جمال خاموشی سے سنتا رہا۔

''ہنہ۔!'' اس نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے ہنکارا بھرا، پھر سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ وقت تو آنا تھا، یوں اچانک آ جائے گا، اس کے بارے میں ہم دونوں ہی نے نہیں سوچا تھا۔ خیر، اب تم کیا چاہتی ہو؟ کیونکہ فیصلہ تم ہی نے کرنا ہے۔''

''مجھے جانا پڑے گا جمال، ورنہ میرے گھر سے کوئی نہ کوئی یہاں آ جائے گا۔ ساری بات کھل جائے گی، اور میں......'' وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ جمال اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا

''فارحہ۔! ہمارا اتنے دنوں کا ساتھ، اتنا وقت اکٹھے بتا دینا اور پھر ایک ایسے بندھن میں بندھ جانا، میں نہیں سمجھتا کہ اس دوران مجھ سے کوئی ایسی بات ہو گئی ہو، جو تمہیں ناگوار گذری ہو۔ میں نے وہی کیا جو تم نے چاہا۔ اب بھی میں وہی کروں گا جو تم چاہو گی۔ اب بولو کیا کرنا ہے؟''

''جمال، میں مانتی ہوں کہ تمہارے رویے نے میرا دل جیت لیا ہے۔ تم نے میرا مان رکھا، مجھے عزت دی، احترام دیا۔ ایک لڑکی جب ایسے بندھن میں بندھ جاتی ہے تو نہیں چاہتی کہ تعلق ٹوٹ جائے۔ تم بہت اچھے ہو۔ لیکن میرا ایک سوال ہے، کیا اتنے دنوں کا یہ ساتھ، یہ تعلق رائیگاں تھا؟ اس نے اپنا ذرا سا بھی اثر نہیں دکھایا۔ کوئی جذبہ، کوئی احساس من میں نہیں اُترا؟'' فارحہ بہت مشکل سے کہتی ہوئی جذباتی ہو گئی تھی۔

''میں سمجھ رہا ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ یقین کرو، ہمارا یہ ساتھ رائیگاں نہیں ہے لیکن۔! فیصلہ تم نے کرنا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا

''میرا فیصلہ تو وہی ہے نا، جو ہم میں طے ہوا تھا، میں تو اس کمٹمنٹ سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔'' وہ بھیگتے ہوئے لہجے کے ساتھ بولی

''تو کیا یہ تعلق یونہی نہیں رہ سکتا؟'' جمال نے ایک دم سے پوچھا تو خاموش رہی تبھی اس نے کہا ''میرے ذہن میں بھی تھا اور ہے۔ مگر یہ اچانک، مجھے اپنے والدین سے بات کرنا ہو گی۔ کم از کم انہیں تو اعتماد میں لینا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا جیون ساتھی میرے ہی گھر میں بے وقعت ہو جائے۔ مجھے کچھ دن تو چاہئیں ہوں گے نا۔'' اس نے اپنی مشکل بتا دی۔

''تو پھر، کیا کریں؟'' اس نے حسرت سے پوچھا تو جمال چند لمحے سوچتا رہا، پھر حتمی لہجے میں بولا

''دو دن، میں آج رات ہی نکلتا ہوں۔ پرسوں رات یہاں ہوں گا، پھر جو بھی فیصلہ ہو، سب کچھ مجھے کرنا ہو گا، یا پھر میں تمہاری بات مان لوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' فارحہ ایک دم سے مان گئی۔

''جاؤ آرام کرو، پریشان نہیں ہونا، ہماری قسمت میں ہوا تو کوئی ہمیں جدا نہیں کر سکتا۔ دعا کرنا، میں ابھی نکلتا ہوں۔'' جمال نے کہا اور اٹھ گیا۔ پھر وہ تیار ہو کر نکل گیا۔



وہ کھڑکی کے پاس کھڑی باہر ہونے والی طوفانی بارش دیکھ رہی تھی۔ وہ ریسٹ ہاؤس کے اس کمرے میں تھی، جس میں وہ پچھلے ڈھائی ماہ سے مقیم تھی۔ شدت سے برستے ہوئے پانی نے سارا منظر دھندلا دیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کا اپنا مستقبل دھندلا ہو گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ جس طرح باہر تیز شور ہو رہا تھا، اس سے کہیں زیادہ اس کے من میں شور مچ رہا تھا۔ سوچیں، خواہشیں، امیدیں اور نجانے کیسے کیسے جذبے آپس میں

الجھے ہوئے تھے۔یوں جیسے باہر سر پٹختی ہوئی تیز ہوا کا پاگل پن، درختوں کا حواس باختہ ہنگامہ، ماحول کو خوف زدہ کر دینے والی دیوانگی،خوابوں کے ٹوٹتے ہوئے پتے کڑکتی بجلی جیسے آنے والے حالات کا خوف،اور نجانے کیا کیا کچھ......

باہر کا موسم اس کے اندر بھی اُترا ہوتھا۔وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پارہی تھی۔انہی لمحات میں اُسے لگا نجانے وہ کتنی ہی ان دیکھی زنجیروں میں کس قدر جکڑی ہوئی ہے۔اسے اندازہ تو تھا کہ فیصلہ کیا ہو جاناہے،کوئی فیصلہ تو ہونا ہی تھا لیکن ایک موہوم سی امید تھی، بالکل ایسے جس طرح تیز ہوا میں کوئی دِیا جلانے کی آرزو رکھتا ہو کہ وہی فیصلہ ہو جو اس کا من چاہتا ہے۔اس کا من کیا چاہتا ہے؟،اس خواہش پر بھی اس کی اپنی دسترس نہیں تھی۔جس طرح آندھی اور بارش کا پتہ نہیں چلتا، اس کے حالات بھی ایسے ہی ہو گئے تھے۔اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی ایسے بھی کسی دوراہے پر لے آئے گی۔اسے کوئی ایسا فیصلہ کرنا تھا، جس کے بارے میں اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔ایسا نامعلوم فیصلہ جسے کرتے ہوئے وہ خود ہی خوف زدہ ہو رہی تھی۔

اسے احمد جمال کا انتظار تھا۔اس طوفانی بارش سے یوں لگ رہا تھا، جیسے قدرت سوچنے کا اُسے تھوڑا سا وقت مزید دینا چاہتی ہے۔وہ کھڑکی کے پاس ہی پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔وہ پھر سے سوچنے لگی، تاکہ نامعلوم فیصلہ کرتے ہوئے وہ کہیں ڈگمگا نہ جائے۔

طوفان تھم چکا تھا۔رات گہری ہو چکی تھی۔ان دو دنوں میں اس نے خود میں بھی ہمت کر لی تھی۔جو فیصلہ بھی ہوتا، وہ اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔دراصل جمال اس کے دل میں اُتر گیا تھا۔جس دن وہ ریسٹ ہاؤس میں آیا تھا، تب وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، سوائے پریشانی کے۔لیکن جیسے ہی وہ نکاح کے بندھن میں بندھی، وہ اس کے لئے کچھ سے کچھ ہو گیا۔پہلی رات ہی سے جو اس نے کمٹمنٹ کی پاسداری کی تھی۔

اسی رات پیار کا بیج اس کے دل کی زرخیز زمین میں اُتر گیا۔پھر جمال کے بے لوث ہونے، احترام اور عزت دینے والے رویے اور اس کے نسوانی احساس نے اس بیج کی آبیاری کی تو محبت کی کونپل نے پھوٹ کر اپنا آپ منوالیا تھا۔محبت کی اس خوشبو سے وہ دونوں ہی مہک اٹھے تھے۔اب یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کونپل کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں، کیونکہ محبت جس من میں پھوٹ پڑتی ہے، امربیل کی طرح پورے وجود ہی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی بلکہ روح تک بھی رسائی کر جاتی ہے۔

پورچ میں کار رُکنے کی آواز آئی تو فارحہ کا دل لرز اٹھا۔آنے والے لمحے نجانے کیا فیصلہ لے کر آتے ہیں۔وہ ہاں اور ناں کی صلیب پر لٹک گئی۔اسے معلوم تھا کہ جمال اس کے کمرے میں نہیں آئے گا۔وہ اٹھی اور کچن میں چلی گئی۔اس نے پانی لیا اور لاؤنج میں آ گئی۔وہ تھکا ہوا صوفے پر بیٹھا تھا۔فارحہ نے پانی اس کے پاس رکھتے ہوئے پوچھا

''کھانا لگاؤں؟''

''نہیں، میں نے راستے میں کھا لیا تھا۔بھوک نہیں اب۔''اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا

''چائے بناؤں۔''اس نے پھر پوچھا

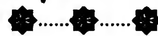
''ہاں، چائے بنالو۔میں فریش ہو کر آتا ہوں۔''اس نے تیزی سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔نجانے کیوں فارحہ کا دل بجھ گیا تھا۔جمال کا رویہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وہ چائے بنا کر کاریڈور میں آ گئی تو جمال وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔وہ میز پر ٹرے رکھ کر سامنے پڑی کرسی بیٹھ گئی تو جمال نے اس کی طرف دیکھا، پھر دھیمے سے لہجے میں بولا

''فارحہ۔!میرے والدین نہیں مانے۔ ہماری کچھ مجبوریاں ہیں۔جن کی تفصیل میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔میں شرمندہ ہوں۔میں نے تمہیں دو دن رو کے رکھا۔اب وہی ہوگا، جو تمہارے ساتھ کمٹمنٹ ہوئی تھی۔''جمال کہتا رہا لیکن فارحہ کو یوں لگا جیسے وہ اندر سے ٹوٹ کر بکھلنے لگی ہے۔آنسو پلکوں پر آ کر مچلنے لگے۔وہ جمال کو کوئی دوش نہیں دے سکتی تھی۔اب تک جو بھی ہوا تھا، اسی کی مرضی سے تھا۔اس کے من میں محبت کی کونپل نے سر اٹھا لیا تھا، اس میں بھی وہ جمال کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔اس لئے خود پر قابو پاتے ہوئے بولی

''ٹھیک ہے۔اب مجھے صبح جانا ہوگا۔''

"ہاں، طلاق کے کاغذات بن گئے ہیں۔ میں نے نکلتے وقت فون کر دیا تھا۔صبح فاریسٹ آفیسر آئیں گے تو ......" وہ اتنا ہی کہہ سکا۔فارحہ نے ایک طویل سانس لی اور اٹھ گئی، اب کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔وہ خود پر جبر کر کے اپنے کمرے تک گئی۔ وہاں جاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔وہ اسی وقت سارے آنسو بہا دینا چاہتی تھی۔



شام کے سائے پھیل گئے تھے جب فارحہ نے اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ایک دم سے اس کا دل بھر آیا۔کوئی بھی طلاق یافتہ لڑکی، اپنے میکے آتی ہے تو وہ اس کے لئے قیامت کی گھڑی ہوتی ہے۔اتنا بڑا طوفان آ کر گذر گیا،لیکن اس قدر خاموشی؟ وہ پوری جان سے لرز گئی۔محسن اسے لینے گیا ہوا تھا۔گھر میں اماں اور ابا اس کے انتظار میں تھے۔گھر میں ملنے ملانے سے لے کر رات گئے باتوں تک، اُسے کچھ سمجھ میں آیا، کچھ نہیں۔وہ تھکن کا کہہ کر اپنے اسی کمرے میں آ گئی جس میں بچپن سے لے کر جوانی تک کا وقت گذارا تھا۔وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔اس کی آنکھوں کے سامنے پھر سے وہی منظر جاگ گیا، جب جمال نے اُسے الوداع کہا تھا۔ٹکٹ لے کر کوچ میں بٹھانے تک وہ بالکل خاموش رہا تھا۔جیسے ہی کوچ چلنے لگی، اس نے دھیمے سے لہجے میں اتنا ہی کہا

"میرا سیل نمبر آپ کے پاس ہے۔ جب بھی میری ضرورت محسوس ہو، مجھے کال کر لیں۔ایک اچھے دوست کی طرح میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

عام سے یہ لفظ نجانے کس جذبے میں بھیگے ہوئے تھے کہ سیدھے اس کے دل میں اُتر گئے۔جیسے رائیگاں محبت کی دیوار پر جذبوں کے یہ نشاں کسی اعزاز کی طرح سج جائیں۔

"میں بھی۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔تبھی اس نے ایک نگاہ اس کی طرف دیکھا۔یہ دیکھنا بہت ظالم تھا۔اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، وہ پلٹ گیا تھا۔فارحہ نے اسے دیکھنا چاہا، مگر وہ یوں اوجھل ہو گیا تھا، جیسے اس کی زندگی سے چلا گیا تھا۔مایوس نگاہیں پلٹ آئیں۔ اس نے آنسوؤں کو روکنے کے لئے سختی سے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔فارحہ کو اس تلخ حقیقت کے ساتھ اپنی دنیا میں لوٹنا پڑا تھا کہ اب فقط یادیں ہی ہیں جو ساری زندگی اس کے ساتھ رہیں گی۔

اس کے ماموں ارسلان نے گھر کرائے پر لے لیا تھا۔وہ اپنے بیٹے سہیل کے ساتھ کر اُس میں شفٹ ہو گئے تھے۔ یہ بڑا غنیمت تھا۔ورنہ جو فارحہ نے سوچا تھا، وہ اس طرح اپنی ماں کو بات نہ سمجھا سکتی تھی۔جمال نے اسے طلاق دی تھی اور طلاق کے بعد اسے ابھی عدت گذارنا تھی۔ یہ وقت گذرنے کے بعد ہی اس کا نکاح ہو سکتا تھا۔فارحہ کو یہ وقت گذارنا تھا۔جس طرح اس نے اپنے نکاح کے بارے میں نہیں بتایا تھا، اسی طرح وہ اپنے عدت کے ان دنوں کو بھی چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔اس راز کو وہ راز ہی رکھنا چاہتی تھی۔اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا، اگر اس کے ہونٹوں سے بات نکل گئی تو پھر وہ راز نہیں رہے گا۔اسے اگر دنیا کی باتیں نہیں سنی، ساری زندگی کے لئے خود کو محفوظ رکھنا ہے تو اسے یہ سب راز ہی رکھنا تھا۔سو اس نے سوچ لیا تھا کہ یہ وقت کس طرح گزارنا ہے۔اسی لئے فارحہ ناشتے کے بعد اپنی اماں کے پاس بیٹھی ہوئی اسے یہ بات سمجھا رہی تھی کہ چند دن کے مزید کام کے بعد اسے اب تک کی ساری محنت کا معاوضہ مل جانے والا ہے۔

"نہ یہاں گھر میں رہ کر کیسے کر سکتی ہے کام؟" اماں نے پوچھا تو اس نے سمجھاتے ہوئے کہا

"یہ میرے پاس لیپ ٹاپ ہے، وہاں پر ابھی جو لوگ ہیں، میں ان کے ساتھ مل کر اس کام کو ختم کر لوں گی۔ میں یہ سب طے کر کے آئی ہوں ان کے ساتھ، یہ میرے لئے مشکل نہیں ہے۔"

"لیکن ہمارے لئے تو ہے نا مشکل، ہم تمہاری شادی کا سوچ رہے ہیں، انہی ایک دو ہفتوں میں۔" اماں نے اپنی رُو میں وہ بات کہہ دی جس کے بارے میں اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ پوری جان سے لرز گئی۔ اگر ان لوگوں نے زبردستی یہ سب کر دیا تو وہ کیا کرے گی؟ وہ عدت میں کیسے شادی کر سکتی ہے؟ یہ سوالیہ نشان اسے پاگل کر دینے کے لئے کافی تھا۔

"بولتی کیوں نہیں ہو، کیا سانپ سونگھ گیا تمہیں؟" اماں کی تیز آواز اسے حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔

''اماں یہ کیا کہہ رہی ہو۔ابھی مجھے یہ کام مکمل کرنے دو، شادی بھی ہو جائے گی، میں بھاگی جارہی ہوں کہیں۔'' اس نے تلخی سے کہا، فطری طور پر اس کی آواز میں تلخی در آئی تھی۔اس سے پہلے کہ اماں مزید بات کرتی وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔وہ سوچنا چاہتی تھی کہ اب اس مسئلے کا حل کیا ہو سکتا ہے ۔اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔اچانک افتاد سے انسان کی سوچیں تک سلب ہو جاتی ہیں۔

یہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ طلاق کے بعد عدت ہوتی ہے۔ جب تک عدت کے دن پورے نہیں ہو جاتے، تب تک وہ دوسرا نکاح نہیں کر سکتی تھی۔فارحہ نے سوچا تھا، دو تین ماہ گزر ہی جائیں گے شادی کو۔وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اتنی رقم آ جانے پر اماں نے جو اسے گھر بلا لیا تھا، یہ اس کی فطری محبت تھی۔مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ گھر آتے ہی شادی رکھ دی جائے گی۔وہ بھی اتنی افراتفری میں۔فارحہ کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ اس نے عدت کے دن گذارنے تھے،اس کے بعد ہی وہ سہیل کے ساتھ شادی کر سکتی تھی۔وہ جس طرح اس مسئلے پر سوچتی جا رہی تھی، کئی سوال اٹھنے لگے تھے۔ اسے ان سوالوں پر بہر حال سوچنا تھا۔

پہلا سوال یہی تھا کہ وہ اپنے نکاح کے بارے میں گھر والوں کو بتائے یا نہیں؟ دوسرا اس کی عدت کتنی ہے؟ کتنے عرصے تک اسے رُکنا پڑے گا؟ اگر ماموں نے جلدی کا شور مچا دیا تو وہ کیا کرے گی؟ جتنا اس نے جمال کے ساتھ نکاح کرنا آسان سمجھا تھا، اب اسے بھی زیادہ گھمبیر صورت حال اس کے لئے پیدا ہو گئی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اس کا دماغ دُکھنے لگا تھا۔کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکے۔وہ انہی سوچوں میں تھی کہ محسن نے ماموں اور سہیل کے آنے کی اطلاع دی۔ اس لئے اماں اور ابا بلا رہے ہیں۔ ناچار اسے صحن میں جانا پڑا۔بلاشبہ اس کا امتحان شروع ہو چکا تھا۔

ماموں ارسلان کافی بوڑھے دکھائی دے رہے تھے، جبکہ ان کا بیٹا کافی وجیہ نوجوان تھا۔شکل صورت سے تو وہ اچھا ہی تھا، دراز قد اور کافی مضبوط جسم کا مالک ہونے کے ساتھ پہلی نگاہ میں اچھا تاثر دینے والا تھا۔فارحہ نے سلام کیا ،ماموں اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے ، اور بڑی خوشی سے بولے

''ارے واہ ، میری بیٹی اتنی بڑی ہو گئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے فارحہ کے سر پر ہاتھ پھیرا ،اور دعائیں دینے لگے،اس نے اپنے کزن کو بھی سلام کی اور وہیں بیٹھ گئی ۔ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے اس کی جاب کے بارے میں پوچھا۔ وہ بتاتی رہی ۔ بلکہ یہی زور دیا کہ کچھ عرصہ تک انہیں کام مکمل کر کے دینا ہو گا۔تبھی ماموں نے کہا

''بس بیٹا۔! اب کام کرنے کی ضرورت نہیں۔انہیں کہو وہ اپنا کام خود ہی مکمل کروالیں۔''

''نہیں ماموں، میں نے انہیں بانڈ دیا ہے، وہ مجھے کرنا ہو گا۔'' اس نے جھوٹ بول دیا

''یہی ہیں نا وہ تمہارے پیسے نہیں دیں گے ،کوئی بات نہیں، چھوڑو بس۔'' انہوں نے بے پرواہی سے کہا

''نہیں ماموں ، مجھے کرنا ہو گا۔اب مجھے تو پتہ نہیں تھا کہ حالات یہ ہو جائیں گے ۔خیر میں جلد ہی اسے سمیٹ لوں گی۔'' اس نے بحث سے بچنے کے لئے تیزی سے کہا

''او کے، چلو دیکھتے ہیں۔'' ماموں نے بھی وقتی طور پر بات ختم کر دی۔ وہ کچھ دیر بیٹھی اور پھر چائے بنانے کا بہانہ بنا کر اٹھ گئی۔



فارحہ ساری رات نہیں سو پائی تھی۔ اسے پورا ایک ہفتہ لگا۔اس دوران اس نے یہ معلومات لے لی تھیں کہ اسے اپنی عدت کے تقریباً تین ماہ دس دن گزارنا ہوں گے ۔ پھر اس کے بعد وہ شادی کر سکتی ہے۔ان معلومات میں بہت ساری باتیں سامنے آئی تھیں لیکن اس نے اپنے لئے اور اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے اس بات کو ترجیح دی کہ چاہے رخصتی نہیں ہوئی ،اور میاں بیوی نے ازدواجی وقت نہیں گزارا لیکن انہیں خلوت میں رہنے کا وقت مل گیا تھا۔ لہذا اس کی عدت ہے اور اسی پر اس نے صاد کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خاموشی سے اپنی عدت پوری کرے گی ۔ پہلے تو وہ پوری کوشش کرے گی کہ کسی کو بتائے بغیر یہ مدت پوری کر لے ، بہت ضروری ہوا تو بتا دے گی ۔ اگر کسی بھی

طرح اس کی شادی سہیل سے نہیں ہوئی تو کوئی بات نہیں، اسے اپنا ایمان زیادہ عزیز تھا۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے اس نے خود میں کہیں زیادہ اعتماد محسوس کیا۔

اس ایک ہفتے میں اس کے دماغ میں یہ بات بھی گھومنے لگی کہ ماموں ارسلان اچانک اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہاں بسنے کیوں آ گئے تھے؟ اور اگر کسی بھی وجہ سے یہاں آ بھی گئے تھے تو انہی پر اتنی مہربانیاں کیوں ہونے لگیں کہ پیسہ پانی کی طرح ان پر بہایا جانے لگا تھا؟ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور رہی ہوگی ورنہ صرف بہن کی محبت اتنا جوش نہیں مارتی، جو کچھ بھی تھا، ان آئندہ آنے والے دنوں میں کھلنے والا تھا۔ یہ اطمینان کر لینا بھی تو اس کا حق تھا۔

دوسرے ہفتے میں فارحہ کا کام مکمل ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس نے جمال احمد کے ساتھ مل کر رپورٹ بھی تیار کر لی۔ وہ اس کے ساتھ آن لائین رہا تھا۔ اب وہ رپورٹ جمع بھی ہونی تھی۔ جمال احمد وہاں سے سب کچھ کلوز کر کے نکل گیا تھا۔ اب ایک دن کے لئے اسے ہیڈ آفس جانا تھا۔ تاکہ نہ صرف اپنا کام دے دے بلکہ ریزائن بھی کر دے۔ اس شام جمال احمد نے اسے بتا دیا کہ وہ کل ہیڈ آفس جا رہا ہے، وہ بھی آ جائے۔ یہ بات جب اس نے اپنی اماں کو بتائی تو اس نے حیرت سے پوچھا

''کیوں جا رہی ہو؟''

''میں ریزائن دینے جا رہی ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا

''ارے جب نوکری چھوڑ دی تو بس چھوڑ دی۔'' اس کی اماں کی سمجھ میں بات نہیں آ رہی تھی۔ تبھی اس کے ابا نے کہا

''نہیں اسے جانا پڑے گا۔ جانے دو۔''

''کاہے کو؟'' اماں نے پوچھا

''تمہیں نہیں پتہ، جب بندہ نوکری کرتا ہے تو یوں چھوڑ کر نہیں بیٹھ جاتا، سو معاملات ہوتے ہیں۔ ورنہ کہیں لینے کے دینے ہی نہ پڑ جائیں نیک بخت، سمجھا کرو کچھ۔'' اس کے ابا نے کہا

''ٹھیک ہے، اب میں کیا کہوں۔'' اس کی اماں نے گویا ہتھیار ہی پھینک دیئے۔ ورنہ تو جب سے ماموں نے آ کر اپنا پیار جتایا تھا، اماں کے رویے میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ بعض اوقات وہ ابا سے بھی سخت بات کر جایا کرتی تھی۔

اگلے دن دوپہر سے پہلے وہ ہیڈ آفس جا پہنچی۔ جمال اس کا انتظار کر رہا تھا۔ فارحہ کی جیسے ہی اس پر نگاہ پڑی تو اس کے من میں دکھ کی لہر پھیل گئی۔ ایک انجان احساس اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا۔ یہی وہ شخص تھا، جسے وہ اپنا کہہ سکتی تھی، جو کبھی اس کا اپنا تھا، اب اس کا نہیں رہا تھا۔ کھو دینے کا احساس اذیت دینے لگا۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی کیفیت کو جان گیا، اس لئے بڑے نرم لہجے میں بولا

''خود پر قابو رکھو فارحہ، خواب بھول جایا کرتے ہیں، وہ یاد رکھنے کے نہیں ہوتے۔''

''لوگ خوابوں کو حقیقت بناتے ہیں اور تم حقیقت کو خواب بنا دینا چاہتے ہو؟'' وہ دُکھ بھرے لہجے میں یوں بولی جیسے اس کے لفظ آنسوؤں سے بھیگ گئے ہوں۔

''میں اگر حالات پر قابو رکھ سکتا تو کبھی خواب نہ بننے دیتا۔'' جمال نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے تاسف سے کہا تو وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ وہ خود پر قابو پانے لگی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو اس کا راز کھول دیں۔ وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ پھر جتنی دیر تک وہ وہاں رہی، اس نے کوشش کی کہ جمال سے دوبارہ سامنا نہ ہو۔

دوپہر کے بعد جب وہ ہیڈ آفس سے لوٹی سے اس کے دل پر بوجھ تھا۔ کھو دینے کا احساس اسے بے چین کر رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ وقت کو کیسے واپس لے آئے۔ جمال سے شادی کرنے اور پھر طلاق لے لینے کے دونوں فیصلے جلد بازی میں کئے گئے تھے۔ اس کا من رُونے کو چاہ رہا تھا لیکن بیچ سڑک میں وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ جمال نے سچ ہی کہا تھا اب اسے خواب سمجھ کر بھولنا ہی ہوگا۔

اسی شام جب وہ کھل کر رُو چکی تھی۔ من کا بوجھ کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ وہ کھلی فضا میں جانا چاہتی تھی۔ اس کا چھوٹا سا گھر ایسا نہیں تھا کہ جس میں کوئی کاریڈور ہوتا اور وہ وہاں بیٹھ جاتی، کوئی بالکنی ہوتی، زیادہ سے زیادہ چھت تھی، جہاں وہ کچھ دیر سکون سے بیٹھ سکتی تھی۔ اس نے صحن میں بیٹھی اماں کو دیکھا، دو کپ چائے بنائی، ایک کپ اسے

دیا اور چھت پر چلی گئی۔ ابھی اس کا کپ ختم نہیں ہوا تھا کہ چھت پر اپنے لندن پلٹ کزن سہیل کو دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئی، پھر خود میں سمٹ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ اماں کی رضامندی کے بنا یہاں نہیں آیا، ورنہ اسے کیا الہام تھا وہ کہاں پر ہے؟ علیک سلیک کے بعد فارحہ ہی نے اس سے پوچھا

''سہیل بھائی، چائے پئیں گے؟ لاؤں بنا کے آپ کے لئے؟'' اس نے جان بوجھ کر ایسا کہا تھا، جس کا ردعمل اس نے اگلے ہی لمحے دیکھ لیا۔ سہیل نے دھیمی سی مسکان کے ساتھ کہا

''نہیں میں نے چائے نہیں پینی، میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر بولا ''اور یہ تمہیں بھی پتہ ہے کہ جلدی ہی ہماری شادی ہونے والی، اس لئے تم مجھے صرف سہیل کہہ سکتی ہو۔''

''شادی سے پہلے تو سارے......'' اس نے کہنا چاہا لیکن سہیل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

''اب تمہیں پتہ چل گیا ہے نا، اس لئے۔''

''اوکے، آپ کچھ باتیں کرنا چاہ رہے تھے؟'' فارحہ نے پوچھا

''یہاں کہاں ماحول ہے، میں چاہتا ہوں کسی پرسکون سی جگہ پر باتیں کی جائیں، یہ کوئی ماحول تو نہیں ہے۔'' اس نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا

''وہ ماحول کیسا ہونا چاہئے؟'' اس بار فارحہ نے بھی یونہی چھیڑنے کے لئے کہہ دیا۔

''کوئی پارک، کوئی اچھا سا ریستوران، یا کوئی لانگ ڈرائیو، کہیں بھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ فوراً مان جائے گی۔

''ٹھیک ہے، میں اماں سے پوچھ لوں گی، آپ بتا دیجئے گا، جب جانا ہو۔'' اس نے دھیمی سی آواز میں کہا

''ہاں ہاں، کیوں نہیں، ہم نے بتائے بنا تھوڑا جانا ہے، ہم اپنے ہی گھر والوں سے کیا چھپائیں گے، کہو تو ابھی پوچھ لوں؟'' اس نے اعتماد سے پوچھا

''جیسے آپ کی مرضی، لیکن میرے خیال میں یوں رات کو گھر سے باہر رہنا اچھا تو نہیں ہے نا۔ ابھی نکلے تو رات ہو جاتی ہے۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا

''چلو اوکے ڈن، کل دوپہر کو سہی، میں فون کر دوں گا۔'' اس نے کہا اور لاپرواہی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ فارحہ کو یہاں گھٹن محسوس ہونے لگی۔ اس نے تیزی سے کہا

''نیچے چلیں سہیل بھائی، میرا مطلب سہیل صاحب۔'' اس نے کہتے کہتے جلدی سے تصیح کر ڈالی، جس پر سہیل یوں مسکرا دیا جیسے اس نے کوئی فتح حاصل کر لی ہو۔ اس نے کندھے اُچکاتے ہوئے نیچے جانے کا یوں اشارہ کیا جیسے اسے اجازت دے رہا ہو۔ وہ تیزی سے نیچے جانے کے لئے بڑھ گئی۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے اس کے ذہن میں تھا کہ یہ تو ابھی سے حکمرانی کا حق جتانے لگا ہے۔

اگلے دن ابھی دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی کہ سہیل کی کال آ گئی۔ وہی لہجہ، وہی انداز حکمرانی والا،

''تیار ہو جاؤ، میں لینے کے لیے آ رہا ہوں۔''

''لیکن میں نے تو ابھی اماں سے پوچھا ہی نہیں۔'' فارحہ نے جلدی سے بتایا

''میں نے پوچھ لیا ہے۔ بس تم انہیں بتا دو کہ میرے ساتھ جا رہی ہو۔'' سہیل نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر ہوا بھی وہی، اماں نے اسے کوئی تبصرہ کئے بغیر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اماں کی مرضی ہی نہیں وہ چاہتی ہی ایسا ہیں۔ فارحہ اگر کہیں مخالفت کر بیٹھی تو اس کا انجام اماں کی شدید مخالفت کی صورت بھگتنا پڑے گا۔ بلاشبہ ایسی صورت میں تو اس نے جو اپنی عدت کے دن گذارنے ہیں وہ ناممکن ہو جائیں گے؟ عدّت سے پہلے شادی سے وہ کس طرح بچ پائے گی؟ یہ ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ سہیل کے ساتھ کار میں بیٹھی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ اس کے دماغ میں جو مہیب مسئلہ چل رہا تھا، وہ خود اس سے خوف زدہ تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ سہیل نے یونہی سرسری سی باتیں کی، جس کا جواب اس نے ہوں ہاں میں دیا تھا، پھر اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ ان کے سفر کا اختتام ایک پارک میں ہوا، جہاں دن کے وقت اتنی رونق نہیں ہوتی تھی۔ وہ وہاں سکون سے بیٹھ کر بات کر سکتے

تھے۔ وہ دونوں لکڑی کے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

"دیکھو فارحہ۔! شادی کوئی گڈے گڈی کا کھیل تو ہے نہیں، میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تمہاری اور میری شادی ہو جاتی ہے تو کیا تم اس رشتے پر خوش ہو؟" سہیل نے سیدھے ہی سوال کرڈالا

"ظاہر ہے لڑکے اور لڑکی کی رضامندی کے بغیر شادی تو ہوتی ہی نہیں ہے۔ میں ایک لڑکی ہوں، میرے والدین نے میری کہیں تو شادی کرنی ہے ۔ وہ بہتر سمجھتے ہیں۔" وہ پرسکون لہجے میں اعتماد سے بولی

"مطلب، والدین کی رضامندی سے وہ جہاں کہیں بھی کر دیں؟" اس نے پوچھا

"وہ میرے لئے اچھا ہی سوچیں گے۔" وہ بولی

"دیکھو، میں ایک کھلے ذہن کا بندہ ہوں ۔ میں نے بہت سارا وقت فارن میں گزارا ہے۔ شادی کے بعد میں کوئی ٹینشن نہیں لینا چاہتا، ایک بہتر زندگی گذارنا چاہتا ہوں۔" سہیل نے کہا تو فارحہ کے دماغ میں الارم بج گیا۔ یہی وہ بات ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے اس لئے سکون سے پوچھا

"سبھی بہتر زندگی گذارنا چاہتے ہیں، اور آپ کی ٹینشن میں سمجھی نہیں؟"

"تمہاری کوئی پسند ہے؟ تم کسی اور کو چاہتی ہو تو میں تم پر مسلط نہیں ہوں گا۔ خاموشی سے کسی دوسری لڑکی سے شادی کرلوں گا۔ ایسا نہ ہوناکہ......"

"ایسا کچھ بھی نہیں سہیل صاحب جو آپ سوچ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر بولی، "آپ کے ذہن میں اگر کوئی اور سوال بھی ہے تو کرلیں۔"

"نہیں کوئی خاص نہیں، بس یہی ایک بات تھی کیونکہ میں نے تمہارا رویہ دیکھا، جس میں کوئی گرم جوشی نہیں ہے۔" سہیل کے یوں کہنے پر وہ بہت کچھ کہہ سکتی تھی، وہ سارے سوال کرسکتی تھی جو اس کے دماغ میں آئے تھے لیکن وہ خاموش رہی۔ تب وہ اپنی باہر گزاری ہوئی زندگی کے بارے میں بتانے لگا، وہ خاموشی سے سنتی رہی، یہاں تک کہ اس نے کہا، "میں چاہتا ہوں کہ شادی سے پہلے اپنا گھر ایک دم سیٹ ہو جائے، تم اس میں دلچسپی لو، اور اپنے انداز میں اسے سجاؤ۔ جیسے ایک گھر کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں کوشش کرتی ہوں۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا تو سہیل نے اٹھتے ہوئے کہا

"اب بتاؤ، شہر میں تمہاری پسند کا ریستوران کون سا ہے، وہیں لنچ لیتے ہیں۔"

"میں کسی بڑے ریستوران کو نہیں جانتی، میں کبھی گئی نہیں وہاں پر۔" فارحہ صاف مکر گئی۔ یہ ایک طرح سے سچ بھی تھا لیکن اس نے جو مسکراہٹ سہیل کے لبوں پر دیکھی، اس پر وہ حیران رہ گئی۔ ایسی مسکراہٹ، جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی، شاید طنزیہ، شاید اس کی غربت کا مذاق یا پھر اس کے لاعلم ہونے پر افسوس۔ جو کچھ بھی تھا، اس مسکراہٹ میں ایک تکبر ضرور تھا۔

"چلو آؤ، میں بتاتا ہوں۔" اس نے کہا اور اٹھ گیا ۔ فارحہ کو بھی اس کے ساتھ اٹھنا پڑا۔

☆......☆......☆

فارحہ کی حالت بالکل پاگلوں جیسی ہوگئی تھی۔ دن کا سکون اور راتوں کی نیند اُڑ گئی تھی۔ اسے سہیل سے کوئی مسئلہ نہیں تھا، اور وہ اس کے بارے میں ابھی کچھ بھی سوچنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اسے اگر فکر تھی تو اپنی عدت کی۔ اس کی عدت کو ابھی چار ہفتے ہی گذرے تھے۔ محض تیس دن، اور ابھی ستر دن باقی تھے۔ وہ چکرا کر رہ گئی تھی کہ اگر اس کی شادی کا مطالبہ یونہی جاری رہا تھا تو باقی دن کیسے پورے کر پائے گی ؟ کیا وہ سب کچھ سچ سچ بتا دے؟ یہ ایک ایسا خوفناک سوال تھا، جس کے بارے میں وہ جتنا سوچتی، نہ صرف اتنا اُلجھتی، بلکہ خوف زدہ ہو جاتی۔

سب سے پہلے اسے اپنے گھر والوں کی ہی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کی ماں کی نگاہوں میں جو تھوڑی بہت عزت تھی، وہ بالکل ختم ہو کر رہ جاتی۔ اس کے بھائی کے لئے وہ تیسرے درجے کی ایک آوارہ لڑکی بن جاتی، اور باپ سوائے نفرت کرنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ شاید ان لوگوں کی نفرت برداشت کرلیتی لیکن یہی بات جب گھر سے نکل کر ارد گرد کے لوگوں کے کانوں تک پہنچتی تو نجانے کیا کیا افسانے بن جاتے، ہر کوئی اپنے مطلب کی نئی نئی تعبیریں نکالتا۔ یہاں تو کچھ نہ ہونے سے بہت کچھ بن جاتا

ہے، وہ تو پھر اس کا نکاح تھا۔ اس کا یقین کون کرتا؟ وہ جب سوچتی تو لرز کر رہ جاتی۔

ہر آنے والے دن کے ساتھ فارحہ کی پریشانی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ کیونکہ ہر نئی صبح سے ہی اس کی شادی کی بات ہونا شروع ہو جاتی تھی۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جہاں وہ پریشانی میں سوچتی وہیں اسے ماورا کا خیال آتا کہ اس سے مدد لے، ممکن ہے وہ کوئی ایسا مشورہ دے سکے، جس سے کم از کم یہ ستر دن نکل جائیں۔ پچھلے تین دن سے وہ اسے سیل فون پر پیغام دے رہی تھی لیکن اس کا کوئی جواب ہی نہیں آیا تھا۔

پریشانی کے ان دنوں میں وہ محسوس کر رہی تھی کہ جیسے اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ وہ جو بھی سوچتی اسے ہر طرف سے دروازہ بند دکھائی دیتا تھا۔ تب اسے لگا کہ جمال کے ساتھ شادی کا جوائیڈ دنچر تھا، وہ اس کی زندگی تباہ کر دینے والا تھا۔

وہ مایوسی بھری کھردری دوپہر تھی۔ وہ اپنے کمرے میں پڑی اپنی پریشانی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اسی دن سہیل بھی آ گیا۔ وہ نئے گھر کے لئے آرکیٹیکچر سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فارحہ بھی اس کے ساتھ چلے تاکہ گھر کا نقشہ بنانے میں اس کی بھی رائے شامل ہو۔ اماں تو سہیل کی اس بات پر نہال ہو گئی۔ اس نے فارحہ کو زبردستی تیار کر کے بھیج دیا۔ وہ گھومتے ہوئے دماغ کے ساتھ اس کے ساتھ چل دی۔ وہ کافی دیر آرکیٹیکچر کے پاس بیٹھ کر اسے نئے گھر کے نقشے کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ سنتی رہی اور ہوں ہاں میں مشورہ دیتی رہی۔ تقریباً تین گھنٹے کی مغز ماری کے بعد وہ آرکیٹیکچر کے آفس سے نکلے تو سہیل نے کہا

''آؤ فارحہ، کسی نئے ریسٹوران لیں چلیں۔''

''میری طبیعت خراب ہو رہی ہے سہیل، ہم گھر نہ چلیں۔'' فارحہ نے کہا تو سہیل نے طنزیہ انداز میں پوچھا

''اگر طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے تو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں اور اگر میرا ساتھ پسند نہ ہونے کی وجہ ہے تو گھر واپس جاتے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات، بس ایویں دل گھبرا رہا ہے۔'' اس نے ایک دم سے ابھر آنے والے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا تو سہیل دھیرے سے ہنس دیا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا

''اچھا کھانا کھاؤ گی نا، تھوڑا ماحول بدلے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ ایک مہنگے ریسٹوران میں آ بیٹھے جہاں واقعی ہی خوشگوار فضا تھی۔ اس نے چند طویل سانس لئے اور سکون سے بیٹھ گئی۔ اس کے سوا چارا بھی نہیں تھا۔

اس وقت وہ کھانا کھا چکے تھے۔ سہیل اٹھ کر واش کی جانب گیا ہی تھا کہ فارحہ کا سیل فون بج اٹھا۔ کوئی انجان نمبر تھا۔ اس نے کال رسیو کی تو دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز ابھری

''میں ارباز بات کر رہا ہوں، آپ فارحہ ہیں نا؟

''جی ہاں، میں ہی ہوں، کیسے ہیں آپ؟'' اس نے بے دلی سے پوچھا تو وہ بولا

''میری ماورا سے ابھی بات ہوئی ہے، وہ کہہ رہی ہے آپ کو کوئی پرابلم ہے، بولیں، کیا پرابلم ہے، میں کوشش کرتا ہوں اسے حل کرنے کی۔''

''میں اس طرح فون پر کیا بتاؤں آپ کو بات؟'' اس نے گھبراتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا تو ارباز نے سکون سے کہا

''اگر آپ اس وقت نہیں بتا پا رہی ہیں تو کوئی بات نہیں، ویسے تھوڑ بہت تو ماورا نے مجھے بتا دیا ہے، مگر مجھے تفصیل سے نہیں پتہ۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں مجھے بتا دیں۔ میرے آفس آ جائیں، یا جہاں آپ کہو، میں آ جاتا ہوں۔''

''میں آپ کو فون پر ہی بتا دیتی لیکن ابھی نہیں کچھ دیر بعد، ابھی میں......'' اس نے کہنا چاہا تو وہ جلدی سے بات کاٹتے ہوئے بولا

''اوکے اوکے، آپ جب چاہیں مجھے فون کر لیں اسی نمبر پر۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے سہیل کو واپس آتا ہوا دیکھ لیا تھا۔

وہ واپس گھر آ گئی تو کچھ دیر سکون کر لینے کے بعد اس نے ارباز کو فون کر دیا۔ اس نے فوراً ہی کال رسیو کر لی۔

''سوری ارباز، میں اس وقت اپنے سو کالڈ منگیتر کے

ساتھ تھی، جس کے سامنے میں بات نہیں کرسکتی تھی۔''

''اوہ اچھا، میں نے آپ کو ریستوران ہی میں دیکھا تھا، اچھا تو اس بندے کے ساتھ آپ کی شادی ہونے والی ہے؟'' ارباز نے انتہائی دلچسپی سے پوچھا تو وہ بولی

''ہاں، وہی ہے میرا کزن اور میں نہیں چاہتی اس سے میری شادی نہ ہو، بس تھوڑے عرصے کے لئے شادی رک جائے۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے پوچھا تو فارحہ نے ساری تفصیل بیان کردی۔ وہ سنتا رہا اور جہاں اسے سمجھ نہیں آتی تھی، وہاں سے سوال کرکے پوچھ لیتا۔ ساری بات سن اور سمجھ لینے کے بعد اس نے کہا

''معاملہ خاصا گھمبیر ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل بھی ہے، لیکن میں سوچتا ہوں۔ ایک دو دن میں ہی بتاتا ہوں، کوئی حل نکال کے۔ لیکن اب آپ بالکل فکر نہ کریں، کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔''

فارحہ اپنی پریشانی شیئر کرکے کافی حد تک مطمئن ہو گئی۔ اس نے شکریہ ادا کرکے فون بند کردیا۔ وقتی طور پر اسے تھوڑا حوصلہ ہوا تھا۔

تیسرا دن بھی گزر گیا لیکن ارباز کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ پریشان ہوگئی۔ اس کی گھبراہٹ اس لئے بھی بڑھ گئی کہ کون دوسروں کے معاملے میں آتا۔ اسی دوپہر ارباز کا فون آگیا۔ اس نے فارحہ کو اپنے آفس بلایا تھا۔ اگلا دن کا وقت طے ہوگیا تو اسے بڑا سکون محسوس ہوا، اسے لگا کہ اس کی بہت بڑی پریشانی حل ہوجانے والی ہے۔

اگلے دن فارحہ اس کے آفس جا پہنچی۔ ارباز بڑے تپاک سے ملا۔ اس نے چند رسمی باتوں کے بعد اس سے کہا

''میں نے آپ کے معاملے میں بہت سوچا، بہت سارے آپشن ذہن میں آئے، مثلاً ایک یہ کہ آپ بیمار بن جاؤ، طبیعت خرابی کا بہانہ بنالو، مگر کتنے دن؟ یہ بات سامنے آ ہی جائے گی کہ آپ بہانہ بنارہی ہو۔''

''ہاں، میں نے بھی سوچا تھا، لیکن یہ ممکن نہیں، اس میں دوائیں الگ سے کھانی پڑیں گی۔ اگر کوئی اوٹ پٹانگ کھالی تو کہیں......'' اس نے خوفزدہ سے انداز میں کہا تو ارباز اس کی بات قطع کرتے ہوئے بولا

''میں نے اس کا ایک بہترین حل نکالا ہے، اس میں آپ پینسٹھ دن کیا، چار ماہ بھی نکال سکتی ہیں۔''

''ایسا کیا حل ہے؟'' اس نے تجسس سے پوچھا

''اس میں آپ کو تھوڑا سا تعاون کرنا پڑے گا، وہ تعاون ہوگا صرف خاموش، نہ آپ انکار کریں گی اور نہ اقرار۔'' ارباز نے مسکراتے ہوئے کہا

''ایسا کیا، مجھے بتائیں تو سہی؟'' اس نے جلدی سے پوچھا

''ہوگا یہ کہ میں، بذات خود اپنی امی کے ساتھ آپ کے گھر میں اپنا رشتہ لے کر جاؤں گا۔'' وہ سکون سے بولا

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، یہ تو......؟'' وہ حیرت سے بولی

''سنیں آپ۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا پھر بولا ''ظاہر ہے آپ کے گھر والے انکار ہی نہیں کریں گے بلکہ ہماری بے عزتی بھی کرسکتے ہیں۔ میں وہاں جو بھی اول فول بکوں، مثلاً میں یونیورسٹی ہی سے آپ سے محبت کرتا رہا ہوں، میں آپ کے ساتھ شادی کئے بغیر نہیں رہ سکتا، فارحہ میری خاموش محبت ہے، وغیرہ وغیرہ اس پر آپ نے نہ انکار کرنا ہے اور نہ اقرار۔ یہ آپ کے گھر والوں کے لئے ایک نئی افتاد تو ہوگی۔ اسی میں آپ کے جو باقی پینسٹھ دن ہیں وہ نکل جائیں گے۔ میں ہار مان کر پیچھے ہٹ جاؤں گا اور آپ شادی کرلینا۔'' اس نے فارحہ کو اپنا پلان سمجھاتے ہوئے کہا۔

فارحہ یہ سب سن کر ایک دفعہ تو لرز گئی۔ یہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ وہ احمقوں کی مانند ارباز کو دیکھتے ہوئے بولی

''یہ سب کیسے ہوگا؟ کہیں ہم مزید مشکل میں نہ پھنس جائیں۔''

اس پر ارباز نے مسکراتے ہوئے بڑے تحمل سے سمجھانے والے انداز میں کہا

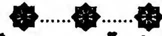
''کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس آپ نے نہ اقرار کرنا ہے اور نہ انکار، آپ پر بات آئے گی ہی نہیں۔ سب کچھ تو میں کروں گا، سو جو بات بھی ہوگی، میں ہی اس کا سامنا کروں گا، گویا آپ کو میرے بارے میں پتہ ہی نہیں کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ بس آپ کو اتنا پتہ ہے کہ میں یونیورسٹی

میں پڑھتا تھا، وہیں دیکھا تھا مجھے اور بس اس کے علاوہ کچھ پتہ نہیں، یہ بھی نہیں معلوم کہ میں کس شعبے میں پڑھتا تھا، کیا نام ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"آپ اتنا کچھ کیسے کرلیں گے؟" فارحہ نے دھیمی آواز میں پوچھا

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جانوں اور میرا کام، بس آپ کی اجازت ہو تو میں یہ سب کر گزروں گا۔" اس نے تحمل سے سمجھایا

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا تو ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو ارباز نے ایک طویل سانس لے کر کرسی سے پشت لگالی۔ اسی دوران ایک ملازم چائے کے ساتھ لوازمات رکھنے لگا۔ چائے پینے کے ساتھ وہ اسے بہت ساری مزید باتیں سمجھاتا رہا۔



وہ ایک خوشگوار صبح تھی۔ فارحہ نے گھر سارے کام سمیٹ لئے تھے۔ وہ فریش ہو کر اپنے کمرے میں بیٹھی ایک میگزین پڑھ رہی تھی۔ اس کی اماں اور ابا صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس دن ماموں بھی آیا ہوا تھا۔ ان کے درمیان ایسے ہی باتیں چل رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ابا نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ان کے محلے ہی کی ایک خاتون کے ساتھ دو اجنبی خواتین تھیں۔ ان خواتین کے لباس اور زیوارت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی امیر خاندان کی خواتین ہیں۔ ابا نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا تو وہ تینوں صحن میں آگئیں۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد محلے دار خاتون نے نووارد خواتین کا تعارف کراتے ہوئے کہا

"یہ مسز ظفر کیانی ہیں۔ اور یہ ساتھ میں ان کی بھابی ہیں۔ یہ ادھر میرے میکے میں ہمارے ہی قریب رہتے تھے۔ ان سے بڑا اچھا تعلق ہے۔ اب تو انہوں نے ماشاءاللہ پوش علاقے میں بنگلہ بنالیا ہے۔ یہ سب ادھر رہتے ہیں۔ بہت اچھا بزنس ہے ان کا۔ یہ آپ سب سے ملنا چاہ رہی تھیں۔"

"بہت خوشی ہوئی جی آپ سے مل کر۔ کیا ہم جان سکتے ہیں کہ آپ کس سلسلے میں ہم سے ملنے آئی ہیں۔" اماں نے ان سے مرعوب ہوتے ہوئے اپنا لہجہ حتی الامکان اچھا بناتے ہوئے پوچھا

"دیکھیں جی، بات تو ہم کرنے آئے ہیں، اور کریں گے بھی، لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں، جنہیں بہت تحمل سے کرنا پڑتا ہے اور انہیں تحمل ہی سے سننا پڑتا ہے۔ چونکہ ہماری پہلی ملاقات ہے سو کہتے ہوئے ذرا عجیب سا لگ رہا ہے۔" مسز ظفر نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سکون سے کہا

"نہیں آپ بات کریں۔ لیکن خیر، پہلے بتائیں ٹھنڈا یا چائے پئیں گی آپ۔" بات کرتے کرتے اماں کو یاد آیا تو اس نے پوچھا

"نہیں، اس کی ضرورت قطعاً نہیں ہے۔ ان کے گھر سے ابھی چائے پی ہے، آپ کے ہاں آئے ہیں تو مہمان داری بھی ہوتی رہے گی۔" مسز ظفر نے اسی سکون سے کہا۔

"بتائیں ہم کیا خدمت کر سکتے ہیں، کیا بات کرنی ہے آپ نے؟" اماں کی بجائے اس بار ماموں نے پوچھ لیا

"دیکھیں بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں، اس میں کوئی دورائے نہیں ہیں۔ ہمیں آپ کی بیٹی فارحہ میں دلچسپی ہے۔ ہم اسے اپنی بیٹی بنانا چاہتے ہیں۔" مسز ظفر نے کہا تو بالکل پرسکون لہجے میں لیکن لفظ تھے کہ سامنے بیٹھے، اماں، ابا اور ماموں کو حیرت زدہ کر گئے۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" اماں نے حیرت سے ششدر ہوتے ہوئے پوچھا تو مسز ظفر نے کہا

"وہی جو آپ نے سنا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکیں اور پھر بولیں۔ "آپ ہمارے بارے میں ہمارے بزنس کے بارے میں، ہماری پراپرٹی کے بارے، جو چاہیں اور جیسا چاہیں، معلومات لیں۔ ہمارے ساتھ تعلق جوڑ کر بہت خوشی محسوس کریں گے اور فارحہ بیٹی ہمارے ہاں پھولوں کی مانند رہے گی۔"

"دیکھیں بہن، فارحہ کی نہ صرف منگنی ہو چکی ہے، بلکہ ہم ایک آدھ ہفتے میں اس کی شادی بھی کر رہے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آپ نے ہمارے گھر کا رخ کیسے کیا لیکن ہم معذرت خواہ ہیں۔" اماں نے بڑے نپے تلے لفظوں میں انکار کر دیا۔ دراصل وہ ان خواتین کے مہنگے لباس اور زیورات سے مرعوب ہو چکی تھی۔

"ہم یوں ہی نہیں آگئے یہاں پر۔ ہمارا بیٹا، جس کے لئے رشتوں کی قطار لگی ہوئی ہے، اور ہم جس بڑے گھر میں

بھی چاہیں اس کی شادی کر سکتے ہیں۔لیکن اس کی پسند فارحہ ہے۔ہمیں اسی لئے تو آنا پڑا کہ کہیں فارحہ کی شادی نہ ہو جائے۔" اس بار مسز ظفر نے کافی حد تک رعب دار انداز میں کہا۔

"کیا بات کرتی ہیں آپ، آپ کو پتہ ہے آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" اس بار ماموں نے سخت لہجے میں کہا

"میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔میرے بیٹے کی ضد نہ ہوتی تو میں کبھی نہ آتی۔وہ بہت ضدی ہے۔کم از کم اس معاملے میں، اس نے ہمیں جھکا لیا، اور میں یہاں آ گئی۔"

"دیکھیں، آپ نے بہت کچھ کہہ لیا۔اب آپ جا سکتی ہیں۔" ماموں نے پھر سختی سے کہا تو مسز ظفر بھی رعب دار لہجے میں بولیں

"میں جانتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ بہت غلط سلوک بھی کر سکتے ہیں۔میں یہ بات ذہن میں رکھ کر آئی ہوں۔لیکن اتنا یاد رکھیں، مجھے کہا گیا ایک ایک لفظ قیمتی ہوگا۔اس لئے بہت سوچ سمجھ کر کوئی بھی بات کیجئے گا۔"

"یہ آپ کس طرح بات کر رہی ہیں؟ کیوں فارحہ کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہیں؟ پہلے یہ......"

"میرا بیٹا جس یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، فارحہ بھی ادھر ہی پڑھتی تھی۔میرے بیٹے کو وہ پسند ہے اور بس۔" مسز ظفر نے کہا تو ماموں نے سوچتے ہوئے پوچھا

"کیا، فارحہ بھی آپ کے بیٹے کو جانتی ہے؟ میرا مطلب ہےان کے درمیان کوئی تعلق......"

"اے ہے کیا بات کرتے ہو۔" اماں تڑپ اٹھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں، فارحہ بیٹی کو تو شاید پتہ بھی نہ ہو۔یہ میرے بیٹے ہی کی خاموش محبت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا "کہاں ہے فارحہ بیٹی؟"

فارحہ اپنے کمرے میں بیٹھی یہ سب سن رہی تھی۔ارباز نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔یہی وہ وقت تھا جب اسے باہر ان کے پاس جانا تھا۔وہ اٹھی اور باہر صحن میں آ گئی۔اس نے آتے ہی سب کو سلام کیا اور مسز ظفر سے بولی

"جی میں ہوں فارحہ، میں نے سب سن لیا ہے۔آپ کے بیٹے کا نام کیا ہے؟"

"ارباز" یہ کہہ کر اس نے پرس میں سے ایک تصویر نکال کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھا "یہ ہے وہ، کیا جانتی ہو اسے؟"

"ارے، یہ تو ہمارے ساتھ والے ڈیپارٹمنٹ میں پڑھتا تھا، میں جانتی تو نہیں، لیکن آمنا سامنا ہو جایا کرتا تھا۔" فارحہ نے تصویر دیکھ کر واپس کرتے ہوئے کہا

"تو بس پھر، میری بات کو ذرا سوچئے اور سمجھئے گا، میں دو چار دن میں دوبارہ آؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے مسز ظفر اٹھی۔اس کے ساتھ دوسری خواتین بھی اٹھ گئیں۔اپنے پرس میں سے کافی سارے بڑے نوٹ نکالے اور فارحہ کی مٹھی میں دیتے ہوئے بولیں، "یہ رکھو، میری بیٹی، حالات کچھ اور ہوتے تو میں بہت کچھ لاتی۔"

"نہیں، میں یہ کیسے......" فارحہ نے انکار کیا تو وہ زبردستی اسے تھما کر بولیں

"بس رکھو۔"

یہی وہ لمحہ تھا جس سے وہ ارباز کو سہارا دے سکتی تھی۔اگر وہ رقم پکڑ لیتی تو اس کا مطلب تھا کہ فارحہ کی ہاں ہے اور مسز ظفر کو اپنے گھر میں آنے کا راستہ دے دیتی۔اس نے وہ رقم پکڑ لی۔

مسز ظفر نے اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے باہر والے دروازے کی جانب چل دیں۔فارحہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔صحن میں خاموشی طاری ہو گئی تھی۔چند منٹ بعد ماموں کوئی بات کئے بنا اٹھ کر چلے گئے۔ابا نے بھی کوئی بات نہیں۔یوں جیسے گھر پر سناٹا چھا گیا ہو۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ارباز کا فون آ گیا۔اس نے کسی بھی ممکنہ ردعمل کے بارے میں پوچھا اور چند منٹ باتیں کر کے فون بند کر دیا۔فارحہ مطمئن ہو گئی تھی کہ اس کی عدت کے دن اب سکون سے گزر جائیں گے۔

اسی شام سہیل ان کے گھر آ گیا۔اس وقت فارحہ صحن ہی میں بیٹھی ہوئی تھی۔اس کے پاس اماں تھیں جبکہ ابا باہر کہیں گئے ہوئے تھے۔اماں اس سے کرید کرید کر پوچھتی رہیں کہ اگر کوئی بات ہے تو بتا دو۔لیکن فارحہ وہی کہتی رہی جو اس نے ارباز کے ساتھ طے کیا تھا۔وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھی جا سکتی تھی۔

وہ کافی دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر اس نے فارحہ سے دبے دبے غصے میں پوچھا

''وہ جو عورتیں آج آئی تھیں، انہیں جانتی ہو، کہاں رہتی ہیں وہ، کون ہیں وہ، کس خاندان سے تعلق ہے ان کا؟''

''میں نہیں جانتی ہوں۔ یہ انہوں نے ہی بتایا کہ......''

فارحہ نے کہنا چاہا مگر وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا

''ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ تمہاری مرضی کے بغیر یہاں پر قدم بھی رکھ لیں، کیونکہ اسکا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اتنی رقم دی اور تم نے فوراً پکڑ بھی لی، جب تم جانتی ہی نہیں ہو، پہلی ملاقات ہے، تو پھر یہ کیا ہے؟'' سہیل نے انتہائی غصے میں کہا تو وہ سکون سے بولی

''انہوں نے دیئے میں نے لے لئے۔''

''تم اتنی بچی نہیں ہو کہ اس بات کو نہ سمجھ سکو۔ سیدھے سیدھے بتاؤ، کیا چکر ہے تمہارا ان کے ساتھ۔'' وہ غصے میں بولا تو فارحہ نے بھڑک کر کہا

''بات سنو سہیل۔! اب ایک لفظ بھی منہ سے نکلا تو بہت برا ہوگا۔ تمہیں ہوش ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ شرم ہے تمہیں۔'' پہلی بار یوں سخت لفظ سن کر سہیل کے ساتھ اماں نے بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو، تمیز سے بات کرو۔'' اماں نے ڈانٹا

''اماں، کوئی میری ذات اور کردار پر انگلی اٹھائے، یہ مجھے برداشت نہیں ہے۔ سہیل کو کوئی حق نہیں ہے کہ میرے کردار بارے ایسے سوال کرے۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا تو اماں ڈھیلی پڑتے ہوئے کہا

''تو پھر وہ کیسے آگئیں؟'' سہیل نے سنبھل کر پوچھا

''جو انہوں نے کہا، سب نے سنا، مجھے بھی وہی معلوم ہے۔ اب جاؤ جا کر پتہ کرلو، وہ کون ہیں؟'' فارحہ نے تحمل سے جواب دیا

''میں سب پتہ کرلوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اماں سے کہا، ''وہ جو اپنے محلے سے خاتون ان کے ساتھ آئی تھی، ذرا ان سے پتہ کرو کہ وہ کون ہیں۔''

''میں کر آئی ہوں اس سے سارا پتہ، اس نے لڑکے کا ہی فون نمبر دے دیا ہے۔'' اماں نے کہا

''کہاں ہے دو مجھے۔'' سہیل نے فوراً کہا تو اماں نے پہلو سے بندھا کاغذ کا ایک ٹکڑا اسے تھما دیا۔ اس نے وہ نمبر پڑھا، اپنے سیل فون میں محفوظ کیا اور وہ کاغذ کا ٹکڑا واپس تھما دیا۔ وہ چند منٹ بیٹھا سوچتا رہا پھر اٹھ کر چلا گیا۔

دو دن تک مکمل خاموش رہی تھی۔ کسی سے فارحہ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اماں نے بھی اسکی شادی بارے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ جو شادی کی بات پر اس کا دماغ بھاری ہو جایا کرتا تھا، وہ بات ہی اس کے سامنے نہیں ہوئی تو وہ پرسکون تھی۔ فارحہ نے حساب لگایا کہ اس کے ساٹھ دن باقی ہیں۔ مطلب دو ماہ اسے انتظار کرنا ہوگا۔ دو دن بڑھ کر ایک ہفتے پر محیط ہو گئے۔ اس کی شادی بارے بات کرنے پہ گویا سناٹا چھا گیا۔

ایک دن دوپہر سے ذرا پہلے وہ اپنی اماں اور ابا کے ساتھ صحن ہی میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ان کے محلے کی وہی خاتون ان کے گھر آئی۔ اس کے ساتھ ایک دوسری ادھیڑ عمر عورت تھی۔ محلے والی خاتون نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ مسز ظفر کی ملازمہ ہے۔

''کیسے آنا ہوا؟'' اماں نے انہیں بیٹھنے کی بجائے بے رخی سے پوچھا

''یہ مسز ظفر نے تھوڑا پھل بھیجا ہے۔'' مازمہ نے کہا

''پھل، کہاں ہے پھل؟'' اماں نے اس کے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ کہا

''وہ باہر مزدور کھڑا ہے لے کر۔ اگر کہیں تو آواز دے لوں۔'' ملازمہ نے انتہائی تحمل سے کہا

''مزدور، بلاؤ۔'' اماں نے اپنا آنچل درست کرتے ہوئے کہا تو ملازمہ نے آواز دے ڈالی۔ تبھی ایک مزدور اندر آیا، اس نے باری باری چند پیٹیاں پھلوں کی ان کے صحن میں رکھ دیں۔ اماں نے حیرت سے پوچھا

''یہ اتنا کچھ؟

اس پر ملازمہ نے کوئی تبصرہ کئے بنا کہا

''مسز ظفر نے پوچھا ہے کہ وہ آپ کے ہاں کب آئیں؟''

''مطلب، وہ......'' اماں نے تذبذب سے کہا تو اس کے ابا بولے

''کوئی ضرورت نہیں آنے کی، یہ اپنا پھل اٹھاؤ اور

واپس لے جاؤ۔"

"یہ تو اب میں لے جا نہیں سکتی۔ خیر آپ کا پیغام دے دوں گی۔" یہ کہتے ہی وہ پلٹی اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ اماں یوں دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے سکتے میں آ گئی ہو۔ پھر پھلوں کی ان پیٹیوں کی جانب دیکھا اور حیرت زدہ سی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ فارحہ جانتی تھی کہ یہ ہی وہ لمحات ہیں جب اسکی ماں کی سوچ بدلنے والی ہے۔

دوسرے دن کی صبح سہیل اپنے باپ کے ساتھ آ گیا۔ انہوں نے نئے آنے والے رشتے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی بلکہ جو نئی پراپرٹی بنائی جا رہی تھی، اسی کی بات کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سہیل نے اماں سے کہا

"فارحہ سے کہیں تیار ہو جائے، آرکیٹیکچر کے پاس جانا ہے۔ اس نے حتمی نقشہ بنانے سے پہلے ایک بار وزٹ کرنے کو کہا ہے۔"

"اچھا کہہ دیتی ہوں۔" اماں نے کہا اور اٹھ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں سن رہی تھی۔ اماں نے اسے سہیل کے ساتھ جانے کا کہا۔ فارحہ نے سکون سے مان لیا۔ اب جبکہ سکون سے دن گذر رہے تھے، وہ ان دنوں کو کسی طرح بھی ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

سہیل اسے لے کر سیدھا ایک پارک میں چلا گیا۔ فارحہ سمجھ گئی کہ وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسے لیکر ایک پرسکون سے گوشے میں پڑے بینچ پر جا بیٹھا۔ فارحہ انتظار کرنے لگی کہ وہ کچھ کہے۔ سو کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد انکشاف کر دینے والے انداز میں وہ بولا

"فارحہ، یہ جو تمہارا رشتہ آیا ہے، وہ سب جھوٹ اور فراڈ ہے۔ وہ لڑکا، تم سے کوئی محبت وغیرہ نہیں کرتا۔ اس سے بچ جاؤ تو اچھا ہے۔"

"پہلی بات تو یہ ہے سہیل، میں اسے صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ میرا یونیورسٹی فیلو ہے، ساتھ کے ڈیپارٹمنٹ میں ہوتا تھا اور بس، اس کے علاوہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہوں۔ دوسری بات میں یہ بھی نہیں جانتی اور نہ ہی یہ کنفرم کرتی ہوں کہ اسے مجھ سے کوئی محبت ہے یا نہیں ہے، تیسری بات، میرا اس سے بچنا یا نہ بچنا اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتا، جب تک میرے والدین نہیں چاہتے، میں نے شادی وہیں کرنی ہے، جہاں میرے والدین چاہیں گے۔ سو۔! وہ فراڈ ہے، جھوٹ ہے کیا ہے، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" فارحہ نے بڑے اطمینان سے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے جواب دیا جہاں اس کی پریشانی ہویدا تھی۔

"دیکھو، معاملہ وہ نہیں ہے جو سامنے دکھائی دے رہا ہے، اس سارے عمل کے پیچھے کچھ دوسری باتیں ہیں۔ اس لئے ان سے بچنا ہی ہوگا۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو پریشانی میں بولی

"میں نہیں جانتی کہ دوسری باتیں کیا ہیں، اور مجھے ان سے کیسے بچنا ہے؟ جبکہ میرا ان سے کوئی لینا دینا نہیں۔"

"یہی میں کہنا چاہ رہا ہوں، اگر وہ دوبارہ آئیں تو تم انہیں صاف انکار کر دو، انہیں بتاؤ کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے اور ......" اس نے کہنا چاہا تو فارحہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

"میں ہی کیوں جواب دوں۔ میرے بڑے بیٹھے ہیں۔ یہ فیصلہ یا اس فیصلے پر انہوں نے عمل کرنا ہے۔ دیکھیں اب میرے والدین نے مجھے یہ کہا کہ میری شادی آپ سے ہو جائے تو میں نے اس پر ایک لفظ بھی نہیں کہا اور میں نے خاموشی سے ......" وہ کہہ رہی تھی کہ سہیل نے جھنجھلاتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر بے بسی والے کہا

"تم سمجھ نہیں رہی ہو، اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ میں تمہیں یہاں اس لئے لایا ہوں کہ تمہیں سمجھا سکوں۔"

"آپ کھل کر بات کریں، کیا کہنا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا

"اچھا، میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پہلو بدلا اور پھر کہتا چلا گیا؛ "یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے۔ وہ ارباز نامی لڑکا بھی وہیں پڑھتا تھا۔ وہ جیسے عام طور پر کالج میں سٹوڈنٹس کی آپس میں مخالفت ہو جاتی ہے۔ میں جس گروپ میں تھا، یہ ارباز دوسرے گروپ میں تھا۔ ایک دو بار ہماری لڑائی بھی ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے گروپ کا ایک لڑکا ہمارے ہاتھوں شدید زخمی ہو گیا۔ میں انہی دنوں یہاں سے بھاگ گیا تھا۔ ہم پر ارادہ قتل کا مقدمہ ہو گیا تھا۔ اب میں واپس آیا ہوں تو

پتہ نہیں ان لوگوں کو کیسے پتہ چل گیا۔ اب یہ میری مخالفت ہی میں سارا کچھ کیا جارہا ہے۔ وہ مجھے ہر حال میں پریشان کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا آپ ارباز سے ملے ہیں؟" فارحہ نے اس انکشاف پر پریشان ہوتے ہوئے پوچھا

"ہاں، اسے ملا ہوں تو مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ کون ہے۔" اس نے بتایا

"میں بھی سمجھی یہ اتنے عرصے بعد اس کی محبت کیوں جاگ گئی۔" فارحہ نے اس سے جھوٹی ہمدردی جتاتے ہوئے کہا

"وہی نا، میں یہی بات تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ اب انکار تمہیں ہی کرنا ہوگا، ورنہ پھوپھو کا تو کوئی پتہ نہیں ہے، وہ بہت بڑا خاندان دیکھ کر کہیں اپنا موڈ ہی نہ بدل لے۔" وہ تیزی سے بولا

"میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوگا۔ اماں ایسی لالچی نہیں ہیں۔ ویسے بھی آپ نے ہم پر بہت انوسٹمنٹ کردی ہے۔" فارحہ نے جان بوجھ کر یہ موضوع چھیڑ لیا تھا۔

"نہیں فارحہ، یہ انوسٹمنٹ نہیں ہے۔ تم لوگ میرے اپنے ہو۔ میری جتنی دولت تھی، وہ سب میں نے تم لوگوں کو دے دی کہ کہیں تم لوگ ہمیں بیگانہ نہ سمجھو۔ اور پھر پاپا نے اتنا عرصہ اپنی بہن کو بھلا کر جو زیادتی کی اس کا بھی ازالہ اب میں ہی کررہا ہوں۔ یہ جو نئی افتاد پڑ گئی ہے، اس کا سامنا اب ہم دونوں ہی نے کرنا ہے۔" اس نے ملائمیت بھرے لہجے میں کہا

"میں آپ کے ساتھ ہوں لیکن ایسا کیسے ہوگا، ہم کس طرح اس افتاد سے نکل پائیں گے؟" فارحہ نے پوچھا

"اس نے میرے گھر پروار کیا ہے اس لئے، میں اب تک خاموش ہوں۔ تم انکار کردو تو وہ پھر نہیں آئیں گے۔ تب میں ان سے نمٹ لوں گا۔" اس نے کہا تو فارحہ کو یہی لمحہ لگا اپنی بات منوانے کا۔ وہ تو ایک ایک کر کے اپنی عدت کے دن گن رہی تھی۔ اس لئے جلدی سے بولی

"ٹھیک ہے، آپ ان سے نمٹ لیں۔ سب کچھ ٹھیک کرلیں، اس کے بعد ہی ہم شادی کریں گے۔ میں نہیں چاہتی میری گھریلو زندگی میں کوئی ایسا مسئلہ ہو۔"

"ٹھیک ہے، ایسا ہی کرتے ہیں۔ تم انہیں انکار کردو۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

سہیل یہ سب طے پا جانے پر بہت خوش تھا۔ وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر ریستوران کی جانب چل دیئے تاکہ لنچ لے سکیں۔

فارحہ نے سہیل کی ساری باتیں سن لیں تھیں اور ان سے وقتی طور پر فائدہ بھی لے لیا تھا لیکن، وہ حد درجہ پریشان ہوگئی تھی۔ اس کے ذہن میں کئی سارے سوال پیدا ہوگئے، جن کے جواب صرف ارباز ہی دے سکتا تھا۔ اگلے ہی دن وہ ارباز کو کال کر کے اس کے آفس جا پہنچی۔ ساری بات سن کر اس نے ہنستے ہوئے کہا

"مجھے پتہ تھا کہ بہت جلد آپ یہ سارے سوال لے کر مجھے ضرور ملنے آؤ گی۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے رُکا، پھر کہتا چلا گیا، "سہیل نے جو کہا، وہ بالکل سچ ہے۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم بعد میں کیا ہوا تھا۔ خیر، ماورا بہت دنوں سے مجھے کہہ رہی تھی کہ آپ کے مسئلے کا حل سوچوں۔ مجھے کچھ سوجھ ہی نہیں تھا۔ اس لئے آپ سے رابطہ نہیں کیا۔ میں نے جس دن آپ کو کال کی، اس دن میں نے اسے آپ کے ساتھ دیکھا تھا۔ سمجھ لیں یہ ربّ تعالیٰ کی طرف سے مسئلہ حل ہوا ہے، مجھے وسیلہ بنایا گیا، میں اسے پہچان گیا۔ مزید تصدیق میں نے کرلی۔"

"اب کیا ہوگا؟" اس نے پوچھا

"کچھ بھی نہیں۔ جب تک آپ چاہو میں اسے الجھا کر رکھوں گا۔" اس نے اطمینان سے کہا

"ہمارے درمیان طے پا گیا ہے۔ دو ماہ بعد ہماری شادی ہوجائے گی۔" فارحہ نے کہا

"ٹھیک ہے۔ آپ کا مسئلہ حل ہوگیا، لیکن......" ارباز کہتے کہتے رک گیا تو فارحہ نے تجسس سے پوچھا

"لیکن کیا؟"

"بس محتاط رہنا، اور رابطے میں رہنا۔"

"جی بالکل کیوں نہیں۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا فارحہ کے من میں اطمینان پھیل گیا۔ اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کی عدت کسی ذہنی اذیت کے بنا پورے ہوجائیں گے۔ ماورا گا ہے بگاہے اس کے ساتھ رابطے میں

رہنے لگی۔ دوسرے تیسرے دن ارباز کا فون آجاتا۔ وہ ان کا خلوص سمجھ کر خوش ہوتی۔ اس دنیا میں اتنے مخلص دوست کسے ملتے ہیں۔ اس دوران اس نے ماورا سے بھی رابطہ رکھا۔ اس نے پھر بھی یہی کہتی کہ اگر کوئی پرابلم ہو کسی قسم کا مسئلہ ہو تو ارباز سے ضرور شیئر کرنا۔



فارحہ کی عدت ختم ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ وہ خوش تھی۔ ایک مسلسل ذہنی اذیت ختم ہو گئی تھی۔ اسے اپنے ہی گھر میں سکون محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک صبح اس کے ماموں اور سہیل آ گئے۔ اس دن چھٹی تھی۔ فارحہ کا بھائی بھی گھر پر تھا۔ ناشتہ کر لینے کے بعد جب وہ باتیں کرنے کے لئے صحن میں بیٹھے تو ماموں نے فارحہ اور سہیل کی شادی کی بات کرتے ہوئے کہا

''جتنا ہم جلدی یہ کر دینا چاہتے تھے، اتنی ہی دیر ہو گئی۔ خیر، جو ہوا سو ہوا، اب فوراً سے پہلے تاریخ رکھ لیں۔''

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔'' اماں نے کہا

''چلیں پھر کل ہی نکاح ہی رکھ لیتے ہیں۔ چند قریبی دوستوں کو بلواتے ہیں اور یہ فرض بھی ادا ہو جاتا ہے۔'' ماموں نے صلاح دی۔ اماں ابا یا بھائی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کسی جہیز وغیرہ کی تیاری بھی نہیں کرنا تھی۔ اس لئے طے پا گیا۔ اس دوپہر کو فارحہ نے فون کر کے ارباز کو بتایا۔ اس نے مبارک باد دی اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ سو اگلے دن کی شام فارحہ اور سہیل کی نکاح ہو گیا۔ ایک نزدیکی ریستوران میں انہوں نے مہمانوں کے لئے کھانا رکھا تھا، فارحہ وہیں سے رخصت ہو کر سہیل کے گھر چلی گئی۔

شادی کے دو ہفتے بہت سکون سے گزرے تھے۔ وہ تیسرے ہفتے کے اختتامی دن تھے۔ اس شام سہیل نے فارحہ کو خوب شاپنگ کروائی۔ ایک اچھے ریستوران سے کھانا کھلایا اور گھر واپس آ کر اس نے خوشگوار موڈ میں کہا

''بیوی، جلدی سے ایک کپ گرما گرم چائے پلا دو۔''

''ٹھیک ہے میں چینج کر کے ابھی بنا لاتی ہوں۔'' فارحہ نے کہا اور بیڈ روم کی جانب بڑھ گئی۔ اس وقت وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی، جب ارباز کا فون آ گیا۔ اس نے پہلے اتنی رات کو فون نظر انداز کر دینا چاہا، پھر کسی ایمرجنسی کا سوچ کر اس نے کال پک کر لی۔ کیونکہ وہ اور ماورا اس کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے، جیسے دوست ہوتے ہیں۔ ارباز نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا

''فارحہ، سہیل نے کسی قانونی قسم کے کاغذات پر آپ کے دستخط لئے ہیں؟ یا ایسی کوئی بات کی ہے؟''

''ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا، کیوں خیر ہے؟'' اس نے بتا کر پوچھا

''خیر ہی ہے، اس کی تفصیل میں آپکو بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال، مجھ سے مشورہ کیئے بنا کسی بھی کاغذ پر دستخط مت کرنا۔''

''ٹھیک ہے، پر مسئلہ کیا ہے؟'' اس نے پھر تجسس سے پوچھا

''سب کچھ سامنے آ جائے گا جب آپ انکار کرو گی یا پھر مجھ سے تفصیل سن لوگی۔'' ارباز نے محتاط انداز میں کہا اور پھر کال ختم کر دی۔

وہ چائے بنا کر لاؤنج میں گئی تو سہیل وہاں پر ایک فائل لئے اسے پڑھ رہا تھا۔ اس نے چائے رکھی اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور سپ لے کر بولا

''بیوی، یہ اس فائل میں جہاں جہاں پنسل سے نشان لگے ہیں نا، وہاں وہاں دستخط کر دو۔ وہی جو تمہارے شناختی کارڈ پر ہیں۔''

سہیل نے یہ لفظ بڑی لاپرواہی سے یوں کہے تھے جیسے یہ کوئی عام سی بات ہو۔ اگر ارباز نے نہ بتایا ہوتا تو شاید وہ اسی وقت دستخط کر دیتی۔ فارحہ اندر سے بے چین ہو گئی۔ اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے لاپرواہی سے کہا

''رکھ دیں۔ میں کر دوں گی دستخط۔''

''ارے نہیں بیوی، یہ صبح میں نے لے کر جانے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہیں۔ لو یہ پین اور کر دو۔'' اس نے پین بڑھاتے ہوئے کہا

''اچھا کرتی ہوں۔ یہ چائے پی لوں۔ ویسے یہ کاغذ ہیں کس بارے۔'' اس نے فائل پکڑ کر پوچھا تو سہیل نے کہا

''وہ جو گھر تمہارے نام بنایا ہے نا اس کے بارے میں

ہیں۔اس پر لون لینا ہے تاکہ بزنس شروع کیا جاسکے۔"

یہ سنتے ہی دھچکا لگا۔اس نے بے دلی سے چائے پی اور اٹھ کر جانے لگی تو سہیل نے کہا

"بیوی میں نے تمہیں کچھ کہا ہے؟"

"میں فائل پڑھ کر ہی کوئی فیصلہ کروں بلکہ میرا خیال ہے آپ لون لینے کی بجائے اسے فروخت کردیں۔مجھے نہیں چاہیے۔"اس نے کہا اور بیڈروم میں چلی گئی۔فارحہ کو شک ہو گیا تھا۔

اگلے دن جب سہیل چلا گیا تو اس نے ارباز کو فون کر دیا۔اس نے ساری تفصیل بتادی۔تب اس نے کہا

"فارحہ۔!میں یہ سمجھا تھا کہ شاید وہ اچھا ہو گیا ہے لیکن اس نے یہاں بھی فراڈ شروع کر دیا ہے۔یہ غیر قانونی رقم لے کر پاکستان آیا ہے۔اس نے اپنے نام پر رکھنے کی بجائے،تم سب گھر والوں کے نام پر وہ رقم محفوظ کی۔اب اسے لون کی صورت میں واپس لے رہا ہے۔"

"اوہ تو اسے اس لئے جلدی تھی میرے ساتھ شادی کرنے کی؟"

"اس سے بھی آگے کی بات سن لو،تمہاری اماں کے حصے میں جو گھر تھا،وہ اس وقت اتنی مالیت کا ہے کہ جو تمہیں گھر بنا کے دے رہا ہے،ویسے چار گھر آجائیں۔میں ابھی اس کے بارے میں مزید تحقیق کر رہا ہوں۔"

"آپ کیوں تحقیق کر رہے ہیں میرا مطلب،یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"فارحہ نے انتہائی پریشانی میں پوچھا

"صرف اپنی کالی دولت چھپانے کی خاطر وہ ایسا کر رہا۔مجھے صرف آپ کی وجہ سے دلچسپی تھی۔ورنہ جن کے بیٹے کو اس نے چھرا گھونپا تھا،وہ اسے معاف کرنے والے نہیں،میری ماما کے ساتھ جو خاتون آپ کے گھر آئی تھی،وہ اسی لڑکے کی ماں تھی۔میں نے انہیں روک دیا تھا،لیکن اب اس کا فراڈ سامنے آنے والا ہے۔محتاط رہنا۔"ارباز نے جب بتایا تو فارحہ کو زمین گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔اسے ساتھی بھی ملا تو کیسا۔وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اسی شام سہیل نے آکر پوچھا

"وہ فائل پر سائن کر دیئے ہیں تو نے؟"

"نہیں میں نہیں کروں گی۔"فارحہ نے صاف کہہ دیا

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارا رابطہ میرے دشمنوں سے ہے،وہی تمہیں میرے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔"

"تم فراڈ کر رہے ہو اور اگر......"

"ہاں،میں فراڈ کر رہا ہوں۔"یہ کہہ کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور بڑے اطمینان سے بولا

"تم نے کون سا فراڈ نہیں کیا۔ایک شادی شدہ عورت کو میں نے اس لئے اپنایا کہ میرا ساتھ دے گی۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"اس نے حیرت سے پوچھا

"مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔تم جو شادی کے نام سے بھاگتی تھی،تب مجھے شک ہوا۔میں نے سب پتہ کیا اور تمہارا نکاح نامہ تک نکال لیا۔اب میرے ساتھ نکاح نامے پر تم لوگوں نے"کنواری"لکھا۔مطلب میرے ساتھ فراڈ کیا۔"یہ کہہ کر اس نے فارحہ کی طرف دیکھا،پھر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا"میں پاگل نہیں اپنی دولت تم لوگوں پر لٹاتا پھروں۔میں نے دولت دے کر پتہ نہیں کیا کچھ تم لوگوں سے لکھوالیا ہے۔اگر مجھے کچھ ہوا تو تیرا بھائی پکڑا جائے گا،سارا دو نمبر کام اسی کے نام سے ہے۔اور تیرا باپ،وہ سیدھا جیل میں۔اس لئے چپ چاپ وہی کرو،جو میں کہہ رہا ہوں۔"سہیل نے خباثت سے کہا تو فارحہ ہونقوں کی طرح اسے بس دیکھتی ہی رہ گئی۔اس کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔کافی دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ انتہائی دکھ سے روتے ہوئے بولی

"میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی،تم نے دھوکا دیا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ کہاں رہنا چاہتا ہوں،بلکہ میں رہ ہی نہیں سکتا۔بس اپنی دولت کو سمیٹ کر یہاں سے نکل جانا ہے۔اور ہاں میں تجھے کبھی طلاق نہیں دوں گا۔اگر تم نے خلع کا کیس کیا تو ایسا کچھ سامنے لاؤں گا،تم لوگ نہیں بچو گے۔یہ یاد رکھنا۔"

وہ کہتا چلا جا رہا تھا اور فارحہ کو زمین گھومتی ہوئی لگی۔وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔اس کے ساتھ قسمت نے یہ کیا مذاق کیا تھا۔وہ ہچکیوں میں رو رہی تھی۔کچھ دیر بعد اس نے سہیل

کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا

''تم جو چاہتے ہو لے لو، مگر میرے گھر والوں کو بخش دو ۔ہمیں کچھ نہیں چاہئے ۔بس تم ہماری زندگی سے نکل جاؤ۔''

'' تو پھر جو کہتا ہوں وہ کرو ۔ میں اس وقت تک یہاں ہوں جب تک یہاں سے اپنی دولت سمیٹ نہیں لیتا۔اب جاؤ شاباش اور فائل لے آؤ۔میرے سامنے دستخط کرو، چلو۔'' اس نے سرد سے لہجے میں کہا۔ ہچکیوں میں روتی ہوئی فارحہ اٹھ کر بیڈ روم میں چلی گئی، جہاں اس نے فائل رکھی تھی ۔ وہ فائل اس نے اٹھائی اور کاؤنج میں لا کر وہاں وہاں دستخط کرنے لگی جہاں سہیل اسے کہتا رہا۔ جب وہ سب کر چکی تو اس نے اپنے بیگ سے ایک اور فائل نکال لی ۔ اس پر بھی اس نے دستخط لئے اور بڑی حقارت سے بولا،'' جاؤ اب دفع ہو جاؤ ۔ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ۔ جس کو چاہو بتاؤ، اب تمہاری اپنی تباہی خود تماہرے ہاتھ میں ہے ۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور بیڈ روم میں چلا گیا۔ فارحہ وہیں لاؤنج میں بیٹھی روتی رہی۔ اسے خود پر بڑا ترس آ رہا تھا۔

اگلے دن کی شام تک فارحہ روتی رہی ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ۔زندگی اسے اس نہج پر بھی لے آئے گی یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جو کچھ سہیل نے کہا تھا ،ایسا ممکن تھا۔ اس کا بھائی پوری طرح اس کے جال میں آ چکا تھا۔شام سے پہلے اس نے سوچا، یوں پڑے رہنے سے تو کچھ بھی نہیں ہوگا، کم از کم اپنے والدین کو تو بتائے کہ ان سب پر کون سا طوفان گزر گیا ہے۔ وہ اٹھ کر جانے کو تیار ہو گئی ۔اس کی سوچوں میں بڑا خوفناک منظر تھا ۔ اسے اپنا سب اجڑتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ لاؤنج سے نکل کر باہر جانے کے لئے دروازے کی جانب بڑھی تو باہر پورچ میں سہیل کی کار آن رکی۔ وہ خوف زدہ ہو گئی ۔ کاش وہ چند لمحے پہلے نکل گئی ہوتی ۔ وہ لمحہ بھر میں فیصلہ کر چکی تھی وہ پچھلے دروازے سے باہر نکل جائے گی ۔وہ سامنے دیکھتے ہوئے مڑنے ہی والی تھی کہ کار میں سے ارباز کو نکلتا ہوا دیکھ کر ٹھٹک گئی ۔ سہیل کی کار میں وہ کیسے؟ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ سہیل باہر نکلا، اس کے ساتھ ہی دو آدمی اور بھی تھے جنہیں وہ نہیں جانتی تھی ۔ وہ رُک گئی ۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ سبھی اندر آ گئے ۔ اسے یوں بیگ پکڑے تیار دیکھ کر وہ سمجھ گئے ۔ تبھی ارباز نے کہا

'' فارحہ ابھی آپ بیٹھو، ابھی کہیں جانے کی ضرورت نہیں ۔''

فارحہ انہیں ہونقوں کی طرح دیکھتے ہوئے پلٹ گئی ۔وہ سبھی لاؤنج میں آ بیٹھے ۔ان کی باتیں وہ صاف سن سکتی تھی ۔ سہیل نے کوئی بات کی تو ارباز نے انتہائی غصے میں کہا

'' تمہارے پاس صرف ایک چانس ہے اور وہ چانس تمہیں اس لئے دیا جا رہا ہے کہ تم فارحہ کے شوہر ہو ۔ ورنہ اب تک تمہارے ساتھ کیا ہوتا ۔ تم اس کا گمان بھی نہیں کر سکتے ہو ۔''

'' کیا چاہتے ہو تم لوگ؟'' سہیل نے پوچھا

'' تمہیں ہمارے سامنے فارحہ کو طلاق دینا ہو گی، ہم گواہ ہوں گے اس کے ۔ لیکن اس سے پہلے وہ تمام کاغذات جو تم نے اس غریب خاندان کو پھنسانے کے لئے تیار کئے ہیں ۔ وہ ہمارے حوالے کرنا ہوں گے ۔ میرا وعدہ ہے میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گا ۔'' ارباز نے دوٹوک انداز میں کہا تو سہیل نے مجروح لہجے میں کہا

'' اس کی کیا گارنٹی ہے کہ مجھے یہاں سے جانے دیا جائے گا؟''

'' میں خود تمہیں اس شہر سے باہر بھجواؤں گا ۔ اس کے بعد تمہاری قسمت ۔ رہی تمہارے باپ کی بات میں اسے نہیں جانتا۔ جو اپنی بہن سے فراڈ کر سکتا ہے، وہ کسی کا بھی سگا نہیں ہو سکتا ۔'' اس بار ارباز نے نفرت سے کہا تھا۔

'' دو کاغذات، وقت نہیں ہمارے پاس ۔'' ایک اجنبی آواز میں کہا گیا تو سہیل وہاں سے اٹھ گیا۔ وہ سیدھا بیڈ روم میں گیا۔ ان نے الماری کھولی ، اس میں لگے لاک کے نمبر ملائے اگلے ہی لمحے جب اس نے ہاتھ نکالا تو اس میں پسٹل تھا۔ اس نے وہ پسٹل ان تینوں پر تانتے ہوئے کہا

'' مجھے نکل جانے دو، ورنہ گولی مار دوں گا ۔ تمہارا کیا

خیال ہے میں بیوی کو طلاق دے دوں اور تم اس سے شادی کرلو، ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ ہٹو میرے راستے سے۔" اس نے الماری میں سے سیاہ بیگ نکلا اور باہر نکلنے لگا۔ وہ تینوں ایک طرف ہٹ گئے۔ فارحہ نے اس سیاہ بیگ کو دیکھا، جس میں اس کی ہی نہیں اس کے گھر والوں کی بھی قسمت بند تھی۔ وہ چند لمحوں بعد لے کر فرار ہو جانے والا تھا۔ جیسے ہی وہ اس کے قریب آیا، اس نے فارحہ کو ڈھال بنالیا۔ گھبرائی ہوئی فارحہ نے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ وہ اسے لے کر لاؤنج میں آ گیا۔ ارباز اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ فارحہ کو پکڑے باہر جا رہا تھا۔ شاید وہ دروازہ پار کر جاتا لیکن فارحہ نے اس کے پسٹل والے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا۔ اس کے ہاتھ سے پسٹل گر گیا۔ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ گیا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ وہ انتہائی تیزی سے داخلی دروازے کی جانب بھاگا مگر وہ تینوں اس تک جا پہنچے اور انہوں نے اسے قابو کرلیا۔ وہ ہانپتا ہوا ان کے قابو آ گیا۔

"بس اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔" ارباز نے اسے کہا تو وہ زمیں پر بیٹھتا چلا گیا۔ فارحہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

"مجھے چھوڑ دو، میں یہاں سے ......" سہیل نے کہنا چاہا تو ارباز بولا

"ہماری بات مان لیتے تو شاید ہم بھی تمہاری مان لیتے۔ اب نہیں، اب تم پولیس کے حوالے ہو۔ تم اب فارحہ کو طلاق نہ دو، وہ خلع لے لے گی۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ فاصلے پر پڑا وہ سیاہ بیگ اٹھایا، پھر فارحہ کے پاس آ کر بولا "یہ بیگ پکڑو اور واپس الماری تک جاؤ۔ اس سے پہلے کہ لوگ یہاں آئیں، جتنے بھی کاغذات تمہارے لوگوں کے متعلق ہیں جلا دو۔"

اس نے ویسا ہی کیا۔ کچن میں ایک ایک کاغذ جلاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ یہ اس کا مستقبل جل رہا ہے یا ماضی خاک ہو رہا ہے۔

☆......☆......☆

ان دنوں سہیل سے خلع لے کر فارحہ اپنی عدت پوری کر چکی تھی۔ اس نے اب شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دوران عدت اس نے پلان کیا کہ وہ خود اپنے بھائی کو ساتھ ملا کر کام کرے گی۔ اس دوران وہ ماورا اور ارباز سے مشورہ کرتی رہی۔ یہاں تک اس نے اپنا بزنس شروع کر لیا۔ اور پوری محنت کے ساتھ اس نے وہ بزنس چلا بھی لیا۔

انہی دنوں ماورا بھی واپس آ گئی۔ وہ اس سے اکثر ملنے آ جاتی تھی۔ شادی کے بعد ایک دن وہ ارباز کے ساتھ اس کے پاس آئی۔ کچھ دیر باتوں کے بعد ماورا نے مسکراتے ہوئے کہا

"تمہیں اپنے کام کے لئے ایک اچھا، محنتی اور قابل ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی مخلص قسم کا منیجر ضرور رکھنا چاہئے۔"

"اتنی خوبیوں والا بندہ کہاں سے ملے گا، وہ بھی اس دور میں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی

"اگر مل جائے تو رکھ لوگی؟" ماروا نے پوچھا

"کیوں نہیں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولی

"انکار کی گنجائش نہیں ہوگی، ابھی سوچ لو۔" ماروا نے پھر کہا

"ڈن، تم کہو گی تو انکار نہیں کروں گی۔" اس نے حتمی انداز میں کہا تو ماورا نے سیل فون پر کال کی۔ اگلے لمحے اس کے سامنے جمال احمد کھڑا تھا۔ فارحہ کا سانس رُک گیا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ پھر کرسی پر آ کر بیٹھتے ہوئے بولا

"میری نوکری پکی ہو گئی یا ابھی......"

"بولو فارحہ؟" ارباز نے پوچھا تو وہ کئی لمحے بات ہی نہ کر سکی پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی

"پکی۔"

اسکے ساتھ ہی اس کا آفس قہقہے سے بھر گیا۔



چندر گانٹھ

زرین قمر

ایک ایسی دوشیزہ کا فسانہ، جو چاند کے عشق میں مبتلا تھی جسے چندر گانٹھ جمع کرنے سے محبت تھی یہ ایسی والہانہ محبت تھی جس نے اسے فطری محبت سے دور کردیا تھا اس کی آنکھوں پر اس عشق کا ایسا پردہ پڑا تھا جس نے اسے سچے عاشق کی چاہت سے بھی محروم کردیا تھا۔

ایک تخیلاتی اور ماورائی کہانی، پراسرار کہانیاں پڑھنے والوں کیلئے بطور خاص

صبح ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے ماہ نور پچھلی کئی راتوں کی طرح ساحلِ سمندر پر موجود تھی، آج چودھویں رات ہونے والی تھی۔ تیرھویں کا چاند پوری آب وتاب سے آسمان پر جلوہ دکھا رہا تھا اس کی دل آویز کرنیں سمندر کی رقص کرتی لہروں پر جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں اور ان کی چمک سے بننے والا روشن حصہ سمندر میں چاند تک پہنچنے کا راستہ بنا رہا تھا کیونکہ ٹھیک اس جگنوؤں جیسے چمکدار حصے کی دوسری طرف چاند جیسے سمندر کو چھو رہا تھا ایسا خوبصورت سماں تھا جس سے آنکھیں ہٹانا ممکن نہ تھا۔

ماہ نور جو دو تین راتوں سے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی وہ اب بھی رات کے اس پچھلے پہر میں یہاں موجود تھی آج اس کی سالگرہ تھی اس نے سفید رنگ کی چمکتی میکسی پہنی ہوئی تھی جو ہوا سے لہرا رہی تھی اس کے سیاہ گھنگھریالے بالوں میں ستاروں سی چمک لیے کلپ لگا تھا وہ کسی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی اس کا دودھیا بدن چاند کی روشنی میں سنگ مرمر کی طرح چمک رہا تھا بڑی بڑی کشادہ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے اور وہ فضا میں ہاتھ لہراتی، جھومتی، گنگناتی ساحل کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی لیکن انداز ایسا تھا جیسے رقص کر رہی ہو فضا میں موجود کہر بھی جیسے اس کے ساتھ ساتھ رقصاں تھی وہ کچھ دور چلتی پھر جھک کر نیچے کچھ تلاش کرنے والے انداز میں دیکھنے لگتی اور پھر آگے بڑھ جاتی۔ چودھویں کے چاند کی روشنی کی وہ ہمیشہ سے دیوانی تھی۔ اب بھی چاند کی پرکشش کرنیں سمندر کی موجوں کی طرح اسے بھی اپنی طرف کھینچ رہی تھیں اور اس پر بے خودی طاری کر رہی تھیں۔

اچانک رقص کرتے، تھرکتے پیروں کے نیچے ٹھنڈی بھربھری ریت نے اسے تھام لیا وہ نیچے جھکی اور پھر وہیں بیٹھ گئی اس کے چہرے پر روشنی کا عکس نمایاں ہوا پھر مخروطی انگلیاں ریت میں کچھ ٹٹولنے لگیں وہ آہستہ آہستہ خوابناک لہجے میں بڑبڑانے لگی۔

''اوہ......مل گیا...... مجھے چندر گانٹھ مل گیا......''

بے پایاں خوشی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہو؟'' ایک اجنبی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اس کے سامنے جو اجنبی کھڑا تھا بلاشبہ کسی امیر فیملی سے تعلق رکھتا تھا اس نے کافی مہنگا



سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا اور خوبصورتی و وجاہت کا بے مثال نمونہ تھا ماہ نور نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس وقت اس کی وہاں موجودگی کی وضاحت مانگ رہی ہو۔

''میں نے پوچھا کیا ڈھونڈ رہی ہو۔'' نوجوان نے مسکراتے ہوئے سوال دہرایا۔ ''چندر گانٹھ۔'' ماہ نور نے دھیمے لہجے میں کہا اور مسکراتے ہوئے اپنی بند مٹھی کی طرف دیکھا۔

''Moon Stone'' اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''ہاں، تم اسے حجر القمر، سنگ قمر، چاند پتھر یا Moon stone کچھ بھی کہہ لو میں تو اسے صرف چندر گانٹھ ہی کہتی ہوں۔''

''حیرت ہے۔''

''کیسی حیرت؟ اسے چندر گانٹھ کہنے پر؟'' ماہ نور نے بند مٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، رات کے اس پہر ایک تنہا لڑکی کے یہاں موجود ہونے پر اور پتھر ڈھونڈنے پر، میرا خیال ہے اس وقت ساری لڑکیاں اپنے آرام دہ بستروں میں محوِ خواب ہوں گی۔''

''ہاں ٹھیک کہتے ہو لیکن وہ میری طرح چاند کی دیوانی نہیں ہوں گی۔''

''چاند کی دیوانی؟''

''ہاں مجھے چاند بہت پسند ہے خاص طور سے چودھویں کا چاند۔'' ماہ نور نے پیار بھری نظروں سے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس میں کیا خاص بات ہے؟'' نوجوان نے پوچھا لگتا تھا کہ وہ بات کو طول دے رہا ہے اور محض ماہ نور سے ہمکلام رہنا چاہتا ہے۔

''کیا سب آج ہی پوچھ لو گے؟''

''کیا مطلب؟ کیا ہم پھر بھی ملیں گے؟''

''میرا اندازہ کہتا ہے کہ ہاں۔''

''کیا میں آپ کو ایک کپ چائے کی دعوت دے سکتا ہوں؟''

''صرف پانچ منٹ کی ملاقات میں چائے کی دعوت؟''

''ہاں...... آپ کی شخصیت بہت دلچسپ لگتی ہے کیوں نہ مون ریسٹورنٹ میں چائے پی لیں۔'' نوجوان نے کچھ فاصلے پر بنے ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کیا جس کی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ ورکنگ عملہ جاگ رہا ہے۔

"رات کے اس پہر میں؟"
"رات کہاں؟ اب تو صبح کی پو پھٹ رہی ہے۔" نوجوان نے مشرق کی طرف اشارہ کیا جہاں صبح کی سپیدی نظر آنا شروع ہوگئی تھی۔
"چلیں ٹھیک ہے۔" ماہ نور نے کہا اور اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر ریسٹورنٹ کی طرف بڑھنے لگی۔
"آپ علاقے میں نئے ہیں؟" ماہ نور نے پوچھا۔
"نہیں میں یہاں کا رہائشی ہوں اتفاق سے آپ سے آج ملاقات ہوئی ہے۔" وہ باتیں کرتے کرتے ریسٹورنٹ میں داخل ہوگئے تھے اور سمندر کی جانب لگی میز پر جا بیٹھے تھے جہاں سے ساحل کا منظر اور اس کے ساتھ ستاروں کے جھرمٹ میں چمکتا چاند نظر آ رہا تھا ماہ نور کی نظریں چاند پر جمی تھیں۔
"آپ نے بتایا آپ چندر گانٹھ ڈھونڈ رہی تھیں؟"
"ہاں۔" ماہ نور نے پھر اپنی مٹھی کی طرف دیکھا۔
"کیا میں دیکھ سکتا ہوں؟"
"کیوں نہیں۔" ماہ نور نے کہا اور مٹھی کھول دی اس کی ہتھیلی پر ایک تکونا ٹرانسپیرنٹ پتھر چمک رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے اس میں سے نقرئی روشنیاں منعکس ہو رہی ہوں نوجوان حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔
"اوہ یہ تو بہت خوبصورت ہے کیا یہاں ساحل پر ایسے چمکنے والے پتھر ملتے ہیں؟" اس نے پوچھا اور ماہ نور اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔
"آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"
"کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ایک دوسرے کا نام لے کر بات کریں۔ اب ہماری ملاقات کو اتنی دیر تو ہوگئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کا نام جان لیں۔" نوجوان نے بے تکلفی سے کہا ماہ نور کو اس کی بات اچھی لگی وہ خود بھی اس کے بارے میں جاننا چاہتی تھی پہلی ہی نظر میں وہ اسے اچھا لگا تھا۔
"آپ کا نام؟" ماہ نور نے پوچھا۔
"مجھے حماد احمد کہتے ہیں۔"
"اور میں ماہ نور ہوں گھر میں مجھے سب مون کہتے ہیں تم بھی کہہ سکتے ہو۔" ماہ نور نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ضرور...... مون۔" حماد نے جواب دیا وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی ایک بڑی مشکل آسان ہوگئی ہے وہ اس لڑکی سے متعارف ہوگیا ہے جس کا پہلی نظر میں دیوانہ ہوگیا۔
"ہاں تو مون بتاؤ کیا یہ پتھر اس ساحل پر ملتے ہیں؟" حماد نے پھر پوچھا۔
"کیوں؟ کیا تم بھی انہیں حاصل کرنا چاہتے ہو؟" ماہ نور نے پھر شکی نظروں سے اسے دیکھا۔
"دیکھنے میں تو قیمتی لگتے ہیں۔"
"ہاں...... خاصی حد تک انہیں جیولرز زیورات میں استعمال کرتے ہیں جواہر کی جگہ۔" ماہ نور نے پیار بھری نظروں سے ہتھیلی پر رکھے چمکدار چندر گانٹھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"کتنا قیمتی ہوگا؟ میرا مطلب ہے دوسرے جواہرات کے مقابلے میں؟"
"ویسے تو دوسرے جواہرات کے مقابلے میں اس کی قیمت کم ہے لیکن یہ جن کے نصیب کا پتھر ہے ان کے لیے بہت قیمتی ہے جیسے میں۔" ماہ نور نے کہا۔
"تم......؟ تمہارا تعلق اس کے ساتھ کیا ہے؟" حماد نے پوچھا اب وہ دونوں آپ جناب کی قید سے آزاد ہوکر قریبی دوستوں کی طرح تو اور تم کے کلمے تک

آ گئے تھے۔

''میں جن تاریخوں میں پیدا ہوئی ان کے حساب سے میرا برج کینسر ہے جو چاند کے تابع آتا ہے اور مجھے چاند بہت پسند ہے۔''

''تم ہو بھی تو چاند کی طرح۔'' حماد نے دل کی بات کہہ دی اسی وقت ویٹران کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''ہم صرف ایک ایک کپ چائے لیں گے۔'' حماد نے کہا اور وہ واپس چلا گیا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم چاند کی طرح خوبصورت ہو۔'' ماہ نور اس کی بات پر مسکرا دی۔

''لیکن میں نے سنا ہے کہ جو لوگ چاند کے زیر اثر ہوتے ہیں وہ تھوڑے دیوانے...... عام لوگوں سے ذرا ہٹ کے ہوتے ہیں اور خاص طور سے چاند کی چودھویں رات میں تو ان کی دیوانگی عروج پر ہوتی ہے۔''

''سب فضول باتیں ہیں سب نے من گھڑت قصے بنائے ہوئے ہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' ماہ نور کی آنکھوں میں غصے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

''ممکن ہے ایسا ہی ہو میں نے تو یونہی پوچھ لیا کیونکہ تم نے بتایا کہ تم برج کینسر سے تعلق رکھتی ہو چنانچہ اپنی عادات و کیفیات کے بارے میں خوب جانتی ہو گی میں نے سوچا تم سے تصدیق ہو جائے گی۔''

''نہیں حماد، ہم تو بہت چاہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔''

''میں نے جیسے ہی تمہیں ساحل پر دیکھا میں دیکھتا ہی رہ گیا تو پھر تمہارے چاند جیسے چہرے کی کشش مجھے تمہاری طرف کھینچتی ہی لے گئی۔'' حماد نے والہانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا وہ جلد از جلد اپنے دل کی بات اسے بتا دینا چاہتا تھا اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اسے بتا دے کہ اب اس کے بغیر وہ جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا وہ بالکل اس کے دل میں بسنے والی شہزادی جیسی تھی زندگی کا اتنا عرصہ گزار لینے کے باوجود اب تک کسی لڑکی نے اسے اتنا متاثر نہیں کیا تھا وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے بس اس کی خوبصورتی ہی اس کے لیے کافی تھی۔

''تم کہاں رہتے ہو؟'' ماہ نور نے پوچھا تب ہی ویٹر چائے لے کر آ گیا اس نے میز پر چائے رکھی۔

''سر کچھ ناشتے میں لینا پسند کریں گے؟'' اس نے پوچھا اور حماد نے سوالیہ نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

''نہیں، ابھی بہت جلدی ہے میں تھوڑی دیر سے ناشتہ کرتی ہوں۔'' ماہ نور نے جواب دیا اور حماد نے ویٹر کو جانے کا اشارہ کیا۔

''ہاں تو تم سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو، نا؟'' ماہ نور نے کہا تو حماد حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا......؟ میں نے کیا جھوٹ بولا...... میں درست کہہ رہا ہوں کہ میں یہاں سے......''

''نہیں، رہائش کے بارے میں نہیں۔'' ماہ نور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم جو کہہ رہے ہو کہ تم نے آج مجھے جیسے ہی دیکھا میری طرف کھنچے چلے آئے۔''

''ہاں یہ بھی سچ ہے۔'' حماد نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

''نہیں یہ جھوٹ ہے۔''

"تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"
"تم پچھلے تین دن سے مجھے دیکھ رہے ہو۔" ماہ نور نے پریقین لہجے میں کہا اور حماد سوچنے لگا کہ وہ کہہ تو درست رہی ہے لیکن اس نے تو اپنی موجودگی ظاہر ہی نہیں کی تھی وہ پچھلے تین دن سے اپنی کار بہت دور روک کر وہیں سے اسے دیکھتا تھا لیکن وہ حیران تھا کہ ماہ نور کو یہ کیسے پتہ چلا۔
"ہاں...... یہ سچ ہے۔"
"آج بھی تم تقریباً ایک گھنٹے سے......"
"ہاں یہ بھی سچ ہے۔" حماد نے ہار مانتے ہوئے کہا۔
"دراصل پہلے دن جب میں یہاں آیا تھا تو لوگوں سے یہ خبر سن کر آیا تھا کہ ایک چاند جیسی حسین لڑکی اکثر پورے چاند کی تاریخوں میں یہاں نظر آتی ہے وہ بہت حسین ہے اس پر سے نظر ہٹنا بھول جاتی ہے اور مجھے بھی ایسی ہی جیون ساتھی کی ضرورت تھی۔"
"جیون ساتھی؟ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ لڑکی میں ہی ہوں؟" ماہ نور نے ہنستے ہوئے کہا۔
"اس کا جواب تمہاری یہ مسحور کردینے والی خوبصورتی ہے اور وہ معصومانہ انداز ہے جو میں نے ابھی ساحل سمندر پر دیکھا تم بالکل کسی بچے کی طرح خوشی میں رقص کررہی تھیں۔"
"میرے گھر والے مجھے خوبصورت کم اور دیوانی زیادہ کہتے ہیں مجھے چندر گانٹھ جمع کرنے کا شوق ہے اور انہیں میں استعمال نہیں کرتی ایک جگہ چھپا کر رکھتی ہوں۔"
"تم انہیں چھپانے کے لیے ڈھونڈتی ہو؟" حماد نے حیرت سے کہا۔
"ہاں بس یہ میرا شوق ہے۔" ماہ نور نے ہاتھ میں پکڑے چمکتے ہوئے چندر گانٹھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"یہ گول تکونے چندر گانٹھ
چمکیلے چکنے چندر گانٹھ
دیوانہ کرتے ہیں مجھ کو......
نزدیک بلاتے ہیں مجھ کو۔
پھر چاند کی روشن کرنوں میں
میں ان کو ڈھونڈتی رہتی ہوں
نظروں سے چومتی رہتی ہوں
مجھے لوگ دیوانی کہتے ہیں
چندا کی رانی کہتے ہیں
یہ گول تکونے چندر گانٹھ
چمکیلے چکنے چندر گانٹھ!"
وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی اور حماد اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ واقعی کوئی دیوانی ہو یا اس میں کوئی ذہنی خلل ہو۔
"وہ خوبصورت تو ہے پر ذرا کھسکی ہوئی ہے پاگل ہے پاگل پاگل۔" اسے ایک شخص کی کہی ہوئی بات یاد آئی اور اس نے جھرجھری سی لی وہ سوچ رہا تھا کہ پتھر کو یوں چاہنا تو واقعی دیوانگی ہے لیکن اس کا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ مون پاگل ہوسکتی ہے وہ اتنی خوبصورت لڑکی کو کھونا نہیں چاہتا تھا اس نے سوچا افواہیں تو افواہیں ہی ہوتی ہیں۔
"آج جب تم آئے تو مجھے پتہ چل گیا...... میں ساحل پر چندر گانٹھ ڈھونڈ رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم پر چاروں سمت سے بہت سی نظریں پڑ رہی ہوں ایسا ہوتا ہے نا جب کوئی آپ کی سمت چھپ کر دیکھ رہا ہو اور آپ کی چھٹی حس آپ کو بتادے کہ کوئی ہے جس کی توجہ کا مرکز آپ بنے ہوئے ہیں۔" ماہ نور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے کہا اور اسے لگا جیسے وہ اس سے نظریں ہٹا نہیں سکتا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو۔'' حماد نے میکانکی انداز میں تائید کی۔

''میں یہاں سے کچھ فاصلے پر رہتی ہوں کچھ عرصہ پہلے میری والدہ کا انتقال ہوگیا' وہ بہت اچھی تھیں وہ کہتی تھیں کہ جب میں پیدا ہوئی تھی تو چودھویں کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا اور جب انہوں نے میرا خوبصورت چہرہ دیکھا تو بے ساختہ ان کے منہ سے ماہ نور نکلا پھر یہی انہوں نے میرا نام رکھ دیا وہ بہت پیار سے مجھے ماہ نور پکارتی تھیں۔'' ماہ نور نے کہا اور اچانک اس کی آنکھوں میں ستاروں کی طرح جھلملاتے آنسو اتر آئے۔

''تم نے اب تک کتنے چندر گانٹھ جمع کیے؟'' حماد نے پوچھا۔

''بہت سے' لیکن مجھے اپنا مطلوبہ چندر گانٹھ اب تک نہیں ملا۔''

''کیا مطلب؟''

''ان کی قسمیں ہوتی ہیں مجھے اب تک جو ملے ہیں وہ اچھے تو ہیں لیکن وہ ایسے نہیں جیسا میں چاہتی ہوں شاید کسی روز میری قسمت جاگ جائے اور میرا مطلوبہ چندر گانٹھ مجھے مل جائے۔''

''اس کی کیا خاصیت ہوگی؟''

''جب وہ میرے پاس ہوگا تو مجھے ہر چیز پر اختیار ہوگا۔'' ماہ نور نے والہانہ انداز میں کہا اور حماد پھر ایک بار اسے غیر یقینی انداز سے دیکھنے لگا۔

''کیا وہ بہت قیمتی اور مہنگا ہوگا۔''

''نہیں' مون اسٹون بہت مہنگے تو نہیں ہوتے لیکن وہ چونکہ مجھے پسند ہیں چنانچہ میرے لیے بہت قیمتی ہیں۔''

''تم انہیں کہاں رکھتی ہو؟''

''میں نے ان کا ایک اسپیشل سیکرٹ گارڈن بنایا ہے۔'' ماہ نور کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی اور حماد کی نظریں اس کے جسم کا طواف کر رہی تھیں اس میں بلا کی کشش تھی حماد کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا وہ اسے چھونا محسوس کرنا چاہتا تھا اسے اپنی ملکہ بنانا چاہتا تھا۔

''سیکرٹ گارڈن؟ مون گارڈن؟'' حماد نے پوچھا۔

''ہاں تم اسے مون گارڈن کہہ سکتے ہو۔'' ماہ نور نے کہا حماد کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا یہ تو بالکل دیوانوں والی بات تھی بھلا زمین پر مون گارڈن کیسے ہوسکتا ہے اس نے سوچا لیکن اپنی سوچ کو ماہ نور پر ظاہر نہیں کیا کیونکہ اسے پانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ خود کو بھی اس جیسا ہی ثابت کرے اور اس کی باتوں سے انکار کر کے اسے ناراض نہ کرے۔

''کیا تمہارے اس مون گارڈن میں کچھ خاص قدرتی طاقتیں ہیں؟'' حماد نے پوچھا حالانکہ اسے اپنے اس احمقانہ سوال پر خود بھی ہنسی آ رہی تھی۔

''نہیں...... کوئی قدرتی خاصیت نہیں...... لیکن آئندہ کے لیے ہمیں وہاں سے کچھ نشانیاں مل سکتی ہیں۔'' ماہ نور نے بڑے یقین سے کہا۔

''یعنی...... مستقبل قریب یا بعید میں ان نشانیوں سے ہماری رہنمائی ہوسکتی ہے؟'' حماد نے بھی اس کے انداز میں کہا۔

''شاید...... کہہ سکتے ہیں۔'' ماہ نور نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

''تم ہی نے تو کہا کہ تمہارے مون گارڈن میں

کچھ نشانیاں ہیں۔"
"ہاں' کیا تم میرا وہ راز جاننا چاہتے ہو اسے دیکھنا چاہتے ہو؟" ماہ نور نے پوچھا۔"وہ ابھی نامکمل ہے ابھی وہاں کی نشانیاں بھی پوری نہیں ہیں ابھی مجھے وہاں بہت کچھ دان کرنا ہے کیا تم آج رات اسے دیکھنا پسند کرو گے؟ شاید یہ رات تمہاری زندگی کی بھی یادگار ترین رات بن جائے۔" ماہ نور نے کہا وہ سوچ رہی تھی کہ یہ کام اس کے لیے بہت آسان ہوگا۔ حماد اسے پسند کرتا ہے وہ اس کی دعوت پر اس کے سیکرٹ مون گارڈن میں ضرور جائے گا۔
"ہاں' کیوں نہیں ضرور......وہ کہاں ہے......میں ضرور دیکھنا چاہوں گا۔" حماد نے اس کی توقع کے مطابق جواب دیا۔
"اس کے لیے تمہیں آج رات ٹھیک گیارہ بجے دوبارہ یہاں آنا ہوگا پھر میں تمہیں وہاں لے چلوں گی کیا خیال ہے گیارہ بجے زیادہ دیر تو نہیں ہوگی؟" ماہ نور نے پوچھا۔
"نہیں......ٹھیک ہے میں آجاؤں گا۔" حماد نے وعدہ کیا وہ سوچ رہا تھا کہ رات کے گیارہ بجے ایک خوبصورت لڑکی سے اس کی خواہش پر ملنے آنا اس کے لیے خوش بختی ہوگی وہ اپنے دل کی مرادیں پوری کرے گا وہ بہت خوش تھا۔
"لیکن ماہ نور یہ ریسٹورنٹ تو دس بجے بند ہوجاتا ہے پھر صبح کھلتا ہے۔" حماد نے کہا۔
"تو کیا ہوا؟ پہلے بھی تم ریسٹورنٹ کے بند ہونے کے باوجود تین دن سے آرہے ہو؟" ماہ نور کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔
"ہاں' ٹھیک ہے میں ٹھیک گیارہ بجے یہاں آجاؤں گا اور ساحل پر موجود پارکنگ میں کار کھڑی کردوں گا اتنی رات کو یہاں شاید ہی کوئی پولیس والا یا سیکیورٹی گارڈ موجود ہو۔"
"ہاں پھر تم آؤ گے نا؟" ماہ نور نے دوبارہ پوچھا۔
"ہاں ضرور پراسرار چاند کی ملکہ۔" حماد نے ہنستے ہوئے کہا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ خوبصورت لڑکی صرف اس کے لیے ہی بنی ہے' اس کے لیے ہی دنیا میں آئی ہے اور قدرت نے اتفاق سے آج انہیں ملوادیا ہے وہ کسی قیمت پر یہ موقع کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسی وقت ویٹر بل لے کر آگیا تھا اور اپنی خوشی میں حماد نے چائے کی قیمت سے زیادہ ٹپ بھی اسے دے دی تھی اور ماہ نور کے ساتھ ریسٹورنٹ سے نکل گیا تھا ریسٹورنٹ سے باہر دونوں کے راستے مختلف سمتوں میں چلے گئے تھے۔
اس روز جب حماد آفس پہنچا تو بہت خوش تھا وہ ایک مقامی فرم میں آئی ٹی انجینئر تھا اور اس کا شمار آفس کے بہترین محنتی ملازمین میں ہوتا تھا اس کی زندگی کا خواب اچھی ملازمت اچھا گھر' اچھی کار اور اچھا جیون ساتھی تھا اور وہ تمام چیزیں حاصل کرچکا تھا سوائے آخری کے اب جیون ساتھی کا خواب بھی پورا ہونے والا تھا وہ اپنی خوشی اپنے دیرینہ دوست سے نہ چھپا سکا۔
"اوہ ارسلان میں آج بہت خوش ہوں۔" اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اپنے دوست کو مخاطب کیا۔
"خیریت؟ بھئی صبح صبح کیا خوشی مل گئی؟" ارسلان نے پوچھا۔
"تم پوچھو......تمہیں تو پتہ ہے میں اپنی زندگی کے کئی خواب پورے کرچکا ہوں۔"
"ہاں...... او رایک ہی خواب باقی رہ گیا ہے......" ارسلان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔"بھابی

کا خواب؟“
”ہاں تم ٹھیک سمجھے۔“
”اچھا...... کب...... کیسے؟ کس نے پسند کیا؟ کیا تمہاری مرضی کی ہے؟“ ارسلان نے ایک ساتھ کئی سوال کردیئے۔
”بھئی میں نے ہی پسند کیا ہے تو میری ہی مرضی کی ہوگی۔“ حماد نے ہنستے ہوئے کہا۔
”تم نے...... لیکن تم نے تو کبھی ذکر نہیں کیا...... بڑے چھپے رستم ہو۔“ ارسلان نے ناراض ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔
”ارے بھئی ابھی تین دن ہی تو ہوئے ہیں۔“ حماد نے وضاحت کی۔
”صرف تین دن؟ اور تم نے اسے جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کرلیا؟ تین دن میں اس کے بارے میں سب کچھ جان گئے؟ بھلا کتنی بار ملے ہوگے؟“ ارسلان نے پھر کئی سوال کردیئے۔
”ایک بار۔“
”ایک بار...... اور......“
”صرف ایک گھنٹے کے لیے۔“ حماد نے بے خودی میں کہا اور اس کے تصور میں اب بھی ماہ نور رقصاں تھی ہتھیلی پر چندر گانٹھ رکھے جس سے اس کا چہرہ منور ہو رہا تھا۔
”کیا پاگلوں والی بات کررہے ہو؟“ ارسلان نے بے یقینی سے کہا۔
”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں نے اسے تین دن پہلے ساحل پر مون ریسٹورنٹ کے قریب دیکھا تھا وہ بہت خوبصورت ہے اس کا چہرہ چاند کی طرح چمکتا ہے میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا میں نے اس کے حسن کی تعریفیں سنی تھیں اور اسے بڑھ کر ہی پایا پھر میں لگا تار اسے دیکھنے جاتا رہا اور کل رات میں بے خودی میں اس کی طرف کھنچتا چلا گیا وہ چندر گانٹھ ڈھونڈ رہی تھی۔“
”چندر گانٹھ؟“ ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔
”ہاں اسے انگریزی میں مون اسٹون کہتے ہیں ایک قیمتی پتھر ہوتا ہے جسے جیولری میں استعمال کیا جاتا ہے جواہرات کی طرح چمکتا ہے لیکن قیمت میں ان سے کم ہوتا ہے وہ چندر گانٹھ کی دیوانی ہے اتنا پسند کرتی ہے کہ اس نے ان کا ایک سیکرٹ گارڈن بنایا ہوا ہے وہ مجھے آج رات دکھائے گی۔“ حماد نے تفصیل بتائی۔
”یار یقین نہیں آرہا یوں لگتا ہے جیسے میں کوئی الف لیلیٰ کی کہانی سن رہا ہوں۔“
”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا جب میں اس سے مل رہا تھا۔“ حماد نے کہا۔
”چلو...... اگر تمہیں تمہاری پسند کا جیون ساتھی مل گیا ہے تو پہلی مبارکباد میری طرف سے قبول کرو۔“ ارسلان نے خوش دلی سے کہا۔
”دعا کرو کہ وہ بھی راضی ہوجائے میں آج رات اس سے اپنی خواہش کا اظہار کروں گا۔“ حماد نے کہا۔
”میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“
حماد نے دن بڑی مشکل سے گزارا تھا اور شام کو آفس سے نکلتے ہوئے راستے میں ایک بڑے شاپنگ سینٹر سے ماہ نور کے لیے ایک گفٹ خریدنے کا ارادہ کیا تھا اس نے کئی چیزیں دیکھیں لیکن اسے کچھ پسند نہ آیا پھر اس کی نظریں ایک پل اوور پر جم گئیں جس میں سر پر اوڑھنے کے لیے بھی ٹوپی نما حصہ بنا ہوا تھا جو اندھیرے میں چمکتا تھا اس کا شیپ بالکل چاند جیسا تھا اس نے سوچا ماہ نور اسے پہن کر بہت اچھی لگے گی اس کا چہرہ چاند کی طرح چمکے گا اور یہ اسے

پسند بھی آئے گا اس کی نظروں میں میری قدر بڑھ جائے گی اور وہ یقیناً خوش ہو کر میرا شادی کا پیغام قبول کر لے گی' حماد نے وہ پل اوور خرید لیا اور گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔



رات کو ماہ نور ساحل کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ حماد یقیناً اچھی شخصیت کا مالک ہو گا' وہ پچھلے شخص کی طرح جھگڑالو اور حجت کرنے والا نہیں ہو گا ایسے لوگ ماہ نور کو پسند نہیں تھے جو اس کی باتوں پر سوال اٹھاتے تھے یا اس سے خواہ مخواہ بحث کرتے تھے وہ حماد کے بارے میں اچھی رائے رکھتی تھی وہ بہت تعاون کرنے والا تھا...... آرام سے باتوں میں آ جانے والا...... جلدی سے کہنا مان لینے والا...... پیار میں قربانی دینے کے لیے تیار رہنے والا...... مجھے چاہنے والا...... مجھ سے محبت کرنے والا...... میرے لیے قربانی دینے والا...... وہ سمجھتا ہے میں اس کے لیے کوئی تر نوالہ ثابت ہوں گی وہ آسانی سے مجھے جیت جائے گا...... لیکن مجھے یقین ہے کہ آج کی رات وہ جو مون گارڈن دیکھے گا اسے کبھی بھی بھلا نہیں سکے گا...... اسے کبھی بھی میرے مون گارڈن اور اس میں موجود چندر گانٹھ کی طاقت پر شبہ نہیں ہو گا کبھی نہیں' کبھی ہرگز بھی نہیں۔

ٹھیک دس بج کر انسٹھ منٹ پر حماد مون ریسٹورنٹ کے قریب ساحل پر پہنچ گیا تھا اس نے اپنی ریڈ اسپورٹس کار ساحل پر پارکنگ میں کھڑی کی اور پل اوور والا شاپنگ بیگ لے کر کار سے باہر آ گیا اس نے اپنا بہترین سوٹ پہنا ہوا تھا کار سے باہر آ کر اس نے موبائل کی روشنی میں کار کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا ٹائی کی ناٹ درست کی پھر موبائل جیب میں رکھ کر ساحل کی طرف بڑھا چند قدم آگے بڑھنے پر اسے بند مون ریسٹورنٹ کی سیڑھیوں پر ماہ نور بیٹھی نظر آئی' اس نے ہلکا نیلا سوٹ پہنا ہوا تھا اس کے گلے میں ایک لاکٹ پڑا تھا جس میں چندر گانٹھ لٹک رہا تھا اور جو چاند کی روشنی میں چمک کر ماہ نور کے چہرے پر بھی روشنی بکھیر رہا تھا ماہ نور اسے دیکھ کر بے تابی سے کھڑی ہو گئی اور حماد نے سوچا کہ یقیناً وہ اسے پسند کرتی ہے تبھی اتنی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی ہے حماد اس کے قریب پہنچ کر مسکرایا اور ماہ نور دوڑ کر اس کی بانہوں میں آ گئی۔ حماد اس بے تکلفی پر حیران تھا اسے اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا بغیر مانگے ہی قدرت کا تحفہ اس کی جھولی میں آ گرا تھا آدھی رات کے وقت ساحل پر دور دور تک کوئی موجود نہیں تھا سوائے حماد' ماہ نور اور چندر گانٹھ کی روشنی کے۔ اس نے سوچا یہ رات میری زندگی کی یادگار رات ہو گی میں اسے ایک نئی دنیا میں لے جاؤں گا عشق کی دنیا پیار و محبت کی دنیا ایک دوسرے کو سمجھنے' چاہنے اور پرکھنے کی دنیا میں۔

''خوش آمدید...... شہزادے......'' ماہ نور نے اس کے سینے سے لگے لگے سرگوشی کی اور حماد کے جسم میں جیسے سنسنی سی دوڑ گئی۔

''تو پھر ہم اپنے مون گارڈن کی طرف چلیں؟'' ماہ نور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یقیناً۔'' حماد نے پیار بھرے لہجے میں کہا وہ سوچ رہا تھا کہ ماہ نور بھی اس کی ہی طرح بے تاب ہے اور تنہائی میں اس کیساتھ کچھ پیار بھرے لمحات گزارنا چاہتی ہے جو یادگار رہیں۔

''تم رہنمائی کرو...... چاند دیوی۔'' حماد نے کہا اور اس کے اس خطاب پر ماہ نور کے چہرے پر خوشی کے تاثرات نظر آنے لگے اسے چاند دیوی کا خطاب

پسند آیا تھا۔
"حماد! میری خواہش ہے کہ تم اپنا سیل فون اپنی کار میں چھوڑ دو۔" ماہ نور نے فرمائش کی تو حماد نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اس نے سوچا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے لیکن پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔
"ہاں ہاں کیوں نہیں...... یہ موبائل خواہ مخواہ ہمیں ڈسٹرب کرے گا۔" حماد نے کہا اور جیب سے موبائل نکال کر کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔
"بھلا اس جادوئی رات میں ہم کسی بھی چیز کو اپنے پیار کے درمیان کیوں آنے دیں؟" ماہ نور نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھاما۔
"جادوئی رات......؟ اوہ ہاں...... آج رات ہمارے لیے جادوئی رات ہی تو ہے۔" حماد نے کہا۔
"ہاں حماد...... ایک قیمتی رات...... چندر گانٹھ کی طرح قیمتی۔" ماہ نور بڑبڑائی۔
پھر وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ساحل کی طرف بڑھتے چلے گئے تھے فضا میں سوائے سمندر کی موجوں کی آواز کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا تقریباً پانچسو فٹ تک جانے کے بعد وہ ایک ایسے چٹانی راستے پر آ گئے تھے جو سیدھا سمندر میں دور تک چلا گیا تھا۔
"یہ کیا......؟ یہ کیسی جگہ ہے......؟ اوہ میں سمجھ گیا...... تم لوگوں کی نظروں سے دور رہنا چاہتی ہو...... بھلا اس کی کیا ضرورت ہے؟" حماد نے اعتراض کیا۔
"تمہیں یاد ہے نا یہ سیکرٹ گارڈن ہے تم پریشان مت ہو میں اس تک پہنچنے کا راستہ تمہیں دکھانا نہیں چاہتی تاکہ کوئی میری غیر موجودگی میں کبھی وہاں نہ جاسکے...... بس تھوڑی دیر کی بات ہے...... پریشان مت ہو...... ہم سمندر میں نہیں جائیں گے...... بس تھوڑے آگے تمہارے پاؤں ریت پر ہی رہیں گے میں وعدہ کرتی ہوں تم ہر خطرے سے باہر ہو گے۔" ماہ نور نے مسکراتے ہوئے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور وہ اس ادا پر قربان ہو گیا۔
"اوہ...... ٹھیک ہے...... تم ٹھیک کہتی ہو...... وہ تمہارا سیکرٹ مون گارڈن ہے تم میری آنکھوں پر یہ کالی پٹی باندھ دو...... یوں لگتا ہے ہم آنکھ مچولی کھیلنے والے ہیں۔"
"ہاں یونہی سمجھ لو۔" ماہ نور نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھی اب حماد کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس راستے پر چل رہا ہے کچھ دور جانے کے بعد وہ ایک جھاڑی دار راستے پر داخل ہو گئے جن کی نوکدار پتیاں اب حماد کو چبھ رہی تھیں۔
"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" حماد نے پوچھا وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ کوئی چال نہ ہو کہیں اسے لوٹ کر قتل نہ کر دیا جائے لیکن اسے ماہ نور سے یہ توقع نہیں تھی پھر وہ چلتے چلتے رک گئے تھے۔
"حماد! اب تم سیاہ پٹی کھول سکتے ہو۔" ماہ نور نے پیار سے کہا اور حماد کی جان میں جان آئی۔
"شکر ہے۔" حماد نے آنکھوں سے پٹی کھولتے ہوئے کہا۔
"میرا سیکرٹ مون گارڈن" یہ ہے۔" ماہ نور نے ایک سمت اشارہ کیا اور حماد اس سمت مڑا اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی وہ جہاں موجود تھے وہاں دونوں طرف جھاڑیاں تھیں جن میں جگہ جگہ قیمتی چندر گانٹھ رکھے ہوئے تھے اور چاند کی روشنی میں چمک رہے تھے جس سے راستہ بھی روشن ہو گیا تھا اس راستے پر قدم

بڑھاتا ہوا وہ ماہ نور کے ساتھ کھلے میدان میں آ گیا جہاں مون اسٹونز سے ایک بیضوی دائری بنا ہوا تھا وہ چاند کی روشنی میں پوری آب وتاب سے چمک رہے تھے اور ان کے درمیان دودھیا پانی میں کوئی سفید سی چمکدار چیز موجود تھی جو ان سب سے زیادہ روشن و منور تھی۔

"یہ ہے میرا اسکریٹ گارڈن" جس کے لیے میں چندر گانٹھ جمع کرتی ہوں۔" ماہ نور نے کہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کتنی آسانی سے اسے وہاں لے آئی تھی۔

"تو یہ ہے تمہارا مون گارڈن اس کا کیا مقصد ہے؟" حماد نے پوچھا۔

"ارے میں نے تمہیں بتایا تو تھا احمق کہ یہاں پر بہت سی نشانیاں ہیں۔" ماہ نور نے کہا وہ سوچ رہی تھی کہ حماد کا دماغ تو بس اس کے جسم اور خوبصورتی پر اٹکا ہوا ہے اسے کچھ اور ہوش ہی نہیں اور یہ ٹھیک بھی تھا وہ جانتی تھی کہ کوئی بھی مرد کسی خوبصورت عورت کے سامنے اپنا سب کچھ ہار جاتا ہے..... سب بھول جاتا ہے حماد بھی بھول گیا تھا اس کے حسن کے آگے حماد کے لیے ہر چیز ماند ہو چکی تھی۔

"اوہ ...... ہاں ...... ہاں ...... بھلا میں کیسے بھول سکتا ہوں؟ تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا اگر میں کوئی نشانی ڈھونڈنا چاہوں؟" حماد نے پوچھا وہ ماہ نور کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے اس کے لیے کوئی فیس ادا کرنا ہوگی ماہ نور......؟" اس نے پوچھا۔

"فیس......؟ ارے نہیں یہ بالکل فری ہے تمہیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ تمہیں باہر سے اس بیضوی دائرے کے اندر چھلانگ لگانا ہوگی اس چمکدار پتھر کے پاس جبکہ تمہارے ہاتھ تمہارے سائڈز میں ہوں گے اور تمہاری نظریں اوپر آسمان پر چمکتے ہوئے چودھویں کے چاند پر۔" ماہ نور نے کہا اس کی آواز میں جذبات کی شدت کی وجہ سے ارتعاش پیدا ہو گیا تھا اور حماد نے سوچا یہ تو بہت ہی آسان ہے اتنی آسانی سے وہ ماہ نور کو خوش کر سکتا ہے یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

"جیسے تیراکی کے لیے بڑا جمپ لگاتے ہیں؟" اس نے تصدیق کی۔

"ہاں بالکل...... براڈ جمپ بہت ضروری ہے اگر تم اصل نشانی تک پہنچنا چاہتے ہو تو۔" ماہ نور نے کہا اور حماد نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہ اس کام سے فارغ ہو کر ماہ نور کے ساتھ کچھ اچھے اور یادگار لمحات گزارے گا۔

"کیا میں کامیابی سے یہ کرسکوں گا اور میری چاند دیوی اس سے خوش ہوگی؟" حماد نے پوچھا اسے ماہ نور کی خوشی کا بہت خیال تھا۔

"ہاں کیوں نہیں؟" ماہ نور نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" حماد نے جواب دیا پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگ سے پل اوور نکالا تھا جو وہ ماہ نور کے لیے لایا تھا جس میں چمکنے والا مون ماسک لگا ہوا تھا اور وہ اس نے ماہ نور کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ تمہارے لیے میرے پیار کا پہلا تحفہ۔"

"واہ...... زبردست۔" ماہ نور خوشی سے چلائی اسے پل اوور کا چاند کی روشنی میں چمکتا ماسک بہت پسند آیا تھا۔

"بہت خوبصورت، تمہیں پتہ ہے حماد اس تحفے کے لیے لیڈی لونا (یونانی چاند دیوی) بہت خوش ہوگی وہ تم سے پہلے سے بھی زیادہ پیار کرے گی...... حماد وہ تمہیں کبھی نہیں بھولے گی...... بس تم میرے ساتھ

اس کھیل میں شریک رہو اور مستقبل کی نشانیاں ڈھونڈتے رہو اسے خوش کرتے رہو۔ اور یاد رکھو ہمارے پیار کے خوشی کے دائمی محبت کے لمحات بس چند قدم کے فاصلے پر ہیں۔"

"کیا تمہیں یہ تحفہ پسند آیا ماہ نور؟" حماد نے پوچھا۔

"اوہ میری خواہش تھی کہ میں اسے پہنے ہوئے تمہاری تصویر بنا سکتا لیکن میرا موبائل تو کار میں ہے خیر کوئی بات نہیں۔"

"مجھے یہ تحفہ بہت پسند آیا...... شکریہ حماد...... کیا اب تم چاند دیوی کو خوش کرنا چاہو گے اور اس بیضوی دائرے میں چھلانگ لگاؤ گے؟" ماہ نور نے پوچھا حماد اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا پل اوور پہن کر اس کا ٹوپی والا حصہ ماہ نور نے سر پر اوڑھ لیا تھا اور اس میں لگا ماسک چہرے پر گرا لیا تھا جو چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

"چلو چھلانگ لگا دو اور دیکھو کہ آگے تمہاری زندگی میں تمہارے لیے کیا تحفہ ہے؟"

"میں تیار ہوں میری مون...... لو...... میں چلا۔" حماد نے کہا وہ سوچ رہا تھا کہ اتنا سا تحفہ دینے اور ایک بات مان لینے کے بعد ماہ نور اس کی ہوگی اس خیال میں مست اس نے بیضوی دائرے کے اندر چھلانگ لگا دی وہ سیدھا دائرے میں موجود چمکدار چندر گانٹھ کے قریب پانی میں گرا تھا' اور نیچے چلا گیا تھا جہاں اندھیرا تھا وہ تقریباً تیرہ فٹ نیچے گیا تھا اس کے پاؤں نیچے پانی میں ٹھنڈی' بھربھری ریت سے ٹکرائے تھے اور پھر اس میں دھنس گئے تھے وہ پریشان ہو گیا تھا' اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی گہری دلدل کے کنوئیں میں پھنس گیا ہو۔

"میرے پیارے تمہیں میرے چندر گانٹھ مبارک باد دیتے ہیں اس دنیا میں تمہاری آمد کا شکریہ۔" ماہ نور اوپر سے اسے پکار رہی تھی اس کے چہرے پر موت کی سی تاریکی چھا گئی تھی۔

"یہاں ہمیشہ ایک مزید شخص کی گنجائش رہتی ہے۔" وہ بڑبڑائی۔ "اور ہمیں ہمیشہ ایک مزید کی ضرورت رہتی ہے...... چاند جو اس زمین پر کرنیں بکھیرتا ہے اور اپنی کرنوں سے سمندر میں جوار بھاٹا پیدا کرتا ہے اسے قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔" ماہ نور کہہ رہی تھی اور حماد سوچ رہا تھا کہ وہ ایک نفسیاتی پاگل لڑکی کا شکار ہو گیا ہے جسے چاند کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے وہ پانی سے نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا اس کی آنکھوں میں اترنے والا آخری عکس ماہ نور کا وہ چہرہ تھا جو پل اوور کے ہیڈ ماسک سے روشن نظر آ رہا تھا پھر وہ بھی وہاں سے ہٹ گئی تھی اور حماد کی آخری چیخ سننے والا وہاں کوئی موجود نہیں تھا سوائے اس چندر گانٹھ کے جس کے نیچے پانی کی تہہ میں وہ پڑا تھا۔

اگلے ماہ اسی رات ٹھیک ڈیڑھ بجے مون ریسٹورنٹ کے ساحل پر ماہ نور نئے لباس میں ملبوس چودھویں رات کے چاند کی روشنی میں رقصاں جشن لٹاتی' نغمے گاتی پھر کچھ ڈھونڈ رہی تھی اچانک ایک نوجوان اس کے سامنے آ کھڑا ہوا یہ ارسلان تھا حماد کا دوست اپنے دوست کی خوبصورت جیون ساتھی کو دیکھنے آیا تھا وہ ماہ نور کے حسن سے مبہوت رہ گیا۔ "یہاں کیا ڈھونڈ رہی ہو؟" اس نے ماہ نور سے پوچھا۔

"چندر گانٹھ۔" ماہ نور نے ایک ادائے دلبری سے کہا۔



سچی محبت

خلیل جبار

ایک نوجوان کی سرگزشت، اس پر جن زادی عاشق ہوگئی تھی
اسے عشق نے اس کی زندگی کا دھارا بدل دیا تھا۔

پراسرار، ماورائی کہانیاں پسند کرنے والوں کیلئے دوسرا رنگ

وہ کمرا ڈیپارٹمنٹ کے برابر میں ہی تھا۔ یہ کمرا ہم لوگوں کے استعمال میں رہتا تھا کیونکہ ہمارے کام میں استعمال ہونے والا سامان اس میں رکھا ہوا تھا جیسے ہی کسی پرزے وغیرہ کی ضرورت پڑتی کمرے میں جا کر لے آتے' کمرے سے سامان چوری ہونے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ شام کو جاتے ہوئے سب کی تلاشی ہوتی تھی۔ اس لیے کوئی بھی چوری کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اب اس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرر ہا تھا' انسان کو کام آنا چاہیے پھر اسے کسی بھی ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیا جائے اس کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

میری سلائی مشین کا ایک پرزہ ٹوٹ گیا تھا۔ میں وہ پرزہ لینے جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا' ایک حسین دوشیزہ کو دیکھ کر چونکا۔ اس کی عمر بھی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اسے اس سے قبل فیکٹری میں دیکھا نہیں تھا۔ اس لیے حیرانی ہوئی کہ یہ کون ہے اور کمرے میں کیوں بیٹھی ہے۔ اگر فیکٹری میں کام کرنے آئی ہے تو کام کرے' ایسے بٹھا کر تو کوئی بھی تنخواہ نہیں دے گا' بقول میرے دوستوں کے فیکٹری مالکان کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ مزدور کا پورا خون نچوڑ لیں۔

مجھے اس فیکٹری میں آئے ہوئے مشکل سے دو ماہ ہوئے تھے' اس سے قبل میں مختلف فیکٹریوں میں کام کرتا رہا ہوں۔ یہاں مجھے ڈبل تنخواہ پر رکھا گیا تھا۔ ایسے میں اس آفر کو کون ٹھکرا سکتا تھا۔ میں نے فوراً کام کی حامی بھرلی اور پرانی فیکٹری سے کام چھوڑ دیا۔ میں ہر قسم کی مشین پر کام کرلیتا ہوں اس لیے فیکٹری والے میری قدر کرتے ہیں اور میرے ناز ونخرے بھی اٹھاتے ہیں۔

میں مشین کا پرزہ لے کر چلا آیا' میں نے نوٹ کیا تھا کہ اس دوشیزہ کی میری طرف ہی نظر تھی اور اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

میرا خیال تھا دوسرے دن کمرے میں نظر نہیں آئے گی مگر دوسرے' تیسرے حتیٰ کہ پورے ہفتے مجھے وہ کمرے میں بیٹھی نظر آتی رہی۔ جب سے وہ کمرے میں نظر آئی تھی' مشین میں روز کوئی نہ کوئی کام نکل رہا تھا اور مجھے کمرے کے اندر ضرور تا جانا پڑ رہا تھا۔ آج میں نے اسے دیکھ کر یہ فیصلہ کرہی لیا کہ اس سے بات کی جائے' اسی سے پوچھا جائے کہ وہ کون ہے؟ اور اس کمرے میں ہی کیوں بیٹھی رہتی ہے؟ کیا اسے ہماری جاسوسی پر مامور کیا گیا ہے؟

''تم کون ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں ایک لڑکی ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں' میرا مقصد یہ نہیں ہے میں یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ تم یہاں کیا کام کرتی ہو؟''

''میں کچھ بھی کام نہیں کرتی۔'' وہ بولی۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ فیکٹری مالکان کسی بھی مزدور کو بٹھا کر نہیں کھلاتے' پھر وہ تمہیں کیسے بٹھا کر کھلائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے ضرورت ہی کیا ہے پیسوں کے لیے کام کروں' میرے پاس نوٹوں کی کمی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پرس کھول کر دکھایا۔

پرس میں ہزار' ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں بھری پڑی تھیں' حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔



''اتنی دولت تمہارے پاس کہاں سے آئی؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے پاس اس سے بھی زیادہ دولت ہے۔''

''پھر تم یہاں کیا کرتی ہو؟''

''میں نے بتایا ہے ناکہ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بس میں تو تمہیں دیکھنے آتی ہوں۔''

''مجھے اس ڈیپارٹمنٹ میں آئے ہوئے ایک دو ماہ ہی ہوئے ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' وہ ہنس دی۔

اچانک قدموں کی آواز پر میں چونکا۔ شاید کوئی کمرے کی طرف آرہا تھا۔ میں اس لڑکی سے مزید کچھ دیر اور بات کرنا چاہتا تھا مگر کسی اور کی موجودگی میں بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلا آیا۔ میرا وہاں سے آنا اچھا ہی ہوا کیونکہ کمرے کی طرف منیجر وقاص احمد آرہے تھے۔ کمرے میں لڑکی کا بغیر کسی مقصد کے ہونا اور وقاص احمد کا کمرے میں جانا ضرور گڑبڑ والی بات تھی۔ فیکٹریوں میں اکثر ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ اکثر دوشیزائیں کام کی تلاش میں یا منیجر کے قریب ہونے کے چکر میں اپنی عصمتیں گنوا بیٹھتی ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ان چکروں میں نہیں پڑتے ورنہ اکثریت میں اچھے عہدوں پر تعینات اپنے عہدے کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہر کلی کا رس چوسنے کے چکر میں رہتے ہیں اور جو انہیں خوش کردے وہ پھر نوازی بھی جاتی ہیں۔

کمرے میں موجود لڑکی کے پاس نوٹوں کی گڈیاں اس کے کردار کو مشکوک بنا رہی تھیں۔ وہ خوبصورت تھی' کم عمر تھی ایسی لڑکیاں اپنی بھرپور جوانی کا خوب فائدہ اٹھاتی ہیں اور وہ چھوٹے موٹے لوگوں کو لفٹ بھی نہیں کراتی ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھوں کے بیڈروم کی زینت بنتی ہیں' زیادہ مال وہی دے سکتے ہیں' اس کا مجھ سے یہ کہنا کہ میں تمہیں دیکھنے آتی ہوں' محض تفریحاً کہا ہوگا بہرحال کچھ بھی تھا' منیجر وقاص احمد کو کمرے کی طرف جاتا دیکھ کر اس کا کردار میری نظر میں مشکوک ہوگیا تھا۔ وہ کوئی اچھی لڑکی نہیں تھی اب دوبارہ وہ مجھے نظر بھی آئی تو میں اس سے بات بھی نہیں کروں گا۔

دوسرے دن میرا پھر کمرے میں جانا ہوا۔ اس کمرے میں جانا ہم سب کی مجبوری تھا' آج بھی وہ کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی' میں جان بوجھ کر اسے نظرانداز کرگیا۔

''کیا ناراض ہو؟'' وہ بولی۔

''تم میری کیا لگتی ہو جو میں تم سے ناراض ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اگر نہیں لگتی تو اپنا بنالو۔'' وہ زور سے ہنستے ہوئے بولی۔

''میں تمہیں اپنا کیوں بنالوں' کیا شہر میں اچھے کردار کی لڑکیاں مرگئی ہیں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''مجھ میں ایسی کیا بات دیکھ لی جو تم میرے کردار پر شک کررہے ہو۔''

''منیجر وقاص کا اس کمرے میں آنا ہی تمہارے کردار کو مشکوک بنا رہا ہے۔''

''یہ کون صاحب ہیں؟'' وہ چونکی۔

''میرے جانے پر جوصاحب آئے تھے وہی منیجر وقاص احمد تھے۔''میں نے کہا۔

''اچھا ہوں گے۔''

''کیا اس نے تم سے بات نہیں کی اور یہ بڑے بڑے نوٹ تمہارے پاس کہاں سے آئے؟''میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں چلی گئی تھی ہوسکتا ہے کہ میرے جانے کے بعد آیا ہو۔''اس نے بے پرواہی سے کہا۔

''پھر تم یہاں کس سے ملنے آتی ہو؟''

''میں نے تم سے کہا بھی ہے کہ میں تم سے ملنے آتی ہوں۔''اس نے شوخی سے میری جانب دیکھا۔

''میں کیسے مان لوں؟''

''جب میں تم سے روز' روز ملنے آؤں گی تو پھر تمہیں یقین آجائے گا۔''

''تم مجھ سے کیوں ملنے آتی ہو؟''

''اس لیے کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''

''تمہاری یہ محبت مجھے نوکری سے نکلوادے گی۔''میں نے غصے سے کہا۔

''میرے پاس بہت پیسے ہیں تم گھبراؤ نہیں۔''

''تم مجھے کتنی بار پیسے دوگی' روز' روز پیسے دینے سے رہی۔''

''میں تمہیں روزانہ پیسے دوں گی یقین نہ آئے تو آزمالو۔''اس نے اپنا پرس کھول کر نوٹ دکھائے۔

''تم کیا کام کرتی ہو جو تمہارے پاس اتنے پیسے آجاتے ہیں۔''میں نے پرتجسس لہجے میں پوچھا۔

''بس یہ مت پوچھو آم کھانے سے غرض رکھو۔''

''کیا تم......''میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میری زبان سے وہ الفاظ ادا نہ ہوسکے۔

''بولو کیوں رک گئے' بے فکر رہو میں کوئی غلط قسم کا دھندا نہیں کرتی یہ میرے اپنے پیسے ہیں۔''

''اتنی رقم تمہارے پاس آتی کہاں سے ہے۔''میں نے اسے کریدا۔

''مجھ پر شک مت کرو' محبت میں شک نہیں کرنا چاہیے۔''

''میں نے کب تم سے کہہ دیا کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''

''ہے نہیں تو ہوجائے گی۔''وہ زور سے ہنستے ہوئے بولی۔

قدموں کی آواز پر میں چونکا' میرے پیچھے کامران کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے دیواروں سے باتیں کی جارہی ہیں۔''

''مجھے پاگل سمجھا ہوا ہے جو دیواروں سے باتیں کروں گا۔''

''پھر کس سے بات کررہے ہو' یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے یہ ہیں نا۔''میں نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے زبردست حیرت کا جھٹکا لگا' وہاں وہ لڑکی نہیں تھی۔

''ارے وہ لڑکی کہاں گئی؟''میں نے کہا۔

''مجھے بیوقوف مت بناؤ میں جب یہاں آیا ہوں کوئی لڑکی موجود نہیں تھی۔''کامران نے کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں' میری بات کا یقین کرو۔''میں نے کہا۔

''اور میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں۔''

''میں اپنی بات کررہا ہوں کہ......''

''کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو' اب وہاں جاؤ تمہارا انتظار ہورہا ہے۔''

''میرا انتظار ہورہا ہے؟''

''ہاں وہ انچارج صاحب آئے ہوئے ہیں جو اپنی جگہ نہیں اس کا پوچھ رہے ہیں۔''

''اوہ اچھا میں ابھی جاتا ہوں۔''میں یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے انچارج شاہد بھائی بڑے غصے میں کھڑے تھے' مجھے دیکھ کر وہ میری طرف بڑھے۔

''ہاں بھئی کہاں گئے تھے' یہ ایسے کام نہیں چلے گا۔''

''شاہد بھائی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو واقعی ایسے کام نہیں چلے گا' یہ پرزہ مشین میں لگے بغیر مشین چلے گی نہیں جب مشین نہیں چلے گی تو کام کیسے ہوگا۔''میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے جلدی اس پرزے کو مشین میں لگاؤ' وہ منیجر

صاحب دورہ کرنے آرہے ہیں اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا منیجر میرے ڈیپارٹمنٹ کے لوگوں کو کچھ کہیں۔'' شاہد بھائی نے کہا۔

''مجھے مشین میں پرزہ لگاتے دیکھ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ مشین پر کام کرتے ہوئے اچانک مجھے پھر اس لڑکی کا خیال آ گیا۔ کامران جھوٹ نہیں بول سکتا' واقعی کمرے میں لڑکی نہیں تھی لیکن وہ اتنی جلدی بھی کمرے سے نہیں جاسکتی تھی۔ جاتے ہوئے وہ ضرور نظر آتی۔ کمرے میں وہ مجھے ہی نظر آرہی تھی' اس کا مطلب ہے وہ لڑکی کوئی عام لڑکی نہیں ہے' کوئی آسیبی چکر ہے' مجھے اس سے معلوم کرنا پڑے گا' وہ کون ہے؟ اور مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ یہ سوچ کر میں مطمئن ہو گیا تھا۔

دوسرے دن میں کام کے بہانے سے کمرے میں گیا' اس وقت وہ بیٹھی ہوئی تھی' مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

''مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔''

''جب تک اس ڈیپارٹمنٹ میں کام کررہا ہوں اس کمرے میں آنا میری مجبوری ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم کیوں مجبور بن رہے ہو' عیش کی زندگی گزارو۔'' وہ بولی۔

''عیش کی زندگی گزارنے کو دولت چاہیے وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''میں تمہیں دولت دوں گی' میری بات مان لو۔ فائدے میں رہو گے۔''

''تم کون ہو اور مجھے دولت کیوں دو گی' تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی ہے اور کب تک مجھے دولت دیتی رہو گی۔'' میں نے کئی سوالات کر ڈالے۔

''تم نے ایک سانس میں کئی سوالات مجھ سے کر ڈالے ہیں۔ میں ایک ایک سوال کا جواب دیتی جاتی ہوں' میں کون ہوں؟ میں انسانوں میں سے نہیں ہوں' میرا تعلق جنات کے قبیلے سے ہے' میرا نام عدینہ ہے۔ میں تم کو پسند کرتی ہوں' ہمارا قبیلہ اس فیکٹری کے قریب جو درخت ہیں ان پر ہمارا بسیرا ہے' جب میں نے تمہیں دیکھا 'میں اپنے حواس کھو بیٹھی اور تمہیں دل و جان سے چاہنے لگی ہوں' جب کوئی کسی کو چاہنے لگے پھر اس کا سب کچھ اس کا ہو جاتا ہے' میرے پاس جو بھی کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے۔ جب مانگو گے دے دوں گی' یہ دولت ہمارے لیے کچھ بھی نہیں' ہم جب چاہیں حاصل کر لیتے ہیں' تم جب تک مجھ سے مخلص ہو دولت دیتی رہوں گی۔'' وہ بولی۔

عدینہ نے مجھے جب یہ بتایا وہ جنات کے قبیلے سے ہے' مجھے خوف سا آیا۔ کامران ٹھیک کہہ رہا تھا یہ اسے نظر نہیں آئی ہو گی' کمرے کی طرف کوئی آرہا تھا اس لیے میں فوراً پلٹ پڑا' یہ کمرہ ایسا تھا ہر انسان کو جو اس ڈیپارٹمنٹ میں کام کررہا ہے اسے کمرے میں آنا پڑے گا میں تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

عدینہ کا تعلق جنات کے قبیلے سے ہوگا' میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا' میرا سارا دن اسی سوچ میں گزرا' میں نے یہ سنا تھا کہ جن عورتوں پر عاشق ہو جاتے ہیں' یہ پہلی بار سن رہا ہوں کہ ایک جن زادی مجھ پر عاشق ہو گئی ہے اور مجھ پر دولت لٹانے کو تیار ہے' رات جب میں بستر پر سونے کو لیٹا مجھے جن زادی کی پیشکش اچھی لگی کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور دولت بھی دے گی' وہ مجھ سے محبت ہی تو کرتی ہے' بیشک کرتی رہے اور مجھے دولت سے محبت ہے میں اس سے دولت سمیٹتا رہوں گا' یہ شاندار آئیڈیا آتے ہی میں مطمئن ہو کر سو گیا۔

صبح بیدار ہونے پر امی اور ابو کی لڑائی چل رہی تھی' ان کی لڑائی خرچے پر ہوتی تھی' ان کی خواہش تھی کہ ابو جو پیسے دیتے ہیں وہ بہت کم ہیں زیادہ دیں۔ یوٹیلیٹی بلز اور دیگر خرچوں سے جو پیسے بچتے تھے وہ سب رقم ابو' امی کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے پھر اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری کرنے کے لیے امی جان کے آگے اپنا ہاتھ پھیلاتے تھے' امی جان بھی انہیں رقم ایسے دیتیں کہ جیسے وہ ان پر بہت بڑا احسان کررہی ہوں۔ میں جب کمرے میں گیا ان کا خرچے پر ہی جھگڑا چل رہا تھا۔ امی ان سے پیسے مانگ رہی تھیں اور ابو کہہ رہے تھے مجھے یوٹیلیٹی بلز بھرنے کے لیے دس ہزار روپے درکار ہیں' سب رقم تمہیں دے دوں گا تو پھر بل کہاں سے بھروں گا' پچھلے مہینے بھی یوٹیلیٹی بلز نہیں بھرے گئے تھے۔

''میں کچھ نہیں جانتی مجھے خرچے کے لیے رقم بڑھا کر دو۔'' امی جان غصے سے بولیں۔

''میں کہاں سے لاؤں۔''

''چوری کرو ڈاکہ ڈالو مجھے پیسے چاہئیں۔''

''میں نے کبھی جوانی میں چوری ڈاکے نہیں ڈالے کیا اب اس عمر میں یہ کام کروں گا؟'' ابو نے کہا۔

''ابو آپ خرچے کے پیسے امی کو دے دیں' باقی رہا یوٹیلیٹی بلز کا وہ میں آپ کو دے دوں گا۔''

''مگر تم کہاں سے اتنی رقم لاؤ گے۔'' ابو پریشان ہوتے ہوئے بولے۔

''مجھے اوور ٹائم کے آج پیسے ملیں گے وہ میں آپ کو دے دوں گا۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

میری بات سن کر امی اور ابو کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''دیکھ لے علی حسن میرا بیٹا اس قابل ہو گیا ہے کہ تیرے یوٹیلیٹی بلز ادا کر سکے۔''

''ہاں آمنہ بیگم مجھے اپنے بیٹے سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔'' ابو نے کہا۔

''اور امیدیں ہونا بھی چاہئیں ہم اپنے بچوں کو پال پوس کر کس لیے جوان کرتے ہیں۔''

''اس لیے کہ وہ ہمارے بڑھاپے کا سہارا بنیں۔''

میں نے جھوٹ ضرور بول دیا تھا مگر اتنے سارے پیسے کہاں سے آئیں گے' یہ بات میرے لیے پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔ بس ایک عدینہ سے امید تھی' شاید وہ دے دے' میں پیسے مانگنے کی نیت سے کمرے میں چلا گیا تھا' پیسے مانگنے سے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ میرے کام آ بھی سکتی ہے یا جھوٹ بولتی ہے۔ میں نے جب اپنی پریشانی کا ذکر اس سے کیا تو عدینہ نے فوراً سے اپنے پرس سے پندرہ ہزار روپے کی رقم تھما دی۔ میں نے رقم گن کر جب پانچ ہزار روپے واپس لوٹانا چاہے تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

''یہ اضافی رقم تمہارے خرچے کے لیے ہے۔''

''میرے خرچے کے لیے؟'' میں چونکا۔

''ہاں تمہیں بھی تو پیسوں کی ضرورت پڑتی ہو گی نا' اپنے دل کے ارمانوں کو مت کچلو اور اپنے دل کے ارمان نکالتے رہو' جس چیز کی بھی ضرورت پڑے لے آؤ' جتنی بھی رقم کی ضرورت پڑے گی میں دوں گی۔'' عدینہ نے کہا۔

اتنی رقم ملنے پر میری خوشی کی انتہا نہ رہی' میں نے جلدی سے وہ رقم اپنے پاکٹ میں رکھ لی۔

میں عدینہ کے پاس کچھ دیر رک کر بات چیت کرنا چاہتا تھا مگر کوئی کمرے کی طرف آ رہا تھا' اس لیے میں تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

فیکٹری سے چھٹی ہونے پر میں سیدھا گھر پہنچا اور دس ہزار روپے کی رقم ابو کی ہتھیلی پر رکھ دی' ابو اتنی رقم دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے' انہیں امید نہیں تھی کہ میں اتنی رقم لا کر دے دوں گا۔

''بیٹے میں تمہیں جلد ہی یہ رقم دے دوں گا۔''

''ابو آپ مجھے رقم دینے کی فکر نہ کریں' میں نے یہ رقم واپسی کے لیے نہیں دی ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے پتا ہے تم نے یہ رقم اپنے دوستوں سے ادھار لا کر دی ہے' تمہاری تنخواہ اور اوور ٹائم ملنے کی تاریخ دس ہوتی ہے اور آج پانچ تاریخ ہے۔'' ابو مسکراتے ہوئے بولے۔

ان کی بات درست تھی پھر بھی میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

''ابو منیجر وقاص احمد مجھ پر آج کل بہت مہربان ہیں ان کی سفارش سے مجھے وقت سے پہلے پیسے مل گئے ہیں۔''

''اچھا بیٹے تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں مگر عقل اس بات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ فیکٹری والے اتنے اچھے کیسے ہو گئے ہیں۔'' ابو نے کہا۔

رات کو جب میں کمرے میں سونے کو گیا' مجھے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا' میں چونکا' کمرے میں عدینہ مجھ سے پہلے موجود تھی۔

''تم......''

''میں ہی ہوں کیا تمہیں مجھے دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔'' وہ بولی۔

''تم مجھے فیکٹری میں ملتی ہو' اس لیے یہاں دیکھ کر حیرت زدہ ہونا ہی تھا۔''

''میں جہاں چاہوں جب چاہوں جا سکتی ہوں' مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔''

''تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

''فیکٹری میں تم ڈرے ڈرے رہتے ہو اپنی جھلک دکھا

کر چلے جاتے ہو جب کہ میں تمہیں گھنٹوں اپنے سامنے دیکھنا چاہتی ہوں تم سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا' گھر والوں کو پتہ چل جائے گا۔"

"میں چاہوں گی تو پتہ چلے گا نا۔ فیکٹری میں میرا کسی کو پتہ چلا سوائے تمہارے۔"

"ہاں یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو' پھر بھی ڈر لگتا ہے نا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے جو تم سوچ رہے ہو ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا' تم نے مجھ سے رقم مانگ کر ثابت کردیا ہے کہ تم میرے ہو بس اب تمہیں کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گی۔" وہ بولی۔

عدینہ سے دوستی ہونا میرے لیے فائدہ مند ثابت ہوگیا تھا۔ میرے پاس ہر وقت پیسوں کی فراوانی رہنے لگی تھی۔ گھر میں بھی سکون تھا امی اور ابو کی بھی جو خرچے پر آئے دن لڑائی رہتی تھی وہ ختم ہوگئی تھی' دونوں خوش خوش رہنے لگے تھے۔ میں امی جان کو الگ سے بھی خرچہ دے دیا کرتا تھا' جس سے گھر کا بجٹ ٹھیک طریقے سے چلتا رہتا تھا۔ گھر میں ضرری سامان بھی آنے لگا تھا' امی اور ابو کو گھر میں سامان آنا اچھا لگ رہا تھا' مگر کبھی کبھی ابو فکر مند بھی ہوجاتے تھے اور مجھ سے اکیلے میں پوچھ بھی لیتے۔

"بیٹے سچ سچ بتاؤ تمہارے پاس ان دنوں اتنے پیسے کہاں سے آرہے ہیں؟"

"ابو میں اوور ٹائم کے پیسوں سے یہ سامان لاتا ہوں کیونکہ ہمیں سامان کی ضرورت تو ہے ناں۔" میں کہتا۔

"بیٹے مجھے تمہاری بڑی فکر رہتی ہے' ان دنوں حالات اچھے نہیں ہیں' بیشتر نوجوان ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہوگئے ہیں جس کا راستہ تباہی کی طرف جاتا ہے۔"

"ابو آپ بالکل نہ گھبرائیں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے پتا ہے جو نوجوان غلط راہ پر نکل جاتے ہیں وہ اپنی بقیہ زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے کاٹتے ہیں یا پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں۔" میں کہتا۔

"میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں اور تم بھی مجھے اس عمر میں رسوا مت ہونے دینا۔"

"ابو میں کبھی بھی کوئی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" میں سعادت مند بیٹے کی طرح کہتا۔

رات میں وہ میرے پہلو میں آ کر لیٹ گئی' میرا جسم جب اس کے جسم سے ٹکرایا' مجھے ایک عجیب سا لطف محسوس ہوا۔ میرے دماغ میں خوشبوؤں کی لپٹیں بس گئیں اور میں خوشبوؤں کے سحر میں ڈوبنے لگا تھا۔ میں اس سے پہلے بہک جاؤں خود کو اس سے دور کرلیا۔

"کیا ہوا؟" وہ چونکی۔

"میں بہکنے لگا تھا اس لیے خود کو تم سے دور کرلیا۔"

"بہک جاؤ' تم سے کس نے دور ہونے کو کہا ہے۔"

"یہ حق تمہارے ہونے والے شوہر کو حاصل ہے۔" میں نے کہا۔

"تم میرے لیے کون سے غیر ہو' تمہیں ہی مستقبل میں میرا شوہر ہونے کا شرف حاصل ہونا ہے' اب تمہاری مرضی ہے اس جسم کو ابھی حاصل کرلو یا نکاح کے بعد حاصل کرلو۔" وہ مسکرائی۔

"تم جنات کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہو ایسے میں ہماری شادی کیسے ہوسکتی ہے۔"

"جب ہم ایک دوسرے سے محبت کرسکتے ہیں تو پھر شادی کیوں نہیں کرسکتے۔ اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا' واقعی وہ ٹھیک کہہ رہی ہے' وہ مجھ سے محبت کرتی ہے میں اس سے پیسے کے لیے محبت کا ڈرامہ کررہا تھا' حقیقت یہ تھی مجھے جنات سے بہت ڈر لگتا ہے' پیسے کا لالچ نہ ہونے پر میں کبھی بھی اسے لفٹ نہ کراتا۔ وہ بھی جان گئی تھی پیسے میری ضرورت ہیں اور پیسے کے لالچ میں اس سے محبت کرنے لگوں گا' اسی لیے میں جب بھی اس سے پیسے مانگتا فوراً ہی مجھے ہزار ہزار کے نوٹ مل جاتے تھے۔

"ابو سمجھ رہے ہیں کہ میں کسی غیر قانونی دھندے میں پڑ گیا ہوں اس لیے وہ مجھے کہہ رہے تھے کہ اس عمر میں مجھے رسوا نہ کرنا۔"

"میں نے موضوع بدلا۔"

"اچھا پھر تم نے کیا کہا۔" اس نے میری طرف مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے انہیں مطمئن کردیا ہے کہ میں کسی غیر قانونی دھندے میں نہیں ہوں۔"

''تم کہہ دیتے کہ یہ رقم تمہاری ہونے والی بہو دیتی ہے۔''
''میں ایسا کہہ سکتا ہوں؟''
''کیوں نہیں کہہ سکتے؟''
''وہ پہلے ہی میری سرگرمیوں سے خوف زدہ ہیں' اگر میں نے انہیں اپنی محبت کے بارے میں بتادیا تو وہ بری طرح سے پریشان ہوجائیں گے اور مولوی صاحب کے چکر میں پڑجائیں گے۔''
''بھلے پڑجائیں میں مولوی' ملاؤں سے ڈرنے والی نہیں ہوں' میں انہیں ایسا مزا چکھاؤں گی کہ وہ پھر ادھر کا رخ کرنا ہی بھول جائیں گے۔'' وہ غصہ سے بولی۔
''ارے چھوڑو تم بھی بلاوجہ غصہ کرنے لگی ہو' میں تم سے پیار بھری باتیں کرنا چاہ رہا ہوں اور تم غصہ ہو رہی ہو ان مولویوں پر۔'' میں نے اسے بانہوں میں بھرلیا۔
''تو کرو نا پیار کی باتیں۔'' وہ میری طرف پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا موڈ اچھا ہوگیا ہے ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ نا جانے کتنی دیر اسے منانے میں لگ جائیں گے اور مجھے فیکٹری جانے کے لیے صبح جلدی اٹھنا تھا۔ جلدی سونے پر ہی جلدی آنکھ کھلے گی' وہ مجھ سے نا جانے کیا باتیں کررہی تھی مگر مجھ پر تھکاوٹ بہت تھی اس لیے مجھے یہ یاد ہی نہیں رہا کہ کب نیند آئی' صبح ہونے پر ہی بیدار ہوا۔

☆......☆......☆

''بیٹے یہ چند تصویریں ہیں دیکھ لو۔'' امی جان نے میرے سامنے تصاویر رکھتے ہوئے کہا۔
''میں ان تصاویر کا کیا کروں؟'' میں نے لڑکیوں کی تصاویر دیکھتے ہوئے کہا۔
''ارے بھئی میں تمہارے لیے لڑکی تلاش کررہی ہوں جو لڑکی تمہیں پسند آئے گی وہی اس گھر کی دلہن بنے گی۔'' امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''امی جان میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔''
''کیوں؟''
''میں کچھ بن جاؤں پھر دیکھ لیں گے۔''
''تم کون سا تعلیم حاصل کررہے ہو جو ہم تمہاری تعلیم مکمل ہونے اور کام مل جانے کا انتظار کریں گے۔ تمہاری فیکٹری میں نوکری لگی ہوئی ہے' اور تمہاری آمدنی میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے' بس اور کیا چاہیے ہمیں۔'' امی جان نے کہا۔
بات ان کی بھی معقول تھی' جب سے میری عدینہ سے ملاقات ہوئی تھی میری آمدنی میں اضافہ ہی ہو رہا تھا جو چاہتا تھا وہ مجھے مل جاتا تھا۔ زیادہ رقم اس لیے نہیں لیتا تھا کہ گھر والے شک کریں گے کہ میرا کام ایسا نہیں ہے پھر اتنا پیسہ کہاں سے آرہا ہے؟
''امی میں ابھی آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''شاہ رخ بیٹے ہم کب چاہ رہے ہیں کہ تمہیں زنجیروں سے باندھ کر گھر میں قید کردیں۔ شادی سب کو ایک دن کرنا ہوتی ہے اور شادی جلدی کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ بچے جلدی جوان ہوجاتے ہیں' ماں باپ کا سہارا بنتے ہیں۔''
''میں آپ سے بالکل اتفاق کرتا ہوں ایسا ہی ہوتا ہے مگر میری کچھ مجبوری ہے میں ابھی شادی نہیں کرسکتا۔'' میں نے کہا۔
''میری بات پر امی جان کا چہرہ بجھ گیا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔
میری اتنی آمدنی نہیں تھی اور شادی کرکے میں پھنس جاتا' یہ جن زادی کی مہربانی تھی کہ گھر میں سکون تھا' اس کے ہاتھ ہٹالینے سے گھر میں خرچے کے نام پر امی ابو کے جھگڑے شروع ہوجاتے' ایسے میں آنے والی میری بیوی پس کررہ جاتی۔ امی ابو کے جھگڑے بعد میں شروع ہوتے پہلے جن زادی مجھ سے جھگڑا کردیتی' میں فی الحال لڑائی جھگڑے سے دور رہنا چاہتا تھا۔
''پھر بھی بیٹے کچھ تو بتاؤ سال دو سال کتنے دن بعد تمہارا شادی کا ارادہ ہے۔ اصل میں خاندان میں ابھی اچھی لڑکیاں موجود ہیں پھر وہ بک ہوجائیں گی تو پھر ہمیں خاندان سے باہر شادی کرنا پڑے گی' یہ بھی پتا نہیں وہ کیسی آئے' خاندان کی لڑکیاں سب دیکھی بھالی ہیں۔'' امی نے کہا۔
''دو سال تک میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' میں نے یہ بات امی جان کو ٹالنے کو کہہ دی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ میں نے شادی کے لیے سوچا ہی نہیں تھا۔ سوچتا بھی کیسے' مالی طور پر مستحکم ہوئے بغیر شادی کرنا سراسر حماقت ہے۔

امی جان سے بات کیے مجھے مشکل سے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ابو میرے کمرے میں آئے۔

''شاہ رخ بیٹا تم نے جمال بھائی کی بیٹی فاطمہ کو دیکھا ہے نا؟'' ابو نے پوچھا۔

''ہاں میں نے دیکھا ہے۔''

''کیسی لڑکی ہے؟''

''بہت اچھی اور سمجھدار لڑکی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے تمہارا رشتہ اس سے طے کر دیا ہے اور اگلے ہفتے وہ رسمی طور پر بات چیت کے لیے آرہے ہیں۔ وہ چاہ رہے تھے تمہاری منگنی دھوم دھام سے ہو مگر میں نے سوچا گھر کی بات ہے' کس کو دکھانا ہے' بس وہ گھر آکر بات پکی کر جائیں۔''

''لیکن ابو میں......''

''مجھے پتا ہے تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ شادی دو سال کے بعد کرو گے' میں نے ان سے تین سال بعد شادی کرنے کی بات کرلی ہے' تمہیں بالکل بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ابو جب ہمیں شادی دو سال بعد کرنی ہے پھر کسی کی لڑکی کو روکنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''تمہیں نہیں معلوم پھر اچھے رشتے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں' فاطمہ بیٹی کی تم بھی تعریف کر رہے ہو اس کا مطلب ہے تمہاری اس کے ساتھ جوڑی اچھی رہے گی اور ساتھ بھی اچھا نبھ جائے گا۔'' ابو نے کہا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ابو سے کیا کہوں' میری وہی کیفیت تھی سر منڈھواتے ہی اولے پڑ گئے تھے۔ سوچا تھا کہ جن زادی کے پیسوں پر کچھ عرصے عیش کرلوں گا مگر یہاں معاملہ ہی کچھ اور ہوگیا تھا گھر والوں کو میرا عیش کی زندگی گزارنا پسند نہیں آرہا تھا۔ میری لاکھ منت سماجت کرنے پر بھی امی اور ابو کو میری حالت پر رحم نہیں آیا۔ میں ان سے کسی بھی قسم کی گستاخی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا' اس لیے سب کچھ وقت پر چھوڑ دیا جو ہوگا دیکھا جائے گا' جمال انکل اپنے گھر والوں کے ساتھ ہمارے گھر مٹھائی لے کر آگئے' ہمارے یہاں منگنی کی یہی رسم ہوتی ہے کہ لڑکی والے لڑکے کو انگوٹھی اور کچھ رقم دے دیتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لڑکا ان کا ہوگیا' موقع پر موجود لوگوں کا مٹھائی سے منہ میٹھا کر دیا جاتا ہے' منگنی کی رسم سے ایک دن پہلے مجھے جن زادی نے صاف اور کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے یہ منگنی کی رسم نہیں ہوگی۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ ''دیکھو جن زادی میرا ابھی بالکل بھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے گھر والے زبردستی منگنی کر رہے ہیں۔''

''تم انکار کردو۔''

''میں یہ گستاخی نہیں کرسکتا۔'' میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم خود چاہتے ہو کہ تمہاری اس سے شادی ہوجائے۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟'' میں نے کہا۔

''پھر تم اس منگنی سے انکار کیوں نہیں کر رہے ہو صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو اور مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔''

''یہ سن کر وہ اور آگ بگولہ ہوجائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے تم خود چاہ رہے ہو کہ تمہاری شادی فاطمہ سے ہوجائے۔''

''تم میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو' میں ابھی فی الحال شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے کہا۔

''جب شادی نہیں کرنا چاہتے تو پھر یہ منگنی کا ڈرامہ کیوں؟''

''یہ سب میرے امی اور ابو کر رہے ہیں' میں انہیں صاف کہہ چکا ہوں کہ میری منگنی مت کرو اور میں دو سال سے پہلے شادی نہیں کرسکتا۔''

''ٹھیک ہے' پھر میں ہی کچھ کرتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے عدینہ خاموش ہوگئی۔

☆......☆......☆

گھر میں منگنی کی رسم کا اہتمام ہوچکا تھا' جمال انکل کی طرف سے آئی مٹھائی کے دو ٹوکرے رکھے تھے' ابھی مجھے منگنی کی انگوٹھی پہنانے کو جمال انکل نے جیب سے انگوٹھی

نکالی ہی تھی کہ مٹھائی کے ٹوکروں میں سے عجیب وغریب قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ سب کی نظریں ٹوکروں پر گئیں ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے ان ٹوکروں میں کچھ ہے ایک سیاہ ناگ نے ٹوکرے کے اندر سے اپنا پھن نکالا سیاہ ناگ کو دیکھ کر عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ناگ جیسے ہی باہر آیا ایک اور سیاہ ناگ باہر نکل آیا دیکھتے ہی دیکھتے ایک درجن کے قریب سیاہ ناگ ٹوکرے سے باہر آچکے تھے۔ ابھی بھی ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ٹوکرے میں اور بھی ناگ موجود ہیں گھر کے صحن میں ان سانپوں کو دیکھ کر ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ جس کا جدھر منہ سمایا بھاگ گیا۔ صحن میں امی ابو اور میں ہی بچے تھے۔ ہم تینوں کے پاؤں مضبوطی سے زمین میں گڑھ گئے تھے۔ ہم میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اپنے بچاؤ کے لیے بھاگ سکیں۔

اچانک جن زادی عدینہ ظاہر ہوئی۔

''دیکھ لیا تم نے شاہ رخ کی زبردستی منگنی کرنے کا نتیجہ کہاں ہیں وہ منگنی کے لیے آنے والے لوگ' شاہ رخ میرا ہے اور میرا ہی رہے گا' اگر تم نے اس کی کہیں بھی زبردستی منگنی یا شادی کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔'' عدینہ نے کہا۔

''امی اور ابو گم صم اسے دیکھ رہے تھے' ان میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس سے بات چیت کرتے' جب اس نے دیکھا کہ کوئی نہیں بول رہا وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''شاہ رخ میں سمجھتی ہوں کہ آج کے لیے اتنا ہی سبق کافی ہے' اپنے امی اور ابو کو سمجھا دینا کہ آئندہ پھر ایسی کوئی حرکت نہ کریں ورنہ آج تو صرف میں کالے ناگ لائی ہوں' کل منگنی میں آئے لوگوں کو ان ناگ سے ڈسوا بھی دوں گی۔''

وہ جیسے آئی تھی چلی گئی' اس کے جانے پر کالے ناگ بھی غائب ہو گئے' ان کے جانے پر امی اور ابو کے حواس ٹھیک ہوئے۔

''شاہ رخ بیٹے یہ سب کیا ہے؟ اور تم نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' ابو بولے۔

''یہ جن زادی ہے اور فیکٹری میں یہ مجھے دیکھ کر مجھ پر عاشق ہو گئی تھی اور اب اس گھر میں رہتی ہے مگر میرے علاوہ کسی کو نظر نہیں آتی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اگر تم ہمیں پہلے بتا دیتے تو آج جو ہوا ہے وہ نہ ہوتا۔'' امی جان نے کہا۔

''مجھے بھی اس کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنا ہنگامہ کرے گی۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے اس کا بھی علاج کرانا پڑے گا۔'' ابو بولے۔

''آپ کیا کریں گے؟'' میں چونکا۔

''تم پریشان مت ہو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ابو نے کہا۔

دوسرے دن سے معمولات زندگی پھر سے اپنی ڈگر پر چلنے لگے۔ جن زادی کا موڈ بھی ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے خوش تھی۔

دوسرے ہفتے اتوار کے دن میری چھٹی تھی' میں صبح کے وقت گھر میں ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے جا کر دروازہ کھولا' ایک ادھیڑ عمر آدمی کھڑا تھا' کھچڑی نما داڑھی' سر پر بڑا سا رومال بندھا ہوا تھا' کرتا پاجامہ میں ملبوس اس شخص نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''تم شاہ رخ ہو؟''

''ہاں آپ کون؟''

''میں بابا جمالی ہوں اور تمہارے ابو نے مجھے بلایا ہے۔''

''ابو نے بلایا ہے۔'' میں چونکا۔

'ابو کو ان سے کیا کام پڑ گیا' میں سوچ میں پڑ گیا۔ ابو کو آواز دینے پردہ کمرے سے باہر آئے۔

''بابا جمالی آئے ہیں۔'' ابو خوش ہوتے ہوئے بولے۔

''آؤ' آؤ اندر آ جاؤ تم سے کون سا پردہ ہے۔'' ابو یہ کہتے ہوئے اسے اندر لے آئے۔

میں حیرت سے ان صاحب کو دیکھ رہا تھا' یہ کون صاحب ہیں جنہیں میں نہیں جانتا' اور ابو ایسے بچھے جا رہے ہیں کہ جیسے انہیں برسوں سے جانتے ہوں۔

''اس بچے پر وہ جن زادی عاشق ہے۔'' بابا جمالی میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''ہاں بابا وہ اس پر عاشق ہے اور اس نے دھمکی دی ہے کہ وہ اس کی کسی سے شادی نہیں ہونے دے گی' اگر اس

کی شادی ہوگی تو اس جن زادی سے ہوگی۔" ابو نے کہا۔
"میں اسے دیکھ لوں گا' میں نے اچھے اچھے جنات کو جلا کر بھسم کر دیا ہے' مجھے یہ پسند ہی نہیں ہے کہ جنات انسانوں کو تنگ کریں۔" یہ کہتے ہوئے بابا جمالی نے ایک خالی برتن منگوایا اور اس برتن میں پانی ڈال کر کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔
میری عجیب حالت ہونے لگی' میرا خود پر کنٹرول رکھنا مشکل ہو رہا تھا اور پھر مجھ پر دیوانگی سی کیفیت طاری ہوگئی' اور میں نے پانی کا برتن اٹھا کر بابا جمالی کے سر پر مار دیا۔
بابا جمالی اس حملے کے لیے ذہنی طور پر بالکل بھی تیار نہ تھے اس لیے گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے...... وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔
"اے جن زادی میں تجھے دیکھ لوں گا۔" بابا جمالی بولے۔
"تو مجھے دیکھے گا' ٹھیک ہے آج یہ فیصلہ ہو کر رہے گا' کون زیادہ طاقتور ہے۔" میرے منہ سے جن زادی کی آواز نکلی۔
بابا جمالی کھڑے کھڑے منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ وہ غصے سے مجھے ایسے گھور رہے تھے کہ ابھی جلا کر بھسم کر دیں گے۔ مجھے خود پتا نہیں چل رہا تھا یہ سب کیا ہو رہا ہے' اور پھر میری زبان لمبی ہونے لگی' سانپ کی سی گولائی میں تبدیل ہو کر بابا جمالی کی طرف بڑھنے لگی' زبان کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر بابا جمالی کا دم خشک ہونے لگا تھا اور پھر ایک جھٹکے سے زبان بابا جمالی کے گلے میں پھندے کی طرح لگ گئی۔ پھندے کا دباؤ بڑھنے سے بابا جمالی کی آنکھیں باہر کو ابلنے لگی تھیں' ان کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی ان کا دم نکل جائے گا۔
'بول کون طاقت ور ہے تو یا میں۔" جن زادی کی آواز آئی۔
بابا جمالی کچھ بولنا چاہتے تھے مگر اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پا رہا تھا اور پھر جب وہ کوشش کے باوجود ایک لفظ ادا نہ کر سکا تو اس نے جہاں سے جن زادی کی آواز آئی تھی اس طرف باقاعدہ ہاتھ جوڑ لیے۔
"ٹھیک ہے میں تجھے معاف کر دوں گی ایک شرط پر کہ آئندہ یہاں کا رخ نہیں کرے گا۔" جن زادی کی آواز آئی۔
بابا جمالی نے ہاں میں بامشکل گردن ہلائی۔
ان کی حامی میں گردن ہلانے پر میری زبان جو پھندا بنی ہوئی تھی ہٹ گئی اور میرے منہ میں ایسے سما گئی جیسے منہ سے باہر نکلی ہی نہیں تھی۔
"مرغا بن جا ورنہ میں ابھی تجھے جلا کر بھسم کر دوں گی۔" جن زادی کی آواز پر بابا جمالی نے مرغا بن جانے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی اور مرغا بن گیا اس کے مرغا بن جانے پر میں خود بخود آگے بڑھا اور اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ بابا جمالی پر میرے بیٹھ جانے سے وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔
"ان لوگوں کو بتا دے تو جعلی عامل ہے۔" جن زادی بولی۔
"ہاں میں جعلی عامل ہوں مجھے کچھ نہیں آتا۔" بابا جمالی بولا۔
"اس کو تم لوگ لائے تھے میرے مقابلے پر یہ تو خود جعلی عامل ہے۔' جن زادی سب کے سامنے ظاہر ہوتے ہوئے بولی۔
امی اور ابو کیا بولتے بس خاموشی سے جن زادی کو دیکھتے رہے جب وہ کچھ دیر تک یونہی گم صم رہے تو جعلی عامل کی طرف مخاطب ہوئی۔
"تیری خیریت اسی میں ہے کہ ابھی اور اسی وقت یہاں سے دفعہ ہو جا ورنہ میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں گی۔"
بابا جمالی نے بھاگنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔
امی اور ابو بھی بابا جمالی کے جانے پر کمرے سے چلے گئے' ان کے جانے پر جن زادی بھی غائب ہوگئی۔
ابو کو میری فکر لگ گئی تھی' وہ مختلف عاملوں کو لاتے مگر جن زادی انہیں بھگا دیتی تھی۔ اس کے باوجود ابو نے ہمت نہ ہاری تھی۔
"ابو آپ عامل کو گھر پر لانا چھوڑ دیں۔" ایک دن تنگ آ کر میں نے کہا۔
"کیوں؟" وہ بولے۔
"عدینہ بہت طاقتور ہے اس کے سامنے ایک بھی عامل نہیں ٹھہر سکتا پھر فائدہ عامل کو لانے کا۔" میں نے

انہیں سمجھایا۔
''شاہ رخ بیٹے ابھی جن زادی تم پر عاشق ہوئی ہے زیادہ عرصہ ہوجانے پر یہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی' ہم تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں اور یہ جن زادی عدینہ تمہاری شادی نہیں ہونے دے گی۔'' ابو نے کہا۔
''آپ کوئی اچھا عامل بھی تو نہیں لا رہے ہوتا' کہیں ایسا نہ ہو وہ غصے میں آ کر آپ دونوں کو نقصان نہ پہنچا دے۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔
''وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی' ہم تمہارے والدین ہیں جس کو گھر کی دلہن بننے کا شوق ہو وہ اپنے ساس سسر کو کیسے کوئی نقصان پہنچائے گی۔'' ابو بولے۔
''اشتعال میں کوئی بھی شخص انتہائی قدم اٹھالیتا ہے پھر یہ جن زادی ہے۔'' میں نے کہا۔
''شاہ رخ بیٹے میں نے نیم والے بابا کی بڑی تعریف سنی ہے جنات اس کا نام سن کر کانپ اٹھتے ہیں۔ میں تمہیں ان کے پاس لے کر جاؤں گا۔'' ابو نے کہا۔
میں ان کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ میری بات نہیں سمجھ رہے تھے۔ جن زادی بہت طاقتور تھی۔ اس کا مجھے اندازہ ہوگیا تھا۔ اس لیے میں چاہ رہا تھا' وہ عامل کو گھر پر لا کر اپنا وقت برباد نہ کریں۔
اتوار کے دن ابو ایک ٹیکسی والے کو لے آئے اور مجھے نیم والے بابا کے پاس لے گئے۔
نیم والے بابا کا کیا نام تھا کسی کو بھی نہیں معلوم تھا بس ایک نیم کے درخت کے نیچے بیٹھے رہتے تھے لوگ دور دور سے اپنے اپنے کام کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ اس وقت بھی ان کے پاس انے والوں کا ایک ہجوم تھا ابو کو دیکھتے ہی نیم والے بابا نے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا' ابو مجھے لے کر ان کے پاس گئے۔
''میں اس جن زادی کو ابھی سبق سکھاتا ہوں۔'' نیم والے بابا نے کہا۔
میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگا' کہ اتنے عامل جن زادی کا کچھ نہیں بگاڑ سکے پھر یہ کیا کریں گے۔ نیم والے بابا آنکھ بند کیے منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے اچانک جن زادی ظاہر ہوگئی' وہ سخت غصے میں تھی' شعلہ بار آنکھوں سے نیم والے بابا کو دیکھ رہی تھی۔
''مجھے کیوں بلایا ہے؟''
''تم ان لوگوں کو کیوں تنگ کر رہی ہو؟'' بابا نے پوچھا۔
''میں شاہ رخ کو پسند کرتی ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' عدینہ بولی۔
''اس لڑکے کے والدین یہ نہیں چاہتے۔''
''ان کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے' مجھے ہر صورت میں شاہ رخ سے شادی کرنی ہے۔''
''میں تم سے کہہ رہا ہوں اس کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں جلا کر بھسم کردوں گا۔'' بابا بولے۔
''مجھے جلا کر بھسم کرنے والے کتنے آئے اور چلے گئے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔'' جن زادی بولی۔
''ہاں میں جانتا ہوں' وہ تمہارے سامنے ٹھہر نہیں سکے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اور کوئی بھی تمہارا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھ سکتا' میں تمہیں چند منٹ دے رہا ہوں' سوچ کر بتادو۔''
''چند منٹ کیا دس سال بعد بھی پوچھو گے تو میرا یہی جواب ہوگا کہ شاہ رخ کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔'' جن زادی بولی۔
''پھر سنبھل۔'' یہ کہہ کر نیم والے بابا نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ جن زادی زور سے فضا میں اچھلی اور زمین پر گر پڑی وہ کچھ دیر تک یونہی بے سدھ پڑی رہی پھر ہوش میں آئی اور بابا کو غصے سے دیکھنے لگی۔
''بولو کیا ارادے ہیں۔'' بابا بولے۔
''مجھے شاہ رخ سے جدا نہ کرو' مجھ پر رحم کھاؤ۔'' وہ رحم طلب نظروں سے بابا کو دیکھنے لگی۔
''تم نے عامل پر رحم کھایا تھا۔''
''کیا کروں وہ مجھے شاہ رخ سے جدا کرنا چاہتے تھے پھر میں ان پر رحم کیسے کھاتی۔''
''تمہیں شاہ رخ کو چھوڑنا پڑے گا' یہ میرا حکم ہے چاہے پیار سے مانو یا غصے سے تمہیں ماننا پڑے گا۔'' بابا جلال میں آگئے۔
جن زادی عدینہ نیم والے بابا کو جلال میں دیکھ کر غائب ہوگئی۔
''بھاگ گئی بزدل کہیں کی۔'' بابا بولے۔

''بابا اس جن زادی کو جلا کر خاک کر دو تا کہ میرے بیٹے کی اس سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے۔'' ابو بولے۔

''میں ایسا کر سکتا ہوں لیکن کروں گا نہیں۔'' بابا مسکراتے ہوئے بولے۔

''وہ کیوں بابا؟'' ابو نے پوچھا۔

''جنات بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے ہیں کسی کو بلاوجہ جلا کر بھسم کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ وہ شاہ رخ کا پیچھا چھوڑ دے گی میں جیسا کہوں ویسا کرنا۔'' بابا نے کہا۔

''ٹھیک ہے بابا جیسا کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے۔'' ابو نے کہا۔

نیم والے بابا نے ایک پانی کی بوتل دی اور ہدایت کی کہ مجھے روزانہ نہاتے ہوئے بالٹی میں اس کا تھوڑا پانی نہانے کے پانی میں شامل کر کے نہاؤ' ایک اگربتی کا پیکٹ گھر میں عصر کے وقت جلانے کو دیا' پندرہ دن یہ عمل مجھے کرنا تھا اور پھر بابا کے پاس آ کر رپورٹ دینی تھی۔

میرا دل فی الحال جن زادی کو چھوڑنے کو نہیں چاہ رہا تھا' مجھے ایک طرح سے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ مگر میں ابو اور امی کے سامنے مجبور تھا۔ میں روزانہ نیم والے بابا کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا جن زادی رات میں آتی اور مجھے منع کرتی کہ میں اس پانی سے نہیں نہاؤں میں وقتی طور پر ہاں کر دیتا لیکن کرتا وہی تھا جو بابا نے کہا تھا میرا یہ عمل ہونے سے ایک دن پہلے جن زادی میرے کمرے میں آئی 'وہ بہت ہی افسردہ تھی۔

''میں نے تم سے سچی محبت کی اور تم نے جھوٹ سے کام لیا۔'' وہ بولی۔

''مجھے بھی تم سے بہت محبت ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر تم نے بابا کی بات پر کیوں عمل کیا؟ اب ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔''

''میں اپنے ابو اور امی کا کہنا نہیں ٹال سکتا' ان کی خوشنودی کے لیے ایسا کیا حقیقت یہ ہے مجھے بھی تم سے سچی محبت ہو گئی تھی اور میں نے اپنے والدین کی خاطر سچی محبت کو قربان کر دیا ہے۔'' میں نے دکھی لہجے میں کہا۔

میری آواز بھرا گئی تھی۔

''میں چاہتی تھی کہ تم دولت میں کھیلتے زندگی گزارو مگر تم یہ نہیں چاہتے' اس لیے میں کل سے تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔ بابا نے کچھ ایسا عمل کر دیا ہے' تمہارے پاس آتے ہوئے میرا جسم جلنے لگتا ہے' دور ہوتی ہوں تو ٹھیک ہو جاتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چلی گئی' اس کے جانے کا مجھے بہت دکھ ہوا وہ اگر انسانوں میں سے ہوتی تو میں کسی صورت میں اسے نہیں چھوڑتا۔ اپنی شریک حیات بنا کر ہی رکھتا۔

والدین کے فیصلے کے آگے میں مجبور تھا۔ میں انہیں ناراض کر کے اپنی آخرت خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

پندرہ دن ہونے پر ہم نیم والے بابا کے پاس گئے' اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا' میری بات سن کر بابا مسکرائے۔

''بیٹا مجھے پتا ہے تم بھی اس سے محبت کرنے لگے تھے۔ جنات سے دوستی اچھی نہیں ہوتی' کبھی کبھی یہ انسانوں کو فائدہ دیتے ہوئے نقصان بھی پہنچا دیتے ہیں اس لیے ان سے دور رہنا زیادہ بہتر رہتا ہے۔ بہت سی باتیں وقت گزرنے پر پتا چلتی ہیں۔'' نیم والے بابا نے کہا۔

میں گردن جھکا کر ان کی بات سنتا رہا' مجھے چند نصیحتیں کر کے جانے کی اجازت دے دی' میں بوجھل قدموں سے چلا آیا۔ میں نے والدین کی خاطر جن زادی عدینہ سے مستقبل میں بھی کسی قسم کا رابطہ نہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ میری انکل جمال کی بیٹی فاطمہ سے شادی ہو چکی ہے۔ تین لڑکے اور دو بیٹیاں بھی ہیں۔ مالی حالات بھی بہتر ہیں' میں سوچتا ہوں جن زادی سے شادی کر کے دولت ضرور حاصل ہو جاتی مگر بچوں کی دولت سے محروم رہتا۔

●

بدلہ

عمارہ خان

چاند کی چودھویں رات کو ایک فوجی کو پیش آنے والے پراسرار واقعات کا احوال اسے پڑھتے ہوئے آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے۔

پانچ سو سال پرانے قبرستان کی کہانی، تیسرا رنگ

رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ویرانیت ہر سو تھی، دور بہت دور سے وقفے وقفے سے کتوں کی آوازیں سناٹے کو چیرتی ہوئی کبھی کبھی سنائی دے رہی تھیں جو کانوں کو بھلی لگ رہی تھی کہ اس وقت دور دور تک کچھ نظر نہیں آرہا تھا اور سناٹا اتنا تھا کہ دل کو گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

سو سوا سو گھروں پہ مشتمل قصبہ ابھی بھی تھوڑی دور تھا لیکن کچھ قریب آتے درختوں کے ہیولے خوش آئند تھے اور اس بات کی نشانی تھی کہ آبادی قریب ہے لیکن......
آبادی سے پہلے قصبے کا قبرستان بھی ہے۔

دور کھڑے برگد کی جھکی ہوئی شاخیں کسی چڑیل کے بالوں کی لٹیں معلوم ہو رہی تھیں۔ جو ہوا کے ساتھ لہرا لہرا کے کسی بھی ذی ہوش کے حواس اڑانے پہ قابض تھی۔

اسی ہولناک خاموشی میں سوتی ہوئی زمین پہ تیزی سے بڑھتے حسن کے قدم اپنے گھر کی طرف رواں دواں تھے۔

حسن کو فوج سے اچانک تین دن کی منظوری مل گئی تھی، اس نے صبح کے انتظار میں ایک پل بھی گنوانا مناسب نہیں جانا تھا اور اسی وقت لاری پکڑ کے نو میل دور اپنے چھوٹے سے قصبہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

جذبات میں آ کے وہ نکل تو گیا لیکن اڈے پہ اترتے ہی اسے یاد آیا، آخری تانگہ رات آٹھ بجے نکل جاتا ہے۔
اب یا اسے فجر تک اڈے پہ انتظار کرنا تھا یا پیدل ہی تین گھنٹے کی مسافت طے کرنی تھی۔

حسن نے دو منٹ میں گھر جانے کا فیصلہ کیا اور بیگ اٹھا کے چل پڑا۔

اب وہ چھوٹا سا میدانی راستہ ناپ رہا تھا جس کے بعد سیدھے ہاتھ کی طرف قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی دیوار کے بعد اس کے قصبے کے گھر شروع ہو جاتے تھے۔

لیکن ایک دم آسمان میں شدید بجلی کڑکی تو اس کا دھیان ایک بار پھر آس پاس کے ماحول کی طرف متوجہ ہوا، اس نے چونک کر نظر اٹھا کے اوپر دیکھا۔ آسمان ایک طرف سے بالکل کالا دکھائی دے رہا تھا اور دوسری طرف مٹیالے سے ہیولے گردش کر رہے تھے۔

جہاں ایک طرف جگمگاتے تارے تھے دوسری طرف اسی آسمان پہ دائرے کی شکل میں اسے عجیب و غریب مخلوقات کے ہیولے گھومتے نظر آرہے تھے۔

ان ہیولوں کے منہ زمین کی طرف تھے اور ان کے منہ سے سرخ رنگ کی کوئی چمکتی چیز نکل رہی تھی۔

کسی اجنبی اندیشے سے اس کا دل کانپ اٹھا اور وہ تیز رفتاری سے قدم بڑھانے کے بجائے اب باقاعدہ دوڑنے لگا۔

اس کے بھاگتے ہی آسمان سے سرخ رنگ کے بڑے بڑے گولے تیزی سے زمین کی طرف گرنے لگے اور وہ گرتے ہی حدت سے بھرے شعلوں میں بدلتے جا رہے تھے، تھوڑی ہی دیر میں حسن نے خود کو ان شعلوں میں گھرا ہوا پایا۔



حسن نے گولوں کی حدت سے خود کو پگھلتا سا محسوس کیا ساتھ ہی اپنی موت بالکل قریب نظر آنے لگی۔

اچانک سامنے اسے ایک چھوٹی سی عجیب و غریب جسامت کی بچی دکھائی دی، جو شاید چار فٹ لمبی لیکن ایک پاؤں کی مالک تھی، جس پہ وہ آرام سے کھڑی تھی ساتھ ہی بغور دیکھنے پہ اندازہ ہوا، اس کا ایک ہاتھ اس کی جسامت جتنا لمبا اور ایک ہاتھ بمشکل لالٹین تھامے ہوئے تھا اور وہ ہاتھ شاید اتنا ہی لمبا تھا کہ وہ بے حد قریب کی کوئی چیز اٹھا سکے۔

وہ حسن کی طرف ٹکٹکی باندھے نہایت خاموشی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی لیکن یہ کیا!

بچی کا اکلوتا پاؤں تو ساکت تھا..... تو کیا وہ بچی ہوا میں گردش کر رہی تھی، حسن نے اسے دیکھ کے مارے حیرت کے سانس ہی روک لی تھی۔

ایکدم اس عجیب بچی کی آنکھیں حسن سے ہٹ کے برگد کے درخت پہ ٹک گئیں، حسن نے ڈرتے ڈرتے بچی کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور اسی سمت دیکھا تو برگد کے درخت کی جھکی شاخ پہ ایک بڑھیا الٹی لٹکی ہوئی حسن کو اپنی سرد آنکھوں سے گھور رہی تھی۔

وہ سفید چغہ قسم کا لباس پہنے ہوئے تھی جو اس کے لاغر جسم سے کھال کی طرح چپکا ہوا تھا، سر بالکل صاف اور جاتے چاند کی معمولی روشنی میں بالوں کے بنا کافی نمایاں تھا، طوطے کی طرح لمبی ناک آگے سے غیر معمولی طور پہ بلند اور جھکی ہوئی تھی، کافی بڑا دھانہ جیسے کسی نے تیز، دھار آلے سے ہونٹوں کو چیر دیا ہو۔ اس دھانے سے جھانکتے پیلے دانت، ابھری ہوئی رخسار کی ہڈیوں کی مالک ساتھ تنی ہوئی بھوئیں جن کے نیچے اس کی غیر معمولی بڑی آنکھیں اندھیرے میں بھی چمک سی رہی تھیں لیکن غور سے دیکھنے پر احساس ہوا آنکھوں کی جگہ دو گہرے کھڈے ہیں جیسے کسی نے آنکھوں کو گودا ہو۔

اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ کر حسن کی چیخ ہی نکل گئی۔ اس بیساختہ چیخ کو سن کے بڑھیا کا دھانہ تھوڑا مزید پھیلا، جیسے اس نے حسن کے ڈر سے لطف اٹھایا ہو۔

اچانک بڑھیا کا ایک ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور میل سے بھرے لمبے ناخنوں والے ہاتھ کو حسن کی طرف بڑھا کے ایک انگلی سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

حسن کی دلخراش چیخ کے ساتھ ہی یک لخت کئی کتے اچانک بھونکنے لگے اور ایک دم کوئی وجود اچھلتا، حسن کو چھوتا ہوا برگد کے درخت سے چھلانگ لگاتا ہوا، ویرانے کی سمت دوڑتا گیا۔

حسن کا سارا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ سانس ایک دھونکنی کی طرح چلنے لگی کہ اچانک میاؤں کی آواز سے اسے ہوش آیا۔

نہایت ہی قریب کالا بلا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا اور زبان سے اپنی کالی لمبی دم کو چاٹ رہا تھا۔

اب حسن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا

ہے اور کیوں ہو رہا ہے، اس سے پہلے اس طرح کا کوئی واقعہ اس کی یادداشت میں نہیں تھا، جس کی روشنی میں وہ کچھ فیصلہ کرنے پر قادر ہو پاتا۔

وہ الٹی لٹکی عورت اور لالٹین تھامے چھوٹی بچی ایک دوسرے کی سمت نفرت سے دیکھ رہے تھے، آسمان سے اترتے گولے اس عورت کے بالکل اوپر گردش کر رہے تھے لیکن اس بچی پر کوئی اثر نہیں تھا، نا وہ متاثر نظر آ رہی تھی نا ہی ڈری ہوئی تھی۔

حسن کے پاؤں جیسے زمین سے چپکے ہوئے تھے تو دوسری طرف اس کا ماؤف ہوتا ذہن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قاصر ہو چکا تھا، وہ ٹکٹکی باندھے ان دونوں کی سمت بت بنا دیکھتا رہا۔

اچانک بچی نے لالٹین کو زور سے اس عورت کی جانب پھینکنا چاہا لیکن اوپر گھومتے گولے اس لالٹین کا راستہ روکنے میں کامیاب ہو گئے۔

عجیب مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ اس بدصورت عورت نے ایک گولے کو انگلی سے اشارے کے ذریعے بچی کی سمت گھمایا۔

حسن نے مارے دہشت کے آنکھیں بند کر لیں لیکن اس کارواں رواں کان بنا منتظر رہا اب کیا ہوگا لیکن وہ شاید دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا، بچی محفوظ رہے۔

اچانک سیٹی کی تیز آواز نے حسن کو جہاں ہاتھ کانوں پر رکھنے پر مجبور کیا ادھر ہی بیساختہ آنکھیں بھی کھل گئیں۔

سامنے گولوں کے اوپر لالٹین تیزی سے گردش کر رہی تھی، غصے کی شدت سے اس مکروہ عورت کا چہرہ کافی خوفناک لگ رہا تھا لیکن اس پوری صورت حال کا بچی پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا، وہ مطمئن، سکون سے اپنی ایک ٹانگ پر کھڑی لالٹین کو شاید اپنی آنکھوں کی جنبش سے حرکت میں لا رہی تھی۔

رفتہ رفتہ حسن کے دل کی دھڑکن معمول پر آئی تو اس نے اپنے گھر، اپنے گاؤں کی سمت قدم بڑھانا شروع کیے لیکن جیسے ہی پہلا قدم آگے بڑھایا کالا بلا اچھل کے اس کے سامنے آن کودا، حسن بے ساختہ دو قدم پیچھے کو ہوا اور انجان کھڈے میں پاؤں جانے کی بدولت لڑکھڑا سا گیا۔

بلے نے غراتے ہوئے حسن پر چھلانگ لگائی ہی تھی کہ لالٹین نے اس کی سمت بدل دی، شدید مکروہ آواز فضاء میں بکھر گئی، یقیناً کالے بلے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا۔

حسن جو کھڈے میں گرا دم بخود تھا، ہوا میں ساکت لالٹین کی دھیمی روشنی میں اس بدصورت عورت کو اپنی طرف خون آشام نگاہوں سے تکتے پایا، رکی ہوئی سانسوں کے ساتھ حسن کی متلاشی نگاہوں نے بیتابی سے ایک ٹانگ والی بچی کو تلاش کرنا چاہا تو وہ دور کھڑی کچھ عجیب طرز کا اشارہ کرتی نظر آئی۔

حسن نے بوکھلا کے دوبارہ بچی کی سمت دیکھا تو اسے محسوس ہوا وہ اسے مزید نیچے لیٹ جانے کو کہہ رہی ہے۔

حسن دیوانہ وار کھڈے میں پڑے جھاڑ کو تیزی سے اِدھر اُدھر کرتے اسی میں گھستا چلا گیا۔

اچانک فضاء میں تیز روشنی پھیلی تو حسن نے اندازہ لگایا وہ گولے اب یقیناً حسن کی سے آ رہے ہیں، انجانی طاقت کے زیر اثر حسن نے اپنی زندگی کی جمع شدہ طاقت صرف کر کے اس کھڈے میں ہر ممکن اندر کی سمت اپنے وجود کو لے جانے میں کامیاب ہو گیا

ابھی ہاتھ اندرونی بھربھری مٹی کی دیوار سے ٹکرانے میں کامیاب ہی ہوئے تھے کہ حسن کو محسوس ہوا ہر سو انجانا سا دھواں دھواں پھیل رہا ہے۔

حسن نے تڑپ کے کھڈے سے باہر کی سمت دیکھنا چاہا لیکن کچھ ہوتا تو نظر آتا، ہر سمت نیلے رنگ کا غبار چھا رہا تھا جس کے آر پار دیکھنا ممکن نہیں تھا شاید اچانک ایک تیز غراہٹ نے احساس دلایا بدصورت عورت غصے میں ہے اور یقیناً اب وہ کوئی نا کوئی عمل کرے گی جس کی بدولت حسن یا اس ایک پاؤں والی بچی کو نقصان ہو سکے۔

یہ وقت صرف دعا کرنے کا تھا۔

حسن کے دل نے بے اختیار رب کائنات کو پکارا۔

کاش میں آج چھاؤنی میں ہی رک جاتا کاش میری چھٹی ہی منظور نہیں ہوئی ہوتی کاش میں صبح ہی گھر کے لیے نکلتا کاش میں صبح والی لاری تک اڈے پر رہتا اب میں یہاں ایسے نا قابل بیان حالات میں گھرا ہوا ہوں جن کا کوئی سر پیر نہیں، نا ہی کوئی میری بات مانے گا۔

مانے گا تب جب میں ادھر سے زندہ بچ کے گھر جاسکوں گا نا۔

شہادت تو نہیں ملی لیکن ایسی موت کی کبھی چاہت نہیں تھی اے خدا......

انہی سوچوں میں گھرا حسن کب غنودگی میں جا پہنچا اسے علم ہی نہیں ہوا، اچانک چڑیوں کی حسین چہچہاہٹ سے اس کی کچی پکی نیند ٹوٹی تو وہ بوکھلا کے اٹھ بیٹھا۔

''یقیناً میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔''

حسن نے خود کلامی کی لیکن اردگرد دیکھنے سے احساس ہوا، اب وہ نیلا غبار بہت حد تک کم ہو چکا ہے۔

حسن خود کی ہمت بندھاتا کھڈے سے رینگتا ہوا باہر نکلنے کی جستجو میں لگ گیا میں اتنے اندر آ کیسے آ گیا۔ حسن نے کھڈے کو دیکھتے اور اس میں سے باہر نکلتے ہوئے سوچا۔

''جان بچانے کو بندہ کیا کچھ کر گزرتا ہے آخر۔''

حسن نے زیرلب کہا اور ڈرتے ڈرتے کھڈے سے باہر کی سمت نگاہیں دوڑائیں۔

ہر طرف صبح کا حسین نظارہ تھا لیکن قبرستان کی ویرانی ویسے ہی قائم تھی۔

آہستگی سے قدم رواں کیے اور جب خود کو یقین ہو گیا کہ رات یقیناً کچھ اور ہوا ہوگا، ممکن نہیں چڑیلوں سے سامنا ہوا ہو، ورنہ وہ ابھی زندہ نہیں ہوتا تو سامنے پڑے کالے بلے کے ادھ جلے جسم نے اس کی سوچ کی نفی کر دی۔

ایک دم سامنے سے چاچا جو قبرستان کی رکھوالی کرتے تھے وہ ہانپتے کانپتے آتے نظر آئے۔

''تم......تم ٹھیک ہو پتر۔'' چاچا نے چور نگاہوں سے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تو ٹھیک ہو چاچا لیکن......'' چاچا نے بے ساختہ اس کی بات کاٹی۔

''بس بس باقی باتیں پھر کبھی سہی، ابھی چلو گھر......''

اور پھرتی سے حسن کا ہاتھ تھام کے آگے کو روانہ ہوئے۔

''لیکن چاچا وہ، بات تو سنیں......''

''ہاں ہاں سن لونگا ادھر سے تو نکلو......''

''وہ، رات......''

''حسن......'' چاچا نے تیکھی آواز سے اسے پکارا۔

''خاموش رہو اور چلتے رہو۔''

حسن مصلحتاً خاموش ہو گیا۔ چلتے چلتے چاچا نے ایک دم حسن کو دیکھا اور شاید اپنے رویے کا احساس ہوا ہوگا اسی بنا پہ مسکراتے ہوئے مخاطب ہوئے۔

''ہر چیز کا کوئی نہ کوئی رکھوالا ہوتا ہے، بس اسے یاد رکھنا۔''

''اس جگہ کو رکھوالے کی کیا ضرورت ہے چاچا۔''

حسن نے ماحول کی سنگینی کم کرنے کی خاطر بشاشت سے کہا۔

''اسی جگہ کو سب سے زیادہ کسی رکھوالے کی ضرورت پڑتی ہے پتر، کب کوئی گندا عمل......!'' چاچا نے ایکدم اپنی بات روک کے حسن کو آگے جانے کا اشارہ کیا ''باقی باتیں بعد میں......!''

''چاچا مجھے حاجت ہو رہی ہے۔''

حسن کو مثانے پر بوجھ محسوس ہوا تو مجبوراً چاچا سے باتھ روم کا پوچھنا پڑا۔

چاچا نے حسن کی بات سمجھ کے گردن ہلائی اور اپنے ایک کمرے کے بنے گھر کی سمت رخ کیا، جو قبرستان کے بالکل شروع میں اینٹیں ایک کے اوپر ایک رکھ کے دیواروں کی شکل دے کے گھر کی شکل دینے کی بھونڈی کوشش کی گئی تھی، چاچا کے لیے یہ بھی غنیمت تھا، ان کا کوئی خاندان تو تھا نہیں، صرف ایک بیٹا تھا جو برسوں پہلے اسی قبرستان میں کسی حادثے کا شکار ہو کے ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے بعد چاچا بالکل ہی خاموش اور گوشہ نشین ہو گئے تھے اور حسن کی صورت میں شاید برسوں بعد کوئی انسان ان کی کھولی میں آیا تھا۔

حسن نے کھولی دیکھتے ہوئے تیز رفتاری سے وہ چند قدموں کا سفر طے کیا اور اپنی حاجت پوری کی لیکن جیسے ہی حسن نے طہارت حاصل کرنے کے لیے لوٹے کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ اس کے اختیار سے باہر ہو گیا، حسن نے مزید ہاتھ بڑھایا لیکن وہ مزید آگے ہو گیا۔ ابھی وہ اس کشمکش میں ہی تھا کہ باہر سے چاچا کی آواز آئی۔

''پٹرول کے برابر میں ایک ٹین کا کنستر ہے وہ استعمال کرلے، اس میں ایک مگا بھی ہے۔''
حسن حیرانی سے بت بن گیا، چاچا کو اندر کا حال کیسے معلوم بھلا۔
خیر اس نے پھرتی سے طہارت کی اور نامحسوس طریقے سے لوٹے کو دیکھتے ہوئے باہر کی سمت بڑھا۔
باہر چاچا ایک کونے میں کھڑے آسمان کی سمت دیکھ رہے تھے حسن کو لگا وہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کررہے ہیں، خیر اس نے بھی مٹی ڈالی اور اپنے گھر جانے کی نیت باندھی۔
''وہ چاچا۔''
''دیکھو حسن پتر، رات جو بھی تم پہ بیتی وہ اپنی حد تک ہی رکھنا۔''
''لیکن کیوں؟''
''کون تم پہ یقین کرے گا؟''
حسن نے گہری سانس لے کے اثبات میں سر ہلایا۔
''لیکن میری ایک شرط ہے۔''
''تم شرط منوانے کی پوزیشن میں کب ہو پتر۔'' چاچا نے عام سے لہجے میں حسن کو کہا۔
''چلیں درخواست سمجھ لیں۔''
''اچھا تو یاد رکھنا، اگر تم نے کسی اور سے یہ باتیں کیں تو نتیجے کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔''
ایک ٹھنڈی لہر حسن کے جسم میں دوڑ گئی۔
''آؤ تمہیں کنارے تک لے چلوں، راستے میں تفصیل بتاتا ہوں۔''
حسن نے بھی پھرتی سے اٹھنے میں عافیت جانی۔



''حسن پتر تم کو معلوم ہے نا میرا بیٹا......'' چاچا نے بات ادھوری چھوڑی۔
''ہاں ہاں چاچا...... بالکل سنا ہے اس کے بارے میں۔''
حسن نے چاچا کے اکلوتے بیٹے کو یاد کرتے ہوئے کہا۔
''تو تم کو اس کی......اس کی موت بھی یاد ہوگی۔''
حسن نے ناسمجھی سے چاچا کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔
''وہ کل رات کی ہی تاریخ تھی جب میرا جوان پتر......''
چاچا نے بے اختیار سسکی لی تو حسن کا دل دکھ سے بھر گیا۔
چاچا اس کے گاؤں کا سب سے معمر ترین انسان تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں چاچا ہندوستان سے آیا تھا اور کٹر ہندو ہی تھا جبکہ کچھ کہتے ہیں یہ جگہ ہی ہندوستان میں شامل تھی جب تقسیم ہوئی تو یہ جگہ پاکستان میں آملی، اس مجذوب بندے کا پورا خاندان مر گیا اسی لیے وہ تنہائی پسند ہوگیا۔
چاچا کو لوگ جو بھی سمجھتے لیکن چاچا کی سب ہی عزت کرتے تھے۔ وہ بہت خاموش طبع انسان تھا خاص طور پر جوان بیٹے کی موت کے بعد بالکل ہی خاموش ہوگیا تھا جبکہ کہنے سننے والے بولتے تھے انہوں نے چاچا کا بیٹا کبھی نہیں دیکھا لیکن قصبے کے دوسرے بزرگ لوگ اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ انہوں نے چاچا کے ساتھ ایک لڑکا ضرور دیکھ رکھا ہے۔ اب وہ اس کا اپنا سگا بیٹا تھا یا لے پلک یا چاچا کے کسی رشتے دار کا تھا۔ یہ نہیں معلوم۔
غرض جتنے منہ اتنی باتیں لیکن یہ بات برحق تھی نا کسی کو اس کی ذات سے تکلیف تھی نا ہی وہ کسی کو کچھ بولتا بلکہ الٹا اس کی موجودگی سے راستہ بھٹکنے والے اکثر قصبے کی سمت آجاتے تھے وہ اکثر بروقت اطلاع دے دیتا تھا اگر کسی کے پیارے کی قبر اکھڑ جائے یا تیز بارش سے کوئی قبر بیٹھ جائے۔ ویسے بھی چاچا سارا دن اپنے ٹھکانے پر رہتا تھا کبھی کسی چیز کی اشد ضرورت ہوتی تو قصبے کی حدود میں پایا جاتا تھا ورنہ وہ اکیلا ہی خوش تھا شاید۔
خیر اس وقت حسن چاچا کے سامنے بیٹھا گم صم حساب کتاب میں مصروف تھا۔
''تو چاچا کل جو بھی ہوا وہ حقیقت تھی؟''
حسن کا دل اچھل کے حلق میں آگیا ''اگر میں اس ایک ٹانگ والی بچی کی بات نہیں سنتا تو یقیناً اس وقت......!''
''ہاں پتر اگر میرا لڑکا اس لالٹین والی کی بات مان لیتا

تو میرے پاس ہوتا وہ لیکن...... وہ کیسے بن سکتا تھا بھلا...... اس کی قسمت میں ہی......!" چاچا نے شاید میرے ذہن کو پڑھ لیا تھا۔

"لیکن، میرا مطلب ہے آج کل کے زمانے میں ایسی باتیں...... وہ...... ذہن نہیں مانتا نا۔" چاچا نے مسکراتے ہوئے حسن کی سمت دیکھا۔

"ہاں پتر تم جیسے پڑھے لکھوں کے لیے ایسی باتیں کہاں ماننے والی ہوتی ہیں لیکن تم بتاؤ جو کل تمہارے ساتھ ہوا اگر کوئی اور قسمیں اٹھا کے بھی بولے گا تم یقین کرو گے یا اس کا مذاق اڑاؤ گے؟"

چاچا نے سادگی سے سوال کرتے ہوئے حسن کو آئینہ دکھایا۔

"پتر ہر دور میں سفلی جادو تعویزوں والے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو شیطان سے پناہ مانگنے کا حکم ہے اور اسی لیے شر پسند لوگوں کا پسندیدہ مقام یہ ہے۔

چاچا نے پیچھے قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔

"تو وہ تھا کیا آخر۔" حسن نے لاچاری سے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"حوصلہ پتر حوصلہ...... وہی تو بتا رہا ہوں......"

چاچا نے ایک نظر حسن کو دیکھا اور کھیتوں کے سلسلے کی طرف دوسری نظر ڈالی۔

"آؤ ادھر آ جاؤ...... ادھر بیٹھ جاؤ۔"

"ہاں چاچا میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ چائے بھی پیتے ہیں اور تم میرے سوالوں کا جواب بھی دینا۔

"چائے......" چاچا نے رک کے حسن کو دیکھا اور مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

"اب چائے پینے کی حاجت ہی ختم ہو چکی پتر لیکن چلو تم تو پی سکتے ہو۔"

چاچا نے فتو کے ڈھابے کی سمت قدم بڑھائے تو حسن کو احساس ہوا کب سے گلہ خشک تھا۔

حسن نے اپنے لیے ایک کپ کا کہا اور منتظر نظروں سے سامنے گم صم بیٹھے چاچا کو دیکھا جو جھریوں سے بھرے ہاتھوں کو اک ٹک دیکھ رہا تھا۔

"تو تم کیا بتا رہے تھے۔"

حسن نے گلا کھنکھارتے ہوئے آہستگی سے چاچا کو مخاطب کیا تو اس نے حسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے گویا عہد سا لیا۔

"دیکھ حسن غور سے سن اور یاد رکھ یہ بات تیری حد تک رہے ورنہ میرا کوئی ذمہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے؟"

حسن نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سر ہلایا لیکن ایک سنسنی سی دوڑ گئی اس کے پورے جسم میں۔

"اچھا تو سنو۔"

یہ قبرستان تقریباً چھ سو سال پرانا ہے اور وہ برگد کا درخت کسی کو یاد نہیں کتنا پرانا ہے تم کو اس کی جڑیں دیکھ کے اندازہ ہو جاتا ہوگا شاید خیر تو یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے جب ادھر پاس ہی شمشان گھاٹ بھی ہوتا تھا۔ شیطان صفت لوگوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ قبرستان اور شمشان گھاٹ کے بیچ کی پگڈنڈی کے کنارے جابجا لوگوں نے سفلی عملیات کرنے کا ٹھکانہ بنا لیا تھا کیونکہ قبرستان سے لاش نکالنا پھر مشکل تھا لیکن ارتھی جلانے کے بعد جو ہڈیاں رہ جاتی تھیں وہ لینا قدرے آسان تھا۔ خاص طور پر جب کسی عورت کو بھی اپنے پتی کے ساتھ ستی کرنا ہوتو۔

تم کو معلوم نہیں ہوگا شاید مردے کو ڈنڈے سے مارتے ہیں الٹتے پلٹتے ہیں تا کہ وہ پوری طرح جل جائے اور اس کی راکھ گنگا میں بہا سکیں۔ یہ پورا عمل کافی لمبا ہے تو لوگ ارتھی کو آگ لگاتے ہی کچھ وقت بعد چلے جاتے تھے باقی کام پنڈت کا ہوتا تھا۔ وہ ارتھی جلنے تک وہی رہ کے اشلوک پڑھتا رہتا تھا۔ ارتھی کے جلنے کے بعد بچی کچی ہڈیاں جمع کر کے کوزے میں رکھنا اور گھر والوں کو دینا اگلے دن اس کے لیے ہون کا بندوبست کرنا یہ سارا عمل صرف اونچی ذات کے ہندوؤں تک محدود تھا۔ باقی رہی نچلی ذات تو ان کے پاس کبھی اتنے پیسے ہوتے کہ وہ مکمل ارتھی جلانے کا بندوبست کر سکیں بس چندہ کر کے اتنی ہی لکڑیاں جمع ہوتیں کہ وہ ارتھی جلائی جا سکے۔ خیر یہ تو الگ بات ہے۔

اصل بات یہ تھی کہ قبرستان کی بہ نسبت شمشان گھاٹ میں سفلی عمل زیادہ آسان تھا اور اس زمانے میں ان عاملوں

کی بہتات تھی۔

انہی دنوں ایک چمار خاندان کا لڑکا چار جماعت پڑھ گیا جب تک اونچی ذات کو علم ہوتا وہ لڑکا باغی ہو چکا تھا۔ تقریباً ہاتھوں سے نکل گیا اس کے لیے یہ بات ہضم کرنا مشکل تھی کہ ایک جیسے انسان کیسے اچھوت ہو سکتے ہیں کہ برہمنوں کے گھر کام کرنے کے بعد وہاں کی عورتیں ہلدی ملا پانی ڈال کے گھر پاک کرتی تھیں کیونکہ صفائی والی اچھوت عورتیں ہوتی تھیں۔ ویسے یہ کام آج بھی ہوتا ہے ادھر پرلی طرف۔

تو بس یہ سمجھو اس تفریق کو اس اچھوت لڑکے راجو کے لیے سمجھنا مشکل تھا یا یوں بولو شاید سمجھ بھی جاتا لیکن دو چار کتاب پڑھ کے اب اس کے لیے یہ بات ہضم کرنا مشکل ترین ہو چکا تھا۔

اس نے پہلے پہل شمشان گھاٹ سے استیوں کو جمع کرنے سے منع کر دیا کہ جب زندہ اونچی ذات سے ہم نیچے ہیں تو مرنے کے بعد کیوں ان کی ارستیاں ڈھونڈ کے جمع کریں۔ یہ بات خیر کچھ عرصے دبی رہی پھر جب بات کھیل کود کے میدان سے ہوتی بڑوں تک آئی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ راجو نے چھوٹی موٹی لڑائیوں کے بعد اب چوریوں کی طرف رخ کر لیا تھا کہ پیسے تو سب کے لیے پاک ہیں کیا اچھوت کیا اونچی ذات اور پیسہ ہر ایک کے لیے اونچا ہے۔ جس کے پاس لکشمی وہ مہان ہو جاتا ہے۔

اس کا یہ عمل اس کے پورے خاندان کے لیے موت کا پیغام بن کے اترا علاقے کے بااثر برہمن ذات کے لوگوں نے دوسروں کے لیے باعث عبرت کے لیے راجو کی ماں معذور باپ اور چھ چھوٹے بہن بھائیوں کو زندہ جلا دیا۔ تین دن تک ان کی ادھ جلی لاشیں اسی برگد کے نیچے پڑی رہی ہاں یہ برگد اس وقت گاؤں کی سرحد متعین کرتا تھا۔ اس کے بعد شمشان گھاٹ، قبرستان اور جنگل کی سرحد شروع ہو جاتی تھی اور ان تینوں کے سنگم پہ اچھوتوں کا خاندان بستا تھا۔ اس زمانے میں چند ہی مسلمان گھرانے تھے جو امن امان سے رہتے تھے بس سمجھو یہ مذہب کی آگ اتنی نہیں پھیلی تھی۔ بھجن کے وقت بھجن اذان کے وقت اذان دینے کی کھلی چھوٹ تھی۔ کیا رام کیا امجد کیا خان کیا سکھ سب سکھ شانتی سے رہتے تھے۔

ہولی، بسنت، محرم، سب کا سانجھا ہوتا تھا لیکن صرف ہلا گلہ کی حد تک۔ کھانے پینے کے معاملے میں ہندو ہمیشہ کی طرح کٹر ہی تھا وہ کسی کو اپنی رسوائی کی سرحد تک جانے نہیں دیتا تھا نفرت ان کے خون میں ہے شاید ہاں تو جب تک راجو کو معلوم ہوتا اس کا پریوار جل کے خاک ہو چکا تھا راجو کو ان کی ارستیاں تک نہیں ملیں کیونکہ گاؤں کے سرپنچ نے پہلے ہی ادھر پہرہ بٹھا دیا تھا اور ارستیاں جمع کر کے گٹر میں بھی بہا دی تھیں لیکن اس بات کا پورا انتظام کیا تھا کہ یہ بات من و عن راجو تک پہنچ جائے۔

راجو کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے سب سے پہلے سرپنچ کی چودہ سالہ بیٹی کو خراب کیا اور اس کو برہنہ کر کے اسی کی ساڑی سے ہاتھ پاؤں باندھ کے چلتا بنا لیکن اپنا نام ضرور بتا گیا تھا تاکہ وہ لڑکی اپنے باپ کو بتا سکے لیکن لڑکی کا باپ ہوشیار تھا وہ یہ بات پی گیا ورنہ پوری برادری میں اس کی تھو تھو ہو جاتی۔

سرپنچ کے بعد راجو نے باری باری سارے ہی ذمہ داروں کی طرف رخ کیا اور بساط بھر نقصان پہنچایا اور اپنے نام کا ہر سو ڈنکا بجوایا ستم یہ ہوا اس کے نام کی مشہوری اس علاقے کے ایک سفلی علوم کے ماہر جگن ناتھ تک بھی جا پہنچی اور وہ بھی ایک اچھوت ہی تھا اور تقریباً سو سال کا تھا بلکہ کہنے والے کہتے تھے اس میں کسی گندے انسان کی روح ہے جو مرنے کے بعد کسی دوسرے کے جسم میں حلول کر جاتی ہے اس طرح وہ کبھی نہیں مرتا لیکن اس کے لیے عمل کرنا پڑتا ہے اور وہ عمل اتنا سخت ہوتا ہے کہ عام انسان سوچ بھی نہیں سکتا لیکن راجو جیسے لوگ جو اپنی پیدائش سے ہی الگ ہوتے ہیں ان کے لیے وہ عمل مشکل نہیں ہوتا۔

جگن ناتھ نے راجو کی انہی خصوصیات کی وجہ سے اسے اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دیا تھا تاکہ جب جگن راجو کو اپنے عمل کے لیے استعمال کرے تو وہ بخوشی اس مکروہ عمل کرنے کو راضی ہو جائے کیونکہ اس مخوص عمل کی شرط یہ ہوتی ہے کہ اسے کرنے والا اپنی مرضی سے وہ عمل کرے گا کوئی زور زبردستی نہیں ہو سکتی۔

اسی شرط کے زیر اثر جگن نے پیار محبت سے راجو کو اپنے

جال میں جکڑا اور اس کو آہستہ آہستہ اپنے علوم کی طرف راغب کرنا شروع کر دیا لیکن یہ الگ بات تھی کہ جگن راجو سے مانوس ہو گیا اور اسے بالکل اپنی اولاد کی طرح پالنے لگا۔

راجو کی اپنی بھی خواہش طاقت حاصل کرنے کی تھی اسی لیے وہ جگن کا ساتھی بن گیا بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ بھی جگن کو اپنے باپ کی جگہ ہی رکھنے لگا تھا۔

جہاں جگن نے اس سے پہلے اپنا کوئی شاگرد اتنا ذہین نہیں پایا تھا تو دوسری طرف اس عمر میں اس کو پلی پلائی اولاد مل گئی تھی۔

جگن کو اپنا ہر عمل راجو کو سکھانے میں مزہ آنے لگا کیونکہ وہ اکیلا ایسا شاگرد تھا جو ہر قسم کا جاپ کرنے پر تیار رہتا تھا، اب وہ شمشان گھاٹ میں رات گئے کوئی عمل ہو یا قبرستان میں تازہ دفن کیے مردے کی لاش نکال کے اس کے بال جلانے ہوں۔ راجو کو دھن دولت کی اتنی چاہ ہو چکی تھی کہ وہ اچھا برا سب بھلا چکا تھا۔

وقت گزرتا گیا اور جگن کے مرنے کا وقت نزدیک آ گیا اب راجو کو اپنا آخری عمل کرنا تھا پھر وہ جگن کی جگہ لے لیتا لیکن اس کے لیے پورن ماشی کی رات برگد کے درخت تلے چھ گھنٹے کا ایک عمل کرنا تھا، چھ گھنٹے مسلسل کنواری کنیا کے خون سے اشنان کرتے ہوئے۔

چھ گھنٹے تین کنوری کنیا۔

کنیا کو رات چاند نکلتے ہی بلی چڑھانا تھا تا کہ اس کا خون کا ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو۔ اس کے لیے راجو کے شاطر دماغ نے آسان حل نکالا۔ لڑکیوں کو اس طرح برگد کے درخت پہ الٹا لٹکایا جائے کہ ان کا خون سیدھا نیچے بیٹھے راجو پہ گرتا رہے اس طرح اشنان بھی ہوتا رہتا اور راجو جاپ بھی کرتا جاتا۔

لیکن پورنماشی میں صرف چھ دن رہتے تھے اور تین لڑکیوں کا بندوبست آسان نہیں تھا لیکن دوسری طرف تھا راجو جو اپنے خاندان کو سزا دینے والوں کو ابھی تک بھولا نہیں تھا اس نے دو زمینداروں کی بیٹیوں کو نظر میں رکھا اور ایک مخصوص جڑی بوٹی کی مدد سے ان کو بے ہوش کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔

صرف انتظار تھا تو درگا ماں کی پوجا کا۔ اس پوجا میں صرف کنواری کنیا ہی حصہ لیتی تھیں کوئی بھی پرش اس سے مندر کے آس پاس بھی نہیں بھٹکتا تھا سوائے پنڈتوں کے۔ ہر ایک کو علم تھا اونچی ذات والے اس پوجا میں شرکت کرتے ہیں تو باقی لوگ از خود ہی اپنے گھروں تک محدود رہتے تھے۔

راجو کے لیے کسی پنڈت کا بہروپ بھرنا کیا مشکل کام تھا اس نے اپنے گرو جگن ناتھ کی مدد سے پنڈت کا روپ بدلا اور تینوں کنیاؤں کو پرشاد کے بہانے وہ بوٹی ملائی ہوئی مٹھائی کھلا دی۔ ان کو مندر کے پیچھے کے راستے سے جگن ناتھ کی مدد سے اپنے ٹھکانے لایا اور ان کو مزید وہ بوٹی سنگھا دی۔

اب پورن ماشی کی رات کا انتظار کاٹے نہیں کٹ رہا تھا دونوں سے جبکہ وہ صرف ایک دن کی دوری پہ تھی اور بلاخر وہ رات آن پہنچی، جس کا جگن کو سو سال سے انتظار تھا۔ اس رات کا سورج طلوع ہونے سے پہلے جگن ناتھ نا صرف امر ہو جاتا بلکہ ایک طاقتور انسان بھی بن جاتا۔

راجو نے اپنے جاپ کے لیے تیز دھار والا چاقو، دو تین صاف کپڑے، رسی، کلہاڑی، ہون جلانے کے لیے چوکی، سیندور، ایک جگہ رکھا اور اپنے گرو کو خاموشی سے تکنے لگا۔ جگن ناتھ نے راجو کو بلایا اور اسے پیار کرتے بولا۔

بھگوان کی سوگند میں نے تجھے سچے دل سے چاہا ہے بالک...... اگر میرا سگا بیٹا ہوتا تو بھی شاید میں تیرے جتنا پریم نہیں کر پاتا۔ نا جانے کیوں تیری اور دل کھینچتا ہے اور......اور......اب میری آتما تیرے شریر میں آ جائے گی
۔

پرنتو......تو بھی میری طرح امر ہو سکتا ہے اگر تو یہ عمل کسی کو سکھا دے تو......

پرنتو گرو میں ابھی تو کیول......

راجو نے جھجک کے اٹکتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

ہاں بالک، جب تو سو سال کا ہونے لگے گا تو کسی کو بھی یہ عمل سکھا دینا اس سے پہلے تیرا کام کیول اپنی شکتیوں کو بڑھانا اور ہر حال میں زندہ رہنا ہے اور جیسے ہی تو سو سال کا

ہو جائے گا تو کسی بھی سمے یہ جاپ کر کے امر ہو سکتا ہے ورنہ تیرا سپنا ادھورا پورا ہو جائے گا۔

جگن ناتھ نے شفقت بھرے لہجے میں راجو کو گیان دیا۔

بالک اب میرا جانے کا سماں قریب ہے لیکن میں تیرے اندر ہمیشہ جیوت رہوں گا مجھے خود سے دور نہیں سمجھنا۔

راجو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہہ نکلی۔اس دنیا میں اگر کسی نے اسے پریم کیا تھا تو وہ یہ ہی جگن ناتھ تھا۔

دبلا پتلا، دھوتی باندھے، ماتھے پہ گہرا لیکن نمایاں تین لکیروں کے ہمراہ وہ ہر وقت کچھ نا کچھ جاپ کرتا رہتا تھا۔

دنیاوی طور پہ بے شک وہ کالا بجنگ تھا، چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کینہ جھلکتا تھا تو پتلے پتلے ہونٹ سفاکی کو ظاہر کرتے تھے۔اس کے سر پر بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی چٹیا کو چھوڑ کے باقی صاف چندیا تھی، جو بقول اس کے ''پنڈتوں'' کو چڑانے کے لیے بطور خاص اہتمام سے یہ انداز اپنا تا تھا۔

دوسری طرف راجو کو اس سے اپنائیت کا احساس ملتا تھا اپنے پریوار کا بدلہ لینے کے لیے لمحہ لمحہ مدد کے لیے تیار، ہر خواہش کا حصول کرنے میں مدد کے لیے کوشاں، خواہاں وہ کوئی بھی کام ہو، ہر کام کے لیے ہر سمے تیار۔

اب اس کے جانے کا وقت تھا تو راجو کو لگ رہا تھا وہ ایک بار پھر یتیم ہو رہا ہے۔

فکر نہیں کرو گرو بس کل رات کی بات ہے۔ایسا جاپ کروں گا تم سکون سے میرے اندر امر ہو جاؤ گے۔

راجو نے مسکراتے ہوئے جگن ناتھ کا حوصلہ بڑھایا۔

لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔



پورے قصبے میں ٹھاکروؤں اور زمیندار کی بیٹیوں کی ڈھونڈیا مچی ہوئی تھی، ہر طرف ہاہا کار ہو چلی تھی لیکن کسی کے وہم و گمان میں بھی راجو کا نام نہیں آ سکتا تھا۔جنگل تک چھان مارا گیا لیکن کسی کا دھیان شمشان گھاٹ کے کنارے بنی جھونپڑی تک نہیں گیا ورنہ شاید کوئی نشانی مل ہی جاتی۔

جہاں ایک طرف کنیاؤں کی گمشدگی کا وبال اٹھا ہوا تھا تو دوسری طرف راجو سمیت جگن ناتھ اپنا جاپ کرنے کے واسطے تیاریوں میں مشغول تھے اور......اور بالآخر وہ وقت آن ہی پہنچا جب پورن ماشی کی رات اور جگن کا امر ہونا طے ہوا تھا۔

''چھوڑ دو مجھے بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔''

سولہ سالہ روپا دیوی نے راجو کی سمت دیکھتے ہوئے نیم مدہوشی میں کسمساتے ہوئے آہستگی سے بڑبڑاتے ہوئے التجا کی جسے راجو نے سننے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کی۔اس کے خیال میں یہ ذرا دیر کا ہوش میں تھا اور سب سے بڑھ کے راجو کے پاس وقت نہیں تھا اور ابھی ان تینوں کو برگد کے اس درخت تلے لیجانا تھا۔

سب سے اہم مسئلہ کسی کی نظر میں آئے بغیر یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا جو مشکل لگ رہا تھا۔ہر سو زمیندار اور علاقے کے جاگیردار پہرا دے رہے تھے لیکن وہ بھی راجو تھا جو شیطان کا چیلا تھا اس نے تینوں کو کالی چادر میں لپیٹا اور شام ڈھلے ہی اس جگہ جا پہنچا۔ایک ایک کر کے تینوں کو جان جوکھم میں ڈالتے ہوئے درخت کی گھنی شاخوں میں چھپا دیا۔کس کا ذہن شاخوں میں لڑکیوں کو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔راجو نے اچھی طرح اطمینان حاصل کیا اور جگن تک خوشخبری پہنچا دی۔

اب انتظار تھا تو چندر ما کے پورے ہونے کا یعنی پورن ماشی کا اور یہ چاند اپنے جوبن پہ آیا اور جگن کا دم اکھڑنے لگا۔راجو نے ڈبڈبائی نگاہوں سے پہلی لڑکی کے ہاتھ کی رگ کاٹی اور اسے اس طرح الٹا لٹکایا کہ قطرہ قطرہ خون سیدھا راجو پہ ٹپکنے لگا۔راجو نے فوراً جاپ کے منتر پڑھنے شروع کر دیے۔

لیکن راجو بھول گیا یہ عمل پوری رات کا ہے اور اس نے باقی لڑکیوں کو وہ بے ہوشی کی جڑی بوٹی مزید سنگھانی ہے ورنہ ہوش میں آنے کا خطرہ تھا اور وہی ہوا۔

پہلی کنواری کنیا کے جسم کا قطرہ قطرہ خون کا بہہ نکلا تو راجو نے منتر پڑھتے پڑھتے دوسری کنیا کے ساتھ بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔مشکل تیسری کے ساتھ ہوئی جب اس کے ہاتھ کی نس کاٹنے کے لیے راجو نے تیز، دھار آلہ اٹھایا

تو اسی وقت وہ لڑکی روپا دیوی نیم مدہوشی سے ہوش کی سمت گامزن ہوئی۔
”ناہی ناہی۔ ہمرے کومت مارو بھگوان کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔ بنتی کرتے ہیں۔“
راجو نے سٹپٹا کے اس کی اور دیکھا اور یہ دیکھنا اتہاس لکھوا گیا
کسا ہوا نوخیز ان چھوا کنورا بدن جو چندر ما کی مدہوش کر دینے والی روشنی میں، سفید لبادے میں اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ دو نشیلی غزالی آنکھیں، ہلکی سی سرخی لیے آنسوؤں سے بھری ہوئی۔ راجو کی سمت تک رہی تھیں چھوٹی لیکن ستواں ناک زیادہ رونے سے سرخی مائل ہو رہی تھی تو گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ کپکپاتے ہوئے مسلسل التجاؤں میں مصروف تھے۔
آہ ایک تیر سا تھا جو جگر کے پار ہوا
جلدی کر راجو رات گزر رہی ہے۔ دیکھ نادان، چندر ما کی اور دیکھ۔ سورج کی ایک بھی کرن پڑ گئی تو سارا عمل ستیاناس ہو جائے گا۔
یکایک راجو کے ذہن میں اس کے گرو جگن ناتھ کی آواز تیز سرگوشی میں گونجی۔
راجو بوکھلا گیا۔
حسین کومل کنیا اتنا نزدیک تھی کہ وہ ہاتھ بڑھا کے اس کا کومل کندن سا بدن چھو سکتا تھا، ہر قسم کی من مانی کر سکتا تھا لیکن کیا ستم تھا کہ راجو کو اسے جان سے مارنا تھا۔ بلی چڑھانی تھی۔ اس کنیا کے خون سے اشنان لینا تھا۔
نہیں بھگوان کے لیے نہیں۔
راجو کشمکش کا شکار ہو چکا تھا۔
جلدی کر بالک جلدی کر...... رات تیزی سے گزر رہی ہے سمے نہیں ہے۔
دو آنسوؤں میں بھیگی نشیلی گلابی آنکھیں
میرے جیون بھر کی محنت ختم ہو جائے گی راجو
مدہم مدہم سی سسکیاں اور سسکیوں سے ہچکولے کھاتا جوان جسم
بالک...... یہ صلہ دے گا تو میرے وشواس کا
لرزتا، کپکپاتا ہوا کومل بدن

راجو...... تو اچھا نہیں کر رہا۔ وشواس گھات مت کر
آہستگی سے نفی میں ہلتا ہوا ریشمی زلفوں سے سجا ہوا سر
راجو راجو آہ...... راجو اچھا نہیں کیا تو نے اس کا حساب دینا پڑیگا تجھے اب۔
دور کہیں فضاء میں گھنٹیوں کے ساتھ پرندوں کی چہچہاہٹ کی ہلکی ہلکی آواز فضا میں پھیلی تو راجو کو خوفناک جھٹکا لگا۔
آہ...... یہ میں نے کیا کر دیا۔
آہ...... گرو...... مجھے شما کر دو۔
آہ...... سارے جیون کا ناس ہو گیا۔
راجو پچھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔
یہ کیا کیا میں نے، کیسے ہو گیا سب کچھ...... ہے رام...... ہے رام...... گھور پاپ ہو گیا یہ تو...... اب کیا ہو گا۔
یہ سارا کیا دھرا اس کنیا کا ہے۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ مجھ سے میرے پتا سمان گرو کو الگ کر دیا۔ میں تیرا جیون اپنے ہاتھ سے لے لوں گا۔
راجو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کے روپا دیوی کا خون خشک ہو گیا، ابھی تو آنسو صاف بھی نہیں ہوئے تھے کہ دوبارہ جان کے لالے پڑ گئے۔
ناہی...... ناہی...... ناہی،
شد و مد سے سر نفی میں ہلاتے روپا دیوی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایک لمحہ گزر چکا جب راجو بہکا تھا اب وہ وہی نیچی ذات کا اچھوت لڑکا تھا جس کے سامنے اونچی ذات کی وہ کنیا تھا جس کی بدولت راجو اپنے پتا سمان انسان سے ایک بار پھر محروم ہو گیا تھا۔
راجو نے پاس رکھے اپنے کپڑوں سے ایک کپڑا اٹھایا اور اپنے جسم پہ لگا خون صاف کر کے وحشی پن سے روپا دیوی پہ ٹوٹ پڑا۔
اگر روپا کو ایک فیصد بھی اندازہ ہوتا کہ اس کی موت اس قدر دہشت ناک ہو گی تو وہ رات خاموشی سے اپنی سکھیوں کی طرح بلی چڑھ جاتی کم از کم عزت تو بچی رہتی۔
اب تو نا صرف عزت سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی بلکہ کومل سے بدن پہ جا بجا زخموں کے نشانات دیکھ کے رونا بھی بھول گیا تھا۔

راجو نے کسی موم کی گڑیا کی طرح توڑ پھوڑ کے رکھ دیا روپا کو لیکن ابھی بھی اس کی وحشت کم نہی ہوئی تھی۔
''صرف تیری وجہ سے میرا گرو مجھ سے ناراض ہوگیا، میں تیری یہ خوبصورتی ہی مٹا دونگا۔''
راجو نے پاس پڑی تیز دھار والی چھری اٹھاتے ہوئے روپا کی طرف پھنکارتے ہوئے کہا۔
آنکھوں کو پھوڑنے کے بعد گہری گہری سانسیں لیتا راجو روپا کے ہونٹوں کو نفرت سے دیکھتا رہا۔
ان ہونٹوں کا نا ہونا ہی اچھا ہے جو کسی کو بھی بہکا دیں۔
راجو نے تیز دھار چھری سے ہونٹوں کو چیرتے ہوئے نفرت سے روپا کے چہرے پہ تھوکا۔
روپا جو پہلے ہی راجو کی وہشت سے گنگ ہو چکی تھی رہی سہی کسر اس بربریت نے پوری کردی۔
راجو غصے اور شرمندگی کے ملے جلے احساس سے اتنا دیوانہ ہو چکا تھا کہ روپا دیوی کے بے جان جسم کو مسلسل ٹھڈن مارتا رہا اور تھک کے وہی گر کے رونے لگا۔
راجو اوندھا لیٹا مسلسل رو رہا تھا اسے احساس ہی نہی ہوا کہ کب اور کہاں سے ایک کالا بلا روپا دیوی کی لاش کے پاس آ بیٹھا اور اپنی زبان سے اس کو چاٹ رہا ہے۔
جیسے جیسے کالے بلے کی زبان روپا دیوی کو چاٹ رہی تھی اسی طرح روپا کا بے جان جسم ہلتا جا رہا تھا۔ مانو اس میں جان آ رہی ہو
راجو روتے روتے سو گیا اسے معلوم نہیں ہوا دوسری طرف روپا دیوی کا بیجان جسم زمین سے ایک انچ اوپر ہوا میں معلق ہو چکا تھا۔
کالے بلے نے آہستگی سے راجو کی سمت رخ کر کے غرانا شروع کیا اور روپا دیوی کو دیکھ کے دم ہلانے لگا۔
روپا دیوی کی گدی ہوئی آنکھوں میں عجیب طرح کی روشنی نمودار ہوئی۔ اس کا چیرا ہوا دہانہ راجو کو ایسے اوندھے پڑا دیکھ کے مزید چرا جیسے مسکرایا ہو۔
کالے بلے نے روپا دیوی کو مسکراتے دیکھ کے اپنی دم سے اس کو متوجہ کیا اور ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ روپا دیوی نے چونک کے کالے بلے کو دیکھا اور اس طرح سر اثبات میں ہلایا جیسے سمجھ گئی ہو اب کیا کرنا ہے۔
کالا بلا برگد کے درخت کے پاس جا کے ایک دم غائب ہوگیا تو اسی پل راجو نے چونک کے روپا کو تلاشنا چاہا لیکن وہ وہاں ہوتی تو ملتی۔
راجو گھبرا کے اٹھ بیٹھا آگے پیچھے ہر طرف دیکھ لیا لیکن وہ نہ ملنی تھی نا ملی۔ راجو نے تاسف سے باقی دو لڑکیوں کی لاشوں کو قبرستان تک گھسیٹا اور کسی کی خالی لیکن پرانی قبر میں دھکیل کے اوپر سے گزارے لائق مٹی ڈال دی۔
راجو کے لیے اپنے گرو جگن ناتھ کی موت اور اس کی جدائی بہت اذیت ناک تھی۔ مرے کو سو درے والی بات روپا دیوی کے ساتھ کیا گیا قبیح عمل اس کو سونے نہیں دیتا تھا۔ وہ دنیا سے منہ پھیرے اب صرف اپنی جھونپڑی تک محدود ہو گیا تھا بستی والے جگن کی وجہ سے اس کو کبھی کبھار کچھ کھانے کو دے دیتے تھے کیونکہ جگن اس بستی کا معمر ترین شخص تھا۔
اب راجو نے ایک طرح سے پرائیشیٹ کا کام شروع کر دیا۔ اس نے قبرستان اور شمشان گھاٹ کے کنارے چکر لگانا شروع کر دیے تھے۔ ساتھ ہی ہر اس بندے پر نظر رکھنے لگا جو اسے کالا جادو یا اسی طرز کا کوئی عمل کرتا دکھائی دیتا۔ خاص طور پر پورن ماشی کی رات کو کیونکہ اسے معلوم تھا پورن ماشی ہر اس منتر جاپی کے لیے اہم ہے جو امر ہونا چاہتا ہے اور اس عمل کے لیے کسی دوسرے زندہ انسان کی بلی بھی لازمی چاہیے ہوتی ہے۔
رفتہ رفتہ راجو نے اپنا بسیرا ہی برگد کے نیچے کر لیا۔
لیکن وہ کیا بولتے ہیں نا۔ انسان کو اپنے کیے کی سزا اسی دنیا میں رہ کے بھگتنا ہوتی ہے تو ایک دن راجو کو برگد کے درخت کے پاس چھوٹی سی بچی ملی جس کا ایک پاؤں کسی کیڑے کے کاٹنے کے سبب زخم سے بھرپور تھا۔ وہ بچی نجانے کسی کے گناہ کا پھل تھی یا کچھ اور مسئلہ تھا لیکن راجو کی زندگی بدلنے میں اس بچی کا نمایاں ہاتھ تھا۔ راجو نے کسی ماہر طبیب کی طرح اس کا ہر طرح سے خیال رکھا لیکن زخم کی نوعیت کچھ اس طرح کی تھی کہ ٹانگ کاٹنی پڑی۔ وقت کے ساتھ وہ بچی بڑی ہوتی چلی گئی لیکن اس کا قد نہیں بڑھا۔ نا صرف قد رک گیا بلکہ نامعلوم وجوہات کی بناء پہ اس کا ایک ہاتھ بھی الگ طرز کا رہ گیا۔ ایک ہاتھ نارمل لمبائی کا تو دوسرا

بے حد چھوٹا۔ خیر کچھ بھی ہو راجو کے لیے وہ بچی دنیا کی سب سے خوبصورت اور قیمتی ترین تھی۔
لیکن وہ یہ بھول گیا تھا مکافات عمل نامی بھی کوئی چیز ہے۔
ہر پورن ماشی کی رات وہ خاص طور پر قبرستان اور شمشان گھاٹ کا چکر لگاتا رہتا تھا تاکہ کوئی اور انسان راجو نہ بن سکے لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔
ایسے ہی ایک رات جب راجو گشت لگا کے واپس اپنی جھونپڑی تک آیا تو کیا دیکھتا ہے اسی برگد کے درخت تلے روپا دیوی الٹی لٹکی ہے اور اس کے ہاتھوں میں راجو کی وہ بچی لٹک رہی ہے۔ بچی کے ہاتھ لالٹین ہے جس کی لو لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔
''نہیں.....نہیں.....!''
راجو دیوانہ وار چیختا ہوا روپا دیوی کی سمت بھاگا لیکن وہ راجو کے پیچھے ہو چکی تھی راجو اپنی جھونک میں بھاگتا ہوا درخت سے ٹکرایا اور گر گیا روپا دیوی نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔
''مجھے معاف کر دو دیوی۔''
روپا نے مزید تیزی سے بچی کو جھولا جھلایا۔
''نہیں.....ایسا نہیں کرو.....جل جائیگی یہ۔''
روپا نے کٹیلی نگاہوں سے راجو کو دیکھا اور پھونک مار کے لالٹین کی لو کو تیز کر دیا راجو نے ایک بار پھر بچی کو بچانے کے لیے چھلانگ ماری لیکن روپا دیوی پھر دوسری سمت چلی گئی۔
راجو کو غصہ آیا۔
''مت بھولو میں کون ہوں۔''
روپا دیوی نے مسکراتے ہوئے راجو کے پیچھے دیکھا۔
راجو نے روپا کی نگاہوں کا پیچھا کیا تو وہ دائیں سمت ایک کونے میں بیٹھے کالے بلے کو دیکھ رہی تھی۔''
''گرو.....گرو۔''
راجو بے ساختہ چیختا ہوا کالے بلے کی سمت بھاگا۔
''دوسری طرف بچی کے منہ سے چیخ سن کے راجو کے قدم ساکت ہو گئے۔ ایک طرف اس کا گرو تھا تو دوسری طرف اپنے ہاتھوں سے پالی ہوئی اولاد جیسی بچی۔
''اب کر فیصلہ بالک۔''
گرو کی آواز فضاء میں گونجی۔
''نہیں نہیں گرو...... مجھے معاف کر دو...... میری غلطی کی سزا اس کو مت دو۔''
''تو نے میرا جیون نرکھ کر دیا راجو کیا سمجھا تھا تجھے تو کیا نکلا۔''
راجو نے روپا دیوی سے نظریں چراتے ہوئے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔
''شما کر دو گرو۔''
''میں شما کر دوں؟ اچھا جا کیا لیکن روپا کیا تجھے چھوڑ دے گی؟''
گرو گرو.....گرووووو
میں نے روپا کو دوسرا جنم دے دیا تاکہ وہ اپنا بدلہ خود لے۔ میں تجھے اپنے ہاتھوں سے نہیں مار سکتا بالک۔ میں نے تجھے واقعی اولاد کی طرح پالا تھا۔
راجو کے مسلسل بہتے آنسوؤں نے نمایاں طور پر واضح کر دیا تھا کہ وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہا ہے۔
کالا بلا اپنی بات ختم کر کے اک ٹک راجو کو دیکھتا رہا اور اگلے ہی پل چھلانگیں مارتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی روپا نے اس بچی کو تیزی سے ہوا میں بلند کیا اور خود بھی غائب ہو گئی۔
راجو کا سانس حلق میں آ گیا۔ اس نے فوراً بھولے بسرے منتر پڑھنے شروع کیے جس کی بدولت بچی ایکدم ہوا میں رک گئی لیکن اسی تیز رفتاری سے وہ نیچے کی سمت آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کی آواز سے راجو کے عین آنکھوں کے سامنے گر گئی گرتے ہی راجو نے پاس پڑی مٹی اٹھا کے منتر پڑھ کے اس کی آنکھوں میں گھسا دی۔
دس، منٹ بعد وہ بچی نظروں سے غائب ہو گئی اور راجو ایک بار پھر اکیلا رہ گیا۔



چاچا نے تھکی تھکی سانس لی اور اپنا سر میز پہ رکھ دیا۔
حسن جو دم سادھے یہ ساری داستان سن رہا تھا اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔
'''چاچا یہ کیا کہانی سنا رہے تھے تم مجھے۔''

چاچا نے آنکھوں کو گول گھماتے ہوئے عجیب طرح مسکراتے ہوئے حسن کو دیکھا اور منہ نیچے کر لیا۔
''بول دو کہ یہ سب جھوٹ ہے ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔''
''اگر تم برگد کے درخت پہ لٹکنے والی عورت کا حلیہ ذہن میں تازہ کرو گے تو تم کو معلوم ہو جائے گا میں نے سچ کہا یا جھوٹ۔ ساتھ ہی اس لالٹین والی بچی کو بھی یاد رکھنا۔''
اور حسن کو چری ہوئی باچھیں اور آنکھوں کی جگہ دو گھڈے یاد آ گئے ساتھ ہی ایک پاؤں والی بچی بھی۔
''اوہ...... اوہ...... نہیں، نہیں...... یہ ممکن نہیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج کے زمانے میں یہ سب......''
حسن نے ہیجانی لہجے میں چاچا کی طرف دیکھتے ہوئے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔
''کیا ہوا...... کیا ہوا؟'' چائے والا بھاگتا چلا آیا۔
''کچھ نہیں جاؤ تم۔''
حسن بوکھلا سا گیا۔ چھوٹو کے جاتے ہی وہ چاچا کی سمت متوجہ ہوا۔
''لیکن پھر وہ راجو وہ گرو، کالا بلا سب؟''
''یاد رکھنا حسن اس دنیا کا ایک صاف اور سچا اصول ہے بدی کا بدلہ بدی، اچھے کا اچھا اور کوئی انسان کسی سے برتر نہیں، اوپر والے کے نزدیک سب برابر ہیں۔ یہ جو ہم اپنی ذات پات دھن دولت کے چکر میں انسانوں کی تفریق کرتے ہیں نا یہ اصل بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔''
چاچا سانس لینے رکا اور تھکے تھکے انداز میں گردن پیچھے کی سمت ڈالی۔
''قدرت کے ان اصولوں سے جو ٹکراؤ کرے گا اس کا حال راجو اور جگن جیسا ہوگا۔''
''لیکن چاچا تم کو یہ سب...... میرا مطلب تم کو یہ سب اتنی تفصیل سے کیسے معلوم۔'' حسن نے جھجک کے پوچھا۔
''پہلے تم کو راجو کا حال نہیں بتا دوں؟'' چاچا نے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں ہاں کیا ہوا راجو اور اس بچی کے ساتھ۔''
راجو نے اس بچی پر وہی عمل کیا تھا جو اس کے گرو جگن ناتھ نے روپا دیوی پر کیا تھا یعنی وہ جیوت تھی لیکن کسی اور دنیا میں اور بعد کے کچھ واقعات نے بتا دیا وہ اب روپا دیوی کے مقابلے میں ہر ایک بے گناہ کی مدد کرنے آن پہنچتی ہے جو انجانے میں اس جگہ پورن ماشی کی رات پھنس جاتا ہے خیر پھر ہندوستان کا بٹوارا ہوا تو یہ جگہ نئے ملک میں آ گئی۔
بٹوارے کے وقت نجانے کتنے خاندان اجڑے، لوگ بچھڑے، قتل ہوئے کیا کیا نہیں ہوا، ظلم اور خون آشام وہ تاریخ لکھی گئی جو رہتی دنیا تک انسانیت کو شرمندہ کرتی رہے اور اسی ہجرت میں ایک دن راجو کی جھونپڑی کے پاس ایک انجان عورت ماں بنی، نہیں معلوم کونسے دھرم کی تھی کس ذات کی تھی، بس بچہ پیدا کرتے ہی وہ پرلوک سدھار گئی۔ بنا کچھ کہے بنا کچھ بتائے۔ راجو نے پہلے پہل انتظار کیا کہ جس کا بچہ ہے وہ آ جائے لیکن جب کوئی نہیں آیا تو اسی نے اس بچے کو پالنا شروع کر دیا جیسے ہی وہ چودہ سال کا ہوا اسے عجیب عجیب گھناؤں کا سامنا کرنا پڑ گیا جیسے وہ دیکھتا برگد کے درخت تلے کوئی عورت الٹی لٹکی ہے اور سامنے ایک ٹانگ والی بچی لالٹین لیے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے اس کی بات پر کوئی یقین نہیں کرتا تھا سوائے راجو کے۔
راجو نے اسے بہترا سمجھایا اگر کبھی حقیقت میں ایسا ہو تو لالٹین والی بچی کی بات سننا اس کے کہنے پہ چلنا لیکن اس نے نہیں مانا اور وہ بھی راجو کو چھوڑ کے چلا گیا۔
یہ انتقام کی ایک شکل تھی جو شاید روپا دیوی نے راجو کے لیے پسند کی تھی۔ بھری پوری دنیا میں ایک بھی فرد راجو کا نہیں تھا وہ جس سے دس منٹ بات کرتا اس کے پریوار کے ساتھ کچھ نا کچھ گھٹنا ہو جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ راجو سمجھ گیا اور وہ خود ہی سب سے کنارہ کش ہو گیا۔
چاچا نے اداسی سے حسن کی طرف دیکھتے ہوئے بات ختم کی۔
''تو کیا وہ راجو مر چکا ہے؟''
حسن کا سوال سن کے چاچا کے چہرے پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔
وہ جب تک سو سال کا نہیں ہوتا مرنا اس کی قسمت میں نہیں

اور سو سال بعد پھر اس کی مرضی وہ مرنا چاہے یا اپنے گرو سے سیکھا جاپ کسی اور کو سکھا کے امر ہونے کی کوشش کرے۔“

”تو وہ......“

”بھگوان کی کرپا سے وہ سو سال کا ہو گیا۔“

”کب......!“ حسن کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”کل......!“

”کہاں ہے وہ۔“

”تیرے سامنے بیٹھا ہے۔“

حسن کے ہاتھ سے چائے کی چینک گر گئی بے ساختہ اسے اٹھانے کو جھکا تو میز سے ٹکرا گیا، مزید بوکھلا کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، میز سے ٹکرانے سے چائے کا پیالہ اور پیتل کا گلاس بھی نیچے گرے جسے دیکھ کے فتو فوراً حسن کی سمت لپکا، فتو کو پہلے ہی چھوٹو نامی بچہ حسن کے چیخنے کا بتا چکا تھا۔

”کیا ہوا حسن بھائی؟“

فتو کھوکھے والے نے گھبرا کے حسن کو جھنجوڑا ساتھ ہی ترچھی نظروں سے کپ کو دیکھ کے اپنے نقصان کا اندازہ لگایا۔ حسن نے بوکھلا کے نیچے گرے پیتل کے گلاس کو دیکھا اور سامنے بیٹھے چاچا کو لیکن وہ ہوتا تو نظر آتا۔

”چاچا او چاچا۔“

”کون سا چاچا، بھیا...... کیا ہوا تم کو...... جب سے آئے ہو نجانے کس سے باتیں کیے جارہے ہو۔“

”کیا؟“ حسن نے چیخ کے فتو کو گھورا۔

”میں اتنی دیر سے قبرستان والے چاچا سے بات کر رہا تھا، تمہیں وہ نظر نہیں آرہے تھے کیا۔“

”کیوں مذاق کر رہے ہو بھیا، ان کا تو کل انتقال ہو چکا تم کیسے ان سے باتیں کر سکتے ہو۔“

حسن کی ریڑھ کی ہڈی تک سنسناہٹ دوڑ گئی۔

”ل......لا......ل......لیکن......وہ ابھی ادھر......“

”ہاں تم نجانے کیا کیا بولے جارہے تھے میں دیکھ رہا تھا، شاید رات کے جاگے ہو اسی لیے۔“

فتو زمین پہ گری چینک اور پیالی کی کرچیاں اٹھاتے ہوئے بولا۔

”فتو میں قسم کھا سکتا ہوں تو میرا یقین کر میں ابھی قبرستان والے چاچا سے ہی بات کر رہا تھا۔“

”اچھا اچھا بھیا تم ٹھیک بول رہے ہو اب جاؤ فروزاں خالہ انتظار کر رہی ہوگی تمہارا۔“

”ہیں؟“

حسن نے غائب دماغی سے فتو کو دیکھا۔

”بھیا، ماں تمہاری، فروزاں خالہ......انتظار...... جاؤ اب ادھر سے۔“ فتو نے بیزاری سے ایک ایک لفظ پہ زور دے کے کہا۔

”اچھا ہاں لیکن......وہ چاچا......تم نے میرا یقین کیا نا فتو۔“

حسن نے لاچاری سے فتو کی طرف اس یقین سے دیکھا جیسے اگر وہ ہاں کرے گا تو معاملہ سلجھ جائے گا۔

فتو کو ایکدم حسن پر ترس آگیا۔

”آؤ بھیا اِدھر آن کے ذرا دیر کو کمر ٹکا لو۔“

حسن کسی بیمار لیکن کمزور انسان کی طرح لڑکھڑاتا ہوا فتو کے کھوکے کی سمت قدم بڑھانے کی کوشش کرنے لگا اور چار قدم چلتے ہی بے ہوش ہو کے گر گیا اور اس کی باچھوں سے خون کی ایک باریک لائن سی بہہ نکلی۔



پچیس سالہ شکیل جو اپنے عزیز اور بچپن کے دوست حسن کے ناگہانی انتقال کے وقت گاؤں میں موجود نہیں تھا، وہ ایک ماہ بعد گاؤں آتے ہی اپنے دوست حسن کی قبر پہ پھول چڑھانے قبرستان کی طرف گامزن تھا، اسے منع کیا گیا تھا کہ مغرب کے بعد سنسان رستے کو اختیار نہیں کرنا، صبح ہونے دو لیکن شکیل کو اپنے بچپن کے سنگی ساتھی کی موت کا ابھی تک یقین نہیں تھا، شاید وہ اس کی قبر دیکھ کے ہی صبر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پرانی یادوں کو دہراتے، اپنے دوست کو یاد کرتے شکیل کو بالکل علم نہیں ہوا کب اس کے عین پیچھے جو برگد کا درخت ہے اس پر آہستگی سے ایک عورت کا ہیولہ نمودار ہو رہا ہے اور قبرستان کی ٹوٹی دیوار کے پار ایسی روشنی ہچکولے کھا رہی تھی جیسے کوئی ہاتھ میں لالٹین تھامے آگے بڑھ رہا ہو۔



زیگی

سید محمود حسن

رات بارہ بجتے ہی جھیل کے اس پار ڈراؤنی آوازیں آنا شروع ہو جاتی تھیں جیسے کوئی بین کر رہا ہو۔

پکنک منانے والے نوجوانوں کو پیش آنے والے پراسرار واقعات کی روداد، چوتھا رنگ

اس پہاڑی سلسلے کو نہایت ہی پراسرار اور خوفناک سمجھا جاتا تھا، کیونکہ یہاں پر رات کے وقت ڈراؤنی آوازیں، خوفناک شکلوں والے لوگ گھومتے اور پرواز کرتے ہوئے نظر آتے، ان کے سروں پر سینگ ہوتے، کوئی بھی شخص اس سلسلے کی طرف جانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، شروع میں یہ پہاڑی سلسلہ جو کرسٹل جھیل اور بلند پہاڑوں کے لاتمناہی سلسلے پر مشتمل تھا، ایک طرف گھنا جنگل، سامنے جھیل اور اس کے پیچھے پہاڑ، شروع میں بہت سے منچلے نوجوانوں نے وہاں جانے کی کوشش کی، جس میں سے بہت سوں کی لاشیں ملیں اور بہت سے لوگ تو ایسے گم ہوئے کہ اُن کا پتہ تک نہ چلا۔

رات کے بارہ بجتے ہی آج پھر کرسٹل جھیل کے اُس پار سے رات ہوتے ہی ڈروانی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں، جیسے کوئی بین کر رہا ہو، غیر انسانی سی آوازیں، جیسے بہت سے بھوت اور چڑیلیں ایک ساتھ مل کر رو رہے ہوں، یہ آوازیں اگر کوئی سن لے تو اُس کا دل پھٹ جائے، اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے، اور کیوں نہ دبکتے، کتنے ہی نوجوان ان آوازوں کے پیچھے جاتے ہوئے لاپتہ ہو گئے تھے اور اُن کا سراغ آج تک نہیں مل سکا تھا، کیونکہ آگے ڈائنا سور جیسی بلائیں تھیں، ناچنے والے بھوت، آسیب اور ایک خوفناک بلا بھی جسے لوگ زیگی کے نام سے جانتے تھے۔

کرسٹل جھیل کے کنارے جیسے ہی رات کے بارہ بجے، ایک ڈروانی اور ہیبت ناک شکل نے رقص شروع کر دیا۔ اور پھر دوسری بلا، اور پھر اسی طرح کی تیسری بلا، بلا کے سر پر سینگ تھے، بڑے بڑے ہاتھی جیسے کان، لمبے جھاڑ جیسے بال اور یہ رقص کے ساتھ ساتھ مختلف آوازیں بھی نکال رہی تھیں اور تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ بلائیں اچانک غائب ہو گئیں، شاید کوئی اُن سے بھی بڑی بلا آ رہی تھی، اور پھر ایسا ہی ہوا تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ ناچنے والی بلائیں غائب ہو گئیں، نجانے وہ کہاں چلی گئی تھیں، شاید اُن سے کوئی بڑی بلا آ رہی تھی، اور پھر ایسا ہی ہوا ایک ڈائنا سور پہاڑی کے دامن سے نمودار ہوا، اور وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے آ گیا جیسے اپنے کسی شکار کی تلاش میں ہو، اور ابھی وہ ڈائنا سور گھوم ہی رہا تھا، جیسا کہ لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ پہلے ایک ڈائنا سور آتا ہے، حالانکہ یہ بات ہی ناقابل یقین تھی، کیونکہ ڈائنا سور تو لاکھوں سال پہلے پائے جاتے تھے، اور اس زمانے میں موجود نہیں تھے، یہ کوئی آسیبی بلا ہی ہو سکتی تھی جو کہ روپ دھار کر آئی تھی۔ اور جب بھی یہ ڈائنا سور آتا تھا، تو اس کے جسم پر زیبرے جیسے نشان تھے، اس لئے لوگ اسے زیگی کے نام سے جانتے تھے اور یہ نام خوف و دہشت کی علامت تھا۔ یہ بلا گرگٹ کی طرح اپنے سات رنگ



بدلتی تھی۔

یہ ایک قوی ہیکل گرگٹ تھا جو کہ خود بھی ڈائنا سور میں مل رہا تھا، بس صرف فرق اتنا تھا کہ وہ اپنے رنگ بدل رہا تھا۔ ڈائنا سور تو قدیم زمانے میں ہوتے تھے، پھر یہ نجانے کہاں سے نمودار ہو گیا تھا۔ یہ ایک ایسا گرگٹ یا گرگٹ نما ڈائنا سور تھا اور اسے لوگ زیگی کے نام سے جانتے تھے، کیونکہ جب وہ آتا تھا تو آسیبی آوازیں آتی تھیں جو کہ زیگی زیگی کہہ رہی ہوتی تھیں اور پھر وہ بلا پہاڑی کے دونوں طرف گھومتی رہتی تھی۔

گاؤں کے بہت سے لوگ لاپتہ بھی ہو گئے تھے، جو بھی اس جھیل کی کھوج میں گیا اور پراسرار آوازوں کا راز جاننے کی کوشش کی، وہ پھر واپس نہیں آیا، سب سے پہلے ان بلاؤں کا پتہ گاؤں والوں کو فضلو بابا کے ذریعے چلا جو کہ رات کو جھیل کے کنارے بیٹھ کر ستار بجایا کرتا تھا اور لوک گیت گایا کرتا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے اس بلا کو دیکھا اور وہ نجانے کس طرح اُس بلا سے بھاگنے میں کامیاب ہوا۔ جب سے فضلو کی زبانی ان واقعات کا علم ہوا تو لوگوں نے اس بات کی تصدیق کرنے کی کوشش کی، مگر جب وہ وہاں گئے تو انہی آسیبی آوازوں نے اُن کا استقبال کیا اور جیسے ہی انہوں نے ڈائنا سور نامی بلا کو آتے ہوئے دیکھا، وہاں سے اپنی اپنی جانیں بچانے کے لئے دوڑیں لگا دیں۔

پھر اُس کے بعد کئی جیالے اور سر پھرے نوجوان اس پراسرار جھیل کی دوسری طرف گئے پر کبھی واپس نہ آسکے۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے لاپتہ ہو گئے۔ اس مرتبہ بھی یونیورسٹی کا ایک گروپ تفریحی دورے پر نکلا تھا،

پہاڑی علاقوں کی دلکشی اور سرسبز و شاداب علاقے نے انہیں اپنی کشش سے اس طرف آنے پر مجبور کر دیا تھا۔اس گروپ میں تین دوست فرید ملک کے ایک بڑے صنعتکار کا بیٹا تھا، احمر ایک سیاستدان کا اور بلال بھی ملک کے ایک بڑے تاجر کا بیٹا تھا۔ تینوں بڑے ذہین اور جوشیلے تھے، اُن کے ساتھ ماریہ، فاریہ بھی تھیں جو کہ انہی کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں اور جرنلزم میں ماسٹرز کر رہی تھیں۔ اُن کا کیمپ خوبصورت جھیل کرسٹل کے کنارے تھا، کرسٹل جھیل کا نام شاید اس لئے تھا کہ اس کا پانی شیشے کی طرح صاف تھا یعنی کہ کرسٹل جیسا، طرف پہاڑ کے ساتھ ایک چھوٹا سا راستہ نظر آ رہا تھا جو کہ نجانے پہاڑوں میں کہاں جا رہا تھا، شاید کہیں دور جا کر جھیل کا کنارہ تھا۔

''کیا خیال ہے، جھیل کے اس طرف اتنا حسن و خوبصورتی ہے تو دوسری طرف نجانے اور بھی حسین قدرتی مناظر ہوں گے۔'' احمر نے جھیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، اُن کے ساتھ ایک مقامی گائیڈ گُل خان بھی تھا۔

''نہیں صاحب اُس طرف جانے کا سوچنا بھی نہیں، نجانے کیسی کیسی بلائیں وہاں رات کو نکلتی ہیں، وہ ساری جگہ آسیب زدہ ہے، جو وہاں گیا کبھی واپس نہیں آیا۔'' گُل خان نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ارے میاں، کوئی جن، بھوت نہیں ہوتے، یہ سب انسانی ذہنوں کی پیداوار ہے۔''

تمام دوستوں میں مہم جوئی کیونکہ فطرتاً پائی جاتی تھی اور اب تو سننے میں آیا ہے کہ وہاں پر ایک ست رنگی بلا آ گئی ہے'' گل خان نے کہا۔

''ست رنگی بلا، وہ کیا ہے۔'' بلال نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا آپ نے گرگٹ دیکھا ہے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔''

''وہ ایک طویل القامت گرگٹ ہے جس کا قد انسانوں سے بھی زیادہ اور چوڑائی ہاتھی جیسی ہے اور یہ ہمیشہ رات کو نکلتی ہے، اور اس کے منہ سے آگ یا زہریلی پھنکار نکل رہی ہوتی ہے۔ ہاں وہاں پر پہلے بھوتوں اور آسیبی قوتوں کا ڈانس ہوتا ہے۔ اور پھر زیگی آتی ہے۔

یہ زیگی کیا ہے بھئی؟، احمر نے حیرت سے سوال کیا۔

یہ ایک ڈائنا سور نما جانور ہے اور جب وہ آتا ہے تو باقاعدہ زیگی زیگی کی آوازیں آتی ہیں، اور اُس کے بعد زیگی آتی ہے جو کہ ایک رنگ بدلنے والی بلا ہے۔ یعنی ایک بہت بڑا گرگٹ ہے اور جب وہ آتی ہے تو چاروں طرف سے زیگی زیگی کی آوازیں گونجتی ہیں۔

ارے پاگل کوئی بلا یا آسیب نہیں ہوتے، یہ سائنسی دور ہے احمر نے مذاق اُڑانے کے انداز میں کہا۔

تم دیکھنا ہم آج رات جھیل کے دوسری طرف گذاریں گے، اور پھر دیکھیں گے کہ بلائیں آتی ہیں یا نہیں۔

نہیں نہیں، وہاں ہرگز نہ جانا، ورنہ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح سے لاپتہ ہو جاؤ گے۔

گُل خان نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا وہ بلا انسانوں کو کھا جاتی ہے لیکن مہم جوئی ان لوگوں کی فطرت میں پائی جاتی تھی اور وہ جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف منع کرنے کے باوجود روانہ ہو گئے، بلال، احمر اور فرید نے اپنے لائسنس یافتہ ریوالورز اپنے پاس رکھ لئے تھے اور پھر وہ اُسی خوبصورت مقام کی طرف چل پڑے، جہاں بقول گل خان اور علاقے کے لوگوں کے آسیبی بلائیں اور ڈائنا سور نما بلا آتی تھی۔

وہ ایک بڑے برگد کے درخت کے سائے تلے بیٹھ گئے، جہاں پر سامنے ہی کرسٹل جھیل کا شفاف پانی تھا اور چاند کی چمکتی ہوئی چاندنی اور ماحول پر ایک سحر سا طاری تھا، چاند کی روشنی میں دور دور تک کا منظر صاف

نظر آ رہا تھا پھر وہ اُسی طرف روانہ ہو گئے، واقعی وہ جگہ جنت نظیر تھی، خوبصورت شیشم کے درخت، رنگ برنگے پھول اور جھیل کا کنارہ اور ایک طرف پہاڑی سلسلہ جہاں پر ایک راستہ جاتا ہوا نظر آ رہا تھا، گل خان نے کہا وہ صرف انہیں وہاں تک پہنچا سکتا ہے، باقی وہ رات کو وہاں رکے گا نہیں اور پھر ایسا ہی ہوا گل خان انہیں اس وادی میں چھوڑ کر وہاں سے واپس ہو گیا۔

رات اب قریب آتی جا رہی تھی کہ، لیکن یہ لوگ ہلہ گلہ کرنے میں مصروف تھے، ایک طرف انہوں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے ساؤنڈ سسٹم پر گانے چلائے ہوئے تھے، اور وہ ڈانس میں مشغول تھے، چاند کی چاندنی چار سو پھیلی ہوئی تھی اور اُس میں جھیل کا پانی بہت حسین منظر پیش کر رہا تھا۔ اچانک ہوائیں سرسراہٹ سی ہونے لگی، اور پھر ایک چیخ کی آواز سنائی دی، اور انہیں ایسا لگا کہ فضا میں اور بھی بھیانک اور ڈروانی آوازیں شامل ہو گئی ہوں پہلے ایک سینگ والا شخص جس کی شکل بہت ڈروانی تھی، زمین سے اوپر پرواز کرتا ہوا نظر آیا، اُس کی پرواز کے ساتھ ڈروانی آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ ہاہاہا، ڈوڈوڈو، بس عجیب بے معنی سی آوازیں تھیں، اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور شعلہ برساتی ہوئی لگ رہی تھیں، پھر تو ایسے بہت سے افراد فضا میں پرواز کرتے ہوئے نظر آنے لگے، اور اچانک ہی وہاں پر ڈروانی عورتیں ایک طرف سے نمودار ہو گئیں، ماریہ اور فاریہ ڈر کے مارے ۔۔ بے ہوش ہو گئیں۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گذری تھی کی جھیل کے بالکل سامنے پہاڑی کے دامن سے ایک روشنی سی نکلتی دکھائی دی اور پھر بے ہنگم سی آوازیں آنے لگیں۔ یار واپس چلتے ہیں، احمر نے کہا، شاید بلاؤں کے آنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔ نہیں آج ہم ان بلاؤں کی حقیقت جان کر ہی دم لیں گے، انہوں نے ماریہ اور فاریہ کو وہیں چھوڑا اور کہا، چھوڑو یار یہ ڈرپوک اور بزدل لڑکیاں ہیں، ہم انہیں بعد میں ہوش میں لائیں گے، پہلے ان آوازوں کا سراغ تو لگا لیں۔

نہیں یار پہلے انہیں ہوش میں لاتے ہیں، ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ انہوں نے ایک ہیبت ناک منظر دیکھا،

ان سے تقریباً آدھا کلومیٹر دور ایک اور عفریت چلا آ رہا تھا، یہ تو مکمل طور پر ڈائنا سور ہی لگ رہا تھا۔ لیکن اُس کا قد وقامت بھی کسی طور پر ایک بڑے ہاتھی سے کم نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی شکار کی تلاش میں ہو اور جو شے بھی اُن کے قدموں تلے آئے گی اُسے کچل کر رکھ دے گا۔ کہیں سے قسمت کا مارا ایک گیدڑ آ نکلا، اور ڈائنا سور نما عفریت نے ایک سانس لی اور زندہ گیدڑ اُس کے منہ کے اندر چلا آ گیا اور پھر اُس کا منہ بند ہو گیا، مگر یہ خوراک تو اُس کے لئے بہت کم تھی، وہ چاروں طرف اور کسی شکار کی تلاش میں تھا۔

اُدھر زیگی نما بلا چاروں طرف گھوم رہی تھی پر اُسے کچھ بھی نظر نہیں آیا اور پھر وہ ایک طرف بڑھتی چلی گئی، جہاں پر شاید جنگلی جانور چھپے ہوئے تھے، اُس نے اپنا منہ جھاڑیوں میں ڈال دیا، وہاں پر شامت کی ماری چند لومڑیاں بیٹھی تھیں، زیگی نے ایک زہریلی پھنکار اپنے منہ سے اُن پر ماری، اور لومڑیاں جیسے اُن کے زہر کے اثر سے بے ہوش ہو گئیں اور زیگی جلدی ہی اُن لومڑیوں کو ہڑپ کر گئیں۔

احمر نے اپنے پستول سے اُس بلا پر جو کہ ڈائنا سور جیسی تھی فائر کیا اور پھر اُس کے ساتھ ہی ساتھ بلال اور فرید نے اپنے اپنے پستولوں سے فائرنگ کی لیکن بلا تو جیسے لوہے کی بنی ہوئی تھی اُس پر اُن کی گولیاں بیکار ہی ثابت ہوئیں اور پھر اُن کے ریوالور بھی خالی ہو گئے، زیگی اُن کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی، وہ غصے سے جیسے پھنکار سی رہی تھی، اور انہیں لگ رہا تھا کہ وہ تھوڑی ہی دیر میں انہیں ہڑپ کر جائے گی۔ خوش قسمتی سے اُن تینوں دوستوں اور زیگی کے درمیان ایک

چھوٹی چٹان حائل تھی جس کی وجہ سے وہ اُن سے قریب ہونے کے باوجود اُس چٹان کو کراس نہیں کر پا رہی تھی۔ اس لئے پہلے کہ وہ مزید کچھ کرتے کہ فضا میں ایک ناگوارسی بو وہاں پھیلتی چلی گئی اور اُن لوگوں کو اپنا ہوش نہیں رہا۔

جیسے ہی وہ لوگ بے ہوش ہوئے، اُدھر زیگی نامی بلا کم از کم تین گھنٹوں تک ایسے ہی گھومتے رہے، پھر ایک عجیب بات رونما ہوئی، زیگی کا سائز چھوٹی ہونا شروع ہوگئی اور بتدریج وہ چھوٹی ہوتی چلی گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک عام سے نسبتاً بڑے سائز کے گرگٹ میں بدلتی چلی گئی اور اب اُس کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی، اور پھر وہ جیسے بے ہوش ہو کر گر گئی۔ یہ ایک عجیب و غریب منظر تھا، وہ لوگ بے ہوش پڑے تھے، زیگی اپنے سائز چھوٹا ہونے کے بعد واپس جا چکی تھی۔

اور پھر جب اُن کی آنکھ کھلی تو وہاں پر بہت سے لوگ نظر آرہے تھے۔ وہ ایک بڑے ہال میں اسٹریچر پر چمڑے کے بیلٹوں سے بندھے ہوئے تھے، اور مختلف لوگ وہاں پر موجود تھے۔ یہاں پر ایک شاندار ہال بنا ہوا تھے جس میں پانچ کمرے موجود تھے، ایک کمرے پر تختی لگی ہوئی تھی جس پر چیف پروفیسر مارٹن لکھا ہوا تھا، اور دوسری پر ڈاکٹر شوبرا، (ماہر حیاتیات) (زولوجی)، ایک کمرے پر انچارج آپریشن ڈیپارٹمنٹ، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ کوئی زیرزمین آفس ہو۔

اور وہاں پر کچھ لوگ موجود تھے جو کہ شکل سے غیر ملکی لگ رہے تھے۔

آؤ آؤ باہمت نوجوانو، تمہیں ہوش آ ہی گیا، میں ہوں ڈاکٹر شوبرا، اور یہ ہیں ہمارے چیف پروفیسر مارٹن، ابھی ہم تم لوگوں کو اپنا غلام بنالیں گے۔ اور تم سے بیگار لیں گے، ویسے ہی ہمارے پاس مزدوروں کی کمی ہے، پھر وہ اپنے عملے کی طرف پلٹا۔ انہیں انجکشن لگا دو اور یاد رہے ہر تین بعد انہیں انجکشن دینا ہے۔“

چیف نے کہا۔ ”ہر تین دن بعد تمہیں انجکشن لگے گا۔ جس کے بعد تم سب کچھ بھول جاؤ گے، حتیٰ کہ یہاں پر آنا اور مجھ سے بات کرنا بھی اور صرف اور صرف ہمارے غلام بن کر رہو گے۔“ پروفیسر مارٹن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

لیکن ہم سے تم لوگ کیا کام لو گے؟“ بلال نے حیرت سے کہا، ہمیں مزدورں کی ضرورت ہے طاقتور مزدروں کی جو ہمارے لیے ان خفیہ سرنگوں میں کام کر سکیں۔

کیسا کام، اور وہ بلائیں کہاں چلی گئیں؟ اور وہ آسیبی آوازیں اور شکلیں بھی غائب ہوگئیں۔

سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔“ پروفیسر مارٹن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ بس تم کل صبح سے کام پر لگ جاو گے۔ اور فرمانبردار مزدورں کی طرح کام کرو گے اور یہ لڑکیاں یہاں پر ہمارے ڈانسنگ کلب میں ڈانس کریں گی۔ اور اس کے بعد ان کی شادی ہوگی، مارٹن نے ہنستے ہوئے کہا۔

نہیں نہیں ہم ڈانس نہیں جانتی اور نہ ہی ہم شادی کریں گی، ہمیں اپنے گھر واپس جانا ہے۔

نہیں جو یہاں ایک مرتبہ آگیا وہ واپس نہیں جا سکتا۔“ مارٹن نے کہا اور ویسے بھی تمہیں بھی وہی انجکشن والا ڈوز دیں گے تو تم بھی سب کچھ بھول جاو گی اور ہماری مرضی پر چلو گی۔ پروفیسر مارٹن نے سرد لہجے میں کہا۔

یہاں پہاڑی کے دامن میں ایک سرنگ جا رہی تھی، جو کہ وسیع تھی اور اُس میں ایک راستہ نجانے کہاں چلا گیا تھا، ایسا لگتا تھا کہ زیرزمین سے کوئی چیز نکالی جا رہی ہو، شاید یہ کوئی پتھر تھا، قیمتی پتھر۔ ان تینوں کو وہیں لگا دیا گیا، اب انہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا اور وہ صرف ایک مزدور تھے۔ ماریہ اور فاریہ کا کچھ پتہ نہیں تھا، شاید انہیں ڈانس کرنے پر لگا دیا گیا تھا۔

انٹیلی جینس ہیڈ کوارٹر میں اجلاس جاری تھا، اس

اجلاس میں متواتر لاپتہ ہونے والے ہائی پروفائل افراد کی بازیابی کے لیے گفتگو جاری تھی، چیف نے اجلاس کی صدارات کرتے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر شہباز اور انسپکٹر فرقان کیونکہ تم دونوں اس طرح کے کیسز حل کرنے میں شہرت رکھتے ہو، اور تم دونوں کی صلاحیتوں پر ہمیں پورا بھروسہ ہے، اس لئے تمہیں یہ کیس حل کرنا ہے، آخر یہ لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں، اس پہلے بھی وہاں اور بھی لوگ لاپتہ ہو چکے ہیں، لوگوں کے متواتر لاپتہ ہونے سے مختلف اداروں کو یہ ٹاسک دیا گیا کہ اس جگہ کا کھوج لگایا جائے اور اس مقصد کے لئے تم دونوں کا انتخاب کیا گیا ہے، اور وہ وادی کی سمت روانہ ہوگئے۔ سب سے پہلے انہوں نے ضروری سامان اپنے ساتھ لیا اور چھوٹے چھوٹے وائرلیس سیٹ، جن کا رابطہ ہیڈ کوارٹر سے تھا۔

دونوں نے اپنی شکلیں بدل لیں اور اب وہ دونوں، شکاریوں کی صورت میں نظر آرہے تھے، وہ دراصل یہ جائزہ لینا چاہتے تھے کہ ست رنگی بلا، اور ڈائناسور میں کیا صداقت ہے اور کیا واقعی جھیل کرسٹل کے دوسری طرف جن، بھوت یا بدروحیں رہتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ رات کا انتظار کرنے لگے، انہوں نے اپنی ٹیم کو وہیں روک دیا اور دور سے نگرانی کرنے کا کہا اور خود آگے کی طرف بڑھنے لگے، ابھی وہ آگے چلے ہی تھے کہ ایک بوڑھے شخص نے انہیں کہا ارے کہاں موت کے منہ میں جا رہے ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آگے بلائیں رہتی ہیں اور رات ہوتے ہی وہاں پر بھوت آجاتے ہیں۔

ارے ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ فرقان نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ اس لئے کہ ہم خود بھوت ہیں اور ہم سے بڑا بھوت کوئی نہیں ہے۔

''اور وہ شخص کانوں کو پکڑتا ہوا اور خوفزدہ نظروں سے انہیں دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وہاں جھیل کے کنارے پہنچ گئے اور رات کا انتظار کرنے لگے، انہوں نے اپنا پڑاؤ جھیل کے کنارے ہی ڈال لیا تھا، اُن کے ہمراہ اُن کے تین ساتھی اور تھے جو کہ مسلح تھے اور ریوالور اُن کی جیبوں میں تھے۔ رات کی تاریکی میں وہ جھیل کرسٹل کے دوسرے کنارے پہنچ گئے تھے۔ انسپکٹر شہباز نے انہیں وہیں رکنے کا حکم دیا اور فرقان کے ہمراہ آگے بڑھتا چلا گیا، اُن کے پاس وائرلیس سیٹ بھی تھے جو کسی بھی ہنگامی صورت حال سے نپٹنے کے لئے تھے۔

پھر وہ رات کی تاریکی کا انتظار کرنے لگے، اور جیسے ہی رات کے بارہ بجے انہیں آسیبی آوازیں آنا شروع ہوگئیں، جیسے بہت سے بھوت اور بلائیں رقص کر رہی ہوں، اور پھر واقعی انہوں نے ایک بھوت نما سایہ دیکھا جو کہ اُن سے تھوڑے فاصلے پر تھا، اور وہ جیسے رقص کر رہا ہو۔ پھر دوسرا بھوت اور عجیب و غریب شکلوں کی بلائیں۔

کیا خیال ہے ان پر فائر کریں۔ انسپکٹر فرقان نے انسپکٹر شہباز سے سرگوشی میں کہا، نہیں ٹھہرو، پہلے انہیں آنے دو آگے، لیکن بہت دیر گزر گئی اور وہ آگے نہیں آئے۔ اور ایک گھنٹے رقص کرنے اور آوازیں نکالنے کے بعد وہ بلائیں نجانے کہاں غائب ہوگئیں۔

پہلے ایک پہاڑی کے دامن سے ایسا لگا کہ کوئی دروازہ کھلا ہو، اور گڑگڑاہٹ کے ساتھ کوئی عفریت نکلنے لگا، پھر جیسے ایک پھنکار سی سنائی دی جیسے کوئی بڑا اژدھا آرہا ہو، اور واقعی ایک ڈائناسور نما عفریت وہاں نمودار ہوا، اچھا تو یہ ہے وہ بلا، شہباز نے فرقان سے کہا، اس پر فائر کرو، دونوں نے ایک ساتھ فائر کیا، گولی اُس بلا کے لگی، لیکن اُسے کچھ بھی نہ ہوا، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ فولاد یا پتھر کی بنی ہوئی ہو، بلکہ اب وہ بلا مزید غصے میں آگئی تھی، انہوں نے یہ بھی سنا تھا کہ جب یہ بلا آتی ہے تو زیگی زیگی کی آواز آتی ہے۔ اور واقعی انہیں زیگی زیگی کی آواز آرہی تھی۔ جو کہ اُس کی پراسراریت کا ثبوت تھی، اُنہوں نے اپنے ریوالور اُس بلا پر خالی کر

دیئے، پر اُس کا کچھ بھی نہ ہوا۔ اور اب وہ نہتے ہو چکے تھے۔
انسپکٹر فرقان تم یہیں رکو، میں اور اسلحہ لے کر آتا ہوں، فرقان وہیں پر رک گیا، بلا سے وہ اور بھی دور ہو گیا تھا، اُسے یہ خطرہ تھا کہ یہ زیگی نامی بلا کہیں اُسے ہڑپ ہی نہ کر جائے، ابھی فرقان ان بلاوں کا جائزہ لے ہی رہے تھا کہ فضا میں ایک خاص قسم کی گیس پھیلتی چلی گئی اور فرقان بے ہوش ہو کر گر پڑا، شہباز کا کہیں پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں چلا گیا، اچانک کئی نقاب پوش وہاں نمودار ہوئے اُن کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں اور انہوں نے انسپکٹر فرقان کو کندھے پر اُٹھا لیا، اور پہاڑی کے دامن میں ایک جانب چل پڑے، پہاڑی چٹان پر ایک پتھر باہر کی طرف نکلا ہوا تھا، انہوں نے اس پتھر کو ایک طرف دبایا تو ایک کھڑکی کھلتی چلی گئی
ادھر فرقان کی جب آنکھ کھلی تو وہ ایک اسٹریچر پر لیٹا ہوا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی آپریشن روم میں ہے اور بہت سے غیر ملکی لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے، ہوں تو تمہیں ہوش آ ہی گیا، انسپکٹر فرقان نے اپنی کلائی پر پڑی ہوئی گھڑی پر نگاہ کی تو اُسے یاد آیا کہ وہ تو اس زیگی نامی بلا پر فائرنگ کر رہے تھے، کہ اچانک کسی قسم کی گیس نے اسے بے ہوش کر دیا تھا اور وہ پورے ایک دن کے بعد ہوش میں آیا ہے۔ ایک گنجا شخص جس کی آنکھوں سے عیاری اور سفا کی جھلک رہی تھی، اُس کے قریب گیا، فرقان نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے لگا کہ اسے اسٹریچر پر موجود چمڑے کی بلیٹوں کی مدد سے باندھ دیا گیا ہے۔ اس لئے اُس کی یہ کوشش بیکار ہی رہی۔
وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ ان اجنبی اور غیر ملکی لوگوں کی قید میں ہے، اُس کا ریوالور ان لوگوں نے لے لیا تھا، اور اب وہ نہتا تھا، اب اُس کے پاس صرف ایک ہی ذریعہ تھا، اور وہ تھا اُس کے پاس موجود ایک طاقتور ٹرانسمیٹر جو کہ نہ صرف ٹرانسمیٹر تھا بلکہ ایک سیٹلائٹ ٹائپ کیمرہ بھی، جس کے سگنل انسپکٹر شہباز کے پاس موجود ڈیوائس سے ریڈیائی لہروں کے ذریعے منسلک تھے۔ اُس نے اپنی گھڑی کے بٹن کو پش کر دیا، یہ گھڑی دراصل ایک طاقتور ٹیلی کاسٹنگ ڈیوائس تھی، جو کہ اُس کی پوزیشن بتا رہی تھی، کوئی بھی اس کی اس حرکت کو نہ دیکھ سکا، کیونکہ اس نے نہایت چالاکی سے اس ڈیوائس کا بٹن دبا دیا تھا۔
انسپکٹر فرقان نے بٹن دبایا، ادھر انسپکٹر شہباز کی کلائی پر بندھی گھڑی میں ایک لائٹ بلنک کرنے لگی، یہ ایک اسپیشل قسم کی مائیکرو ڈیوائس تھی جس کی مدد سے ہر چیز کو سنا جا سکتا تھا۔ یعنی اس ڈیوائس کی مدد سے وہ اپنی لوکیشن اپنے ہیڈ کوارٹر کو بتا سکتا تھا، اور ساری آوازیں، اس ڈیوائس کی مدد سے سنی جا سکتی تھیں، ادھر شہباز کے پاس انسپکٹر فرقان کی طرف سے آئے ہوئے سگنل ملنے شروع ہو گئے۔ اُنسپکٹر شہباز نے نے اپنے پاس لگے اس ٹرانسمیٹر کو کمپیوٹر اپنے لیپ ٹاپ سے اٹیچ کیا، اور اُس کے سامنے ایک اسکرین روشن ہو گئی۔ اور وہاں پر ہونے والی آوازیں اب وہ بخوبی سن رہا تھا۔ اور ایک گنجا آدمی، اُس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ساری صورت حال دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ کوئی اور ہی چکر ہے، اس خفیہ لوکیٹر جو کہ ایک طاقتور ترین ٹیلی کاسٹر ڈیوائس بھی تھی، ساری بات چیت وہ آرام سے اپنے کمپیوٹر پر سن رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ابھی یہ کسی خاص قسم کے انجکشن کا تجربہ فرقان پر کریں گے، اور پھر فرقان بھی ذہنی طور پر اُن کے زیر اثر آ جائے گا، اور بیگار کیمپ میں شامل ہو جائے گا۔
انسپکٹر شہباز نے فوراً ہی وائرلیس سیٹ پر اپنے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کیا، اور نہایت تیزی سے ساری صورتحال بتا دی، اس نے بتایا کہ انسپکٹر فرقان خطرے میں ہے۔ اور یہاں پر فوری ایکشن کی ضرورت ہے۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں مسلح فورسز کے دستے وہاں پر پہنچ گئے، اور کرسٹل جھیل کے اطراف آگے بڑھنے لگے۔

ہیں، میں ابھی تمہیں بھی انجکشن لگاؤں گا جس کے بعد تم بھی ہمارے غلام بن جاؤ گے جیسے کہ اور لوگوں کو ہم نے بنایا ہوا ہے۔ تم ہماری جاسوسی کرنے آئے تھے نہ؟، پروفیسر مارٹن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، اب تم بھی ہمارے غلام بن جاؤ گے۔ ارے بھئی میں تو ایک شکاری آدمی ہوں، بس ذرا تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آ گیا تھا، انسپکٹر فرقان نے بات بناتے ہوئے کہا۔ تم چاہے جو بھی ہو، تم نے زیگی پر فائرنگ کی، اور تمہارا ایک ساتھی بھاگ گیا، لیکن تمہیں یہ سب کیسے پتہ، انسپکٹر فرقان نے حیرت سے کہا، یہاں کرسٹل جھیل کے کنارے جو کچھ بھی ہوتا ہے، اُسے ہم اپنے کیمروں کی مدد سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

لیکن تم مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہو، تا کہ تمہارا تجسس دور ہو جائے، اور ویسے بھی انجکشن لگنے کے بعد تمہارے ذہن سے ہر بات نکل جائے گی، اور تم صرف ہمارے غلام ہو گے، لیکن یہ ڈائنا سور نما جانور اور زیگی کیا ہے، انسپکٹر فرقان نے پھر حیرت سے سوال کیا، بتاتا ہوں، میں ہوں دنیا کا عظیم ترین پروفیسر مارٹن، میں نے ایسی دوائیں ایجاد کی ہیں جو کہ حیرت انگیز ہیں، مارٹن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ یہ ان معمولی پہاڑی جانوروں کو قوی ہیکل ڈائنا سور میں تبدیل کر دیتی ہیں، ویسے ڈائنا سور کے متعلق کی گئی جدید تحقیق یہ بتاتی ہے کہ ڈائنا سور کی نسلیں یہی پہاڑی جانور جیسے کہ پہاڑی گوہ، اور گرگٹ وغیرہ ہیں، جو کہ لاکھوں سال گذرنے کے بعد بتدریج چھوٹے ہوتے چلے گئے۔

میرا کام ہی ریسرچ کرنا ہے، میں بڑے عرصے ریسرچ کرنے کے بعد ان جانوروں کو بڑا کرنے میں کامیاب ہوا ہوں لیکن یہ کامیابی صرف وقتی ہوتی ہے، یعنی کی اس کا اثر صرف ۳ سے ۴ گھنٹے تک رہتا ہے، اور پھر وہ اپنی اصلی حالت میں آ جاتے ہیں، میں ابھی اس دوائی پر مزید کام کر رہا ہوں۔ اور جلد ہی اس دوائی کا دورانیہ بڑھانے میں کامیاب ہو جاوں گا۔

اور جب تک یہاں پہاڑوں میں موجود دولت بھی سمیٹ کر نکل جائیں گے۔ میں اور ڈاکٹر شوبرا مل کر اس پروجیکٹ کو چلا رہے ہیں۔ آؤ تمہیں بھی دکھاؤں کہ ہم یہاں اس جھیل کے کنارے کیا کر رہے ہیں، لیکن وہ آسیبی آوازیں اور تصویریں، اور وہ ڈائنا سور نما بلا، وہ کیا ہے۔ وہ بھی ایک سائنس کا کرشمہ ہے۔ وہ بھی ہماری پیدا کی ہوئی، مختلف قسم کی ریز کا کمال ہے، اور اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں، اور یہ گرگٹ نما ست رنگی بلا جو وہ ایک خاص قسم کا گرگٹ ہے۔ جو کہ دوائی کے اثر سے وقتی طور پر ایک عفریت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

آؤ تمہیں اس بلا جسے اس علاقے کے لوگ زیگی کے نام سے جانتے ہیں، اس کا اصلی روپ دکھاؤں، پھر ڈاکٹر شوبرا نے ایک بیل بجائی اور ایک ملازم آیا، زیگی کا روم دکھاؤ، اُس نے ایک بٹن دبایا تو زیگی کا روم سامنے آ گیا، اب ہم اسے تمہارے سامنے اسے اپنا ایجاد کردہ اسپشل انجکشن لگائیں گے۔ تو یہ ۱۰ منٹ کے اندر اندر ایک عفریت میں بدل جائے گا، اور ہم اس کے کمرے کا دروازہ کھول دیں گے اور یہ آسیبی آوزیں ، اور زیگی زیگی کی آوازیں بھی اسپشل ساؤنڈ ایفیکٹ ہے، ایک بلا جسے لوگ زیگی کے نام سے جانتے ہیں اور یہ نام بھی ہم نے ہی پھیلایا ہے، باہر جائے گی اور ۳ گھنٹے کے بعد واپس آ جائے گی، لیکن یہ واپس کیسے آتی ہے، فرقان نے سوال کیا، اسے جیسے ہی اسکی دوائی کا اثر ختم ہونے لگتا ہے، ایک خاص قسم کی بو آتی ہے جو کہ ہم اسکے لئے ایک گوشت کے ٹکڑے میں ملاتے ہیں،

اور پھر اُن کے سامنے ان جانوروں کے پنجرے لائے گئے۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں چند افراد جن کے پاس پنجرے تھے اور اُن پنجروں کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے، دھکیلتے ہوئے داخل ہوئے، اُن لوگوں کے چہرے پر ماسک تھے اور ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے تھے۔ اچانک انہوں نے پنجرے کے اوپر لگا ہوا کوئی بٹن دبایا اور پنجرے کا دروازہ کھلتا چلا گیا۔

پنجرے میں کچھ گوشت کے ٹکڑے رکھے ہوئے نظر آرہے تھے، وہ دو جانور جو کہ ایک پہاڑی گرگٹ تھا، جس کا سائز نسبتاً بڑا تھا، وہ دہ گرگٹ اس خوراک کی طرف چل پڑا، اور جیسے ہی وہ پنجرے کے اندر داخل ہوا، اُن افراد نے پنجرے کے اوپر موجود بٹن دبائے اور پنجرے کا دروازہ لاک ہو گیا اور وہ جانور اُس میں قید ہو گیا لیکن اب وہ جانور اُس گوشت کو کھانے میں مصروف تھا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ جانور بے ہوش ہو کر گر گیا۔ یہ ایک حیران کن منظر تھا۔

پھر ڈاکٹر شوبرا نے اپنے ہاتھ پر دستانے پہنے اور ایک چھوٹا سا انجکشن اس ڈائنا سور جو کہ اب ایک پہاڑی گرگٹ کو لگایا جس کا نام زیگی تھا اُسے دوسرا انجکشن لگایا۔ پھر جلد ہی اُن کے پنجروں کو ایک سلاخوں والے کمرے میں دھکیل دیا گیا اور مارٹن نے ایک بٹن دبایا تو وہ جانور آزاد ہو گیا اور اب اس پنجرے نما کمرے میں گھوم رہے تھا، پھر حیرت انگیز طور پر اس کی ہیت میں تبدیلی ہونے لگی۔ اور وہ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک ڈائنا سور میں تبدیل ہو گیا۔ اور پھر مارٹن نے ایک اور بٹن دبایا اور اُس پنجرے کا دوسری طرف سے دیوار ہٹتی چلی گئی اور وہ ڈائنا سور باہر کی طرف نکل گیا، بلاشبہ اُس کا رخ کرسٹل جھیل کے کنارے کی طرف تھا تاکہ وہ آگے جا کر لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا سکیں۔

اور انسپکٹر شہباز کے سامنے ہی ایک انجکشن انسپکٹر فرقان کے لگا دیا گیا۔ وہ یہ سارا منظر اپنی کمپیوٹر اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ دوسرے دن صبح ایک غار میں موجود تھے، جہاں پر کچھ لوگ ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ یہ وہ کیمپ تھا، جہاں پر لاپتہ ہونے والے افراد موجود تھے اور اُن سے بیگار لی جاتی تھی، ایک سرنگ پہاڑوں کے اندر خفیہ طور پر بنی ہوئی تھی، ایک زیر زمین ہال تھا، جس میں بہت سارے لوگ تھے، ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ سارے نشے کی حالت میں ہوں اور ایک راستہ پہاڑوں کے نیچے کی طرف جا رہا تھا جہاں مشینوں کے ذریعے کھدائی جاری تھی، شہباز نے دیکھا کہ وہاں سے ٹرالیاں بھر بھر کر کوئی پتھر نما چیز لائی جا رہی ہے، اور وہاں کچھ اُن کے نگران بھی موجود تھے جن کے ہاتھوں میں ہنٹر تھے اور وہ سستی کرنے والے افراد پر کوڑے کی طرح برساتے تھے۔ دوسری طرف کام کرنے والے افراد کسی مشین کی طرح کام کر رہے تھے جیسے کہ وہ انسان نہیں بلکہ روبوٹ ہوں۔ یہ یقیناً اُس انجکشن کا اثر تھا جس نے ان کے حواس معطل کر دیئے تھے اور وہ صرف ایک مشین بن چکے تھے۔

انسپکٹر شہباز اب سارا کھیل سمجھ چکا تھا، کہ یہاں پر مارٹن اور ڈاکٹر شوبرا کوئی ایسی دوائی انجکشن کے ذریعے استعمال کرتے تھے جو کہ اس پہاڑی جانور کے جسمانی اور حیاتیاتی نظاموں پر اثر انداز ہوتی تھی اور گرگٹ جو کہ رات کو بہت قوی ہیکل ہو جاتا تھا۔ اور تین گھنٹے بعد معمول پر آجاتا تھا۔ اور وہ خوفناک ست رنگی بلا زیگی اصل میں ایک گرگٹ تھا جو کہ بڑا ہو کر ڈائنا سور میں ملنے لگتا تھا۔

اصل میں یہاں پر یہ کوئی قیمتی پتھر تھے، یہ کیا ہو سکتا ہے، پھر اُس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا، یہ کیا ہو سکتا ہے، ارے یہ تو قیمتی اور اعلیٰ کوالٹی کے ہیرے ہیں، یہ یقیناً قیمتی ہیروں کی کوئی کان ہے جس کا پتہ اب تک کسی کو نہیں ہے یعنی یہ خفیہ ہے اور یہاں سے ہیرے نکال کر بیرون ملک اسمگل کیئے جا رہے ہیں۔ اب وہ ساری کہانی سمجھ چکے تھے، کہ یہاں پر کوئی ہیروں کی خفیہ کان دریافت ہوئی تھی، جس کا پتہ حکومت کو بھی نہیں تھا اور لوگوں کو وہاں پر لے جا کر اُن سے بیگار لی جاتی تھی اور لاپتہ ہونے والے لوگ وہیں پر لے جائے جاتے تھے اور پروفیسر مارٹن کوئی بین الاقوامی مجرم ہے اور ڈاکٹر شوبرا کی مدد سے لوگوں سے بیگار لے رہے تھے،، جہاں پر ہیرے یا سونے کی کان تھی اور اُن لوگوں کو انجکشن لگا کر اپنا غلام بنایا ہوا تھا، اور بیگار لی جاتی تھی، یعنی کی ہیرے نکالے جاتے تھے اور پھر بین الاقوامی

طور پر خفیہ طریقے سے اسمگل کر دیئے جاتے تھے۔

انسپکٹر شہباز نے فوراً ہی اپنے ہیڈ کوارٹر کو اس کی اطلاع دی، اور ایک گھنٹے کے اندر اندر فورسز کی گاڑیاں کرسٹل جھیل کے کنارے پہنچ گئیں، اُدھر ڈاکٹر شوبرا نے جو اپنے کیمروں کے ذریعے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا، اس بلا زیگی کو آزاد کر دیا، یہ فورسز کی گاڑیوں کی طرف لپکی، اُن بلاؤں پر فورسز کی جانب سے فائرنگ شروع ہوگئی تھی، لیکن گولیاں اُن پر اثر نہیں کر رہی تھیں، انسپکٹر شہباز اس آپریشن کی قیادت کر رہا تھا۔

گولیاں اس بلا زیگی پر اثر نہیں کر رہی تھی، نجانے کتنی سخت اس کی جلد تھی کہ ایسا لگ رہا تھا کہ گولیاں کسی پتھر پر لگ رہی ہوں، اس نے اپنے گن سے اس بلا کی آنکھوں کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ جس کے نتیجے میں اُس بلا کی آنکھ پھوٹ گئی اور وہ تکلیف کے مارے پٹکنے لگی، اس بلا کی دوسری آنکھ پر بھی فائرنگ کرو، اُدھر زیگی فائرنگ کی وجہ سے اور غضبناک ہوگئی تھی، اس کی آنکھوں پر فائرنگ کرو۔ انسپکٹر شہباز نے چیخ کر کہا، فورسز کے لوگ اس بات کو سمجھ چکے تھے، بلا کی صرف آنکھوں پر گولی اثر کرتی ہے، اس لئے اب سب نے مشترکہ طور پر نشانہ لیکر فائرنگ زیگی کی آنکھوں پر فائرنگ کی اور تھوڑی ہی دیر میں اُس بلا کے جسم سے سیال بدبودار مادہ بہنے لگا، اور وہ بلا وہیں سر پٹکتے پٹکتے بے حس وحرکت ہوگئی، اور پھر ایک حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ اس بلا کی جسامت چھوٹی ہونی شروع ہوئی اور وہ ایک بڑے پہاڑی گرگٹ کی جیسی ہوگئی، لیکن اب یہ بلا بے حس وحرکت تھی اور ہلاک ہو چکی تھی۔

انسپکٹر شہباز میگافون پر اعلان کر رہا تھا، پروفیسر مارٹن اور ڈاکٹر شوبرا تم لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے، اپنے ہتھیار پھینک کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو، اور فورسز کے جوان آگے بڑھتے چلے گئے۔ اب صبح کی روشنی پھیل چکی تھی، اور فورسز نے ان غاروں کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں تمام لوگوں کو بازیاب کرا لیا گیا۔ پروفیسر مارٹن کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن اُس نے اچانک ہی خودکشی کر لی، اُس نے کوئی زہریلا کیپسول اپنے دانتوں کے تلے دبایا ہوا تھا، جسے اُس نے اپنے مخصوص طریقے سے دبایا تو اُس کا جسم نیلا پڑ گیا اور منہ سے جھاگ آگئے اور وہ وہیں پر گر کر ہلاک ہوگیا، جبکہ ڈاکٹر شوبرا بھاگنے کی کوشش میں مارا گیا، پھر تین دن بعد اس انجکشن کا اثر اُترا تو تمام لوگ نارمل ہوگئے، ہم کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے، یونیورسٹی گروپ کے تمام دوست ایک دوسرے سے معلوم کر رہے تھے، ہم کہاں تھے، انسپکٹر فرقان نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اصل میں یہ ہیروں کی ایک خفیہ کان تھی، جو کہ مارٹن کو ایک سروے کے دوران دریافت ہوگئی تھی، وہ ایک بین الاقوامی مجرم تھا، اور ڈاکٹر شوبرا بھی اُس کے ساتھ تھا جو کہ حیاتیات اور زولوجی کا بہت بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا، اور یہ عجیب اور خطرناک انجکشن اور دوائیں اُسی کی ایجاد تھے۔ جو کہ وہ اپنے آپ کو چھپانے اور ہیروں کی کان سے ہیرے نکالنے کے لئے استعمال کر رہے تھے، تاکہ لوگ اس طرف نہ آئیں اور ان بلاؤں سے ڈرے رہیں، اور جو لاپتہ افراد تھے اُن سے کان میں مزدوری کرائی جا رہی تھی اور انہیں ذہنی طور پر مفلوج بنا دیا گیا تھا۔ اور انہیں کنٹرول میں رکھنے کے لئے ہر تیسرے دن انہیں انجکشن لگایا جاتا تھا۔ اور اسی طرح سے اربوں روپے کے قیمتی اعلیٰ کوالٹی کے ہیرے ملک سے باہر اسمگل کیے جا رہے تھے۔



ایک سو سولہ چاند کی راتیں

عشنا کوثر سردار

قسط نمبر 17

یہ ناول 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں ہے، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے ہیں جنہوں نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزرے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر...... وہ خوف...... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔





خوشنما نے خالہ کی طرف دیکھا تھا بلوائیوں کا ہجوم اس کی طرف بڑھنے کو تھا جب اس نے پلٹ کر دوڑ لگانا چاہی تھی مگر بلوائیوں نے اسے آن دبوچا تھا وہ بے بس سی ہاتھ پاؤں مارنے لگی تھی مگر وہ ان کی گرفت سے آزاد نہ ہوسکی تھی بلوائی اسے دیکھ کر مسکرائے تھے۔

''چلبل چڑیا ہے زندگی میں شکار تو کئی کیے مگر ایسی رنگین چڑیا نہ دیکھی۔'' ایک بلوائی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا دوسرا بھی مسکرایا تھا۔

''اسی تان ہار گئے جی کردا گھر وچ سجا کے رکھاں تے دل ویکھ ویکھ کر پرداہنوا۔'' ایک بلوائی نے اسے میلی نظروں سے دیکھا تھا۔

''بے وقوف دیوی کا اوتار ہے اسے تو پوجتے صبح سے شام ہوجایا کرے گی میں تو بھگوان کا گناہگار بندہ ہوں میں تو اس اپسرا کو چھو کر دیکھنا چاہوں گا۔'' ایک نے اسے شرارت سے دیکھ کر آنکھ دبائی تھی۔

''کڑی تا سوہنی ہے جیوں ہٹا ہون کرنا کی۔ قرعہ ڈال لیو کہ کارکون لے کے جاوے گا میں تاں کہند اں مینوں سونپ دیو، میں تا انج وی کنوارا واں، میرا کاروس جائے گا۔'' ایک نے شرارت سے کہا تھا۔ مگر تبھی ایک نے تلوار سے اس کا سیاہ آنچل کھینچ دیا تھا خوشنما دنگ رہ گئی تھی جیسے کسی نے اسے سرعام برہنہ کردیا ہو ایک بات تو وہ جان گئی تھی کہ وہ اب محفوظ نہیں ہے اس کے فرار کے تمام راستے مسدود تھے اس کا دماغ کام کرنا بند کرگیا تھا سوچ جیسے ایک جگہ تھم گئی تھی۔

......☆☆☆......

نواب زادی نے تیمور کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ لے کر چسکی لی تھی تھکے اعصاب کو جیسے سکون ملا تھا سر میں جو عجیب سا انتشار تھا اس کا حل ملنا تو جیسے ناممکن تھا مگر اتنا ہوا تھا کہ سر کا درد قدرے تھما محسوس ہوا تھا وہ چھوٹی چھوٹی چسکیاں لیتی رہی تھی اور اعصاب کو تراوٹ ملتی گئی تھی۔

''ہمیں فکر ہورہی ہے حیدر میاں کی ابھی تک کوئی خبر نہیں کہیں ان کی ٹرین بلوائیوں کے حملے کی نذر نہ ہوگئی ہو، اگر ایسا ہوا ہو تو ہمارا سفر رائیگاں رہے گا۔'' وہ مدہم لہجے میں بولی تھی اس کا لہجہ کسی بھی جذبات سے عاری محسوس ہوا تھا تیمور نے اسے بغور دیکھا تھا مگر فوری طور پر کچھ نہیں کہا تھا وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ گویا وہ کسی جذبے کے زیر اثر متفکر تھی یا محض اس بارے میں بات کررہی تھیں۔

''کیا اس متعلق کوئی معلومات مل سکتی ہیں؟'' وہ جانے کس خیال کے تحت بولی تھی تیمور نے سرنفی میں ہلایا تھا اور آہستگی سے بولے تھے۔

''ہمیں نہیں علم کہ اس متعلق کوئی معلومات موجود ہوں گی کہ نہیں فی الحال پاکستان آنے والوں کا اندراج بھی پورے طور پر ممکن نہیں دکھائی دے رہا ہاں کلیم کرنے والوں کی قطار دیکھی گئی ہے آپ وہاں پتا کرسکتی ہیں ہوسکتا ہے حیدر میاں نے ایسا کوئی کلیم کیا ہو اس سے خبر ہوسکتی ہے کہ درحقیقت ماجرا کیا ہے؟'' تیمور نے کہا تھا اور نواب زادی نے انہیں پرخیال انداز میں دیکھا تھا۔

''آپ کچھ متفکر ہیں؟'' تیمور نے عین کو جانچنے کی کوشش کی تھی مگر فوری طور پر عین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا نواب زادی نے کچھ سوچتے ہوئے سرنفی میں ہلا دیا تھا۔

''ہمیں جلال بھائی کی بہت یاد آرہی ہے شاید ہمیں انہی کے ہمراہ تیار کرنا چاہیے تھا جانے کیوں یہ فیصلہ غلط لگ رہا ہے۔ وہ جانے کیا سوچ کر بولی تھیں، تیمور نے کوئی جواب نہیں دیا تھا تبھی وہ کھوئے سے لہجے میں بولی تھیں۔

''ہم سمجھ نہیں پارہے ہم نے یہ ہجرت اختیار کیوں کی ہم سے منسلک رشتے جب اس مقام پر ہیں تو ہم یہاں کیا کررہے ہیں؟'' وہ انتہائی مایوس کن لہجے میں بولی تھیں تیمور نے انہیں دیکھا تھا۔

''آپ اپنے والد محترم کے حکم سے یہاں آگئی ہیں عین، یہ خواہش آپ کے والد محترم کی تھی وہ یہاں ہجرت کرکے آنا چاہتے تھے انہوں نے آپ کو اپنے ہمراہ لے کر یہاں آنا تھا اور......!'' وہ کہتے کہتے رک گیا تھا عین بھیگی آنکھوں سے سر ہلانے لگی تھی۔

''یاد ہے ہمیں ابا جان کی اولین خواہش تھی کہ وہ پاکستان ہجرت کریں ہم بھی پرجوش تھے مگر ابا جان کے بغیر سب بے معنی لگ رہا ہے یہ ان کے ساتھ ہوتا تو اچھا

تھا وہ نہیں رہے اور ہم ان کے بنا جیسے اپنے وجود کا بڑا حصہ وہیں چھوڑ آئے ہیں جیسے ہم بنا روح کے زندہ لاش بن کر رہ گئے ہیں ہجرتیں تو زندہ وجود کرتے ہیں ہم تو روح سے خالی ہیں ہم نے ہجرت اختیار کیوں کی، اس کے معنی ڈھونڈنے میں ہمیں دشواری ہو رہی ہے۔" وہ انتہائی دل گرفتہ دکھائی دی تھیں ان کی آنکھوں میں رکے نمکین سمندر کے کئی قطرے آنکھوں کے کناروں سے اتر کر رخساروں پر پھیلنے لگے تھے تیمور بے بسی سے ان کو دیکھ کر رہ گیا تھا وہ ان کی دل جوئی نہیں کر سکتا تھا کوئی دلاسہ نہیں دے سکتا تھا ہر شے جیسے بے معنی تھی وہ خاموشی سے نگاہ پھیر گئے تھے۔

"عین آپ اکیلی نہیں ہیں، اس کیمپ میں موجود ہر چہرہ ایسی کئی کہانیاں رکھتا ہے، سب کسی نہ کسی اپنے کو گنوا کر آیا ہے ان سب کا دکھ بھی یہی ہے آپ اکیلی نہیں ہیں، یہ مشترکہ دکھ ہے کئی لوگ اس دکھ سے گزر رہے ہیں۔" تیمور نے مدہم لہجے میں کہا تھا تبھی وہ بھیگتی آنکھوں سے بولی تھیں۔

"مگر یہ دکھ کا مداوا کرنے کو کافی نہیں ہے تیمور یہ جواز کافی نہیں اس خیال اور سچائی سے کوئی تسلی نہیں ملتی ایسا سوچنا کوئی تدارک نہیں کرتا نہ سب کے دکھوں کو دیکھنا ہمارے زخموں پر مرہم رکھتا ہے دکھ اپنے اپنے ہوتے ہیں تیمور، درد کی کیفیت کو جو وجود جھیلتا ہے اسے کوئی اور نہیں جھیل سکتا یہاں ہر وجود اپنا اپنا دکھ جھیل رہا ہے ہر وجود کی تکلیف بے پناہ ہے اور کسی کا مداوا کچھ نہیں۔" وہ پر درد لہجے میں بولی تھیں تیمور خاموشی سے دیکھتا رہا تھا عین کی آواز ابھری تھی۔

"اگر ہم پوری عقل سے فیصلہ لینے کے قابل ہوتے تو ہم اس ہجرت کا حصہ نہ بنتے ہم ابا جان کے پہلو میں دفن ہونا پسند کرتے اماں جان سے قریب رہنا چاہتے یا پھر اپنی دادی جان کے قدموں میں رہنا پسند کرتے وہ سب پیارے وہاں ہیں تو ہماری یہاں موجودگی کیا حق رکھتی ہے تیمور؟" وہ عجیب کیفیت سے گزرتی ہوئی پوچھ رہی تھیں تیمور نے سر ہلایا تھا۔

"آپ کے جذبات قابل قدر ہیں عین مگر آپ اس سے انکار نہیں کر سکتیں کہ یہ سفر اختیار کرنا ضروری تھا۔" آپ حیدر میاں سے محبت کرتی ہیں اور حیدر میاں چاہتے تھے آپ ان کے ہمراہ پاکستان آئیں ان کے ساتھ اس زندگی کا آغاز کریں، یہ سب ضروری تھا آپ نے محبت کے لیے یہ سفر اختیار کیا۔" تیمور نے کہا تھا تو وہ ان کی طرف دیکھنے لگی تھی جیسے ان کے الفاظ پر وہ حیران ہوئی تھی اور خود اپنے طور پر کچھ اخذ کیا تھا اور ان کے لبوں پر زخمی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"محبت کی تعریف عجیب الجھے ہوئے معنی رکھتی ہے تیمور، سوچنے لگو تو ہر معنی متنازع لگتا ہے مگر محبت کی سمجھ پھر بھی نہیں آتی ہمارے لیے محبت ایسی ہی عجیب الجھی ہوئی اصطلاح ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں محبت اگر ہے تو فقط والدین کی محبت ہے یا پھر ان رشتوں کی محبت جو بنا کسی غرض کے ساتھ رہتے ہیں اس کے علاوہ محبت کوئی معنی نہیں رکھتی۔" وہ عجیب یاسیت بھرے لہجے میں بولی تھیں اور تیمور ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

"بہرحال ہم کل حیدر میاں کے متعلق معلومات اکٹھا کریں گے ہمیں امید ہے ہم انہیں ضرور تلاش کر لیں گے۔" تیمور نے گویا دلاسا دیا تھا مگر عین کچھ نہیں بولی تھیں تیمور نے ان کی آنکھوں سے ٹوٹتے آنسوؤں کو خاموشی سے دیکھا تھا ان کو یقیناً ان آنکھوں سے بہتے آنسوؤں سے تکلیف ہو رہی تھی مگر وہ ان آنکھوں کو پونچھنے کا کوئی حق نہیں رکھتے تھے وہ ان کے ساتھ تو تھے مگر ہمراہ نہیں تھے یہ ملال روح کو تار تار کر رہا تھا۔

......☆☆......

پلک پلک لہو ٹپکے
روتا اک اک تارا ہے
یہ عجب بٹوارا ہے
احساس اجنبیت کا
غرور اکثریت کا
تہذیب کا اتالیق کا
ادب کی زمین و آسمان کا
بول کا زبان کا
آغوش ہند کا

نصیب، سندھ کا
چراغ ہدایت کا
میکدے کے رند کا
رام رحیم بھگوان کا
رشتوں غیرت کا
انسان کا
ہجرت کی قتل گاہوں کا
یہ عجب بٹوارہ ہے
روتا اک اک تارا ہے
یہ عجب بٹوارا ہے
سورج چاند تاروں کا
تاریک راہوں کا
چوپالوں چوناروں مچان کا
بول ڈول پکوان کا
رام کتھا کہانی کا
ماضی کا مستقبل کی جوانی کا
سبزی ترکاری دھان کا
نائی قصائی دہقان کا
غیور کا خائف کا
محمل نشین کا طوائف کا
پوجا کا وظائف کا
یہ عجب بٹوارا ہے
روتا اک اک تارا ہے
موج تلاش کا زندان کا
دل سودائی کا عہد و پیاں کا
جدائی کی لٹھ کے نشان کا
کہ میری پلک پلک لہو ٹپکے
روتا اک اک تارا ہے
یہ عجب بٹوارا ہے
یہ عجب بٹوارا ہے
روتا اک اک تارا ہے

''ہاجرہ میری بچی، بھاگ جا۔'' بوڑھی خالہ چیخی تھیں اور وہیں ڈھے گئی تھیں خوشنما کی ان کی سمت پشت تھی مگر وہ ان کی آواز میں چھپی تکلیف کے معنی بخوبی سمجھتی تھیں سو وہ جانتی تھی اسے کیا کرنا تھا ایسے ان بلوائیوں کے ہاتھوں بے حرمت ہونا نہیں چاہتی تھی یا ان کا چارہ بننا نہیں چاہتی تھی اس نے نگاہ گھما کر جائزہ لیا تھا اس کے فرار کے تمام راستے مسدود تھے وہ بھاگ نہیں سکتی تھی سو اس نے خود کو کسی طرح چھڑا کر ایک بلوائی کے ہاتھ سے کرپان کو چھینا تھا اور بلوائیوں کو دیکھا تھا۔ وہ اس اقدام پر حیرت سے محتاط ہو کر قدرے دور ہوئے تھے جیسے انہیں یقین تھا کہ وہ اس پر حملہ کردے گی اور سب کو چت کردے گی خوشنما نے ان سب کو اپنے گرد موجود دیکھا تھا اور پھر یکدم اس نے کرپان کرپالے کو اپنے اندر اتار لیا تھا اس کے وجود سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا وہ ایک عزم سے ان کو دیکھتی ہوئی زمین پر ڈھیر ہوئی تھی اس کے لبوں سے اس وقت میں کلمہ کی ادائیگی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئی تھیں بلوائی اس اقدام کو شدید حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ماحول میں ایک سکوت چھا گیا تھا خالہ نے آنکھیں کھولتے ہوئے بامشکل ہمت کر کے جیسے اپنے وجود کو زمین سے اٹھایا تھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی خوشنما کے قریب آئی تھیں بلوائی اپنا کام تمام کر کے اس مقام سے پلٹنے لگے تھے بوڑھی خالہ نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا اور تبھی ان کی نگاہ خوشنما کے وجود پر گئی تھی اس کا خون سے لت پت وجود دیکھ کر وہ چونکی نہیں تھیں نا کسی دکھ کا اظہار کیا تھا بس چلتی ہوئی اس کے پاس گئی تھیں اور پھر جھک کر اس کا چہر دیکھا تھا اور اس کے چہرے پر آئے بال ہٹائے تھے ان کے لب آہستگی سے ہلے تھے۔

''شاباش میری بچی، جو اقدام تو نے کیا یہی بہترین تھا ایک غیور قوم کی بیٹی کو عزت گنوانے سے پہلے مرجانا لازم ہے۔ ہاجرہ تو نے جو کیا یہی بہترین عمل ہوسکتا تھا تو سچی شریف زادی ہے۔'' انہوں نے مدہم لہجے میں کہا تھا۔

''میری باحیا بچی، میں تیرے آخری سفر کی تیاری کرنے جاتی ہوں، تو آرام سے سوتی رہ تیری نیند نہ کھلے یہ ابدی نیند تجھے سکون دیتی رہے۔'' وہ کہہ کر اٹھی تھیں اور

چلتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگی تھیں۔

......☆☆......

جلال کی گاڑی کے تباہ ہونے کی اطلاع کسی نے دی تھی اور فتح النساء کے قدموں سے گویا زمین نکل گئی تھی وہ وہیں بیٹھ گئی تھیں جسم سے روح گویا نکلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی جیسے کسی نے بے دردی سے سینے سے دل کو نکال لیا تھا وہی ہوا تھا گویا جس کا خدشہ تھا اس نے جلال کو منع کیا تھا اور جلال قدم واپس لینے کو تیار نہ تھے اور وقت چال چل گیا تھا مرزا سراج الدولہ نے اوچھی چال چلی تھی۔

''یا اللہ ہمارے سر تاج سلامت ہوں انہیں خراش بھی نہ آئی ہو، میرا مولیٰ ہمارے خاوند کی زندگی کو محفوظ رکھ۔'' فتح النساء کے لبوں پر جلال کی سلامتی کی دعائیں تھیں آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ ہمت ہارنا نہیں چاہتی تھیں اس نے آنکھیں رگڑی تھیں اور حکمت چاچا کو فون ملایا تھا دوسری طرف حکمت بیگم نے فون اٹھایا تھا۔

''آداب چچا جان۔''

''تسلیمات بیٹا جلال کی گاڑی کو حادثہ پیش آنے کی اطلاع ملی۔ حکمت صاحب اسی طرف گئے ہیں حوصلہ رکھو جلال کو کچھ نہیں ہوگا دنیا واقف ہے کہ جلال نے مقدمہ کیا ہے اگر جلال کو کچھ ہوتا ہے تو اس کا شک صاف طور پر مرزا صاحب پر ہی جائے گا مرزا صاحب ایسا کوئی خطرہ تو مول لینا نہیں چاہیں گے۔'' بیگم حکمت نے سمجھایا تھا۔ دوسری طرف فتح النساء یقین سے بولی تھی۔

''جلال کو کچھ نہیں ہوگا جانے کیوں ہمیں یقین ہے کہ جلال کو خراش بھی نہ آئی ہوگی مگر مرزا صاحب ڈسنے سے باز نہیں آئے افسوس ہے ان کی ذہنیت پر ان کی طبیعت میں گھلا زہر کبھی ختم نہیں ہو پایا اور شاید کبھی ہوگا بھی نہیں۔'' وہ مدہم آواز میں گویا ہوئی تھیں۔

''تم فکر مند نہ ہو میری بچی میں بس تمہارے ہاں آنے کے لیے نکل ہی رہی تھی، مجھے تمہاری فکر تھی تم تنہا ہوگی تسلی کی ضرورت ہوتی ہے۔'' حکمت بیگم بولی تھیں۔

''آپ وہیں رہیے چچی جان ہم اسپتال کے لیے نکلنے والے تھے۔''

''لیکن آپ کو خبر نہیں کہ ان کو کسی اسپتال لے کر گئے ہیں آپ گھر پر ہی رہیے ہم پتا کراتے ہیں فکر مت کیجیے حکمت صاحب اور ہم ہیں۔'' بیگم حکمت نے کہتے ہوئے فون کال کا سلسلہ منقطع کیا تھا دوسری طرف فتح النساء متفکر سی ہوگئی تھیں۔

......☆☆......

مرزا صاحب نے جوش اور خوشی سے جام سے جام ٹکرایا تھا اور مسکرائے تھے۔

''گاڑی تو تباہ ہوگئی جلال میاں بچے ہوں ایسا ممکن نہیں۔'' وہ پریقین لہجے میں بولے تھے۔

''مرزا صاحب تسلی کرلیجیے کہیں یہ جشن بے معنی نہ رہ جائے۔'' وکیل صاحب نے کہا تھا اور مرزا صاحب مسکرا دیے تھے۔

''جناب گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے ایسا تو ممکن ہی نہیں کہ کوئی تیر چلائیں اور وہ نشانے پر نہ لگے مرزا سراج الدولہ کا چلایا گیا وار خالی نہیں جاتا، بہرحال آپ کی تسلی کے لیے پتا بھی کرالیں گے ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ ہم نے چھوٹے نواب کے ڈرائیور کو بھی بھاری رقم دے کر خرید لیا تھا۔ ان کے نمک خوار ان کی موت کا باعث بنے ہم نے تو جو کیا سو کیا افسوس ان کے نمک خواروں پر کیا فائدہ مال و دولت کا جب محل کے ملازمین ہی کبھی وفادار نہ رہے مگر یہ سازشیں تو اس طور سے اندر سے ہی چنگاری لگانے کا کام کرتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے تخت اور تختے کی کہانی بس یہی ہے کل بھی محل کے اندر سے ہی ایسی چنگاری پھوٹی تھی اور آج بھی پتا یہ بھی چلتا ہے کہ محل میں رہنے والوں کی بنیادیں اسی قدر کمزور ہوتی ہیں اور ستون کو ڈھانا کسی قدر آسان ہوتا ہے۔'' مرزا صاحب مسکرائے تھے۔

''درست فرمایا آپ نے مرزا صاحب حکمران طبقہ ایسی سازشوں کا شکار اندر سے ہی ہوتا ہے اب آپ بھی تو قریبی دوست تھے نواب صاحب کے۔'' وکیل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا مرزا سراج الدولہ بجائے شرمندہ ہونے کے کھلکھلا کر ہنس دیے تھے۔

''بس میاں ایسا ہی ہے ویسے مزے کی بات ہے لگتا

ہے چھوٹے نواب کے بچنے کا سبب صرف یہی تھا کہ وہ ہماری سازشوں سے ہمارے ہاتھوں مارے جاتے نواب صاحب اچھے آدمی تھے اور نواب صاحب کے صاحبزادے بھی پرعزم سیاستدان تھے زندہ رہتے تو ضرور کوئی بڑا کام کرتے مگر افسوس ان کی زندگی مختصر تھی۔'' مرزا صاحب مشروب کا سپ لیتے ہوئے مسکرائے تھے۔

''بہرحال جانے دیجیے آپ مشروب لیجیے یہ ہرن خصوصاً آپ کے لیے بنوایا ہے نوش فرمایئے۔'' مرزا صاحب نے کہا تھا اور مشروب کے گھونٹ گلے سے اتارنے لگے تھے ان کا چہرہ مسرور تھا آنکھوں میں فتح یابی کی چمک تھی۔

......☆☆......

عین نے کلیم کرنے والے عملے سے باز پرس کی تھی مگر کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا تھا وہ تھک کر تیمور کی طرف آئی تھیں۔

''اس عملے کو کچھ خبر نہیں پتا نہیں حیدر میاں یہاں پہنچے بھی ہیں کہ نہیں جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے وہ ہم سے پہلے نکلنے والی ٹرین پر سوار ہوئے تھے گویا ان کو ہم سے پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا پھر ان کے لاپتا ہونے کا کیا سبب ہے وہ اس کیمپ میں موجود بھی ہیں کہ نہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کراچی جا پہنچے ہوں مہاجرین کی بڑی تعداد کراچی بھی تو روانہ ہوئی ہے۔ ضروری تو نہیں کہ کہ لاہور ہی رکے ہو۔'' عین نے خدشہ بیان کیا۔

''اگر حیدر میاں نہیں ملے تو؟'' عین نے خدشہ بیان کرتے ہوئے تیمور کو دیکھا تھا۔

''کہیں ان کی ٹرین کو کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو، کہیں بلوائی؟'' وہ فکرمندی سے گویا ہوئی تھیں پھر جانے کیوں سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

''نہیں ایسا ممکن نہیں ضرور وہ پاکستان پہنچے ہوں گے۔'' وہ خودی جواز بنا کر خود ہی رد کر رہی تھیں تیمور نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا ان کے دیکھنے پر عین نگاہ پھیر گئی تھیں اور مدہم لہجے میں پوچھنے لگی تھیں۔

''آپ اس طرح الزام دیتی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔'' عین کے کہنے پر تیمور نے نفی میں سر ہلایا تھا عین نے اسے بغور دیکھ کر جیسے جانچنا چاہا تھا اور بولی۔

''کوئی بات ہے آپ کے ذہن میں کیا سوچ رہے ہیں آپ۔'' وہ جیسے جاننے پر بضد ہوئی تھیں تیمور خاموشی سے ان کی سمت دیکھنے لگا تھا پھر نرمی سے بولا تھا۔

''کیا آپ حیدر میاں پر اب بھی اتنا اعتبار کرتی ہیں کہ ان کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ لے سکیں۔'' تیمور کے کہنے پر وہ چونکی تھیں۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ نواب زادی کہ فتح النساء کے ساتھ جو بھی ہوا اور حیدر میاں نے جیسا رویہ روا رکھا کیا اس سب کے جاننے کے باوجود کسی رشتے کا کوئی جواز بچتا ہے؟'' وہ جانے کیوں پوچھے بنا نہیں رہے تھے اگرچہ انہوں نے قصد کیا تھا کہ نواب زادی کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرے گا۔'' مگر جانے کیوں وہ خود کو روک نہیں پائے تھے۔ عین نے لمحہ بھر کو خاموش ہو کر ان کو دیکھا تھا پھر نرمی سے بولی تھی۔

''تیمور، ہمیں نہیں معلوم سچائی کیا ہے ہم کسی پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے، یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے حیدر میاں کی بابت کئی کہانیاں سنی ہیں مگر جب تک ہمیں کوئی ٹھوس شواہد ہاتھ نہ لگے ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے، ہم نہیں کہتے کہ فتح النساء غلط تھیں، فتح ایک دوشیزہ ہیں اور یقیناً وہ اتنی بڑی بات بنا کسی سبب کے نہیں کہہ سکتیں مگر ہم کیا کریں، ہم کسی بات کا فیصلہ نہیں کر پا رہے دوسری بات اگر حیدر میاں سے متواتر رشتہ جاری رکھنے اور ان کے لیے ایک رشتے میں بندھ کر پاکستان آنے کی ہے تو ہم نے ایسا مرزا حیدر سراج الدولہ کے لیے نہیں کیا ہم نے یہ ہجرت اپنے ابا جان کے لیے اختیار کی کیونکہ انہوں نے اس رشتے کو جوڑا اور اسے جاری رکھا اگر یہ رشتہ غلط بھی ہے تو ہمیں اسے جاری رکھنا ہے ہماری مجبوری سمجھ لیجیے ہم اپنے ابا جان کے حکم سے انحراف نہیں کر سکتے یہ ان کی زندگی کا آخری فیصلہ تھا ایک بیٹی کے لیے لیا گیا آخری فیصلہ اور کوئی والد اپنی اولاد کے لیے کوئی غلط فیصلہ نہیں لے سکتے، ہم صرف اپنے ابا جان کے احکامات

کی پیروی کر رہے ہیں ان کی حکم عدولی نہیں کرنا چاہتے ان کی روح کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔'' عین نے اپنی طرف سے تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کی تھی اور تیمور کی طرف دیکھتے ہوئے نگاہ پھیری تھی تیمور نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے عین کو دیکھا۔

''عین سیف چچا ایک اچھے انسان تھے ان کی خوبی تھی کہ وہ جلد معاف کر دیتے تھے اور کسی کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتے تھے مرزا سراج الدولہ نے جو بھی کیا نواب چچا نے اس پر بھی سراج صاحب کو معاف کیا سراج صاحب آخری بار بھی نواب چچا سے ملے تھے ضرور مرزا سراج الدولہ نے نواب چچا کی نرمی کا فائدہ اٹھالیا ہوگا اور ان کے فیصلوں پر اثر انداز ہوئے ہوں گے کیونکہ جو ہوا تھا اس کے بعد نواب چچا ایسا فیصلہ نہیں لے سکتے تھے آپ کی رخصتی کا عمل میں آنا یا اس تعلق کو آگے بڑھانے کا فیصلہ نواب صاحب کا ذاتی فیصلہ نہیں تھا بہر حال اس بات پر بحث کرنا اہم نہیں جبکہ ہم نواب چچا کے فیصلے کے باعث ہجرت کر چکے ہیں۔'' تیمور نے ان کی سمت دیکھے بنا مدہم لہجے میں کہا عین انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

......☆☆......

فتح النساء نماز سے فارغ ہو کر اٹھی تھیں جب فون بجا تھا انہوں نے سرعت سے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا تھا۔

''السلام علیکم۔'' دوسری طرف جلال کی آواز سن کر فتح النساء کے بے چین دل کو قرار ملا تھا اور انہوں نے سکون کی گہری سانس لی تھی۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔'' ان کے لبوں پر بے اختیار ابھرا تھا۔

''آپ خیریت سے ہیں فتح النساء؟'' دوسری طرف جلال نے پوچھا تھا۔

''ہم خیریت سے ہیں فتح النساء آپ خیریت سے ہیں؟ چچی سے بات ہوئی وہ آپ کی بابت بتا رہی تھیں تبھی ہم نے آپ کو فون کر کے خیریت پوچھنا ضروری خیال کیا بہر حال پریشانی والی کوئی بات نہیں ہیں آپ تسلی رکھیے ہم تھوڑی دیر میں گھر پہنچ جاتے ہیں۔'' جلال نے کہا تھا فتح النساء کو پریشان دیکھنا نہیں چاہتا تھا کیا یہ کوئی التفات کی قسم تھی یا محض وہ انہیں آگاہ کر رہے تھے وہ سمجھ نہیں پائی تھی مگر جلال کی خیریت معلوم کر کے فتح النساء کو سکون ضرور محسوس ہوا تھا۔ دل جیسے تھم سا گیا تھا ایک قرار سا ملا تھا۔

''آپ ٹھیک ہیں نا، آپ کے حادثے کی خبر ملی تھی اور ہم۔'' فتح النساء نے بولنا چاہا تھا تبھی وہ بات کاٹتے ہوئے بولے تھے۔

''ہم گھر پہنچ کر آپ سے بات کرتے ہیں فتح النساء ہم فون رکھتے ہیں۔'' جلال نے کہا تھا اور سلسلہ منقطع کر دیا تھا فتح النساء نے سکون کی گہری سانس خارج کی تھی ان کے درمیان ہزار دوریاں سہی کتنے بھی اختلافات سہی مگر وہ اپنے اندر جلال کے لیے کبھی نفرت محسوس نہیں کر سکی تھی اسے شکوے تھے گلے تھے اپنی طرح سے غصے میں اس نے رشتہ بھی ختم کر دیا تھا خود کو جلال کے لیے مار دیا تھا مگر اب جب جلال کے حادثے کی خبر سنی تھی تو وہ اپنے اندر کی تمام مخالفتیں بھول گئی تھی، یہ احساس کیا تھا؟ اسے جلال سے ہمدردی تھی کہ محبت، اور یہ محبت کس نوعیت کی تھی اصولاً جیسی رویہ جلال نے روا رکھا تھا اس کو دیکھتے ہوئے فتح النساء کو اس کے مخالف کھڑا ہونا چاہیے تھا بجائے جلال کی فکر کرنے کے مگر ایسے کوئی محسوسات اس کے اندر جیسے تھے ہی نہیں، اس نے دل میں جھانکا تھا وہاں خاموشی ضرور تھی مگر یہ خاموشی کوئی بھیانک احساس نہیں رکھتی تھی۔

......☆☆......

''جلال بیٹا آپ کے والد محترم متوازن اور بردبار شخصیت کے مالک تھے آپ نے بہت سی خصوصیات نواب سیف الدین پٹوڈی سے چرائی ہیں آپ نے جو بھی کہا وہ غلط نہیں ہے ہم اس اقدام کو سراہتے ہیں مگر آپ کے اس اقدام سے مرزا صاحب کی ساکھ پر بہت اثر پڑتا ہے اور اسی بات کا غصہ ان کو انتہائی اقدامات لینے پر اکسا رہا ہے ہمیں لگتا ہے اس مقدمے کو یہیں بند کر دینا مناسب ہوگا آپ ہمارے عزیز دوست کی اولاد ہیں آپ کے خاندان واحد وارث ہیں اور ہم آپ کو کوئی

تکلیف پہنچتے نہیں دیکھ سکتے آپ کو پہلے بھی مشورہ دیا تھا کہ محتاط رہیے۔'' حکمت چچا نے جلال کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا جلال خاموشی سے ان کو دیکھنے لگے تھے۔

''بیٹا یہ حملہ جو آج ہوا ہے مرزا کی طرف سے ہے اس کا یقین ہمیں ہے مگر سوچئے اگر آپ کو کوئی نقصان ہوتا ہے تو اس کی تلافی ممکن نہیں ہوگی آپ ہمارے لیے تیمور جیسے ہیں ہم نے کبھی آپ میں اور تیمور میں تفریق نہیں جانی، جتنا خیال اور فکر ہمیں تیمور کی رہتی ہے اتنی ہی آپ کی بھی یوں تجھیے نواب صاحب کے جانے کے بعد ہماری ذمہ داری بڑھ گئی ہے سب جانتے ہیں ہم ہندوستان میں رک گئے ہیں اور پاکستان نہیں گئے ہم نے یہاں شمولیت اختیار کی ہے کیونکہ، کیونکہ مصلحت کے لیے بھی کبھی کچھ فیصلوں میں ترمیم ضروری ہو جایا کرتی ہے آپ کا ساتھ دینا تبھی ممکن تھا جب ہم کچھ کسی مضبوط طاقت کا منبع ہوتے کبھی کبھی کچھ کڑوے گھونٹ بھی کرنے پڑتے ہیں سو ہم ہندوستان میں ہیں اور پاکستان جانے کا فی الحال ارادہ نہیں ہے ہم مستحکم مقام کے حامل رہ کر آپ کی معاونت کرنا چاہتے ہیں نواب صاحب کے رفیق ہیں نواب صاحب کے قتل نے ہمیں بھی اس قدر کمزور کیا جتنا آپ کو ہمارا ارادہ نواب صاحب کے ہمراہ پاکستان جانے کا تھا مگر یہ ممکن نہیں ہوسکا ایسا نہیں کہ ہمیں ملال نہیں مگر کبھی غور سے چیتے کو دیکھیے اسے قدم آگے لینے کی غرض سے دس قدم پیچھے بھی لینا پڑیں تو اسے ہار گردانا غلط ہے۔ کیونکہ ان چند قدموں کے بعد چیتا ایک لمبی چھلانگ آگے کی سمت لیتا ہے سو آپ کے اس اقدام پر آپ کی حکمت عملی کو آپ کی ہار گردانتے والے یقیناً بے وقوف کہلائیں گے سو کسی بات کو محض سوچ بنا کر اقدامات کو واپس لینا کوئی شرمندگی والی بات نہیں ہے کیونکہ آپ کو شرمندہ کرنے والے آپ کی حکمت عملی کے متعلق بے خبر ہیں مگر آپ جانتے ہیں اگر چہ آپ کی پوزیشن خاصی مستحکم ہے اور کانگریس آپ کو کوئی بڑی وزارت بھی دینے والی ہے مگر جب تک ان خبروں کی صداقت کے متعلق پتا نہیں چلتا تب تک اس مقدمہ کو کچھ طول دیں اگر مرزا صاحب سمجھیں کہ آپ کا مقدمہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تو انہیں ایسا سمجھنے دیجیے ان کا یہی سمجھنا سود مند ہوگا۔'' حکمت صاحب نے سمجھایا تھا جلال نے سر ہلا دیا تھا۔

''چچا جان ہم اس دن کے منتظر ہیں جب ہم مرزا صاحب کو سلاخوں کے اس طرف دیکھیں اس معاملے میں کوئی معافی نہیں ہے اتنا تو طے ہے کیونکہ ہمارے والدین کا خون اتنا ارزاں نہیں تھا کہ ہم اس معاملے کو ایسے چھوڑ دیں، مرزا کا چہرہ تو ہم بے نقاب کر کے رہیں گے۔'' جلال عزم سے بولے تھے حکمت صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''جو کرنا ہے ضرور کریں مگر تحمل سے آپ کی ساکھ مستحکم ہو اور مستحکم رہنا ضروری ہے اس کے بنا یہ سب بے معنی رہے گا مگر جو مقدمہ آپ نے کیا ہے اس کے باعث مرزا صاحب کی شخصیت کی ملمع کاری کا کچھ تو پتا چلا ہے اور کانگریس میں بھی ان کی حمایت کے لیے کوئی آگے نہیں آ رہا اگر یہی حال رہتا ہے تو کچھ دنوں میں کانگریس سے ان کا پتا صاف ہو جائے گا اتنی بڑی سیاسی جماعت اپنی ساکھ برقرار رکھنے کو ایسے انسان کو اپنے اوپر دھبہ بنا کر رکھنا نہیں چاہے گی اور محترم مرزا سراج الدولہ کانگریس کی ساکھ پر ایک بہت واضح دھبہ ضرور ہیں اور یہ بات بھی واضح ہوتی نظر آتی ہے کہ اپنے مقاصد کے لیے مرزا صاحب نے کانگریس کی ساکھ اور نام کو استعمال بھی کیا ہے تو یہ ایک طرح سے اپنے جال میں صیاد آ گیا والا معاملہ ہے۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا جلال نے سر ہلایا تھا۔

''یہی بات ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مرزا صاحب کسی درجہ مکروہ اور فریبی ہیں ان کا اصل چہرہ لوگوں کے سامنے آنا ضروری ہے کانگریس کل تک ان کی حمایتی رہی ہے اور اگر آج وہی حمایت کرنے سے پس و پیش سے کام لے رہی ہے تو اس کی وجہ یہی مقدمہ ہے اس مقدمہ کے ہونے سے ایک نیک کام تو بہر حال ہوا کہ مرزا چچا کا نقاب کھلنے لگا۔'' جلال نے کہا تھا اور حکمت چچا نے تائید کی تھی۔

☆☆☆

''تقسیم کے عمل نے جیسے ایک افراتفری سی مچادی ہے وہ لوگ بھی جائیداد میں کلیم کرتے دکھائی دیے ہیں جنہوں نے کبھی ہجرت بھی نہیں کی۔'' تیمور نے کہا تھا عین نے خالی دماغ سے محض ان کو دیکھا تھا۔

''ہوس کئی طرح کی ہوتی ہے تیمور اور بھوک بھی کئی اقسام رکھتی ہے لالچ اور حرص وطمع انسانی مزاج کا حصہ ہیں مان لیجیے کہ ہم زمین کے ایک ٹکڑے پر جنت ڈھونڈنے کے خواہاں ہیں مگر فرشتہ بننے کے لائق نہیں ہم کو مان لینا پڑتا ہے کہ ہم انسان ہیں اور انسانیت سے خالی ہیں۔'' عین نے مدہم لہجے میں کہا تھا تیمور عجیب افسوس سے مسکرایا تھا۔

''بجافرمایا نواب زادی جس کو دیکھو انسان ہونے کی دلیلیں دے رہا ہے مگر انسانیت سے خالی ہے بہرحال ایسے موقع بہت سے لوگوں کے لیے محض سنہری موقع بن کر رہ جاتے ہیں وہ محض ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانے کے چکر میں ہوتے ہیں مگر ان کو اتنا جان لینے کی ضرورت ہے کہ جب کوئی واقف نہیں اور کوئی نہیں دیکھ رہا تو اللہ سب دیکھ رہا ہے، انسانوں کی آنکھوں میں کوئی دھول جھونک لے گا مگر اللہ کے غضب سے کوئی کیسے محفوظ رہے گا۔'' تیمور نے کہا تھا۔

''بے وقوف لوگ اپنے لیے زمین پر مال اکٹھا کرتے ہیں اور خردمند لوگ آسمان پر جو زمین پر مال جمع کرتے ہیں ان کی بخشش کیسے ہوگی اس کے متعلق صرف اللہ جانتے ہیں بہرحال ہمیں کسی کی عیب جوئی کرنے کا کوئی حق نہیں جانے ہم سے کب کہاں کوئی کوتاہی سرزد ہوئی ہو اور ہمیں اس کی کوئی خبر نہ ہو، ایسی دعا بھی سزا کا باعث بنتی ہے تیمور پتا نہیں ہم پر یہ براوقت اور آزمائش کیونکر آئی کیونکہ ہم نے جو سزا کاٹی ہے وہ بھی سوچنے پر مجبور کردیتی ہے، اور یوں بھی ابھی یہ سزا ختم نہیں ہوتی۔'' عین النور نے کہا تھا تیمور ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے پھر مدہم لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

''یہ آزمائش ہے نواب زادی سزا نہیں آپ ثابت قدمی سے اس آزمائش سے گزریں گی تو اللہ کی طرف سے انعام ملے گا۔ اللہ اپنے نیک بندوں ہی کی آزمائش لیتا ہے اسے سزا سے جوڑنا مناسب نہیں آپ اس متعلق سوچ کر سوچوں اور ذہن کو مزید مت الجھائیے۔'' تیمور نے عین کو سمجھایا تھا وہ خاموش ہوئے تھے اور عین جیسے کچھ سوچنے لگی تھی تبھی اس خاموش فضا میں ایک آواز ابھری تھی۔

''محترم ہم آپ کو بتا رہے ہیں ہم بڑی جائیداد ہندوستان میں چھوڑ کر آئے ہیں جتنی آپ ہمیں دینے کے متعلق بات کررہے ہیں اس سے زیادہ تو ہم ملازمین رکھتے تھے اتنے اثاثے ناکافی ہیں آپ کو بہرحال جو کرنا ہے آپ کریں گے مگر آپ کسی کا مدعا تو سن لیجیے مدعا سنے بنا آپ کسی بات کا فیصلہ نہیں کرسکتے۔'' وہ آواز سن کر تیمور نے چونک کر دیکھا تھا ہجوم کے باعث وہ بولنے والے کو دیکھ نہیں سکے تھے مگر وہ یقین سے کہہ سکتے تھے کہ بولنے والا کون تھا تیمور نے اٹھتے ہوئے عین کی طرف دیکھا تھا، عین نے حیران ہوکر تیمور کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا ہوا، ایسے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہیں آپ؟'' عین نے پوچھا تھا۔

''ہم نے حیدر میاں کی آواز سنی ہے وہ جائیداد کلیم کرنے والوں کی قطار میں کھڑے تھے غالباً ہم نے انہیں سنا ہے۔'' تیمور نے کہہ کر عین کا ہاتھ تھام کر تیزی سے آگے کی سمت قدم بڑھائے تھے عین حیرت میں غلطاں ان کے ساتھ کھنچتی چلی گئی تھی تیمور عین النور کو لے کر وہاں کاؤنٹر پر پہنچا تھا مگر مرزا حیدر سراج الدولہ دکھائی نہیں دیے تھے۔

''کہاں ہیں مرزا حیدر سراج الدولہ؟'' عین نے پوچھا تھا اور یہاں وہاں نگاہ دوڑائی تھی مگر حیدر دکھائی نہیں دیے تھے تیمور نے کاؤنٹر سے پوچھنے کی ٹھانی تھی مگر کلیم کرنے والوں کی قطار میں جگہ لینا جیسے ناممکن دکھائی دیا۔

''تیمور اس طرح کوئی معلومات ہاتھ نہیں آئیں گی اگر حیدر میاں یہاں تھے بھی تو وہ اب یہاں موجود نہیں ہیں اور اس سے بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ اگر وہ ہم سے قبل یہاں پہنچ گئے تھے تو انہوں نے ہمیں ڈھونڈنے

کی کوشش کیوں نہیں کی جیسے کہ ہم انہیں ڈھونڈنے کی کوشش میں مصروف ہیں دانشمندی یہ ہوگی کہ ہم انہیں نہ ڈھونڈیں اور انہیں خود ہم تک آنے دیں، ان کو بھی اپنی منگیتر کی فکر ہونا لازم ہے فقط ہم ایسی کوشش کیوں کریں؟ وہ ضرور اسی کیمپ میں ہیں ان کا رویہ سمجھ سے بالاتر لگ رہا ہے۔'' عین نے کہا مگر تیمور نے ان کی بات سے گویا انحراف کرتے ہوئے سرنفی میں ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''ہم آپ کی بات سے اتفاق نہیں کرتے عین اگر ہم ان کے لیے ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں تو ہمیں ان کو ڈھونڈنا لازم ہے ہم نواب چچا کے حکم سے آپ کو یہاں لے کر یہاں آئے ہیں اس سفر میں آپ ہماری ذمہ داری ہیں ہم آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے نہ آپ کو کسی طرح کا جذباتی فیصلہ لینے کی اجازت دیں گے۔'' تیمور نے سمجھایا تھا عین تھکن سے بھری نظروں سے تیمور کو دیکھنے لگی تھیں۔

''ہم تھکن سے چور ہیں تیمور ہمارے وجود کو اٹھا کر مزید چلنا جیسے ہمارے لیے ممکن نہیں ہم واپس لوٹ جانا چاہتے ہیں ہم اپنے جلال بھائی کے ہمراہ رہنا چاہتے ہیں۔'' عین نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا ان کا لہجہ تھکن سے بھرا تھا تیمور کو اندازہ تھا مگر وہ ان کی ہمت کو بڑھانے کی غرض سے ان کے ہمراہ تھا توڑنے کی غرض سے نہیں سو فوری طور پر انہوں نے کچھ نہیں کیا تھا عین نے اس تھکن سے پلٹنا چاہا تھا مگر یکدم وہ لڑکھڑائی تھیں تیمور نے ان کو سہارا دے کر تھاما تھا۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں عین، آپ کو آرام کی ضرورت ہے آیئے میں سہارا دے کر آپ کو کیمپ میں واپس لے جاتا ہوں۔'' تیمور نے کہا تھا اور ان کا ہاتھ تھام کر کیمپ کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

''ہمارا نسوانی وقار کہتا ہے کہ ہمیں منزل کے طور پر اپنے آپ کو محدود رکھنے کی ضرورت ہے منزل اپنی جگہ رہتی ہے چل کر مسافر تک نہیں جاتی حیدر جس رشتے سے منسلک ہیں ان کو اس رشتے کی قدر ہونا ضروری ہے۔'' عین نے کہا تھا تیمور نے جواباً کوئی وضاحت نہیں کی تھی وہ جن حالات سے گزر رہی تھیں وہ ان کے وجود دل و دماغ دونوں کو اثر انداز کر رہی تھی، وہ تھکن زدہ تو دکھائی دے رہی تھیں اس کے ساتھ وہ خاصی نحیف اور کمزور بھی دکھائی دے رہی تھیں تیمور کو ان کی صحت کی فکر ہوئی تھی اس لیے وہ ان کو لے کر کیمپ کی طرف لوٹ گیا تھا۔

......☆☆......

خالہ خاموش بیٹھی پتھرائی نظروں سے خوشنما کو دیکھتی رہی تھیں پھر اس کے چہرے کو چھو کر دیکھا تھا۔

''ہاجرہ میری بچی کتنا سمجھایا تھا تجھے میرے پاس رہ میری بات سن مگر تو نے ماں کی بات نہیں مانی تجھے لگا ہوگا تیری ماں غلط ہے دیکھ ثابت ہوگیا نا تیری ماں غلط نہیں تھی۔'' عجب پاگل پن سے خالہ بولی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر خوشنما کے چہرے پر گرے تھے انہوں نے خوشنما کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے ملائمت سے چھوا تھا اور پھر جھک کر خوشنما کی پیشانی پر لب رکھے تھے۔

''میری بچی میری ہاجرہ اچھا ہوا چلی گئی تو یہ دنیا اس قابل نہیں کہ اس میں تیرے جیسے صاف دل والے لوگ رہیں ایسے اجلے چہرے میلی نگاہوں کو کیوں جھیلیں، میلے دل، میلی سوچوں سے ایسے اجلے چہروں کو میلا کردیتے ہیں اچھا ہوا تیرا دامن داغدار نہ ہوا اچھا ہوا یہ پیشانی ایک غرور سے مسلسل چمک رہی ہے، ورنہ دنیا تیری پارسائی پر انگلی اٹھاتی اور تجھے برا بھلا کہہ کر خود کو تسکین دیتی تو دنیا کے سامنے اپنی پارسائی بیان نہ کرپاتی تو ثابت نہ کرپاتی اور ہار جاتی۔'' خالہ نے کہہ کر پاس پڑے چھوٹے سے عنابی صندوق کو کھول کر نکالا تھا اور اس کے اندر سے سفید براق کفن نکالا تھا اور خوشنما کے وجود کو ڈھک دیا تھا۔

''تیری پارسائی کو تیری ماں سمجھتی ہے تیرا یقین کرتی ہے سو تجھے اپنا کفن تحفے میں دیتی ہے یہ بے داغ کفن تیرے دل کے تمام داغ چھپا دے گا اور بھرم رہ جائے گا ہاجرہ میری بچی تیرے پارسائی کے سامنے تیری پاگل ماں کا یہ تحفہ بہت حقیر لگتا ہے مگر اس وقت کے لیے یہی تحفہ بہتر ہے تیری ماں کے پاس تجھے دینے کے لیے اس کے سوا کچھ ہے بھی نہیں تیری عزت پر نگاہ رکھنے والے تیری طرف انگلیاں اٹھانے والے تیرے دامن پر داغ

لگانے والے گندے دماغ کبھی جان نہیں پائیں گے کہ تو کتنی پاک باز تھی تیری روح کس قدر پارسا تھی زمانے نے تجھے جو نام دیے اور تیرے دل پر جو داغ لگائے ان کا ازالہ تیری ماں سے ممکن نہیں مگر جس کے پاس تو جا رہی ہے وہ ذات پاک جانتی ہے سو عزت بچا کر گئی ہے تو گندگی میں کھلا کنول ہے جس نے خود کو بچائے رکھا اور داغدار نہ ہونے دیا اگرچہ خودکشی حرام ہے مگر اللہ جانتا ہے تو نے یہ خودکشی کیوں کی وہ ذات پاک تیری یہ خطا ضرور معاف کردے گی۔

میں تجھے سہاگن کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی تیرا نکاح حمزہ سے کرانے کا سوچا مگر ایسا ممکن نہ ہوسکا مگر بہرحال تجھے دلہن کے لباس میں دیکھ تو لیا مجھے کیا علم تھا یہ تیرے دفن کی تیاری تھی میں تو تیرا نکاح کرکے تجھے حمزہ کے ہمراہ پاکستان بھجوانا چاہتی تھی مگر تیرے نصیب میں یہ ہجرت نہ تھی میری بدنصیب بچی۔'' محلے کی ایک عورت دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی خالہ کی آواز کے تعاقب میں آ کر خالہ کو اس دوشیزہ سے لپٹا دیکھا تھا۔

''میری ہاجرہ اللہ تیری خطاؤں کو معاف فرمائے اور تجھے جنت الفردوس میں مقام دے ایک ماں اپنی بیٹی کو یہی دعا دے سکتی ہے اللہ تعالیٰ تمہارے آگے کی منزلیں آسان کرے میری بچی۔'' خالہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا تھا محلے کی عورت نے خالہ کو زبردستی خوشنما سے الگ کیا تھا اور خالہ کو ساتھ لگا کر چپ چاپ تسلی دینے لگی تھیں۔

فتح النساء خاموشی سے اپنے سامنے کھڑے جلال کو دیکھا تھا وہ انہیں ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتی تھیں جیسے ان کی موجودگی کا احساس کرنا چاہتی تھیں مگر انا کے لیے اس تمام جھکاؤ سے گزرنا آسان نہ تھا سو وہ چپ چاپ کھڑی رہی تھیں۔

''ہم خیریت سے ہیں مارنے والے سے بچانے والا زیادہ بڑا ہے فتح النساء یہی معمولی خراشیں آئی ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' جلال بولے تھے۔ فتح النساء نے خاموشی سے انہیں دیکھا تھا اور گویا ہوئی۔

''ہم جانتے ہیں ہم کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتے اور شاید آپ ہماری سننا ضروری خیال بھی نہیں کریں گے مگر یہ قدم مناسب نہیں تھا یہ دانشمندی نہیں تھی آپ نے مرزا چاچا کے ساتھ مخالفت مول لے کر اچھا نہیں کیا ہم آپ کو سمجھاتے رہے مگر آپ نے ہماری سننا گوارا ہی کہاں کیا۔'' فتح النساء نے شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

جلال نے خاموشی سے بنا کچھ جتائے اور کہے فتح کو دیکھا تھا۔

''ہم......!'' فتح نے کچھ کہنا چاہا تھا پھر جانے کیا سوچ کر خاموش ہوگئی تھیں اور بے بسی کے احساس سے ان کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں جلال نے خاموشی سے ان آنکھوں اور آنسوؤں کو دیکھا تھا۔

''آپ اس درجہ افسردہ کیوں ہیں فتح النساء، ہم سمجھے تھے شاید آپ کو اس سب سے کوئی فرق بھی نہیں پڑے گا، ہم حیراں ہیں کہ آپ کو کس شے سے فرق پڑا ہے کیا محض اس لیے کہ ہم خیریت سے ہیں؟'' وہ مسکرائے تھے اور فتح النساء بھیگتی آنکھوں سے ان کو غصے سے دیکھنے لگی تھیں، ان آنکھوں میں یقیناً اس لمحے کچھ تھا جس کو دیکھ کر جلال پلک جھپکنا بھول گئے تھے۔

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جلال کے لب آہستگی سے ہلے تھے فتح النساء نگاہ پھیر گئی تھیں۔

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

جلال کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

فتح جانے لگی تھیں جب جلال نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا اور شانوں پر ہاتھ رکھ کر ان کا رخ پھیر کر اپنی طرف کرتے ہوئے بغور ان کا چہرہ دیکھا تھا اور ہاتھ بڑھا کر آنسوؤں کو پوروں پر لیا تھا اور شاکی نظروں سے فتح النساء کو دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

''یہ آنسو کس لیے فتح النساء، کس سبب کیا سبب یا پھر کسی کی یاد آرہی ہے آپ کو کوئی خاص سبب ہے تو مطلع کردیجیے آپ کی خاطر پاکستان نہیں گئے ابا جان کی

آرزو تھی کہ ہم پاکستان ہجرت کرتے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا گویا ابا جان کی آخری خواہش کا بھی احترام نہیں کیا کیوں، کیونکہ حیدر میاں پاکستان کے لیے روانہ ہوئے تھے اور ہم وہاں جا کر ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے ہم میں ہمت نہیں تھی فتح النساء کیونکہ آپ نے ہمیں کمزور کر دیا ہے ہم کسی سے نگاہ ملانے کے قابل نہیں رہے۔'' وہ شکوہ کرتے ہوئے ان کی سمت بغور دیکھنے لگے تھے فتح النساء نگاہ جھکائے ان کی نظروں میں چھپی نفرت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھیں سو ان کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھیں۔

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا
میں نے تم سے کی وفا، اور تم نے مجھ سے کیا کیا؟
کیا خجل ہو اب علاج بے قراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دھڑکا کیا

جلال نے ان کا ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر عین دل والی جگہ پر رکھا تھا اور اسے بغور دیکھا تھا۔

''دیکھیے اب بھی دھڑکتا ہے نا یہ دل کمبخت آپ کی بے وفائی سہہ کر بھی رکا نہیں، متواتر دھڑکتا ہے مسلسل دھڑکتا ہے آپ نے بے وفائی کرنا تھی تو دل سے کہہ دیا ہوتا کہ دھڑکنا موقوف کر دے کہ آپ کی بے وفائی کے بعد دھڑکنے کی ضرورت بچتی نہیں تھی مگر آپ نے قصداً دل کو رکنے نہ دیا تھمنے نہ دیا اور دھڑکتا چھوڑ دیا ایسا ظلم بھی کوئی کرتا ہے فتح النساء؟'' جلال نے شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا اور مسکرائے تھے فتح النساء نے اپنی صفائی میں شاید کچھ کہنے کو لب کھولنا چاہے تھے مگر جلال نے ان کے لبوں پر شہادت کی انگلی ٹکا دی تھی اور بغور دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

ٹانکنے چاک، گریباں کو تو ہر بار لگا
ہاتھ کٹواؤ جو نا صح رہے اب تار لگا
جذبہ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤ کیونکر؟
آپ وہ میرے گلے دوڑ کے اک بار لگا

''کچھ مت کہیے فتح النساء بے وفائی کے ذکر خوش آئند نہیں ہوتے بات رسوائی کی ہو تو خاموشی اختیار کرنا مناسب ہے نا، سو لب سی لینے میں کیا مضائقہ ہے بھول جائیے سب پرانا زخم ہرا کرنا ہے تو ایک بار مزید کوئی نیا درد دیجیے وہ درد پرانا ہو گیا اب اس دوست سے نبٹنے کا سلیقہ آنے لگا ہے اس درد سے سوا کوئی بھی اور آپ کو درد دینے کا سلیقہ بھی۔'' وہ مسکرائے تھے فتح النساء نے اشکوں سے بھری آنکھوں سے انہیں ایک نگاہ دیکھا تھا اور ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ کر نکال لیا تھا اور ان کی سمت تکتی ہوئی پر اعتمادی سے گویا ہوئی تھیں۔

''کہنے کو شاید ہمارے پاس بھی بہت کچھ ہے جلال الدین مگر ہم حروف ضائع کرنا نہیں چاہتے کیونکہ آپ سنتے ہوئے نہیں سنیں گے اور دیکھتے ہوئے نظر انداز کر دیں گے کیونکہ آپ یہی کرتے آئے ہیں اور اس کہانی کو دہراتے رہیں گے آپ کا سچ آپ کا خود ساختہ ہے اسے آپ خود ترتیب دیتے ہیں سو آپ کسی اور کا سچ سننے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے، بے وفا ہوتے تو آج آپ کے ہمراہ نہ کھڑے ہوتے جتنے نشتر آپ لگاتے ہیں ان کا سامنا کوئی کیونکر کرنا چاہے گا کلیجہ ہمارا بھی چھلنی ہے دکھ ہمیں بھی ہے مگر سننا نہیں چاہیں گے سو ہم کہنا بھی نہیں چاہتے آپ ہمیں الزام دیتے رہیے اور ہم ہر بار زخم سہتے رہیں گے دیکھتے ہیں کس کا حوصلہ زیادہ ہے، آپ کے الزام دیتے رہنے کا یا ہمارے درد سہتے رہنے کا۔'' وہ کہہ کر پلٹی تھی اور چلتے ہوئے وہاں سے نکل گئی تھیں جلال ان کو دیکھتے رہے تھے اور پھر نگاہ جانے کیوں یکدم ان کے خود خالی ہاتھ پر ٹک گئی تھی۔

......☆☆......

عین سر جھکائے افسردہ سی بیٹھی تھی تیمور سمجھ نا پایا تھا کہ وہ کس باعث افسردہ ہیں۔

''کیا آپ چاہتی ہیں کہ ہم ایک بار پھر حیدر میاں کی تلاش کا کام شروع کر دیں۔'' وہ قصداً حیدر میاں کے متعلق گویا ہوئے تھے مگر وہ خاموشی سادھے بیٹھی رہی تھیں، تب تیمور ان کی سمت دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

''نواب زادی کیا آپ واپسی کی خواہشمند ہیں مگر پھر اس سفر کا کیا سبب رہے گا۔'' وہ تیمور نے ان کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا عین سر اٹھا کر ان کی سمت دیکھنے لگی تھیں۔

''فی الحال یہ تمام سوال جواب نہیں رکھتے تیمور بہادر یار جنگ ابا جان نے خوامخواہ آپ کو بھی زحمت دی آپ کے ساتھ بھیجنے کی کیا وجہ تھی بھلا؟ اگر ابا جان کو بھیجنے کا فیصلہ لینا ہی تھا تو ہمیں بھیجتے۔'' وہ خفگی سے گویا ہوئی تھیں۔

یقیناً اس لمحہ وہ خلفشار کا شکار تھیں اور ان کے دماغ میں بہت کچھ چل رہا تھا، سو ان انتشار کو کوئی سمت یا راستہ تو درکار تھا اور تیمور پر غصہ کرنا آسان ترین راستہ تھا تیمور نے ان کو خاموشی سے سنا تھا گویا وہ ان کی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا اور جان بوجھ کر ان کے غصے کو راہ دینا چاہتا تھا عین نے ان کی طرف سے نگاہ ہٹائی تھی اور بولی تھیں۔

''آپ واپس چلے جائیں تیمور آپ کے یہاں رکنے کا کوئی سبب نہیں ہے آپ ہمارے ہمراہ ہونے کا کوئی جواز نہیں رکھتے ٹھیک ہے ابا جان آپ پر اس درجہ اعتبار ضرور کرتے تھے مگر آپ کو ہمارے ہمراہ روانہ کر دینا کوئی معقول جواز نہیں یہ رستہ ہمارا تھا منزل ہماری تھی ہم جیتے یا مرتے کسی اور کو کیا؟'' وہ انتہائی غصے سے گویا کسی پتے کی مانند کانپ رہی تھیں ان کا نازک اندام وجود جیسے کسی پتے کی مانند کسی طوفان کی زد پر تھا وہ تیمور کی سمت سے پشت پھیر کر کھڑی ہو گئی تھیں تیمور تب بھی ان کو خاموشی سے دیکھتے رہے تھے اور کچھ نہیں کہا تھا عین اس انتشار کے باعث پلٹی تھیں اور گویا ہوئی تھیں۔

''آپ اب تک کھڑے ہیں گئے کیوں نہیں ابا جان نے آپ پر جو ذمہ داری لگائی تو وہ ہمیں صحیح سلامت پاکستان چھوڑنے کی تھی نا؟ تو ہم پاکستان پہنچ چکے ہیں سو اب اور کیا اس کے بعد کیا ہونا باقی ہے اب ہماری قسمت کہ ہمیں حیدر میاں ملے یا نہ ملیں کسی اور کو اس سے کیا واسطہ؟'' وہ گھورتے ہوئے سرخ آنکھوں سے گویا ہوئی تھیں تیمور نے اس قدر غصے میں ان کو اس سے قبل نہیں دیکھا تھا غالباً ایسا پہلی بار ہوا تھا عین کا غصہ انتہائی شدت رکھتا تھا تیمور تب بھی اسی پرسکون کیفیت سے ان کو دیکھتا رہا تھا اور پھر مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''نواب زادی سیف چچا جان سے جو بات ہوئی تھی اس کے متعلق آپ واقف نہیں چچا جان نے ہمیں صاف کہہ دیا تھا کہ آپ کا ہاتھ نا صرف حیدر میاں کے ہاتھ میں سونپ کر آئیں بلکہ آپ کا نکاح بھی کروائیں سو چچا جان سے کیا گیا وعدہ تو ایفا کرنا پڑے گا اس کے بنا ہم واپس نہیں لوٹیں گے۔'' تیمور پرسکون انداز میں کہتا ہوا بولا تھا عین نے تیمور کی طرف دیکھا تھا اور پھر سر کو جیسے درد کی شدت سے تھاما تھا تیمور آگے بڑھا تھا اور تشویش سے پوچھا تھا۔

''عین، آپ خیریت سے ہیں نا؟'' وہ پریشان ہو اٹھے تھے عین نے ان کی طرف دیکھے بنا سر ہلایا تھا اور مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

''ہمیں نہیں لگتا ابا جان نے ایسی کوئی ذمہ داری آپ کو سونپی ہوگی۔'' وہ جانچتی نظروں سے تیمور کو دیکھتے ہوئے جیسے اعتبار کرنے کو تیار نہ تھیں۔

''آپ ہم پر اعتبار نہیں کرتیں عین النور؟'' تیمور جیسے بہت دل برداشتہ ہوا تھا۔

عین نے گہری سانس خارج کی تھی اور بولی تھیں۔

''آپ اچھے دوست ہیں یہ بات ہم جانتے ہیں ابا جان آپ کو اہم ذمہ داریاں سونپتے رہے ہیں یہ بات بھی ہم جانتے ہیں ابا جان آپ پر انتہائی درجے کا اعتبار کرتے ہیں یہ بات بھی علم میں ہے مگر نکاح والی بات ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی ابا جان یہ ذمہ داری آپ کو کیسے سونپ سکتے ہیں، اگر وہ ایسی ذمہ داری جلال بھائی کو سونپتے تو عقل تسلیم کرتی مگر آپ؟'' نواب زادی نے گویا اسے ان کی حیثیت یاد دلائی تھی کہ ان کا کیا مقام ہے اور وہ اس درجہ اہمیت کے لائق نہیں اور محض ایک دوست کے بیٹے ہیں۔'' ان کی بات سن کر جہاں تیمور کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے عین کو بھی شاید اپنے کہے کا احساس ہوا تھا وہ خاموش ہو گئی تھیں اور پھر قدرے توقف سے بولی تھیں۔

''تیمور ابا جان آپ پر اتنی بڑی ذمہ داری کیسے اور کیونکر ڈال سکتے ہیں ہمارا مطلب ہے آپ ضرور اس ذمہ داری کے قابل ہیں مگر ہم......!'' وہ جیسے سمجھانے کی کوشش میں ہار گئی تھیں اور خاموش ہو گئی تھیں۔

تیمور ان کی سمت دیکھتے ہوئے پلٹنے لگے تھے جب

عین النور بولیں۔
''تیمور ہم معذرت چاہتے ہیں ہمارا مقصد آپ کی دل آزاری قطعاً نہیں تھا وہ دراصل ہم بہت الجھے سے تھے اور شاید غصہ کا شکار آپ ہوگئے۔'' عین النور بولی تھیں مگر تیمور کچھ کہے بنا وہاں سے ہٹ گئے تھے عین ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

......☆☆......

''ایسا ممکن نہیں تھا کہ نشانہ چوکتا مگر ایسا ہوا ہمیں یقین نہیں ہوتا جلال کا ڈرائیور اتنی بڑی رقم لے کر بھی اپنے مالک کو کیسے بچا گیا کیا جلال کو تمام احوال کہہ سنایا ہوگا اس ملازم نے یا پھر یہ محض ایک اتفاق ہے کہ جلال اس حادثے میں بال بال بچ گئے ہیں۔'' مرزا صاحب عجیب وحشت سے بولے تھے اور اپنے وکیل کو دیکھا تھا وکیل صاحب مسکرا دیے تھے۔
''محترم مرزا صاحب معاملہ کچھ الجھا الجھا سا ہے سمجھ میں ہماری بھی نہیں آرہا مگر ایسا لگتا ہے آج کا لونڈا آپ کو چار سو سے گھیر رہا ہے۔'' وکیل صاحب نے کہا تھا اور مرزا ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔
''کیا مطلب وکیل صاحب ہمیں ایسا نہیں لگتا ہم نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے وہ آج کا بچہ ہم سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔'' مرزا سراج الدولہ تنی گردن سے بولے تھے انہیں خود پر جیسے بے حد یقین تھا۔
''زندگی شہ اور مات کی بساط بنا کر کاٹی ہے کئی فتوحات پائی ہیں ہم اتنی کچی کھیلیں نہیں کھیلتے۔'' مرزا صاحب کا سر غرور سے تنا تھا وکیل صاحب مسکرا دیے تھے۔
''محترم بجا فرماتے ہیں آپ گھاگ ہیں مگر اس سے جیت یقینی دکھائی نہیں دیتی آج کل کے نوجوانوں کے دماغ بھی کمال کے چلتے ہیں پاکستان ہندوستان کی تحریک میں نوجوانوں نسل کا بہت ہاتھ رہا قیادت اگرچہ پرانی نسل کی تھی مگر اس پرانی نسل نے نئی نسل کو ایک نئی سوچ کے ساتھ مقصدیت بھی دی، مقصد ملا تو گویا منزل کے لیے سفر آسان ہوگیا، نوجوانوں کا عزم اور ولولہ اس تحریک کو بڑھا کر کہاں سے کہاں لے گیا کالجوں، یونیورسٹیوں میں اس تحریک نے سر اٹھایا تو فرنگیوں کو اپنی شکست کا اعلان کرتے ہی نہیں سو نئے جوش و ولولے کو رد کرنا ممکن نہیں مرزا صاحب۔'' وکیل صاحب نے سمجھایا تھا۔ مرزا صاحب مسکرا دیے تھے۔
''وہ اور بات تھی محترم وکیل صاحب یہ اور بات ہے چھوٹے نواب ضرور چالاک ہوں گے مگر ہماری چالوں کو سمجھنے کے لیے ان کی عقل تھوڑی ہے ان کے والد محترم نہیں سمجھ پائے ہمیں ہم مصلحتوں کے تحت کھیل کھیلتے اور چالیں چلنے کے عادی ہیں گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو ہم انگلی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔'' مرزا صاحب مسکرائے تھے وکیل صاحب نے سر ہلایا تھا۔
''ہم نے ان کے والد محترم کو کئی بار شکست دی ہے بہت کمال کی سمجھداری رکھتے تھے مگر ہم سے نہیں نبٹ سکے ان کے سپوت کہاں کے سورما ہیں۔'' وہ ہنسے تھے اور مونچھوں کو تاؤ دینے لگے وکیل صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

......☆☆......

عین بہت بے چین ہوگئی تھیں تیمور کو اتنا کچھ سنا تو دیا تھا مگر اب دل بہت پریشانی میں گھر گیا تھا تیمور کیمپ میں کہیں دکھائی نہیں دیے تھے، وہ کئی بار ان کی تلاش میں نکلی تھیں اور کیمپ میں لوٹ آئی تھیں۔
''یا خدا ہم نے کیا کردیا۔'' عین کو جیسے اپنے کیے کا افسوس ہوا تھا انہوں نے زندگی میں کبھی اس طرح غصہ نہیں کیا تھا مگر جانے کیا ہوا تھا شاید ان کا دل بہت بوجھل تھا اور انہوں نے تمام غصہ تیمور پر انڈیل دیا تھا انہوں نے سوچا نہیں تھا کہ تیمور کو کوئی بات ناگوار گزر سکتی ہے یا ان کو کوئی صدمہ ہوسکتا ہے یا وہ کہیں چھوڑ کر جا بھی سکتے ہیں تیمور کے ساتھ رہ کر وہ خود کو انتہائی محفوظ تصور کر رہی تھیں جیسے انہیں کسی بات کا کوئی خوف نہ تھا کو سہارا زندگی میں کتنے من رکھتا ہے ان کے ہمراہ ہوتے ہوئے انہوں نے سوچا نہیں تھا مگر اب یکدم ایسا لگا تھا جیسے وہ کھلے آسمان کے نیچے تنہا کھڑی تھیں اجنبی چہرہ کو دیکھتے ہوئے ان کے اندر خوف ہی خوف تھا ان چہروں میں سے وہ کسی کو نہیں جانتی تھیں ایک اجنبی جگہ پر ایک اجنبی کا

سا ماحول میں اتنے سارے اجنبی لوگوں کے ساتھ وہ جیسے بولائی بولائی سی پھر رہی تھیں ہر چہرہ متفکر تھا سب کی اپنی فکریں تھیں مگر انہیں بھرے جہاں میں اپنا آپ بہت خالی لگا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کس طرح تیمور کو تلاش کریں مگر وہ کئی بار ان کی تلاش میں نکل کر واپس کیمپ لوٹی تھیں، انہوں نے تب نہیں جانا تھا کہ وہ مضبوط تھیں تو صرف تیمور کی وجہ سے یا پھر اگر ان کے حواس اس درجہ توانا تھے تو فقط تیمور کی غرض سے ٹرین میں جب وہ دور ہوئے تھے تو وہ مسلسل انہی کے متعلق سوچتی رہی تھیں۔

''کیا ہوا بٹی اس طرح جلے پیر کی بلی کی طرح کیوں پھر رہی ہو کوئی کھو گیا ہے کیا؟'' کسی خاتون نے عین کو پریشان دیکھ کر پوچھا تھا مگر عین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''تم تو غالباً اپنے خاوند کے ہمراہ تھیں نا۔'' خاتون نے عین کو دیکھ کر قیاس کیا تھا۔

مگر عین نے کوئی جواب دیے بنا قدم کیمپ کی طرف اٹھا دیے تھے اور کیمپ میں آ کر ان کے آنسو بہنے لگے تھے اور سارے بندھ ٹوٹ گئے تھے۔

......☆☆......

جلال کافی کے سپ لیتے ہوئے کچھ الجھے ہوئے دکھائی دیے تھے جب فتح النساء ان کے لیے دودھ میں ہلدی ملا کر لائی تھیں اور جلال ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے فتح النساء نے خود ان کو دیکھا تھا اور متوجہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں جانی تھی۔

''ہم آپ کے لیے دودھ لائے تھے ہلدی ملا دودھ آپ کے زخموں کو جلدی اچھا ہونے میں معاونت کرے گا۔'' کہہ کر فتح النساء نے دودھ کا گلاس ان کی سمت بڑھایا تھا جلال نے فتح النساء کو دیکھا تھا اور مسکرا دیے تھے۔

''اتنا خیال کہیں دودھ میں زہر نہ ملا لائیں ہوں۔'' ایک طنز کا تیر چلا تھا فتح النساء نے ان کی سمت دیکھتے بنا توقف دودھ کا گلاس لبوں سے لگایا تھا جلال نے ان کا ہاتھ روکا تھا اور گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا تھا اور کافی بھول کر دودھ کو گھونٹ گھونٹ پینے لگے تھے ان کی نگاہیں فتح النساء پر ٹکی رہی تھیں فتح النساء خاموش سے ان کو جیسے جتاتی نظروں سے دیکھتی رہی تھیں۔'' جلال نے گلاس کو خالی کر کے ان کی سمت بڑھایا تھا اور آہستگی سے بولے تھے۔

''اگر اس گلاس میں زہر ملا بھی ہوتا تو ہم چپ چاپ پی لیتے فتح النساء۔'' انہوں نے جتانے کو اپنی طرف سے بڑی بات کہی تھی مگر یہ بات جلال کا اعتبار نہیں ان کا شک ظاہر کرتی تھی۔

''ہم جانتے ہیں آپ کو اعتبار نہیں جلال آپ کا شک واضح ہے جہاں اعتبار نہیں ہوتا وہاں ایسا شک ہونا حیران کرنے والا فعل نہیں لگتا۔'' فتح النساء جیسے گلہ کرنے میں تامل کر رہی تھیں جلال کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری اور بولے تھے۔

''ہمیں لگا آپ کو رشتوں کا کوئی مہر نہیں ہے فتح النساء مگر آپ تو رشتوں کے متعلق خاصی سمجھ بوجھ رکھتی ہیں۔'' ایک مزید طنز ہوا تھا فتح النساء نے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ خاموشی سے پلٹی تھیں اور جانے لگی تھیں جب جلال نے آواز دے کر روک لیا تھا۔

''فتح النساء۔'' اور فتح النساء رک گئی تھیں پلٹ کر نہیں دیکھا تھا جلال نے ان کی پشت کو دیکھا تھا اور نرم لہجے میں بولے تھے۔

''عجیب سی بات ہے نا، ہمارے درمیان عجیب سا رشتہ ہے اور اس عجیب سے رشتے کے جیسے کوئی معنی ہی نہیں۔'' جلال کے کہنے پر فتح النساء نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

''رشتہ کوئی عجیب نہیں ہوتا چھوٹے نواب رشتوں کو عجیب معنی ہماری سوچ پہناتی ہے، ہمارا نظریہ رشتوں کی ہیت اور معنی بدلتا ہے ہوسکتا ہے آپ کا نظریہ اس رشتے کو کسی اور زاویے سے دیکھ رہا ہو اور ہمارا نظریہ اور زاویہ مختلف ہو، اگر ہم دونوں کی سوچ اس رشتے کے متعلق ایک نہ ہو تو اس پر حیران ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔'' فتح النساء مضبوط لہجے کے ساتھ گویا مضبوط موقف بھی رکھتی تھیں جلال خاموشی سے دیکھنے لگے تھے فتح النساء نے

حتمی سوچ کے ساتھ انہیں دیکھا تھا اور قدم ان کی سمت اٹھایا تھا۔

''چلیے طے کرلیجیے کہ کیا کرنا ہے؟ یہ طنز کے تیر جتنے ہوں گے تھوڑے ہیں یہ آپ کے دل کو زیادہ دیر راحت نہیں دیں گے بلآخر آپ کا دل پھر اس نفرت سے بھر جائے گا آپ کے دل کو سکون نہیں رہے گا اور ذہن منتشر رہے گا کوئی حتمی فیصلہ لے کر قصہ تمام کر دیجیے اس سے دل کی بے چینی اختتام پذیر ہو جائے گی اور سارا قلق جاتا رہے گا۔'' وہ مدہم لہجے میں بولی تھیں۔'' جلال مسکرا دیے تھے۔

''کچھ رشتے پھانس بن کر ہمیں بے چین رکھتے ہیں فتح النساء شاید آپ کو خبر نہیں آپ ضرور چاہتی ہوں گی کہ ہم آپ کو رہائی دے دیں اس رشتے سے اور تمام ذمہ داریوں سے مگر جو زخم آپ نے ہمارے دل کو دیے ہیں وہ کسی بھی طرح مندمل ہونے والے نہیں آپ کو زندگی سے خارج کر کے بھی درد جوں کا توں رہے گا سو کیا فرق پڑتا ہے یہ رشتہ ختم ہو یا باقی نہ رہے درد تو موجود رہے گا اور درد کی حد بھی کم ہی نہیں ہوگی۔'' جلال نے اپنا موقف بیان کیا تھا فتح النساء نے گہری سانس لی تھی۔

''تو پھر حل کیا ہے؟ ہمیں ایک دوسرے کا عادی ہونا پڑے گا یہ لازم ہے۔'' فتح النساء نے جیسے تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا جلال نے پرخیال انداز میں سر ہلایا تھا۔

''کم بخت دل کو اسی بات کی عادت تو پڑ چکی ہے اور عادت کو اب بدلنا ممکن نہیں لگ رہا کیا کیجیے۔'' جلال جیسے تھکے ماندے لہجے میں بولے تھے۔

''اگر ہم ایک دوسرے کے عادی ہو بھی جائیں اور مان بھی لیں کہ یہ تعلق اسی طور چلتا ہے تو پھر بھی بے وفائی اپنا ذکر کہیں سے اٹھا لائے گی اور پھر وہی شکستہ پائی قدموں سے کسی بیل کی طرح لپٹنے لگے گی۔'' وہ تھکے ماندے لہجے میں بولے تھے فتح النساء کے دل پر جیسے گہرا وار ہوا تھا انہوں نے بہت ہمت سے سہا تھا۔

''اعتبار دل سے قائم ہوتا ہے چھوٹے نواب جب آپ کا دل اعتبار سے خالی ہے تو پھر کوئی شکوہ ممکن نہیں ہمیں بھی افسوس ہے کہ آپ نے ہم پر شک کیا ہماری وفا کی قدر نہیں کی اور سب سے بڑھ کر اس محبت کی قدر نہیں کی جو ہم آپ کے لیے اپنے دل میں رکھتے تھے ہمیں بھی دکھ ہے کہ آپ نے اپنے شک کی بنا پر اس رشتے کو انتہائی نہج پر لا رکھا بجائے سمجھ بوجھ سے کام لینے کے آپ نے اس رشتے کو سوالیہ نشان بنا دیا اور اس تعلق میں جیسے اب کچھ باقی نہیں بچا آپ نے ہمارے دامن پر داغ لگایا ہمیں بے وفا جانا بجائے اس کہ آپ ہماری طرف داری کرتے آپ نے ہمیں حیدر میاں کے ساتھ منسلک کیا وہ بری نیت رکھتے تھے ہمیں بری نظر سے دیکھتے تھے ہمیں اور پریشان کرنے کے ساتھ دھمکیاں دینا بھی انہوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا ہم نے چیخ چیخ کر کہا مگر آپ نے یا نواب زادی نے ہمارا یقین کرنے کی بجائے الٹا ہمیں ہی شک کے دائرے میں رکھا ہمیں ہی لعن طعن کیا ہمیں آپ سے محبت تھی بے حد محبت تھی تب سے جب سے محبت کے معنی بھی نہیں جانتے تھے مگر کبھی آپ سے کہا نہیں کہنے کا موقع ہی نہیں آیا آپ نے نوبت ہی نہ آنے دی ہمارے لیے کیا کیا آپ نے کیا خاص معنی دیتے آپ نے اس تعلق کو سب مذاق بنا دیا بھی تو ہم نے کہا تھا کہ ہم آپ کے لیے مر چکے ہیں ہم تو آپ کے سامنے بھی نہیں آنا چاہتے تھے اپنی موجودگی اور زندگی کے کوئی شواہد بھی آپ پر عیاں کرنا نہیں چاہتے تھے مگر آپ کے سامنے آ کر غلطی کر دی ہمیں لگا آپ اس خاموش محبت کو سمجھیں گے مگر آپ اس محبت کی کچھ قدر نہ جان سکے ہم آپ سے منسوب تھے آپ کی عزت تھے اور آپ نے ہمیں خود اپنے ہاتھوں رسوا کیا کسی غیر نے برا کیا مگر آپ جو محرم تھے آپ نے کیا کیا اپنے ہاتھوں سے ہمارے دامن پر کیچڑ اچھالا ہمارا دل چھلنی کیا اور دنیا بھر میں رسوا کیا ایسے سورما تھے آپ تو حیدر میاں کا گریبان تھام کر کیوں طمانچہ رسید نہ کیا بے وفائی تھی کہ نہیں مگر آپ کی غیرت پر واجب تھا کہ ایک بار حیدر میاں سے اپنی زوجہ کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا حساب ضرور چاہتے پھر ہماری بے وفائی کا فیصلہ کرتے حیدر میاں اتنا بڑا کارنامہ انجام دے کر نکل گئے اور الٹا آپ نے عین النور کو بھی ان کے لیے پاکستان روانہ کر دیا اس گھٹیا انسان کے لیے یہ کوئی

انعام تھا اس نواب خاندان کی طرف سے۔'' وہ سچائی جلال کے سامنے رکھتی ہوئی بولی تھیں اور جلال نے ہاتھ اٹھا کر ان کو مزید بولنے سے باز کر دیا تھا ان کی پیشانی کی رگیں تن گئی تھیں اور غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''عین النور کے متعلق فیصلہ ہم نے نہیں کیا فتح النساء مگر ہم اس زندگی اور رشتے کا فیصلہ کر سکتے ہیں بہت جلد آپ کو خبر ہو جائے گی کہ اس رشتے کی وقعت کیا تھی اور اس کے ساتھ کیا ہونا چاہیے تھا ہمیں یہ رشتہ ایک ناسور بنتا دکھائی دیتا ہے اور ناسور کا علاج کیا ہوتا ہے اس کی خبر آپ کو ہو جائے گی۔'' جلال نے حتمی انداز میں پر اشتعال انداز میں کہا تھا فتح النساء ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

......☆☆......

خالہ نے خوشنما کی قبر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے خوشنما کے وجود کو محسوس کیا تازہ گیلی مٹی پر جیسے خوشنما کا لمس محسوس کیا تھا۔

''میری بچی ہاجرہ کچھ پرندے لمبے سفر کا ارادہ کرتے ہوئے بھی سفر اختیار نہیں کرتے تو بھی ایک ایسا پنچھی تھی تیرے پاس ہمت تھی ارادہ تھا تو نے اڑان بھرنا چاہی مگر سفر اختتام پزیر ہو گیا یہ تیری ماں تجھے کبھی فراموش نہیں کرے گی تو اس ماں کے دل میں آباد رہے گی میری ہاجرہ تجھے سکون سے سوتا دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہے اب کہیں کوئی ہلچل نہیں کوئی پریشانی نہیں سب فکریں ختم ہو گئی ہیں۔ سچ پوچھ تو مجھے بھی ڈر تھا اتنی حسین ہے تو اگر کسی کی نگاہ پڑ جاتی تو نوچ لیتا تجھے مجھے ڈر لگتا تھا جب تو پاکستان ہجرت کے متعلق ذکر کرتی تھی مگر خوف تھا تو بھوکے بلوائیوں کے کام نہ آ جائے مگر تو نے میرا ڈر دور کر دیا جو ہاجرہ کے ساتھ ہوا تو نے اس کا ازالہ کر دیا ہاجرہ کا دامن داغدار کر دیا تھا بلوائیوں نے اس کی عزت کو روند دیا تھا ظالموں نے مگر تو نے ہاجرہ کی طرح ان کو موقع نہیں دیا میری بچی میری ہاجرہ تجھے دیکھ کر ہمیشہ ہاجرہ کا خیال کیوں دماغ میں کوندتا رہا اب سمجھ آیا جب تو بلوائیوں کے آگے عزت بچا کر بھاگ رہی تھی اور چمکتی آسمان سے کوندتی بجلی نے ان بلوائیوں کو جلا کر خاک بنا دیا تھا تب میں جان گئی تھی کہ تو میری ہاجرہ ہے اور تو اپنا دامن کبھی داغدار نہ ہونے دے گی مجھے تجھ پر فخر ہے میری بچی تو نے عزت کو زندگی پر ترجیح دی حیات کو چھوڑ کر عزت کو چنا اور عزت سے موت کو گلے لگا لیا تو میری ہاجرہ ہے اور میرا دل تیری محبت سے بھرا ہے ایک ماں کا دل محبت سے ہمیشہ بھرا رہتا ہے آج میری اولاد میرے ساتھ نہیں مگر میں سرشار نہیں میری روح سکون میں ہے میں نے دونوں بچیوں کو اپنے ہاتھوں لحد میں اتارا ہے مگر مجھے اب کوئی ملال نہیں میری دونوں بچیاں پرسکون نیند سو رہی ہیں اور میری بیٹیوں کا سکون مجھے سکون دیتا ہے۔'' وہ آنسو پونچھ کر مسکرائی تھیں ان کے چہرے پر حد درجہ سکون دکھائی دے رہا تھا جیسے صحیح معنوں میں وہ بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو گئی تھیں۔

......☆☆......

''بہن کیا معاملہ ہے آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔'' وہ سیاہ چادر سے منہ چھپائے سر جھکائے بیٹھی تھیں جب ایک آواز سنائی دی تھی اور عین کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا چونک کر دیکھا تھا سامنے شہاب کھڑا تھا وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھیں مگر اس وقت کا تقاضا تھا کہ وہ خاموش رہتیں اور شہاب پر ظاہر نہ کرتیں کہ وہ اسے پہچان چکی ہیں وہ نظر جھکا گئی تھیں اور سر نفی میں ہلا کر گویا جان چھڑائی تھی۔

''اوہ آپ قوت گویائی سے محروم ہیں معذرت چاہتا ہوں بہن لیکن مدد کی ضرورت ہو تو آپ کا بھائی شہاب یہاں ہے کوئی مشکل ہوئی تو فوراً حل کر دے گا، آپ آیئے ہمارے ساتھ۔'' عین اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔



اندر باہر

رانا زاھد حسین

ان کی مثال آگ اور پیٹرول کی مانند تھی دونوں کا ملنا تو دور کی بات ان کا قریب آنا بھی دھماکا سے کم نہیں تھا۔

نئے افق کے قارئین کے لیے ہلکی پھلکی پرمزاح تحریر

پاک سرزمین شاد باد
کشور حسین شاد باد

کشور کو گلی میں دیکھ کر حفیظ قومی ترانہ پڑھنے لگا۔ وہ حفیظ جالندھری تو نہیں تھا مگر اپنے آپ کو حفیظ لاہوری ضرور سمجھتا تھا۔ شعروشاعری کا بھی اسے بہت شوق تھا۔ شاعری تو اس نے کیا کرنی تھی بس وہ تک بندی کر لیتا تھا ’کشور واقعی حسین لڑکی تھی اور ہر وقت شاد باد رہتی تھی۔ لمبا قد بھرا ہوا مضبوط جسم‘ مارشل آرٹس کا فن بھی اس نے سیکھ رکھا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ہر وقت لڑنے کے لیے تیار رہتی تھی۔ اس کے محلے کے لوگوں نے اسے پھولن دیوی کا خطاب دے رکھا تھا۔ حفیظ بھی کافی مضبوط جسم کا مالک تھا اس کی طبیعت میں بھی غصہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا‘ چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ آپے سے باہر ہو جاتا تھا‘ کسی سے جھگڑا مول لینا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا‘ کشور اگر آندھی تھی تو حفیظ طوفان تھا۔ دونوں لڑنے جھگڑنے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔

اوئے تم نے مجھ کو دیکھ کر قومی ترانہ کیوں پڑھا؟‘‘ کشور نے حفیظ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور گلی کے تھڑے پر بیٹھ گئی۔

’’قومی ترانے کا کچھ تو احترام کرو‘ جب قومی ترانہ پڑھا جاتا ہے تو اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔‘‘ حفیظ نے کشور کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

’میں پوچھتی ہوں تم نے مجھے دیکھ کر قومی ترانہ کیوں پڑھا؟‘‘

’’کیونکہ تمہارا نام کشور ہے اور تم حسین بھی ہو اور ہر وقت شاد باد بھی رہتی ہو۔‘‘

’’اگر میرا نام اللہ رکھی ہوتا تو پھر تم کیا کرتے؟‘‘

’’پھر میں تم کو دیکھ کر ملی نغمہ پڑھتا سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے۔‘‘

’’آخر تم چاہتے کیا ہو؟‘‘

’’تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’دل دل پاکستان جان جان حفیظ بھائی جان۔‘‘ کشور نے بھی اپنے جذبات کا اظہار ملی نغمہ گا کر کیا تھا۔

’’یہ جذبہ جنون تو ہمت نہ ہار‘ ایک دن ایسا آئے گا جب تم مجھے صرف جان کہو گی اور بھائی تمہاری زبان سے ایسے اڑ جائے گا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔‘‘

’’تم اپنی بکواس بند کرو گے یا دکھاؤں تم کو دو ہاتھ۔‘‘ کشور نے بروس لی کی طرح کا ایکشن بنایا۔

’’قوت اخوت عوام‘ حفیظ نے سرنڈر کر کے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

’’چلو ہٹو آگے سے۔‘‘ کشور نے حفیظ کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

’’اگر نہ ہٹوں تو پھر......‘‘ حفیظ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

حفیظ اور کشور میں تکرار جاری تھی کہ محلے کا غنڈہ قادر وہاں آ گیا۔

یہاں کیا ہیر رانجھے کی فلم چل رہی ہے۔ قادر نے کشور اور حفیظ کو معنی خیز نگاہوں سے گھورا۔

’’قادر اپنا کام کرو ورنہ میں مار مار کر تم کو کدو بنا دوں۔‘‘ حفیظ نے اپنی آستین چڑھا لیں۔



''اوئے تم اپنے آپ کو گوالمنڈی کا غنڈہ سمجھتے ہو۔''
قادر بھی سینہ پھلا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
''کشور تم گھر جاؤ میں ذرا قادر صاحب کا دماغ درست کرلوں۔''
کشور چلی گئی تو قادر اور حفیظ گتھم گتھا ہو گئے' حفیظ نے مار مار کر قادر کا بھرکس نکال دیا' دونوں کی لڑائی دیکھنے کے لیے سارا محلہ اکٹھا ہو گیا ان تماشائیوں میں قادر کے ساتھی حمید' رشید اور سلطان بھی تھے لیکن تینوں نے قادر کا ساتھ نہ دیا اور دور کھڑے ہو کر قادر کو پٹتے ہوئے دیکھتے رہے' حفیظ جب قادر کی خوب دھلائی کر چکا تو حمید رشید اور سلطان نے آگے بڑھ کر قادر کو اٹھانا چاہا تو قادر ان پر برس پڑا۔
''اوئے تم یار نہیں تم یار مار ہو مجھے پٹتا دیکھتے رہے تم لڑ نہیں سکتے تھے تو کم از کم چھڑا ہی دیتے۔''
''قادرے تم کو تو پتہ ہے حفیظ کا ہاتھ بڑا بھاری ہے۔''
رشید عرف شیدا بولا۔
''اچھا تو تم حفیظ کے بھاری ہاتھ سے ڈر گئے تھے۔''
''ہم ڈرے تو نہیں تھے ہم نے سوچا گر ہم لڑائی میں کودے تو جھگڑا بڑھ جائے گا۔'' حمید عرف میدا بولا۔
''واہ کیا امن پسند ہیں میرے دوست۔''
'میں نے تو ان دونوں کو کہا تھا قادر کو مار پڑ رہی ہے ہمیں قادر کو بچانا چاہیے۔'' سلطان بولا۔
''اپنے نام کی ہی لاج رکھ لینی تھی تم نے سلطان راہی تو اکیلا درجن درجن آدمیوں کو مار بھگاتا تھا۔'' قادر نے سلطان کو بھی کھری کھری سنادی۔
''قادر بھائی جب تم کو پتہ ہے تم حفیظ سے لڑ نہیں سکتے پھر تم کیوں اس سے پنگا لیتے ہو۔'' شیدا بولا۔
''اوئے شیدے پستول کوئی کشور پر لائن مارے مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔''

''کشور اپنی حفاظت کرنا خوب جانتی ہے' وہ خود بلیک بیلٹ ہے تم کشور کی اتنی ٹینشن نہ لیا کرو۔'' میدا بولا۔

''کیسے نہ لوں میں کشور کی ٹینشن' وہ میری صاحباں ہے میں اس کا مرزا ہوں۔'' قادر یکدم رومانٹک ہوگیا۔

کشور تم کو پسند نہیں کرتی' ایسا نہ ہو کسی دن تمہاری صاحباں' تمہارے سارے تیر توڑ دے سلطان بولا۔

''کیوں بری بری باتیں منہ سے نکالتے ہو میری کشور ایسی نہیں۔''

''میری کشور' کیا خوش فہمی ہے۔'' سلطان سے اپنی ہنسی روکنی مشکل ہورہی تھی۔

''اڑالو میرا مذاق تم نہیں اڑاؤ گے تو اور کون اڑائے گا؟''

''ہم تمہارا مذاق نہیں اڑا رہے تمہاری خوش فہمی دور کررہے ہیں۔'' شیدے نے قادر کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا۔

کشور کو اگر کوئی رام کرسکتا ہے تو وہ حفیظ ہی ہے کشور اگر سیر ہے تو حفیظ سوا سی۔'' میدے کی زبان پر سچی بات آ ہی گئی پھر قادر میدے شیدے کے کندھوں کا سہارا لیتا ہوا چل پڑا' پیچھے پیچھے سلطان چل رہا تھا جسے اپنی ہنسی روکنی مشکل ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

قادر کے سر پر کافی زخم آئے تھے' اس لیے قادر دو ہفتے گھر سے باہر نہیں نکلا اور محلے میں سکون رہا' جب قادر کے زخم بھر گئے تو وہ گھر سے نکلا' قادر کے گھر سے نکلتے ہی اس کے دوست میدا' شیدا اور سلطان بھی وارد ہوگئے' محلے کے چوک میں ایک بہت بڑا درخت تھا پیپل کے اس درخت کی چھاؤں کافی گھنی تھی۔ اس درخت کی چھاؤں میں تاش کی محفل جمتی تھی جون کا مہینہ تھا' گرمی اپنے پورے شباب پر تھی۔ میدا' شیدا' سلطان اور قادر تاش کھیلنے میں مگن تھے۔

''یہ آیا میری طرف سے نہلا۔'' قادر نے پتہ پھینکا۔

''ادھر دیکھ یہ کھڑا دہلا۔'' اچانک حفیظ اپنے دوست اسداللہ کے ساتھ آ گیا۔

''حفیظ کو دیکھ کر قادر ذرا سہم گیا کیونکہ ابھی تک اس کے زخم پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔

''جا پیچھے اپنا کام کر ہماری گیم خراب نہ کر کھیلنا ہے تو بیٹھ جا۔'' قادر نے کہا۔

''میں معذوروں والی گیم نہیں کھیلتا' مجھ سے تو تو نے کوئی کشتی وغیرہ لڑنی ہو تو آ جا میدان میں۔'' حفیظ نے چیلنج کردیا۔

''حفیظ بھائی کیوں ہمارے دوست کی ہڈی پسلی تم نے ایک کرنی ہے' یہ صرف تاش کھیل سکتا ہے' کشتی نہیں کرسکتا۔'' سلطان بولا۔

''اوئے میں کیوں کشتی نہیں لڑسکتا' میں مرد نہیں ہوں۔'' قادر نے سلطان کو ڈانٹ دیا۔

''کل پھر ہو جائے تیری میری کشتی'' حفیظ نے فوراً ہی کشتی کی ڈیٹ مقرر کردی۔

''جب میرا کشتی کرنے کا دل چاہے گا تم کو بتادوں گا۔'' قادر نے بہانہ بنالیا۔

''یار اس نے کیا کشتی لڑنی ہے تم چیلنج تو اپنے برابر کے بندے کو کیا کر۔'' حفیظ کا دوست اسداللہ بولا۔

پھر حفیظ اور اسداللہ قہقہے لگاتے ہوئے چلے گئے تو قادر اور اس کے دوستوں کی تاش کی بازی پھر گرم ہوگئی۔

''یہ آیا جی میری طرف سے بادشاہ۔'' میدے نے پتہ پھینکا۔

''وہ آئی میری ملکہ۔'' قادر پتہ پھینکنے لگا تو اس کا ہاتھ فضا میں معلق ہی رہ گیا۔

کشور اپنی دوست نائیلہ کے ساتھ گلی سے گزر رہی تھی قادر کی نظر اس پر پڑی تو وہ بت بنا اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سب پتے پھینک کر کشور اور نائلہ کو دیکھنے لگے۔

''کہاں جارہی ہو میری چڑیا کی دکی۔'' قادر اپنی عادت سے مجبور تھا۔

''میں چڑیا کی دکی نہیں اینٹ کی تکی ہوں۔'' کشور نے گلی میں پڑی اینٹ اٹھالی۔

''باجی اینٹ نیچے رکھ دو اس کے سر کے تو پہلے ہی زخم ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئے۔'' سلطان نے التجا کی۔

''تم چاروں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔'' نائلہ نے سلطان کو ڈانٹا۔

''میں تو اس محلے کا سب سے شریف لڑکا ہوں۔ مجھے آپ ان سے ملا رہی ہیں۔'' شیدے نے تاش کے پتے نیچے پھینکے۔

''میں بدمعاش ہوں؟'' میدے نے شیدے کا

گریبان پکڑلیا۔

''یار تم آپس میں لڑرہے ہو' کچھ خدا کا خوف کرو۔'' قادر نے دونوں کو چھڑایا۔

''میری ایک بات غور سے سن لو آئندہ اگر تم نے اس چوک میں تاش کی محفل جمائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' کشور نے دھمکی لگائی۔

''یہ چوک تمہارے باپ کا ہے؟'' سلطان اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''میرے باپ پر جاتا ٹھہر جا تجھے ابھی مزہ چکھاتی ہوں۔''

کشور نے ہاتھ میں پکڑی اینٹ سلطان کو دے ماری۔ سلطان تو نیچے بیٹھ گیا اینٹ سیدھی شیدے کے سر پر لگی اس کے سر پر آلو جتنا گومڑا پڑ گیا' پھر کشور نے جوڈو کراٹے کے دو تین پیچ قادر اور سلطان کو لگائے دونوں دیوار کے ساتھ جا لگے' کشور کو جلال میں دیکھ کر قادر سلطان میدے اور شیدے نے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی' اب پیپل کے نیچے کشور اور نائلہ ہی رہ گئی تھیں۔ گلی کے نکڑ سے حفیظ اور اسداللہ اچانک آگئے۔

''سنا ہے وہ بات کرے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔'' حفیظ نے کشور کو دیکھتے ہی احمد فراز کا شعر پڑھا۔

''چلو پھر بات کرکے دیکھتے ہیں۔'' اسد اللہ نے مصرعہ مکمل کردیا۔

''میرے منہ سے پھول نہیں میرے ہاتھوں سے اینٹیں جھڑتی ہیں۔'' کشور نے پھر اینٹ اٹھالی۔

''کبھی تو پیار سے بات کرلیا کرو ہر وقت لڑنے جھگڑنے پر تیار رہتی ہو۔'' حفیظ نے کشور کے ہاتھ سے اینٹ چھین لی۔

''کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے......''

''جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لیے......'' حفیظ نے فوراً کشور کی بات کاٹ دی۔

''کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے جیسے تم میرے میلے میں کھوئے ہوئے حفیظ بھائی کی جا
کشور آخر اپنی بات پوری کرکے ہی رہی۔

''کیوں حفیظ بھائی جان نکل گئی نہ جان
خاموش نہ رہ سکی۔

''ان شاپروں میں کیا ہے؟'' حفیظ نے نائیلہ اور کشور کے ہاتھوں میں پکڑے شاپروں کی طرف اشارہ کیا۔
''ان شاپروں میں کھانے پینے کا سامان ہے آج میری سہیلی کو کچھ مہمان دیکھنے آرہے ہیں۔'' نائیلہ نے بتایا۔ اتنا کہہ کر نائیلہ اور کشور گلی کا موڑ مڑ گئیں۔
''یہ کیا ہوگیا اسداللہ؟'' حفیظ تقریباً رونے لگا۔
''یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کب ہوا تب ہوا' جب ہوا یہ نہ سوچو۔'' اسداللہ کشور کمار بن گیا۔
''کشور کو دیکھنے مہمان آرہے ہیں تم گانے گا رہے ہو۔ میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو۔''
''نمک تو تمہارے زخموں پر کشور نے چھڑکا ہے اس میں میرا کیا قصور۔''
''اب میں کیا کروں؟''
''ایسے موقع پر باباجی عبید ابوذری فرماتے ہیں۔
وہ اپنی کھڑکی نہیں کھولتے تو نہ کھولیں
میری نظر میں بار پاں اور بھی ہیں......!!

☆......☆......☆

آج گرمی اپنے پورے عروج پر تھی دوپہر تک لو چل رہی تھی۔ سفید پوش لوگوں کے گھروں میں ایئر کولر اور کھاتے پیتے گھروں میں ایئر کنڈیشنر چل رہے تھے مگر قادر اور سلطان پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے شیدے اور میدے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک چنگ چی رکشا پیپل کے نیچے آ کر رکا ایک عورت اور ایک مرد رکشے سے اترے دونوں کی عمریں پچپن ساٹھ سال کی تھیں۔
''بیٹا یہاں شرافت علی کا گھر کہاں ہے؟'' ادھیڑ عمر مرد نے قادر سے پوچھا۔
''کون شرافت علی؟ قادر جان بوجھ کر انجان بن گیا حالانکہ وہ کشور کے باپ شرافت علی کو اچھی طرح جانتا تھا۔
''ہم شرافت علی کی بیٹی کو دیکھنے آئے ہیں۔'' اب عورت بولی۔
''سوچ کیا رہے ہو تم اس محلے میں نہیں رہتے؟''
''میں تو اسی محلے کا ہوں میں شرافت علی کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں' شرافت علی صاحب تو اپنے نام کی طرح بڑے شریف آدمی ہیں مگر ان کی بیٹی کشور......'' اتنا کہہ کر قادر خاموش ہوگیا اور اپنے کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔
''کیا بات ہے بیٹا لڑکی کا چال چلن تو ٹھیک ہے؟''
''لڑکی کا اپنا چال چلن بھی خراب ہے اور وہ دوسروں کی چال بھی خراب کر دیتی ہے۔'' قادرے کے پاس بھی آج کشور سے بدلہ لینے کا سنہری موقع تھا۔
''کشور لڑکی نہیں پھولن دیوی ہے' ہر وقت لڑنے مرنے پر تیار رہتی ہے۔'' سلطان نے بھی جلتی پر تیل پھینکا۔
''ہاں بیگم پھر کیا خیال ہے؟'' مرد نے اپنی بیوی سے پوچھا۔
''اب آئے ہیں تو لڑکی دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔'' عورت سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولی۔
''بیٹا شرافت علی کا گھر کون سا ہے؟''
''اس گلی کا آخری گھر شرافت علی کا ہے۔'' قادر نے بتایا۔
دونوں میاں بیوی نے چنگ چی رکشے والے کو کرایہ ادا کیا اور شرافت علی کے گھر چلے گئے شرافت علی پہلے ہی مہمانوں کا منتظر تھا مہمانوں کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوگیا۔
''کشور کی ماں آجاؤ مہمان آگئے ہیں۔'' شرافت علی نے کشور کے ہونے والے ساس سسر کو دیکھ کر کشور کی ماں کو آواز دی' کشور کی ماں فوراً ہی آگئی۔ ''کشور کہاں ہے؟'' شرافت علی نے پوچھا۔
''وہ تیار ہو رہی ہے۔'' کشور کی ماں نے بتایا پھر کشور کی ماں کشور کی ہونے والی ساس سے گلے ملی۔
''آپ کے بیٹے کا نام جاوید ہی ہے ناں۔'' شرافت علی نے پوچھا۔
''ہاں جی میرے بیٹے کا نام جاوید ہے تعلیم بی اے ہے اسکول میں ٹیچر ہے۔'' جاوید کا باپ بولا۔
''آپ کی بیٹی کی کیا تعلیم ہے؟'' جاوید کی ماں نے پوچھا۔
''میری بیٹی تو صرف میٹرک ہے جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ ہے۔'' کشور کی ماں نے بتایا۔
''ہائے میں مرگئی یہ بلیک بیلٹ کیا ہوتی ہے؟'' جاوید کی ماں گھبرا گئی۔
''ہمارا بیٹا تو ماسٹر ہے۔'' جاوید کا باپ بولا۔
''کاش باکسر ہوتا۔'' شرافت علی بولا۔
''وہ کیوں جی؟''

''اگر رشتہ ہوگیا تو آپ کو پتہ چل جائے گا' آپ کے بیٹے کا باکسر ہونا کیوں ضروری ہے۔''

''کشور اب آ بھی جاؤ تیاری میں اتنا ٹائم۔'' کشور کی ماں نے کشور کو آواز دی۔

تھوڑی دیر بعد کشور شرمائے نظریں جھکائے چائے والی ٹرالی دھکیلتے چلی آئی وہ اس وقت بالکل 70 کی دہائی کی ہیروئن لگ رہی تھی اس نے آتے ہی سلام کیا۔

''میری بیٹی تو بہت خوبصورت ہے شرم والی ہے۔'' جاوید کی ماں کشور کی بلائیں لینے لگی۔

جاوید کے والدین کو کشور پسند آ گئی اگلے دن کشور کے والدین جاوید کو دیکھ آئے پھر جاوید اور کشور کا رشتہ پکا کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

''کشور کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔'' اسد اللہ نے حفیظ کو تھڑے پر بیٹھتے ہی بریکنگ نیوز سنائی۔

''اوئے دنیا نیوز کے پتر یہ خبر سنا کر تم نے تو میری دنیا ہی اندھیر کردی ہے۔'' حفیظ غمگین ہوگیا۔

''اب تو تم واقعی کشور کے حفیظ بھائی جان بن گئے ہو' ایک سال بعد کشور ماں بن جائے گی پھر اس کے بچے تم کو ماموں ماموں کہا کریں گے۔

''اوئے اسد اللہ کے بچے میرے دل پر چھریاں چل رہی ہیں اور تجھے مذاق سوجھ رہا ہے۔''

ادھر دیکھ کون آ رہی ہے؟'' اسد اللہ نے حفیظ کی گردن دائیں جانب موڑ دی۔

''گلی کی دائیں جانب کشور اپنی سہیلی نائلہ کے ساتھ ہنستی آ رہی تھی۔

''سنا ہے تمہارا رشتہ پکا ہوگیا ہے۔'' حفیظ نے کشور کے پاس آتے ہی پوچھا۔

''ہاں ہوگیا ہے حفیظ بھائی جان اب میری بارات کی تمبو قناتیں آپ نے ہی لگانی ہیں۔''

''خدا مجھے وہ دن نہ دکھائے۔''

''میری بارات رات کو آئے گی۔''

''وہ رات میرے لیے کالی رات ہوگی۔''

''اچھا حفیظ بھائی جان آپ نے میری شادی پر آنا ضرور ہے۔''

''تمہاری شادی میری بربادی ہوگی اتنا کہہ کر حفیظ اٹھ کر گھر چلا گیا' جب حفیظ گھر پہنچا تو حفیظ کے گھر بھی مہمان اس کو دیکھنے آئے ہوئے تھے پہلے بھی کئی حفیظ کے رشتے آ چکے تھے ہر رشتہ حفیظ ٹھکرا چکا تھا۔ آج حفیظ نے لڑکی بنا دیکھے ہی رشتہ قبول کرلیا تھا کیونکہ اب اسے کشور کی امید نہیں رہی تھی۔

☆......☆......☆

کشور گھر میں اکیلی تھی اس کے ماں باپ اس کے جہیز کا سامان خریدنے بازار گئے ہوئے تھے۔ دروازے پر دستک ہوئی' کشور نے دروازہ کھولا تو سامنے اس کا ہونے والا شوہر جاوید کھڑا تھا' کشور جاوید کو دیکھ کر شرما گئی' حالانکہ شرمانا اس کو آتا نہیں تھا پھر بھی وہ شرمانے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

''آپ' اس وقت یہاں' امی ابو تو گھر پر نہیں ہیں۔'' کشور شرماتے ہوئے بولی۔

''میں امی ابو سے نہیں تم سے ملنے آیا ہوں۔'' جاوید اندر آ گیا۔

''شادی سے پہلے آپ کا اس طرح یہاں آنا مجھے اچھا نہیں لگا۔

''کیوں اچھا نہیں لگا' تم میری ہونے والی بیوی ہو۔''

''ہونے والی ہوں ابھی ہوئی تو نہیں ہوں۔''

''میں دو ٹکٹ لایا ہوں میٹرو پول میں بڑی اچھی فلم لگی ہے۔''

''شادی سے پہلے میں آپ کے ساتھ فلم دیکھنے نہیں جا سکتی۔''

''فلم کا نام ہے پیار کا موسم۔''

''ابھی تو گرمی کا موسم ہے۔''

''میٹرو پول فلم ایئر کنڈیشنڈ سینما ہے۔''

''مجھے رومانٹک فلمیں ویسے بھی پسند نہیں ہیں۔''

''تم کو کیسی فلمیں پسند ہیں۔''

''مجھے ایکشن فلمیں پسند ہیں جٹ دا کھڑاک وحشی عورت ہنٹر والی' کشور نے اپنی طبیعت کے ساتھ میل کھاتی فلموں کے نام بتائے۔

''چلو آؤ پھر کوئی ایکشن فلم ہی دیکھ لیتے ہیں۔'' جب تک میری شادی کی فلم نہیں بن جاتی میں آپ

کے ساتھ فلم نہیں دیکھ سکتی۔
''آ بھی جاؤ اب نخرے نہ کرو۔'' جاوید نے کشور کو بازو سے پکڑ لیا۔
کشور نے جوڈو کراٹے کی فلائنگ کک جاوید کے منہ پر ماردی اور پھر اس کے منہ پر مکوں کی بارش کردی۔
جاوید کا منہ سوج کر کپا بن گیا منہ کی تکلیف سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔
''جاؤ اب جا کر شادی کی مگر آدھی فلم دیکھو اب میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔'' کشور نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔
کشور کے ماں باپ بھی آ گئے' وہ جاوید کو حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔
''بیٹی یہ کون ہے؟'' کشور کی ماں نے جاوید کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا جو سوجن کی وجہ سے پہچانا نہیں جا رہا تھا۔
''پہچان سکتی ہیں تو پہچان لیں۔'' کشور نے غصے سے تھوکتے ہوئے کہا۔
''یہ گھڑی میں جاوید کے لیے لائی ہوں سنبھال کر رکھ لو بڑی قیمتی گھڑی ہے۔'' کشور کے باپ نے کشور کو گھڑی پکڑائی۔
''یہ قیمتی نہیں بڑی منحوس گھڑی ہے۔'' جاوید اپنے سوجے ہوئے منہ کے ساتھ بولا۔
''بیٹی یہ کون ہے تم نے بتایا نہیں۔'' کشور کی ماں نے پھر غور سے جاوید کو دیکھا۔
''آپ اسے غور سے دیکھیے آپ اسے پہچان لیں گی۔'' کشور نے غصے سے کہا۔
''بیٹی یہ جاوید کے جوتے ہیں' سائز چیک کرلو۔'' کشور کے باپ نے کشور کو جوتوں کا ڈبہ دیا۔
''اس کے سر پر جوتے مار کر سائز چیک کرلیں۔'' کشور نے جاوید کی طرف اشارہ کیا۔
''بیٹی جوتے پاؤں میں پہنے جاتے ہیں سر پر نہیں' میں یہ جوتے جاوید کے لیے لایا ہوں۔'' کشور کا باپ بولا۔
''آپ غور سے دیکھیں یہ جاوید ہی ہے۔'' کشور نے بالآخر سسپنس ختم کیا۔
''یہ تو مجھے جاوید کا بھوت لگتا ہے۔'' کشور کا باپ جاوید کو غور سے دیکھنے لگا۔

''یہ تو واقعی جاوید ہے۔'' کشور کے باپ نے آخر جاوید کو پہچان ہی لیا۔ ''بیٹی شادی سے پہلے ہی تم نے اس کی یہ حالت کردی۔''
''یہ شادی سے پہلے ہی مجھے ہنی مون پر لے جانے کے لیے آ گیا تھا۔''
''بیٹی ذرا جوتے والے ڈبے سے جوتے تو نکالنا۔'' کشور کے باپ کا چہرہ بھی غصے سے تن گیا۔
کشور نے اپنے باپ کو ڈبے سے جوتے نکال کر دیئے تو کشور کے باپ نے ان جوتوں سے جاوید کی پٹائی شروع کردی۔
''میرے جوتے اور میرا ہی سر۔'' پھر جاوید نے بھاگ کر اپنی جان بچائی اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔
کشور اور جاوید کا رشتہ ختم ہوگیا۔

☆......☆......☆

حفیظ گلی کے چوک والے تھڑے پر بیٹھا تھا' اسد اللہ وہاں آ گیا' حفیظ تھوڑا غمگین سا تھا۔
''کشور کا رشتہ ٹوٹ گیا یار بہت برا ہوا۔'' اسد اللہ نے ایک دفعہ پھر حفیظ کر بریکنگ نیوز سنائی۔
''برا نہیں یار بہت اچھا ہوا آج تم نے مجھے یہ خبر سنا کر سما باندھ دیا' آج تم مجھے سانیوز لگے ہو۔
''آپ کو ابا جان نے گھر بلایا ہے۔'' ایک لڑکا حفیظ کے پاس آ کر بولا۔
''یہ کون ہے یار اسے پہلے تو اپنے محلے میں نہیں دیکھا۔'' اسد اللہ آنے والے لڑکے کو غور سے دیکھنے لگا۔
''یار یہ میرا سالا ہے۔'' حفیظ نے اسد اللہ کو بتایا کیوں بلایا ہے ابا جان نے مجھے۔'' حفیظ نے اپنے سالے سے پوچھا۔
''یہ تو مجھے نہیں پتہ؟''
''اچھا یار میں ذرا اپنے سسرال ہو کر آتا ہوں۔''
''ٹھیک ہے یار جاؤ۔'' اسد اللہ نے فوراً اس کو اجازت دے دی۔
''بیٹا تم کو اس لیے بلایا ہے کہ تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔'' حفیظ نے گھر میں قدم رکھا تو اس کا سسر بولا۔
''جی کہیے۔''
''بیٹا ہماری ایک ہی بیٹی ہے' میں چاہتا ہوں تم شادی

کے بعد ہمارے گھر داماد بن کر رہو۔''
''یہ نہیں ہوسکتا گھر داماد اور میں ایسا تو آپ سوچنا بھی نہیں۔'' حفیظ نے صاف جواب دے دیا۔
''اگر تم نے میری یہ شرط نہ مانی تو یہ رشتہ ختم بھی ہوسکتا ہے۔''
''رشتہ ختم ہوتا ہے تو ہوجائے میں گھر داماد نہیں بن سکتا۔'' حفیظ نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔
''رشتہ ختم ہوگیا تو میری بہن کی بدنامی ہوگی تم کو گھر داماد بننا پڑے گا۔'' حفیظ کا سالا تو دھمکی پر اتر آیا۔
''تمہاری بہن کی بدنامی ہوتی ہے تو ہوجائے میں جارہا ہوں۔'' حفیظ نے باہر کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے تو حفیظ کا سالا اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔
''ہٹو میرے راستے سے۔''
''تم یہاں سے جا نہیں سکتے۔''
''کون روکے گا مجھے۔''
''میں روکوں گا۔''
''تم ابھی بچے ہو ہٹو آگے سے۔'' جب حفیظ کا سالا آگے سے نہ ہٹا تو حفیظ نے اس کو اٹھا کر صحن میں پڑی چارپائی پر پٹخ دیا جس سے چارپائی کا ایک پایا ٹوٹ گیا اور حفیظ کے سالے کو چار دن اسپتال میں گزارنے پڑے اور جب حفیظ کا سالا صحت یاب ہوکر گھر آیا تو حفیظ کو رشتے سے جواب دے دیا گیا' حفیظ یہاں شادی کرنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ دوسری طرف کشور کا رشتہ بھی ٹوٹ چکا تھا۔ حفیظ ایک دفعہ پھر کشور کو اپنی شریک حیات بنانے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

جاوید سے رشتہ ٹوٹنے کے بعد کشور کے ایک دو رشتے آئے مگر کشور کی جلالی طبیعت کے باعث وہ رشتے ہو نہ سکے اسی طرح حفیظ کی بھی دو تین جگہ بات چلی مگر سب لڑکی والے حفیظ کی جلالی طبیعت سے گھبرا کر چلے گئے۔ ایک دن حفیظ کی ماں حفیظ کے کہنے پر کشور کے گھر اس کا رشتہ مانگنے چلی گئیں۔
بہن تمہاری لڑکی کو کوئی لڑکا لینے کو تیار نہیں اور میرے لڑکے کو کوئی لڑکی دینے کو تیار نہیں' تمہاری بیٹی آندھی ہے تو میرا بیٹا طوفان ہے کیوں نہ آندھی اور طوفان کو اکٹھا کردیں۔'' حفیظ کی ماں نے صاف گوئی سے کام لیا کوئی لگی لپٹی نہ رکھی۔
''ہاں بہن لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے' دونوں ہی جوشیلی طبیعت کے مالک ہیں' کشور کی ماں نے بھی حفیظ کی ماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''پنجابی کی مثال ہے سپ نوں سپ لڑے تے وس کنوں چڑھے'' حفیظ اور کشور کی ماؤں کے خیالات ملے تو حفیظ اور کشور کا رشتہ طے پا گیا حفیظ اور کشور کا ملاپ آندھی اور طوفان کا ملاپ تھا سب کو فکر تھی' ان دونوں کی شادی والے دن کوئی سونامی نمودار نہ ہوجائے۔ سارے محلے کو ان کی شادی کے دن کا بے چینی سے انتظار تھا۔ کیونکہ دونوں کے کئی رشتے ٹوٹے تھے۔
آخر محلے والوں کا انتظار ختم ہوا اور شادی کا دن آن پہنچا' آج دو جنگجوؤں کی شادی تھی' ہر کوئی سہا ہوا تھا کہ شادی والے دن ہی کوئی ہنگامہ نہ ہوجائے' کشور بیوٹی پارلر سے تیار ہوکر آ گئی تھی۔ آج تو کشور واقعی حسین شاد باد لگ رہی ہے نائیلہ نے کشور کو دلہن بنی دیکھ کر مذاق کیا۔
''آج تو حفیظ بھائی کشور کو دیکھ کر قومی ترانہ ضرور گائیں گے۔'' کشور کی ایک اور سہیلی بولی۔
''یہ بارات ابھی تک نہیں پہنچی بارات نے ایک بجے پہنچنا تھا اب تو دو بج گئے ہیں۔'' کشور کی ماں کو بارات لیٹ ہونے کی وجہ سے تشویش ہوئی۔
''آجائے گی بارات تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔'' کشور کے والد نے اپنی بیوی کو تسلی دی۔

☆......☆......☆

''میرا یار بنا ہے دولہا اور پھول کھلے ہیں دل کے' میری بھی شادی ہوجائے دعا کرو سب مل کے۔
حفیظ بیوٹی پارلر سے تیار ہوکر آیا تو اسد اللہ نے اس کو دیکھتے ہی گانا شروع کردیا۔ حفیظ آج بڑا خوش تھا۔
آج اس نے اپنی محبت پالی تھی آج وہ اپنی کشور کو بیاہنے جارہا تھا' اس نے قادر سے بھی اپنے اختلاف بھلا کر اس کو اپنی شادی پر انوائٹ کیا تھا۔ شیدا' میدا اور سلطان بھی باراتیوں میں شامل تھے۔
''قادر آج تو کشور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حفیظ کی ہوجائے گی' تمہارے دل پر کیا بیت رہی ہے۔'' سلطان نے قادر کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''یار ہر وقت حفیظ بھائی جان حفیظ بھائی جان بولتی تھی' اچانک پتہ نہیں کیوں حفیظ کی جان بننے پر تیار ہو گئی۔''

''یار تم بھی بیوقوف ہو شادی سے پہلے ہر لڑکی ہر لڑکے کو بھائی جان ہی کہتی ہے۔''

''یار مجھے تو اس نے کبھی بھائی جان بھی نہیں کہا تھا۔''

''شادی کے بعد کہا کرے گی۔''

''یار میرا دل تو کرتا ہے حفیظ کی بارات جانے سے پہلے میں وہاں پہنچ جاؤں اور کشور کو اٹھا کر لے جاؤں۔

''اوئے کیا بکواس کی تم نے میری کشور کو اٹھائے گا۔'' حفیظ نے قادر کی بات سن لی تھی اور آ کر قادر کو گریبان سے پکڑ لیا۔

''حفیظ بھائی یہ آج آپ کا مہمان آپ کا باراتی ہے ایسا تو نہ کریں۔'' سلطان حفیظ کو سمجھانے لگا۔

''میرا باراتی میری ہی دلہن کو اٹھانے کی بات کر رہا ہے' میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔'' حفیظ پھر جلال میں آ گیا۔

''قادر کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں حفیظ بھائی آپ قادر کو معاف کر دیں۔'' سلطان نے التجا کی۔

''یہ میری عزت اچھال رہا ہے میں اسے معاف کر دوں۔ کشور میری عزت ہے اس کے خلاف کوئی گندی زبان استعمال کرے گا میں اس کی زبان کاٹ دوں گا۔ حفیظ کو سنبھالنا سلطان سے مشکل ہو رہا تھا۔

''کشور اتنی بھی عزت والی نہیں ہے. مجھ سے وہ آنکھ مٹکا کرتی رہی ہے۔' اب دلہن تمہاری بن رہی ہے۔'' قادر نے جلتی پر تیل پھینک دیا اب تو حفیظ بے قابو ہو گیا' صحن میں پڑی دیگ میں پڑا بڑا سا کڑچھا اٹھا کر اس نے قادر کا سر کھول دیا' قادر کا سارا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔ قادر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ پولیس آئی حفیظ کو پکڑ کر لے گئی اور جا کر حوالات میں بند کر دیا' کشور دلہن بنی کی بنی رہ گئی۔ باراتیوں کا سارا کھانا غریبوں میں تقسیم کر دیا گیا' دس دن قادر اسپتال اور حفیظ حوالات میں رہا پھر محلے کے معززین نے دونوں میں صلح کرا دی تو حفیظ کی ضمانت ہو گئی' دس دن بعد پھر حفیظ اور کشور کی شادی کی نئی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ آخر شادی کا دن آ گیا۔ کشور ایک دفعہ پھر دلہن بنی کشور کی ساری سہیلیاں کشور کے گھر جمع تھیں لڑکیاں جب اکٹھی ہوں تو آپس میں بڑی بے باک ہو جاتی ہیں سب کشور کو چھیڑ رہی تھیں۔

''آج تو ہماری کشور بڑی خوبصورت لگ رہی ہے آج تو حفیظ بھائی جان کی خیر نہیں' وہ کشور کے حسن کی تاب نہیں لا سکے گا۔ نائیلہ نے جو کشور کی سب سے بیسٹ فرینڈ تھی کشور کو کہنی کا ٹہوکا دے کر چھیڑا تو کشور شرما گئی۔

''حسن کی تاب کا تو مجھے پتہ نہیں' حفیظ بھائی کشور کے کراٹوں کی تاب پتہ نہیں لا سکیں گے کہ نہیں۔'' کسی نے دور سے پھبتی کسی۔

''اب ہماری کشور اتنی بھی لڑاکا نہیں ہے جو اپنے مجازی خدا کو ہی کراٹے کی فلائنگ کک لگانے لگے۔'' نائیلہ نے کشور کا دفاع کیا۔

''اس کا کوئی پتہ نہیں اسکو کون سی کوئی تمیز ہے۔'' محلے کی ایک اور لڑکی روبینہ بولی۔

''تم کو تمیز ہے تو میری جگہ تم دلہن بن کر حفیظ کے گھر چلی جاؤ۔'' کشور اپنی عادت سے مجبور پھٹ پڑی۔

''میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی گھر مہمان بلا کر تم مہمانوں سے ایسا سلوک کرتی ہو۔'' روبینہ بولی۔

''تم کو مہمان سمجھ کر ہی زبان سے سمجھا رہی ہوں ورنہ تمہیں پتہ ہے میری زبان بعد میں ہاتھ پہلے چلتے ہیں۔''

''میں تم کو بڑی اچھی طرح جانتی ہوں نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔''

''چوہیا خاموش ہو جا۔'' پھر کشور نے روبینہ کو اس کے بالوں سے پکڑ کر دیوار کے ساتھ دے مارا اور پھر لاتوں اور گھونسوں سے اس کی پٹائی کرنے لگی۔ قادر دور کھڑا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ روبینہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ قادر نے فوراً تھانے میں فون کر دیا۔ لیڈیز پولیس آئی اور کشور کی سونے کی چوڑیاں اتار کر اس کو لوہے کی ہتھکڑی پہنا دی۔ حفیظ بھی بارات لے کر پہنچ گیا تھا' ہے مبارک آج کا دن رات آئی ہے سہانی شادمانی او شادمانی' کی دھن بج رہی تھی اور بینڈ کے درمیان سے پولیس کشور کو ہتھکڑی لگا کر لے جا رہی تھی۔ بینڈ ماسٹر بھی کچھ زیادہ ہی عقلمند تھا اس نے یہ ساری سچویشن دیکھ کر فوراً بینڈ پر عجیب داستان ہے یہ کہاں شروع کہاں ختم یہ منزلیں ہیں پیار کی نہ تم سمجھ سکے نہ ہم''

کی دھن بجانی شروع کردی' پھر ساری بارات بغیر دلہن کو لیے ہی واپس چلی گئی' جب کشور کی ضمانت بھر پور کوشش کے بعد بھی نہ ہوسکی تو روبینہ کے والدین کی منت سماجت کر کے روبینہ کو راضی کیا گیا اور روبینہ نے عدالت جا کر کشور کو معافی دے دی تو کشور کو رہائی ملی۔ کشور اور حفیظ کے والدین سر جوڑ کر بیٹھے اور پھر فیصلہ یہ ہوا کہ اب ان کا نکاح خاموشی سے مسجد میں پڑھا دیا جائے کوئی بارات نہیں کوئی بینڈ باجا نہیں ہوگا کیونکہ دو دفعہ یہ حادثہ ہو چکا تھا' جب کشور باہر تھی تو حفیظ اندر تھا جب حفیظ باہر تھا تو کشور اندر تھی' اس اندر باہر کے چکر سے بچنے کے لیے حفیظ اور کشور نکاح چار گواہوں کی موجودگی میں پڑھا دیا گیا' جب مولوی صاحب نے تیسری دفعہ حفیظ سے پوچھا تم کو کشور سے نکاح قبول ہے پوچھا تو حفیظ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''مولوی صاحب میں پہلے بھی تم کو دو دفعہ بتا چکا ہوں قبول ہے تو پھر بار بار کیوں پوچھ رہے ہو۔'' بڑی مشکل سے حفیظ کو ٹھنڈا کیا گیا اور نکاح کا مرحلہ مکمل ہوا' مولوی صاحب کو ایسی ہی صورت حال کا سامنا کشور کے سامنے بھی کرنا پڑا' وہ بھی بار بار قبول کہنے سے بھڑک اٹھی تھی کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے آخر کار حفیظ اور کشور نکاح کے بندھن میں بند گئے اب دونوں ایک دوسرے کے شریک حیات تھے لیکن پہلی ہی رات دونوں ایک دوسرے کے شریک فساد بن گئے' شادی کی پہلی رات جس کو سہاگ رات کہتے ہیں۔ حفیظ کے کمرے سے برتن ٹوٹنے کی آوازیں آئیں' حفیظ کے باپ نے حفیظ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ حفیظ نے دروازہ کھولا تو حفیظ کے ماتھے پر زخم کا نشان تھا کشور کے گال پر بھی نیل پڑا ہوا تھا' دودھ کا جگ اور گلاس جو شیشے کے تھے چکنا چور بیڈ کے پاس پڑے تھے۔ مسہری کے سارے پھول فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔

یہ سب کیا ہے حفیظ کے باپ نے کمرے کے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا اور پھر حفیظ سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ابا جان دس دن تک ہم نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اس لیے آج ہم اپنا اپنا ہاتھ ایک دوسرے پر کھول رہے تھے۔'' حفیظ اپنے ماتھے پر لگا خون صاف کرتے ہوئے بولا۔

''ابا جان پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جب دو برتن پاس پاس پڑے ہوں تو کھڑک ہی پڑتے ہیں۔'' کشور بھی دروازے کے پاس آ گئی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ چڑیل لگ رہی تھی۔

''یہ عجیب برتن ہیں جب اکٹھے نہیں تھے تب بھی کھڑکتے تھے اور اب اکٹھے ہو گئے ہیں پھر بھی کھڑک رہے ہیں۔'' حفیظ کے باپ نے اتنا کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی برتن ٹوٹنے کی آوازیں پھر آنے لگیں۔ حفیظ کے باپ نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور صوفے پر آ کر بیٹھ گیا جہاں حفیظ کی ماں پہلے ہی سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ ''آج کے بعد اس گھر میں شیشے کے سارے برتن چھپا دو۔''

''وہ تو میں نے پہلے ہی چھپا دیئے ہیں۔ آپ اتنا پریشان نہ ہوں' بچے ہیں۔ جب ان کے بچے ہوں گے یہ سلجھ جائیں گے۔''

''مجھے یہ سلجھنے والے نہیں لگتے یہ سلجھنے والا نہیں' یہ الجھنے والا جوڑا ہے کہتے ہیں جوڑے آسمان پر بنتے ہیں یہ جوڑا تو لگتا ہے پانی پت کے میدان میں بنا ہے۔'' حفیظ کا باپ پریشان بیٹھا چھت کو دیکھنے لگا۔

''آپ دل پر نہ لیں' آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' حفیظ کی ماں نے اپنے شوہر کو تسلی دی جو خود بغیر تسلی کے بیٹھی تھی۔ حفیظ کی ماں کے منہ میں ابھی یہ الفاظ تھے کہ ایک ٹوٹا ہوا گلاس حفیظ کے کمرے کی کھڑکی سے اڑتا ہوا آیا اور سیدھا حفیظ کے باپ کے بازو پر لگا' حفیظ کا باپ بازو پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''جب تک ان کے بچے ہوں گے اس وقت تک ہم نہیں بچیں گے۔'' پھر حفیظ کا باپ اپنا بازو سہلانے لگا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' حفیظ کی ماں نے بھی اپنے شوہر کی تائید کی اور ٹوٹے ہوئے گلاس کی کرچیاں اکٹھی کرنے لگی۔



برزخ

زرین قمر

ایک جری، حسین اور بے باک ساحرہ کی کہانی جو منتخب کر لی گئی تھی برزخ کے باسیوں کے لیے جو مظلوم، مجبور اور ادھورے تھے جنہیں انصاف کی تلاش تھی جو صدیوں سے بھٹک رہے تھے موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کے عرصے میں وہ ان کی امیدوں کی ایک کرن تھی۔

زرین قمر کے قلم سے نئے افق کے قارئین کے لیے بطورِ خاص





1992 نومبر کی سردیوں کی وہ رات موت کی طرح سرد تھی۔ چار دروازوں والی بیوک اسٹیشن ویگن روڈ کی ڈھلان پر تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی کبھی کبھی تیزی کی وجہ سے روڈ پر موجود برف کی سیاہ تہہ پر گرنے سے ٹائروں سے چرچراہٹ کی آواز آتی تھی۔ روڈ کے دائیں جانب اونچی پہاڑیاں موجود تھیں جبکہ بائیں جانب ڈھلان تھی اور لوہے کی زنگ آلود حفاظتی ریلنگ لگی ہوئی تھی اور ڈھلان میں درختوں پر موجود برف کی تہہ عجب سماں پیش کر رہی تھی راجر ٹیفٹ نے پرل کلر کا سوئٹر پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے وہ اپنی فیملی کی زندگی بچانے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور اس کی بیوی اپنے گداز جسم کے ساتھ اس کے برابر بیٹھی چیخیں مار رہی تھی جبکہ پچھلی سیٹ پر موجود یوگی اور ونا کی خوفزدہ چیخیں بھی راجر کو پریشان کر رہی تھیں۔ اسٹیشن ویگن گھومتی ہچکولے کھاتی لڑھکتی آگے بڑھ رہی تھی اور راجر کا دل جیسے اس کے حلق میں دھڑک رہا تھا۔ اس نے خوف کو اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیا تھا اور مضبوطی سے اسٹیئرنگ کو تھامے تھامے وہ اپنی بیوی حنا کی طرف مڑا تھا جو خاصی خوبصورت تھی اس نے سردی سے بچنے کے لیے موٹا سوئٹر اور جینز پہنی ہوئی تھی جبکہ سر کے سرخی مائل بالوں کو ایک مفلر سے لپیٹا ہوا تھا۔

"میں کوشش کر رہا ہوں کہ ہم لوگ وقت پر پارٹی میں پہنچ جائیں۔" راجر نے گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا اور حنا نے غصے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا اسے افسوس تھا کہ راجر کے والدین ایک گھنٹے سے ان کے منتظر تھے لیکن برفانی طوفان کی وجہ سے وہ لیٹ ہو رہے تھے، راجر جو ایک ٹوائے کمپنی میں کام کرتا تھا اسے چھٹی بھی دیر میں ملی تھی۔

"تمہیں اب کس بات کی جلدی ہے؟ جو دیر ہونا تھی وہ تو ہو ہی گئی اور تمہارے والدین کے طعنے تو بہرحال سننا ہی ہوں گے۔" حنا نے منہ بنا کر کہا وہ جانتی تھی کہ راجر کے والد ایک کامیاب وکیل تھے اور انہوں نے ہمیشہ راجر کو ٹوائے کمپنی میں ایک منیجر کی جاب کرنے پر مذاق کا نشانہ بنایا تھا وہ اسے اس کے بھائی ڈاکٹر ڈیکر ٹیفٹ کی مثالیں دیا کرتے تھے۔

"یہ ہماری فیملی کی روایت ہے ہمیں ہر کرسمس پر وہاں جانا ہوتا ہے۔" راجر نے گاڑی کے اسٹیئرنگ پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے کہا۔

"اور میری فیملی؟ کیا وہ اس قابل نہیں کہ ہم کبھی ان سے بھی ملنے جائیں؟" حنا نے کہا۔

"ہم گرمیوں میں ان سے ملنے بھی جائیں گے۔" راجر نے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا۔

"مجھے تمہارا یقین نہیں ہے۔"

"میں پروگرام بنا رہا ہوں۔"

"ہاں......ہاں......تم یہی کہتے ہو۔" حنا نے بے یقینی سے کہا۔

"اس بات کا کیا مطلب ہے؟"

"تم جانتے ہو؟"

"مجھے نیچے اترنا ہے۔" پچھلی سیٹ سے چھ سالہ ونا چیخی وہ بہت خوبصورت تھی اور اس کے سونے جیسے سنہری بال اسے مزید حسین بنا رہے تھے اس نے موسم کے لحاظ سے فر والا کوٹ اور موٹی جینز پہنی ہوئی تھی اور سر پر اونی ٹوپی تھی جس میں بڑا سا پھندنا لٹک رہا تھا۔

"بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔" راجر نے اپنی مونچھوں کو کھجاتے ہوئے کہا اس کی پینٹ اور شرٹ پر چاکلیٹ کے دھبے پڑے ہوئے تھے جو گاڑی چلانے کے دوران ہاٹ چاکلیٹ کافی پیتے ہوئے گر جانے سے پڑے تھے۔

"ٹھی شوں......ٹھی شوں" ونا کے برابر بیٹھے یوگی نے باپ کی طرف ہاتھوں سے پستول کا اشارہ کرتے ہوئے آواز نکالی۔

"یوگی...... بدتمیزی مت کرو۔" حنا نے اپنے بیٹے کو ڈانٹا جس کے دو دانت بڑے تھے اور منہ سے باہر کی جانب جھانک رہے تھے۔

"ٹھی شوں......ٹھی شوں......ٹھی شوں......" یوگی نے منع کرنے پر اب اپنی ہاتھوں سے بنی پستول کا رخ حنا کی طرف کر لیا تھا اس کا چہرہ چوکور اور بال راجر کی طرح اخروٹی رنگت کے تھے اس میں باپ جیسی مشابہت تھی۔

"راجر، میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے ٹرمینیٹر 2 مت دیکھنے دیا کرو۔" حنا نے کہا۔

"وہ فلم ایک سال پرانی ہے اور تم نے تو اسے ٹرمینیٹر

کا کھلونا بھی لے کر دیا ہوا ہے۔'' راجر نے کہا۔
''یہ کوئی بہانہ نہیں ہے تم نے یوگی کو بگاڑ دیا ہے۔'' حنا نے کہا اور راجر نے اس کا جواب دینے کے بجائے گاڑی کا ٹیپ آن کر کے آواز تیز کر دی اب گاڑی میں گانے کی آواز گونج رہی تھی برفباری میں شدت آتی جا رہی تھی اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی بس تیس فٹ آگے تک نظر آ رہی تھی۔ راجر نے ہاتھ میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اس کے پاس تیس منٹ اور تھے اسی وقت حنا زور سے چیخی۔
''راجر!'' اور راجر نے سامنے کی طرف دیکھا کچھ ہی فاصلے پر ایک بھاری باکس ٹرک روڈ کے بیچوں بیچ کھڑا تھا بالکل ایسے جیسے جان بوجھ کر راستہ بند کیا گیا ہو راجر نے ایک گہری سانس لی ٹرک کے اندر لائٹس آن تھیں جن کی روشنی میں ٹرک کی سیٹیں خالی نظر آ رہی تھیں۔ ٹرک میں کوئی موجود نہیں تھا۔
''میں چیک کرتا ہوں۔'' راجر نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔
''نہیں، بس واپس چلو، مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔'' حنا نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔
''واپس؟ پاگل ہو گئی ہو؟ دیکھتے ہیں شاید کسی کو مدد کی ضرورت ہو اسی لیے ایسے ٹرک کھڑا کیا ہو، میں اب یہاں تک آ کے واپس نہیں جانا چاہتا۔'' راجر نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا باہر بہت سردی تھی گاڑی سے اتر کر اس نے فوراً دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ بچے سردی سے محفوظ رہیں پھر اپنے سوئٹر کی جیب سے گرم دستانے نکال کر ہاتھوں میں پہنے تھے اور ٹرک کی طرف بڑھا تھا، وہ روڈ کے ساتھ لگی حفاظتی ریلنگ سے قریب ہوتا جا رہا تھا، اور اپنی گاڑی سے دور..... باکس ٹرک سفید رنگ کا تھا اس کا سامنے کا حصہ کسی پک اپ ٹرک جیسا تھا۔
''کسی کو مدد درکار ہے؟'' راجر نے زور سے پوچھا ساتھ ہی سائڈ ونڈو سے ٹرک میں جھانکا تھا جہاں فاسٹ فوڈ کے پیکٹ اور کپ پڑے تھے، ٹرک کی چابی اب بھی اگنیشن میں موجود تھی اس نے اطراف کا جائزہ لیا وہاں کوئی موجود نہیں تھا وہ واپسی کے لیے مڑا تو دور ایک درخت کے قریب اسے ایک سایہ کھڑا نظر آیا جس کے ہاتھوں میں گن سے مشابہ کوئی چیز تھی۔

حنا خوف سے راجر کو جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر محسوس کر رہی تھی اسے اپنا خواب یاد آ رہا تھا جو وہ کافی عرصے سے بار بار دیکھ رہی تھی وہ راجر اور اس کے نئے اسسٹنٹ کے بارے میں تھا وہ اسے سیفا کے لباس میں اپنے بیڈ کی طرف جاتے دیکھتی تھی اس نے کئی بار راجر کو اس کے بارے میں بتایا تھا۔
''یہ محض خواب ہے۔'' راجر ہر بار جواب دیتا حنا اس کے جواب سے تنگ آ گئی تھی جبکہ اس کا خیال تھا کہ یہ خواب اسے کسی خطرے سے آگاہ کر رہا ہے وہ چاہتی تھی کہ اس خواب کے سلسلے میں اپنی والدہ سے مشورہ کرے اتنی لمبی گفتگو وہ فون پر نہیں کر سکتی تھی چنانچہ انتظار میں تھی کہ کسی طرح ان سے ملنے جائے تو بات کرے۔
''بوودم۔'' اچانک ایک زوردار شوٹ کی آواز آئی اور راجر کے چہرے سے خون بہنے لگا وہ ٹرک کے دروازے سے ٹکرایا تھا اور پھر پلک جھپکائے بغیر زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی۔ حنا کے ساتھ اس کے دونوں بچے بھی چیخ رہے تھے پھر حنا نے تیزی سے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا لیکن فوراً رک گئی تھی ایک سایہ جنگل سے نکل کر روڈ پر آیا تھا اس کے ہاتھ میں گن تھی اور وہ ویگن کی طرف بڑھ رہا تھا اپنے لباس اور انداز سے وہ کوئی پہاڑی باشندہ لگ رہا تھا فوراً ہی دوسرا دھماکا ہوا تھا اور گولی اسٹیشن ویگن کے سامنے کا شیشہ توڑتی ہوئی حنا کے پیٹ میں لگی تھی، بچے زور سے چیخے تھے اور حنا سیٹ پر ڈھیر ہو گئی تھی۔
''مام'' ونا چیخی۔
''بھاگو......'' حنا نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔
''لیکن......''
''جلدی ......'' حنا نے ونا کی بات کاٹ کر کہا اور دونوں بچوں نے اپنی اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگا دی گن مین گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا اور حنا اپنے بچوں کو روڈ کے ساتھ لگی زنگ آلود حفاظتی ریلنگ پار کر کے نیچے ڈھلان میں اترتا دیکھ رہی تھی، پھر گن مین بھی ان کے پیچھے حفاظتی ریلنگ پھلانگ کر ڈھلان میں اترتا چلا گیا تھا اور وہیں روڈ پر ایک سائن بورڈ لگا تھا۔

''ویلکم ٹو ہائی لینڈ......ایلی ویشن 4118 فٹ۔''

☐......☐......☐

2017ء میں پچیس سال بعد کیلیفورنیا' ہائی لینڈ میں واقع گاؤں میں کرسمس کی شام منائی جارہی تھی ہیڈ لے ہاؤس دو منزلوں پر مشتمل تھا اس کے باہر لان برف سے ڈھکا ہوا تھا اور برف کے گالے رات میں یوں زمین پر برس رہے تھے جیسے آسمان سے تاروں کی بارش ہو رہی ہو' چاند کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور منظر بڑا طلسماتی لگ رہا تھا۔

بڑے ہال میں لگی گھڑی کے سامنے ایک بڑا کرسمس ٹری رکھا تھا اور اس کی شاخوں میں تحائف لٹک رہے تھے ریکل ہرلے اپنے جاسوس پارٹنر جیسن پیک کے ساتھ بیٹھی اپنے دادا سے باتیں کررہی تھی پیک نے نیلے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا وہ اس پر بہت جچ رہا تھا اور ریکل بار بار اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی' پیک کے قریب اس کی پانچ سالہ بیٹی کلو بیٹھی تھی' بچی کے بال پیک کی طرح سنہرے تھے' باتیں کرتے کرتے ریکل کی توجہ کسی چیز کی طرف مبذول ہوئی' اسے محسوس ہوا جیسے اوپر کی منزل میں کوئی چیز حرکت کررہی ہو اس کے دادا ولیم ہاروے نے دعا مانگنا شروع کی تو ریکل نے آنکھیں بند کرکے سر جھکا لیا اور بند آنکھوں سے اس نے دیکھا جیسے بہت سے خون آلود چہرے اس کے تصور میں حرکت کررہے ہیں ان میں قاتل بھی تھے اور مقتول بھی' اس نے آنکھیں کھول دیں اور وہ منظر غائب ہوگیا۔

''سراغرساں پیک ہماری فیملی کی ایک روایت ہے کہ ہر کرسمس کی شام ہم سب ایک ایک تحفہ ضرور کھولتے ہیں۔ چنانچہ تم بھی اپنا تحفہ ہوشیاری سے منتخب کرلو اور درخت سے تحفہ اتارلو۔'' ولیم ہاروے نے کہا اور ساتھ ہی ریکل کو ایک چوکور باکس دیا۔

''شکریہ دادا جان۔'' ریکل نے کہا۔

''تحفہ کھولنے سے پہلے شکریہ مت کہو پہلے کھول کر دیکھ تو لو کہ کیا ہے؟'' سراغرساں پیک نے کہا اور ریکل نے مسکراتے ہوئے گفٹ کھولا۔

''اوہ......دادا میں یہ نہیں لے سکتی...... یہ تو بہت قیمتی ہے......'' ریکل نے تحفہ دیکھ کر کہا۔

''کیوں' تم سے زیادہ قیمتی تو نہیں...... تمہیں کسی خاص تحفے کا منتظر ہونا چاہیے تھا تم میرے لیے بہت قیمتی ہو۔'' دادا ولیم نے کہا۔ ''لاؤ میں تمہیں پہنادوں۔'' انہوں نے سونے کی قیمتی چین اس کے گلے میں ڈال دی وہ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد سے ریکل پر پیسہ پانی کی طرح بہارہے تھے۔

''تم پر یہ چین بہت سج رہی ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شکریہ' دادا جان۔'' ریکل نے مسکراتی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا اس کی ہری ہری آنکھوں میں خوشی کی چمک موجود تھی۔ پیک اس کے لمبے قد اور متناسب جسم کو پسندیدگی سے دیکھ رہا تھا ریکل کرسمس ٹری کی طرف بڑھی اور قریب رکھا ہوا ایک بڑا گفٹ کا ڈبہ اٹھا کر پیک کی طرف بڑھایا اور پیک نے وہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے وہ ڈبہ کلو کو دے دیا جسے کلو نے فوراً ہی کھول لیا تھا اور اس میں سے ایک خوبصورت گڑیا نکلی تھی جس نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اس کی آنکھیں سیاہ بال سنہرے تھے۔

''کیا اس کے بال اصلی ہیں؟'' کلو نے پوچھا۔

''ہاں...... بالکل اصلی۔' ریکل نے کہا اور کلو اس کے گلے لگ گئی۔

''مجھے گڑیا پسند نہیں ہیں۔'' پیک نے کہا۔

''میں بہت جلد تمہارے لیے ایک گڑیا ڈھونڈوں گی۔'' ریکل نے ذومعنی انداز میں کہا اور ایک بکس پیک کو تھما دیا' پیک نے بکس کھولا تو اس میں کئی سنہرے رنگ پڑے تھے۔

''یہ کیا؟'' پیک نے حیرت سے کہا۔ 'میں بھلا کس کو دوں گا یہ؟''

''یہ سب رنگ کسی ایک لڑکی کو مت دے دینا۔'' ریکل نے اسے چھیڑا تو پیک نے بھی اس کی طرف ایک گفٹ بڑھا دیا۔

''میں جانتا ہوں دو تحفے کھولنا تمہاری خاندانی روایت کو توڑنا ہے لیکن میری طرف سے۔'' پیک نے گفٹ دیا تو ریکل نے کھولا اس میں خوبصورت رنگین پینسلوں کا سیٹ تھا اور ساتھ ہی ایک نوٹ بھی لکھا رکھا تھا۔ ''تمہاری

آوارہ روحوں کے لیے۔'' ریکل نے نوٹ پڑھا اور پیک کی طرف دیکھنے لگی ولیم کچھ نہیں سمجھا تھا۔

''مجھے نئے سیٹ کی ضرورت تھی۔'' ریکل نے کہا۔

''میں نے بہترین اور مہنگا ترین سیٹ خریدا ہے۔'' پیک نے کہا پھر ریکل نے ولیم کو ایک خوبصورت مگ گفٹ میں دیا تھا اسی وقت ریکل کو اوپری منزل سے پھر کچھ گرنے کی آواز سنائی دی جو اس کے بیڈروم کی سمت سے آرہی تھی۔

''ایکس کیوز می۔'' ریکل نے کہا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی پیک اسے جاتے دیکھتا رہا تھا اور ولیم نے اسے بیٹھنے کو کہا تھا۔

''مجھے اپنے بارے میں بتاؤ پیک۔''

ریکل جب اپنے کمرے میں پہنچی تو وہاں اندھیرا تھا اس نے لائٹ آن کی جو روشن ہونے سے پہلے کئی بار ٹمٹمائی ریکل نے اپنے ہاتھ میں اپنا پولیس والا پستول پکڑا ہوا تھا اس کے بیڈ پر رکھی چادریوں اوپر کو اٹھی ہوئی تھی جیسے اس کے نیچے کوئی بچہ چھپا ہوا ہو ریکل نے آگے بڑھ کر چادر کھینچ لی لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا اسی لمحے ریکل کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے پیچھے سے چھوا ہو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ گئی اس کی گرفت اس کے پستول پر سخت ہوگئی اور وہ پیچھے مڑی اس کے سامنے ایک گیارہ سالہ کورین لڑکی کھڑی تھی۔

''اوہ تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے۔'' ریکل نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے انکل کا کیس ختم ہوگیا ہے اور وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے جاچکے ہیں۔'' ریکل نے اسے بتایا اس کا مزید بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لڑکی کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ نی ما نے اپنی زبان میں کوئی سرگوشی کی جو ریکل نہ سمجھ سکی لیکن اسے اندازہ ہوا کہ وہ خفگی کا اظہار کررہی ہے وہ کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔

''بس آج رات کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔'' ریکل نے کہا اور نی ما نے پھر کورین میں کچھ کہا ریکل نے اندازہ لگایا کہ وہ اسے کچھ دکھانا چاہتی ہے اس نے عجلت میں اپنی چمڑے کی جیکٹ پہنی اپنا پستول جیب میں رکھا اور وہیں سے اونچی آواز میں اپنے والد کو مخاطب کیا۔

''آپ کو کچھ چاہیے تو نہیں میں کام سے باہر جارہی ہوں۔''

''کوئی دکان نہیں کھلی ہوگی ریکل آج کرسمس ہے۔'' اس کے دادا نے جواب دیا۔

''میں گیس اسٹیشن تک جارہی ہوں۔'' ریکل نے کہا۔

پھر جب وہ باہر جارہی تھی تو اس کے دادا نے لونگ روم سے آواز ماری۔

''آج وقت ہمارے ساتھ ہی گزارتیں، تمہیں فرصت کہاں ہوتی ہے۔''

''میں آدھے گھنٹے میں واپس آجاؤں گی پیک آپ کے ساتھ ہے۔'' ریکل نے کہا اور اپنے دادا کا جواب سنے بغیر گھر سے نکل گئی۔ نی ما اس کے ساتھ تھی۔ ریکل نے اپنے سردی سے اکڑے دستانوں والے ہاتھ ایکدوسرے سے رگڑے اور اپنی امپالا اسٹارٹ کردی پھر اس نے کار کی کھڑکی سے برف کی تہہ صاف کی تھی اور کار آگے بڑھادی تھی۔

رات کی تاریکی گہری ہوگئی تھی۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے اور پتوں سے آزاد درخت برف سے ڈھکے ہوئے تھے راستے میں جگہ جگہ درخت، گھر اور دکانیں کرسمس کے لیے سجے ہوئے تھے، جہاں مقامی کلچر کی چیزیں فروخت کے لیے بجی تھیں ریکل ایک منزلہ گھر کے سامنے کار روک کر اتر گئی تھی۔ وہاں موجود گھر بھی روشنی سے منور تھے اور کچھ کی چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا ریکل گھر میں داخل ہوئی تھی۔ مسٹر جنگ اور ان کی بیوی اب بھی کالے لباس میں تھے، حالانکہ ان کے ہاں ہونے والے ناخوش گوار واقعے کو کئی ہفتے گزر چکے تھے نی ما اب بھی ریکل کے ساتھ تھی اب اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اس کی آنکھیں اپنے رشتے داروں، انکلز اور آنٹیوں پر لگی تھیں اس نے اپنی کورین زبان میں ریکل سے جیسے درخواست کی۔

''وہ تمہیں نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں، صرف میں دیکھ سکتی ہوں، اب تم اپنے گھر جاؤ۔'' ریکل نے کہا لیکن لڑکی نے برہمی کا اظہار کیا جیسے اسے یہ بات پسند نہ آئی ہو۔

'تم میری بات سمجھو اب یہ تمہارے رہنے کی جگہ نہیں

ہے۔'' ریکل نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔اور نی ما کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے وہ کرسمس کی خوشیاں مناتے اپنے خاندان کو دیکھ رہی تھی پھر چند لمحوں بعد ریکل کا ہاتھ چھوڑ کر برفانی رات میں گم ہوگئی تھی ریکل نے اطمینان کا سانس لیا تھا وہ سمجھ گئی تھی کہ نی ما اس کی بات سمجھ گئی تھی۔

جب وہ گھر واپس پہنچی تو پیک اپنی بیٹی کلوو کے ساتھ واپس جانے کے لیے تیار تھا' اس کے دادا نیند سے بوجھل آنکھیں لیے اس کے منتظر تھے' ریکل پیک کو چھوڑنے باہر تک آئی تھی۔

''تم آج رات ایک آوارہ روح کیساتھ تھیں نا؟'' پیک نے پوچھا۔

''ہاں تھی بھی۔'' ریکل نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آج تمہارے ساتھ کونسی روح تھی؟'' پیک نے پوچھا۔

''نی ما' تھی جس کے انکل کو پچھلے دنوں قید ہوگئی اور وہ قتل کردی گئی۔'' ریکل نے کہا پیک چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اپنی کار میں بیٹھ گیا اس کی بیٹی بھی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

''میری کرسمس ریکل...... پھر کل ملتے ہیں۔'' پیک نے کہا اور رخصت ہوگیا۔

اس رات ریکل بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی صبح کے قریب ایک کال آئی جس میں علاقے کی جھیل میں ایک لاش ملنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ریکل فوراً ہی موقع پر پہنچی تھی وہاں دوسرے پولیس آفیسرز کے ساتھ پیک بھی موجود تھا اور علاقے کے کچھ لڑکے بھی جن کی عمریں پانچ سے آٹھ سال کے درمیان تھیں پولیس والے انہیں جائے حادثے سے ہٹا رہے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ وہاں ملنے والی لاش سے وہ دور رہیں ریکل پیک کے ساتھ ان لڑکوں کے قریب چلی گئی۔

''اتنی صبح ایسے موسم میں تمہارا یہاں کیا کام؟'' اس نے لڑکوں سے پوچھا۔

''ہم برف پر سلائڈنگ کررہے تھے۔'' ایک لڑکے نے جواب دیا۔

''سلائیڈنگ؟ تو پھر تمہاری سلائیڈ کدھر ہے؟'' ریکل نے پوچھا۔

''آپ ہم پر شک کررہی ہیں؟'' ایک شرارتی لڑکا بولا۔

''کیا تم پر شک کیا جاسکتا ہے؟'' ریکل نے کہا تو لڑکا آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

''چلو اپنی جیبوں کی تلاشی دو۔'' اس نے کہا اور لڑکے جیبیں خالی کرنے لگے ان کی جیبوں سے لائٹر اور آتش بازی کا سامان برآمد ہورہا تھا۔

''ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آتش بازی برف میں کیسی لگتی ہے۔'' ایک لڑکے نے کہا۔''پلیز ہمارے والدین کو مت بتایئے گا۔''

''پلیز...... پلیز ......پلیز......'' دوسرے لڑکے بھی چیخے۔

''ٹھیک ہے نہیں بتاؤں گی لیکن پہلے تم لوگ مجھے یہ بتاؤ کہ کرسمس کے گفٹ کھولنے کے بجائے تم لوگ فائر ورکس کے لیے باہر کیوں آگئے؟'' ریکل نے پوچھا۔

''ہم گفٹس کھول چکے تھے۔'' ایک نے کہا۔

''انہیں کچھ مت بتانا ہم پہلے ہی بہت مشکل میں پھنس گئے ہیں۔'' ایک لڑکے نے دوسرے سے کہا۔

''پچھلی رات ہم نے کچھ فائر ورکس کی آوازیں سنی تھیں تو ہم نے سوچا کہ ہم بھی یہ کام کرتے ہیں۔'' ایک لڑکے نے کہا۔

''اس کی آواز کیسی تھی؟'' پیک نے پوچھا۔

''ٹھی شوں......'' لڑکے نے بتایا۔

''یہ کسی گن شاٹ کی آواز لگتی ہے۔'' پیک نے کہا او رریکل نے سوچا کہ اگر پیک درست کہہ رہا ہے تو اس سے مرنے والے کی موت کے وقت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ لڑکوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے یہ آوازیں نو بجے سے گیارہ بجے رات کے درمیان سنی تھیں۔بچوں سے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں پوچھا گیا تھا اور انہیں ان کے والدین کے سپرد کردیا گیا تھا۔ پولیس انسپکٹر کورونور اور وڈ گیٹس لاش کے پاس موجود تھے لاش کے سر کے بال گرے کلر کے تھے اس کی آنکھیں سرمئی تھیں اس نے پلاسٹک کے دستانے پہنے ہوئے تھے' گیٹس نے ریکل اور پیک کی بات سننے اور لاش کا معائنہ کرنے کے بعد اپنے خیال کا اظہار کیا تھا کہ اسے

شکاری گن کا نشانہ بنایا گیا تھا۔
لاش کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی عمر سترہ سے پچیس سال کے درمیان رہی ہوگی وہ بہت دبلا پتلا تھا' اس کی پسلیاں اس کی زرد کھال کے اوپر سے گنی جا سکتی تھیں اور ہاتھ اور ٹانگیں کھال اور ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے اس کے جسم پر جگہ جگہ کھرونچے اور زخموں کے نشان تھے اس کے دو دانت جبڑے سے باہر نکلے ہوئے تھے' اچانک ریکل کو لگا جیسے کوئی اسے تالاب کے پانی کی طرف کھینچ رہا ہے۔ وہ آگے بڑھی تو اسے ایک جگہ پر پانی میں بلبلے سے نظر آئے اس نے جھک کر غور سے دیکھا تو نیچے ایک لڑکے کی لاش نظر آئی جس کی شکل اس لاش سے مل رہی تھی جو پہلے دریافت ہوئی تھی اس کے بھی اوپری جبڑے کے دو دانت بڑے تھے اور باہر جھانک رہے تھے' ریکل بغور اسے دیکھتی رہ گئی۔

''ریکل......! ریکل!'' اسے اپنے پیچھے پیک کی آواز سنائی دی تو وہ چونک کر اس کی طرف مڑی تو پیک نے لاش کی طرف اشارہ کیا ریکل نے پلٹ کر تالاب کی طرف دیکھا لیکن وہاں بچے کی ابھرنے والی لاش غائب ہو چکی تھی وہ بوجھل قدموں سے پیک کی طرف بڑھ گئی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سی آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی ہیں تالاب کے سامنے دور تک جنگل پھیلا ہوا تھا' پیک کے قریب کھڑے وڈ کینس نے لاش تالاب سے نکلوائی تھی اس نے لاش کا جبڑا کھول کر دیکھا اس کی زبان کٹی ہوئی تھی۔

''زبان کٹنے کا یہ نشان بہت پرانا ہے لگتا ہے سالوں پہلے یہ کاٹی گئی ہوگی۔'' وڈ کینس نے کہا۔

''پریشان کن ہے۔'' ریکل نے زیر لب کہا اور لاش سے نظریں ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگی اس سفاکی نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا وہ دور برف سے ڈھکے درختوں کو دیکھ رہی تھی اور فوٹو گرافر لاش کی تصویریں کھینچ رہے تھے اچانک ریکل کو ایک خیال آیا اور وہ لاش کی طرف بڑھی۔

''اسے الٹا کرو۔'' اس نے قریب جا کر کہا وہ چاہتی تھی کہ باڈی کے پوسٹ مارٹم سے پہلے وہ اس کا اچھی طرح جائزہ لے اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے کورنر نے لاش کو پلٹ دیا تھا اور وڈ کینس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں لاش کی پشت پر زخم کا نشان تھا۔

''اوہ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔'' پیک نے بھی حیرت کا اظہار کیا اور ریکل نے جھک کر نشان کو بغور دیکھا وہ (1) ون کی طرح بنا ہوا تھا اور اسے باقاعدہ کھود کر بنایا گیا تھا۔ یہ نمبر ون ایک لمبا اور آدھا انچ چوڑا بنایا گیا تھا ریکل جھک کر لاش کا معائنہ کر رہی تھی تو اسے احساس ہوا جیسے اس کے سامنے کوئی آ کھڑا ہوا ہو کیونکہ اس پر کسی کا سایہ پڑ رہا تھا اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے سامنے تقریباً بیس سالہ لڑکا بغیر شرٹ پہنے کھڑا تھا اس کے اخروٹی کلر کے بڑے بال اس کے شانوں پر جھول رہے تھے اس کی آنکھ کے اوپر زخم کا نشان تھا اور اس کے دانت سردی کی شدت سے بج رہے تھے۔ ریکل نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کے علاوہ وہاں موجود کسی اور شخص کو نظر نہیں آ رہا ہے وہ سمجھ گئی کہ وہ کوئی ذی روح نہیں ہے کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے جو اس سے رابطہ کرنے آئی ہے۔ ریکل اس سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن سب کے سامنے ایسا نہیں کر سکتی تھی ورنہ لوگ اسے پاگل سمجھتے اس کے اس راز سے صرف اس کا پارٹنر پیک آگاہ تھا اور اس پر یقین بھی کرتا تھا کہ وہ روحوں کی نشاندہی پر اپنے بہت سے کیس حل کرتی ہے جو ہمیشہ درست ثابت ہوتے ہیں۔

اچانک اس اجنبی لڑکے نے جنگل کی طرف چلنا شروع کر دیا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ چاہتا ہو کہ ریکل اس کے پیچھے قدم بڑھائے پھر ریکل نے بھی ایسا ہی کیا اب وہ اس کا تعاقب کر رہی تھی اور پیک ریکل کے پیچھے تھا حالانکہ وہ اس روح کو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن بہت عرصے ریکل کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ ریکل کسی خاص وجہ سے جنگل کی طرف جا رہی ہے ایسے موقع پر وہ اسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جب ریکل دوسرے لوگوں سے کافی دور نکل گئی تو اس نے روح کو مخاطب کیا۔

''میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں......لیکن تمہیں مجھے سب کچھ بتانا ہوگا۔'' ریکل نے کہا اس لڑکے نے بات کرنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کے منہ سے خرخراہٹ کی آواز نکل کر رہ گئی۔

''وہ کیا کہہ رہا ہے؟'' پیک نے ریکل کو بات کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' ریکل نے کہا یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ

ریکل ایسے کیس سے نمٹ رہی تھی وہ اس کی عادی تھی بچپن ہی سے اسے روحیں نظر آتی تھیں اس میں ان روحوں سے بات کرنے کی صلاحیت تھی اس لڑکے کی روح دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اسے کچھ بتانا چاہتا ہے لیکن بتا نہیں پا رہا اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ زبان نہ ہونے کی وجہ سے بول نہیں پا رہا تھا کچھ مہینے پہلے بھی ریکل کو ایسے ایک واقعے سے واسطہ پڑا تھا اس نے بغور لڑکے کی روح کی طرف دیکھا اور اپنی جیب سے نوٹ بک نکال کر اس کے دانت ایک صفحے پر بنا لیے کیونکہ وہ غیر معمولی تھے وہ اوپری جبڑے سے باہر نکلے ہوئے تھے پھر اس نے اس کے جسم کی دوسری تفصیلات بھی ڈرائنگ کی تھیں مقصد صرف یہ تھا کہ اسے اس کیس کی تحقیقات میں مدد مل سکے وہ اس اجنبی لڑکے پر برابر نظر رکھے ہوئے تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جیسے ہی اس کی نظر ذرا چوکی وہ غائب ہو جائے گا اور پھر ہوا بھی یہی تھا ابھی اس نے آدھا اسکیچ ہی بنایا تھا کہ وہ گھنے جنگل کی طرف دوڑ پڑا ریکل بھی اس کے تعاقب میں آگے بڑھی سرد ہوا کے تھپیڑے اس کے منہ پر پڑ رہے تھے اجنبی لڑکا اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ اگلی بار اس کا قدم کس سمت اٹھے گا وہ ہر قدم پر راستہ بدل رہا تھا پھر وہ ایک گرے ہوئے درخت کے قریب رک گیا تھا پیک بھی ریکل کی تقلید میں اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

جو درخت گرا ہوا تھا اس پر ایک خون آلود ہاتھ کا نشان تھا۔

''اس کی تصویر لے لو۔'' ریکل نے پیک سے کہا اور آگے بڑھتی رہی وہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ کبھی ایک درخت کے قریب نظر آتا اور دوسرے ہی لمحے دس قدم دوسرے کسی درخت کے قریب نظر آتا اور پھر ایک مقام پر آ کر یوں لگا جیسے وہ نیچے گرا ہو اور غائب ہو گیا ہو ریکل اس مقام پر پہنچی لڑکے کا کہیں نام و نشان نہیں تھا جس جگہ وہ گرا تھا وہاں سے دو راستے پہاڑوں کی چڑھائی کی طرف جاتے تھے۔

''ہیلو!'' ریکل زور سے چیخی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا دور دور تک جنگل یا پہاڑیوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''تم مجھے کیا دکھانا چاہتے ہو؟'' ریکل نے سوچا وہ سوچوں میں اس سے رابطہ کرنا چاہتی تھی لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا وہ جا چکا تھا ریکل واپس اسی مقام پر آ گئی جہاں تالاب میں لاش دریافت ہوئی تھی' لاش کو اب ایک بیگ میں رکھا جا چکا تھا اور وہاں موجود پولیس افسران کا خیال تھا کہ لاش کی پشت پر جو نشان موجود تھا اسے قتل کے بعد بنایا گیا تھا۔

□......□......□

ہائی لینڈ پولیس ڈپارٹمنٹ کے بریفنگ روم میں بیٹھی ریکل کافی کی چسکیاں لے رہی تھی کمرے میں دو سفید رنگ کی مستطیل پلاسٹک کی میزیں رکھی ہوئی تھیں جن کے سامنے دیوار پر ایک وائٹ بورڈ لگا ہوا تھا بالکل کسی اسکول کی کلاس والا منظر تھا لیفٹیننٹ میک کونل ہاتھ میں بلیک پوائنٹر لیے بورڈ کے قریب کھڑا تھا اس کا قد لمبا چہرہ ستواں اور بال سیاہ تھے' کمرے میں ریکل کے ساتھ ساتھ پیک اور دوسرے پولیس افسران بھی موجود تھے وہ ان سب کو لیکچر دے رہا تھا۔

''میرا خیال ہے آپ سب ہی کرسمس منا رہے ہوں گے؟'' اس نے پوچھا اس کی بات کا کسی نے اثبات میں سر ہلا کر اور کسی نے ہنکارا بھر کر جواب دیا تھا۔

''میں جانتا ہوں آپ سب کے جذبات کیا ہوں گے؟'' میک کونل نے کہا ''سارے لوگ کرسمس کی خوشیاں منا رہے ہیں اچھے اچھے کھانے کھا رہے ہیں لیکن ہمیں اپنی ڈیوٹی ادا کرنا ہے چنانچہ ہمارا فرض ہے کہ ہم جان ڈوز کے قاتلوں کا پتہ لگائیں تاکہ ہم بھی اپنے گھروں کو واپس جا کر ان خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔''

''ہم سب متفق ہیں۔'' سب نے یک زبان کہا۔

''خوب۔'' کونل نے تعریفی نظروں سے سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر آغاز کرتے ہیں...... گیٹس تم مجھے لاش کے بارے میں بتاؤ۔''

جتنی دیر گیٹس لاش کے بارے میں تفصیلات بتاتا رہا پچھلی نشست میں بیٹھے ریکل اور پیک بھی اس کیس پر اپنے خیالات اکٹھا کرتے رہے اور گیٹس کے بعد انہوں نے اپنی معلومات بھی کونل کے ساتھ شیئر کیں۔

''لگتا ہے کہ مقتول کا پیچھا کیا گیا اور پھر اسے فائر کر کے ہلاک کیا گیا۔'' پیک نے کہنا شروع کیا۔ ''اور

پھر اسے پانی کے تالاب میں ڈبو دیا گیا پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی یہی بتاتی ہے اندازہ ہے کہ وہ کافی عرصے سے کسی کا قیدی تھا اور اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جا رہا تھا میرا خیال ہے اس نے فرار کی کوشش کی ہوگی جو ناکام ہوگئی اور یا پھر اسے آزاد کیا گیا تھا اور اس کے بعد ڈرامائی انداز میں اس کا شکار کیا گیا۔'' پیک نے کہا کمرے میں مکمل خاموشی تھی پیک کے بیٹھنے کے بعد ریگل کھڑی ہوگئی تھی۔

''اس کی پشت پر موجود نمبر خاص اہمیت رکھتا ہے شاید ہمیں ایک سیریل کلر کا سامنا ہے لیکن ہمارے ڈیٹا بیس کے تجزیے کے بعد بھی کوئی نام سامنے نہیں آیا ہے۔'' ریگل نے لاش کی پشت کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے یہ لاش ہمارے قاتل کے جرائم کا آغاز ہو یا وہ پہلے آغاز کر چکا ہو اور اب اس اقدام کو آگے بڑھا رہا ہو لیکن ابھی ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

''ہمیں محنت سے اس کیس پر کام آگے بڑھانا ہوگا۔'' کونل نے کہا۔ ''اب تک کے لیے اتنا ہی میں چاہتا ہوں آپ سب مل کر اس کیس پر کام کریں موسم خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا ہے اپنا خیال رکھیے گا۔''

ریگل اور پیک کی میزوں پر پرانی طرز کے مانیٹرز موجود تھے اور کیس کی فائلوں کا پلندہ تھا جن میں پرانی DNA رپورٹس بھی موجود تھیں۔ ایک سراغرساں کی حیثیت سے ریگل نے کبھی بھی صرف ایک کیس پر کام نہیں کیا تھا وہ ایک وقت میں کئی کئی کیسوں پر کام کر رہی ہوتی تھی' اس وقت بھی وہ ایک ساتھ چار کیسوں پر کام کر رہی تھی ایک فرار کا کیس تھا' ایک میاں بیوی کے جھگڑے کا کیس تھا جس میں شوہر نے بیوی کو قتل کر دیا تھا' ایک جنگ فیملی کا کیس تھا جو عدالت جا چکا تھا اور ایک موجودہ کیس جس میں لاش تالاب سے ملی تھی اور ریگل کے خیال کے مطابق یہی کیس سب سے اہم تھا ریگل نے اپنی اسکیچ بک نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی اس میں ایک لڑکی' ایک لڑکے (جو برساتی کوٹ) پہنے ہوئے تھے' اور دوسری تصویریں بنی ہوئی تھیں پھر اس کی نظریں تالاب میں ملنے والی لاش کے اسکیچ پر رک گئی تھیں اس کے بارے میں ملنے والی تمام معلومات اس بات کی طرف اشارہ کرتی تھیں کہ اسے کافی عرصہ پہلے قتل کیا گیا اور نہایت سفاکی سے قتل کیا گیا یہ انسانی ظلم کی بدترین مثال تھی۔ ریگل نے سر اٹھا کر اطراف کا جائزہ لیا تو پیک اس کی سمت ہی دیکھ رہا تھا۔

''تم یہ کیس آرام سے حل کر سکتی ہو۔'' پیک نے اس سے کہا۔

''میرا خیال ہے تمہارا آئیڈیا اچھا نہیں ہے۔''

''کیا تم نئے سال کی آمد کے دنوں میں بھی اسی کام میں الجھے رہنا چاہتی ہو؟ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ پہلے حل نہیں ہوا تو ہماری نئے سال کی چھٹیاں بھی برباد ہو جائیں گی۔'' پیک نے کہا۔

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ریگل نے جواب دیا وہ اداس تھی۔

''چلو باہر کھانا کھاتے ہیں۔'' پیک نے پیش کش کی۔

''ٹھیک ہے۔'' ریگل نے کہا اور کھڑی ہوگئی برسوں کی دوستی اور ساتھ کام کرنے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے ریگل چالیس سال سے اوپر کی تھی اور اس کی اپنے شوہر بیرٹ سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ کھانے کے لیے کسی ریسٹورنٹ میں جانے سے پہلے ریگل نے ایک روز پہلے ملنے والی لاش دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی جو گیٹس کی نگرانی میں سردخانے میں رکھی ہوئی تھی اور پیک کے سامنے اس کی بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا وہ اس کے ساتھ پہلے سرد خانے گیا تھا جہاں گیٹس نے تھوڑی سی بحث کے بعد انہیں لاش کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیا تھا۔

''چونکہ اس کا نام معلوم نہیں اس لیے ہم اسے نمبر ون کہہ رہے ہیں۔'' گیٹس نے بتایا۔

''ہوں...... مرنے کے بعد انسان کی بس اتنی ہی اہمیت رہ جاتی ہے کہ اسے نمبر سے شمار کیا جائے۔'' ریگل نے تاسف سے کہا گیٹس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا اور کمرے سے نکل گیا تھا جاتے جاتے اس نے ریگل اور پیک کو ڈسپوزایبل دستانے دیئے تھے جو انہوں نے پہن لیے تھے لیکن گیٹس کے جانے کے بعد ریگل نے اپنے دائیں ہاتھ کا دستانہ اتار دیا تھا اور لاش کے اوپر سے چادر ہٹا کر اپنا سیدھا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ دیا تھا' لاش سرد تھی ریگل نے ایک جھرجھری لی تھی اس نے لاش کے

ماتھے پر ہاتھ رکھنے کے بعد کچھ محسوس کرنے کے لیے آنکھیں بند کی تھیں لیکن اسے اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا تھا۔

''حیرت ہے...... کچھ پتہ نہیں چل رہا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اس نے دوبارہ کوشش کی' اس بار اندھیرے میں اسے ٹائروں کے چرچرانے کی آواز سنائی دی اور اسے لگا جیسے وہ ایک چھوٹا لڑکا ہو جس کا پیٹ درد سے پھٹا جا رہا ہو شدید سردی کا احساس بھی اسے ہو رہا تھا' پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی روشنی کی لکیر کسی دروازے سے اندر آ رہی ہو اور نمبرون کسی پنجرے میں قید ہو۔ اس کی انگلیاں زخمی ہوں کیونکہ اپنی ننگی انگلیوں سے وہ اس پنجرے کی کنڈیاں کھولنے کی کوشش کرتا رہا ہو اور پھر اس کے والد نے اسے باہر جانے کی اجازت دی ہو۔

پھر اسے دوسرا منظر نظر آنے لگا ایک ٹرک تیزی سے رکا تھا اس کا دروازہ اچانک کھلا تھا' جس سے نمبرون اچھل کر باہر گرا تھا اور ٹرک کی بیک سے ٹکرایا تھا اسے سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی اور ٹرک دوبارہ پہاڑی راستوں پر جانے کے لیے اسٹارٹ لے رہا تھا اسے محسوس ہوا نمبر ون فرار کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اس میں فرار کی ہمت نہیں تھی وہ سوچ رہا تھا اس کا کوئی نام نہیں ہے' کوئی آواز نہیں ہے وہ اپنی عمر تک نہیں جانتا اس لیے اس کے والد ہی سب کچھ ہیں ان کے بغیر نمبرون کی کوئی اہمیت نہیں ہے اس کی تمام یادیں صرف اور صرف اس کے والد سے وابستہ تھیں وہی اسے کھلاتا تھا وہی اسے کپڑے پہناتا تھا وہی اسے آرام دیتا تھا اس کے لیے زندگی صرف والد کا گھر یا ان کا ٹرک تھا اس کے علاوہ کچھ یاد نہیں تھا ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا جو اس کا خیال کرے اس کی رہنمائی کرے پھر اس میں زندگی کی لہر دوڑی تھی وہ فرار چاہتا تھا اس نے ٹرک سے باہر چھلانگ لگائی تھی اور اندھیری رات میں سڑک پر آ گرا تھا سرد ہوا اس کے جسم میں سوئیاں چبھا رہی تھیں اور اس کا سیدھا ہاتھ کسی پتھر سے ٹکرا کر زخمی ہو چکا تھا۔ وہ لڑھکتا ہوا روڈ سے نیچے جنگل کی ڈھلان میں گرتا چلا گیا تھا اس کے چاروں طرف لمبے لمبے برف سے ڈھکے درخت تھے' ٹرک تیز چرچراہٹ کی ساتھ رکا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ والد اس کے تعاقب میں آ رہے ہیں' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اس نے خود کو قریبی جھاڑیوں میں چھپا لیا تھا برف نے اس کے پیروں کے تلوؤں کو سن کر دیا تھا پھر بھی اس نے اٹھ کر دوڑنا شروع کر دیا تھا اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے بس وہ اپنے والد سے زیادہ سے زیادہ دور جانا چاہتا تھا اس وقت اس کے لیے یہی اہم بات تھی۔

گن کے فائر کی آواز بہت تیز تھی اس کے ساتھ ہی اس کے پہلو میں شدید درد کی چمک ہوئی تھی اس کی چیخ نکل گئی تھی اور وہ ایک درخت کے تنے سے ٹکرایا تھا' اس نے اپنے خون آلود ہاتھ سے ایک گرے ہوئے درخت کو تھاما تھا اور پھر برفیلی زمین پر دوڑنا شروع کر دیا تھا اور پھر وہ پانی میں گر گیا تھا۔ اس نے پانی سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تھے اسے پتہ نہیں تھا کہ کیسے تیرا جاتا ہے اس کے والد کا سایہ جو اس کے تعاقب میں تھا کچھ فاصلے پر آ کر رکا تھا وہ بالکل تالاب کے قریب تھا۔

''نہیں...... نہیں...... نہیں۔'' وہ چیخا تھا لیکن والد نے کئی فائر کیے تھے اور پھر رائفل کو اس کی اور بڑھایا جیسے اسے سہارا دینا چاہتا ہو نمبرون نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا لیکن سرد پانی نے اسے نگل لیا تھا ڈوبتے ہوئے نمبرون نے اپنے والد کی آواز آخری بار سنی تھی جو ایک درد بھری چیخ تھی۔

ریکل کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا گرم کپڑوں کی تین تہیں اس کے جسم پر ہونے کے باوجود سرد پانی کے احساس نے اس کی ہڈیاں تک جیسے جما دی تھیں اور جیسے ہی وہ ہوش میں آ گئی تھی اور نمبرون کے تصور سے باہر آ گئی تھی اپنی ان صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے اسے اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خطروں سے کھیل رہی ہو وہ جانتی تھی اس طرح اسے نقصان بھی پہنچ سکتا تھا پیک بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

□......□......□

''تم نے کیا دیکھا؟'' کچھ دیر بعد پیک نے اس سے پوچھا سرد خانے سے واپسی پر وہ پیک کے ساتھ ریسٹورینٹ آ گئی تھی اور گرم کافی پی رہی تھی۔

''مجھے یوں لگا جیسے میں ایک ٹرک کے اندر موجود ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ وہ ٹرک دس یا بارہ فٹ

لمبا رہا ہوگا۔" وہ کانپ رہی تھی اسے اب تک اپنے جسم میں درد محسوس ہو رہا تھا جو دراصل نمبر ون کی کیفیت کو اپنے اوپر طاری کرنے کی وجہ سے تھا۔

"کیا تم نے قاتل کو دیکھا؟" پیک نے پوچھا اور ریکل نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے تصور میں اس منظر کو دہرایا جس کو کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔

"نہیں میں نے صرف اس کی چیخ سنی تھی...... میرا خیال ہے شاید اسے لڑکے کی فکر تھی...... شاید وہ اسے بچانا چاہتا تھا۔"

"اپنے پیارے کو اگر کسی وجہ سے کوئی موت کے گھاٹ اتارتا ہے تو اسے دکھ بھی ہوتا ہے۔" پیک نے کہا۔

"میرا خیال نہیں کہ وہ اپنے قیدی کو مارنے کی کوشش کر رہا تھا شاید وہ اسے دوبارہ پکڑنا چاہتا ہو؟"

"تم نے بتایا کہ وہ رات کا وقت تھا اور وہ بھاگ رہا تھا تو ممکن ہے قاتل نے اسے صرف زخمی کرنے کے لیے فائر کیا ہو وہ اسے فرار ہونے سے روکنا چاہتا ہو؟" پیک نے کہا۔

"ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ریکل نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"ابھی کوئی فیصلہ کرنا درست بھی نہیں ہوگا کیونکہ ہم نہیں جانتے تمہیں جو مناظر نظر آئے ہیں وہ کس حد تک سچے ہیں۔"

"لیکن پیک مجھے تو یوں لگتا ہے کہ وہ سچے ہیں میں وہ ساری کیفیات خود محسوس کرتی ہوں۔"

"ہاں...... لیکن ان تصورات پر یقین کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں عملی طور پر تحقیقات بھی کرنا ہوگی۔"

پیک نے کہا ریکل نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا کیونکہ وہ بھی درست کہہ رہا تھا وہ جو کچھ دیکھتی تھی اسے مقتول کی سوچ کا حصہ کہا جا سکتا تھا لیکن ایک حقیقت مسلمہ تھی کہ ایک قاتل موجود تھا جسے مقتول کے ذہن اور جسم پر اختیار حاصل تھا خدا ہی جانتا تھا کہ وہ کب کسی اور کو اپنا شکار بناتا ہے اور اسے نمبر ٹو کا نشان عطا کرتا ہے۔

دوسرے روز پیک نے اپنے کمپیوٹر کے ڈیٹا بیس سے اس علاقے میں بہترین نشانہ بازوں کے نام معلوم کیے تھے لیکن اسے ناکامی ہوئی تھی ریکل آرام کی غرض سے اپنے پرانے گھر چلی گئی تھی وہ 1892ء میں تعمیر کیا گیا تھا اور جنگلات کے درمیان واقع تھا جب وہ وہاں پہنچی تو گھر کی ویرانی دیکھ کر اداس ہوگئی تیز سرد ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے اور اندازہ ہو رہا تھا کہ برفانی طوفان آنے والا تھا جس کی پیشن گوئی کونل نے کی تھی گھر کے چاروں طرف گھنے درخت تھے جو ہوا کے تھپیڑوں سے جھول رہے تھے ان کی شاخیں گھر کی دوسری منزل کی کھڑکیوں تک پہنچ رہی تھیں وہ گھر میں داخل ہوئی تو اسے گھر کی دیواریں کراہتی محسوس ہوئیں سورج غروب ہونے والا تھا اس نے گھر کا اگلا اور پچھلا دروازہ لاک کر لیا اپنی چھٹی اس طرح گزارنے کا اس کا بالکل کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن وہ مجبور تھی وہ مقتولوں اور حقیقی دنیا کے درمیان ایک رابطہ تھی اور ان کی مدد کرنا چاہتی تھی جن کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہوا تھا جنہیں بے قصور بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا وہ اس ذمہ داری سے فرار نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اسے اس کام کے لیے چن لیا گیا تھا اس کے ذہن میں اچانک اپنے سابقہ شوہر ہیرٹ کا خیال آیا اس نے ریکل کے لیے کتنی خوشی سے یہ گھر خریدا تھا پھر جب ریکل پر اپنی نئی صلاحیتوں کا بھید کھلا اور اس نے ان کے مطابق زندگی کو ڈھالا اور ہیرٹ کو اعتراض ہوا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ریکل محض ایک معمول بن کر رہ جائے اور ان دیکھی قوتوں کے اشاروں پر ناچتا رہے جبکہ ریکل ان صلاحیتوں کو اپنی قوت سمجھتی تھی۔

"کیونکہ صرف میں ہی ہوں جو ان کی مدد کر سکتی ہوں...... صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط ثابت کر سکتی ہوں۔" اس نے اپنے شوہر سے کہا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ ایک فیملی کی حیثیت سے ہماری کوئی زندگی نہیں۔" ہیرٹ نے بھی غصے سے کہا تھا اور پھر بات بڑھ گئی تھی ہیرٹ نے دھمکی دے دی تھی کہ وہ اس زندگی کو خیر باد کہہ دے ورنہ اس کا گھر برباد ہو جائے گا اور پھر ہوا بھی یہی تھا وہ اسے چھوڑ گیا تھا لیکن وہ سوچتی تھی کہ جو بھی ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے وہ پچھلے دس سال سے ان ارواح کی مدد کر رہی تھی جو دن رات بھٹک رہی تھیں جن کے ساتھ ظلم ہوا تھا ہیرٹ نے دوسری شادی کر لی تھی اور زمین اپنے محور کے گرد گھوم رہی تھی۔

رات کے دس بجنے والے تھے جب ریکل اوپری

منزل میں اپنے کمرے میں سونے کے لیے گئی تھی اس نے شاور لیا تھا اپنے بستر میں گھس گئی تھی۔ کمرے میں ہیٹر نے زندگی بخش حرارت بکھیر دی تھی لیکن تیز ہوا کی چیخوں اور کھڑ کی چرچراہٹ نے اس کی آنکھوں سے نیند کو دور بھگا دیا تھا اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کوئی چاقو کی تیز نوک سے اس کی پشت پر کھرچ رہا ہے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی سامنے دیوار پر لگی ڈیجیٹل کلاک میں صبح کے تین بج رہے تھے وہ تیزی سے بستر سے اتر گئی کپڑے تبدیل کیے موٹے سوئٹر پہنے اور ہاتھ میں گن لے کر کمرے سے نکل گئی اسے خطرے کا احساس ہو رہا تھا' وہ احتیاط سے چلتی نیچے آئی تھی اور ہال میں پہنچنے پر اسے سامنے کا دروازہ چوپٹ کھلا ملا تھا جبکہ کچھ گھنٹوں پہلے وہ خود اسے لاک کر کے گئی تھی دروازے سے آتی ہوئی برف نے ہال میں بھی قبضہ جمالیا تھا اور اس برف پر اسے کسی کے قدموں کے نشان نظر آ رہے تھے اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا وہ سوچ رہی تھی کہ یہ کسی ان دیکھی ہستی کے پیروں کے نشان ہیں یا اس کے گھر میں کوئی مجرم آ گھسا ہے اس نے کئی کمروں میں چیک کیا کچن کی لائٹ آن کی لیکن کچھ نظر نہیں آیا کیونکہ لائٹ آن نہیں ہوئی تھی اندھیرا اسی طرح چھایا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ گھر کے باہر آئی جہاں اس کی وائٹ امپالا پر برف جمی ہوئی تھی دور دور تک کوئی نہیں تھا وہ واپس گھر میں آ گئی تب ہی اسے محسوس ہوا جیسے اس کے قریب سے کوئی تیزی سے گزرا ہو اور باہر کی طرف گیا ہو وہ ایک بار پھر باہر کی طرف مڑی اور تب ہی اس نے اپنے سامنے پڑی برف پر قدموں کے نشان محسوس کیے جو سامنے کے لان کی طرف جا رہے تھے پھر وہ ایک جگہ رک گئے تھے یہ ننگے قدموں کے نشان تھے لیکن کوئی نظر نہیں آ رہا تھا پھر ریکل نے ایک قدم پیچھے ہٹایا تھا تو سامنے برف پر بھی ایک قدم اس کی سمت بڑھا تھا اور ایک سایہ سا نمودار ہوا تھا۔

''ون؟'' ریکل نے کہا اور اسی وقت اس کی پشت پر موجود بیرونی دروازہ زور سے بند ہو گیا......وہ تیزی سے دروازے کے قریب گئی اور اس کو کھولنے کی کوشش کرنے لگی لیکن وہ لاک ہو چکا تھا وہ واپس مڑی اب برف پر بننے والے قدموں کے نشان اس سے صرف چند قدم کے فاصلے تک آ کر رک گئے تھے۔

''اسے کھولو۔'' ریکل نے کہا لیکن قدموں کے نشان اپنی جگہ پر جوں کے توں رہے وہ جو بھی کوئی تھا خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''صرف ایک میں ہی ہوں جو تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔'' ریکل نے کہا۔ ''تم جو بھی ہو کیا یہ چاہتے ہو کہ میں سردی میں اکڑ کے مر جاؤں؟''

قدم واپس لان کی طرف جانے لگے تھے ریکل نے بھی ان کا تعاقب شروع کر دیا اس کے ہاتھ اب بھی مضبوطی سے اپنی گن تھامے ہوئے تھے لان میں پہنچ کر قدموں کے نشان ایک جگہ رک گئے تھے اور پھر برف پر ایسے نشان بننے لگے تھے جیسے کوئی کسی چھڑی سے کچھ بنا رہا ہو کچھ دیر میں برف پر ایک گھر کا نقشہ بنا ہوا تھا جس میں کھڑکیاں' دروازے' دیواریں' چھت سب تھا شروع میں وہ ایک بچے کی ڈرائنگ کی طرح سادہ سی تصویر تھی لیکن پھر وہ بہتر سے بہترین ہوتی چلی گئی تھی اس میں دوسری منزل کا اضافہ ہوا تھا ایک پورچ بھی تھا۔ گاڑی کھڑی کرنے کے لیے چھت سے ڈھکا ڈرائیو وے تھا' چمنیاں تھیں اور بہت کچھ چند ہی لمحوں بعد ریکل کے سامنے ایک بہترین تصویر بنی ہوئی تھی یہ ایک دو منزلہ گھر تھا جسے چاروں طرف سے درختوں نے گھیرا ہوا تھا۔

''کیا یہ تمہارا گھر ہے؟'' ریکل نے پوچھا اور اسی وقت اس کے سامنے نمبر ون ظاہر ہوا وہ کراہ رہا تھا اور اس کے گولی کے زخم سے خون بہہ کر برف پر گر رہا تھا برف پر الٹی ترچھی لکیریں بن رہی تھیں لیکن کوئی واضح لفظ نظر نہیں آ رہا تھا جسے وہ کچھ لکھنا چاہتا ہو لیکن لکھنا نہ جانتا ہو۔

''تم کتنے عرصے قید رہے؟'' ریکل نے پوچھا لیکن اس کے سامنے موجود سایہ منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتا رہا وہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بول نہیں پا رہا تھا پھر گھر کا بیرونی دروازہ خود بخود کھل گیا تھا وہ دروازے کی طرف بڑھی اور جب پلٹ کر دیکھا تو نمبر ون غائب ہو گیا تھا ریکل نے جلدی سے اپنا سیل فون نکالا اور برف پر بنی ہوئی تصویر کے کئی شاٹس لے لیے اس کے بعد اس نے پیک کو فون ملایا۔

''کیا؟'' پیک کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مجھے کچھ ایسا ملا ہے جس سے ہم اپنی تحقیقات آگے

بڑھا سکتے ہیں۔'' ریگل نے کہا۔

''صبح کے ساڑھے تین بجے؟'' پیک نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ جنگل میں بنا ایک دومنزلہ گھر ہے جہاں نمبر ون کو قید رکھا گیا میں تمہیں تصویریں بھیجتی ہوں۔'' ریگل نے کہا اور تصویریں بھیج دیں۔

''یہ تو برف نظر آرہی ہے۔'' پیک نے کہا۔

''ہاں؟'' ریگل نے کہا اور دوڑ کر اپنا رائٹنگ پیڈ اور پنسل لے آئی پھر اس نے برف پر اپنی تصویر کو دیکھ کر پیڈ پر تصویر بنائی تھی۔

''تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' پیک نے پوچھا۔

''ہاں۔'' ریگل نے کہا ساتھ ہی اس نے اپنی بنائی ہوئی ایک تصویر پیک کو بھیجی تھی۔

''یہ وہ گھر ہے۔''

''اگر ہم میک کونل کو اپنی بات سمجھا سکے اور وہ ہماری مدد کے لیے تیار ہو گیا تو ہم اس کو بنیاد بنا کر آگے کام کر سکتے ہیں۔'' پیک نے کہا۔ ''کل دیکھتے ہیں۔''

''ہاں...... اس وقت تو بات کرنا مناسب نہیں ہے۔'' ریگل نے کہا۔

''لیکن مجھے کال کرنا؟ یہ مناسب ہے؟'' پیک نے ہنستے ہوئے کہا۔

''شب بخیر پیک۔'' ریگل نے کہا۔

''شب بخیر ریگل۔''

ریگل واپس گھر میں آ گئی تھی وہ آرام کرنا چاہتی تھی وہ پھر بستر پر لیٹ گئی اور تصور میں اس گھر کو دیکھنے لگی جس کی تصویر اس نے برف پر سے اتاری تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خود بھی کبھی وہاں گئی ہو یا وہ اس کا گھر رہا ہو......!

دوسرے روز وہ سب سے پہلے پولیس اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ اس نے اپنی چند کیسوں کی فائلیں چیک کی تھیں' آٹھ بجے کے قریب پیک بھی آ گیا تھا اس کے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اس نے نیوی بلو کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا وہ اس کے سامنے رکھی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔

''میک کونل سے بات کرنے کے لیے تیار ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں' میں تم سے اس کے آفس میں ملوں گی۔'' ریگل نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

ریگل نے میک کونل کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی اور اندر داخل ہو گئی تھی کونل کے آفس میں اس کی فیملی کی تصویر اس کی میز پر رکھی ہوئی تھیں زیادہ تصویریں اس کے بیٹے کی تھیں جو سوسر کھیلتے ہوئے لی گئی تھیں' کونل اس وقت کافی پی رہا تھا۔

''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں اور پیک جنگل میں ایک ایسے کیبن یا گھر کو ڈھونڈنا چاہتے ہیں جہاں مجرم نے نمبر ون کو قید کیا ہوا تھا؟'' ریگل نے کہا۔

''تمہارے خیال میں اسے اس علاقے میں کیوں قیدی رکھا گیا تھا؟'' کونل نے پوچھا جس کے جواب میں ریگل کو پوری تفصیل بتانا تھی اور اسے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے الجھن ہوتی تھی کوئی شاید ہی اس پر یقین کرتا چنانچہ اس نے بات بدل دی۔

''ہم نہیں جانتے کہ وہ وہاں تھا یا نہیں لیکن ہمیں اس کی پروفائل مکمل کرنے کے لیے معلومات تو درکار ہیں۔'' ریگل نے کہا۔

''ہم علاقے میں موجود' کیبن' گھر' ٹریلرز اور تالاب کے قریب بنی عمارتیں چیک کرنا چاہتے ہیں شاید وہاں سے ہمیں کوئی معلومات مل سکیں۔''

''ہوں......تو تم کیا مدد چاہتی ہو؟''

''میرا خیال ہے ایک فضائی جائزہ صحیح رہے گا۔'' ریگل نے کہا۔

''تو تم ......طوفان آنے سے پہلے ہیلی کوپٹر استعمال کرنا چاہتی ہو؟''

''ہاں......ایسا ہی ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن میں اس کی اجازت تمہیں صرف اس لیے دے رہا ہوں کہ تم دونوں میرے پسندیدہ سراغرساں ہو۔'' اس کا اشارہ پیک کی طرف بھی تھا۔

''ہم آپ کے پسندیدہ نہیں بلکہ صرف ہم دو ہی آپ کے سراغرساں ہیں۔'' ریگل نے ناگواری سے کہا۔

''بہرحال میرے ہیلی کاپٹر کا ایندھن خواہ مخواہ ضائع

مت کرنا کیونکہ اس کا بل ریاست مجھے آسانی سے ادا نہیں کرتی ہے۔"
"شکریہ لیفٹیننٹ۔" ریکل نے کہا اور اس کے کمرے سے نکل گئی۔
کچھ ہی دیر بعد ریکل اور پیک ہیلی کاپٹر میں موجود تھے انہوں نے ہیڈ فونز لگائے ہوئے تھے اور وہ پائی لینڈ پر پرواز کرر ہا تھا۔ جہاں جہاں تک نظر کام کر رہی تھی بڑے بڑے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے تھے اور ان پر موجود درختوں پر برف کی چادر بچھی تھی برف سورج کی کرنوں سے سونے کی طرح چمک رہی تھی ریکل کو علاقے کی خوبصورتی نے بہت متاثر کیا تھا اس نے اپنے علاقے کی خوبصورتی کو بھی اوپر سے نہیں دیکھا تھا ان کا ہیلی کاپٹر برف سے ڈھکے درختوں، جمے ہوئے آبشاروں، چمکتی ہوئی جھیلوں اور جنگل سے گزرتی ہوئی بے شمار سڑکوں کے اوپر پرواز کرر ہا تھا۔
ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے پرواز کچھ نیچے کرنا شروع کیا وہ اس تالاب کے اوپر پرواز کرر ہا تھا جہاں سے نمبرون کی لاش ملی تھی اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر وہ سڑک تھی جہاں نمبرون نے ٹرک سے نیچے چھلانگ لگائی تھی جب ہیلی کاپٹر دوسرا چکر لگا رہا تھا اسی علاقے میں کچھ فاصلے پر ویسا ہی دو منزلہ گھر بنا ہوا تھا جیسا ریکل نے اس تصویر میں دیکھا تھا جو نمبرون نے برف پر بنائی تھی۔
"وہ......وہ دیکھو پیک۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے پیک کی توجہ اس گھر کی طرف کرائی تھی اور پیک نے پائلٹ سے اس گھر کی سامنے کی کھلی جگہ میں ہیلی کاپٹر اتارنے کے لیے کہا تھا گھر کی تعمیر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بہت پرانا ہے دیواروں پر جگہ جگہ سے پلاسٹر اکھڑ چکا تھا دروازہ لاک تھا کچھ کھڑکیاں کھلی تھیں جن سے اندر کا منظر نظر آ رہا تھا گھر کے بیرونی دروازے سے گزر کر ریکل اور پیک گھر کے پچھلی طرف چلے گئے تھے جہاں دور دور تک پھیلی برف میں جگہ جگہ برف کے ڈھیریوں بنے ہوئے تھے جیسے کسی نے ہاتھوں سے انہیں وہاں جمع کیا ہو اب سورج کی روشنی پڑنے سے وہ آہستہ آہستہ پگھل رہے تھے ریکل کو زمین پر ایک جگہ برف پھسلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اس نے بغور دیکھا پھر وہاں ایک شکل سی ابھرنے لگی ریکل نے پیک کی طرف دیکھا وہ بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا لیکن زمین پر ابھرنے والی شکل اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔
"ون......؟" ریکل نے پوچھا انداز ایسا ہی تھا جیسے خود سے ہمکلام ہو۔
پھر اس کی آنکھوں کی سامنے وہی بیس سالہ جسم ابھرا تھا جواب تک بار بار اسے نظر آ تار ہا تھا وہ ریکل کی طرف ہی دیکھ رہا تھا اس کے دانت کھلے ہوئے تھے اور کٹی ہوئی زبان نظر آ رہی تھی وہ اپنے ہاتھوں کا سہارا لیے بغیر اٹھا اب وہ بیٹھ گیا تھا' پیک اس جگہ بغور دیکھ رہا تھا جہاں ریکل کی توجہ تھی لیکن اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا پھر نمبرون اپنے ہاتھوں اور پیروں پر اچھلا تھا بالکل کسی جانور کی طرح اس کے منہ سے غراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں ریکل اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔
"ریکل؟" پیک نے اسے آواز دی لیکن ریکل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس کی ساری توجہ نمبرون کی طرف تھی جو چاروں ہاتھوں پیروں سے اچھلتا ہوا گھر کے پچھلے برآمدے کی طرف جا رہا تھا ریکل تیزی سے اس کے تعاقب میں دوڑی تھی اور پیک ریکل کے پیچھے بڑھا تھا۔
پچھلے برآمدے میں لکڑی کے کئی ستونوں سے لوہے کی موٹی زنجیریں بندھی ہوئی تھیں ان کے بولٹ اتنے مضبوطی سے لگے تھے جنہیں کسی چیز کی مدد کے بغیر کھولا نہیں جا سکتا تھا وہاں جا کر نمبرون غائب ہو گیا تھا برآمدے کے لکڑی کے فرش پر کچھ کھرونچوں کے نشانات نظر آ رہے تھے جیسے وہاں کسی کو گھسیٹا گیا ہو اس کے علاوہ وہاں بہت سی فٹ بال کی گیندیں بھی موجود تھیں۔
"میرا خیال ہے ہمیں آفس فون کر دینا چاہیے۔" ریکل نے کہا اور پھر اس نے میک کونل کو فون کر کے ساری صورت حال بتائی تھی کچھ ہی دیر میں پولیس کی گاڑیاں وہاں پہنچ گئی تھیں انہوں نے گھر کے دروازے کھولے تھے اور ساری گھر کی تلاشی لی تھی کئی کمروں میں بیڈز موجود تھے فرج میں کھانے پینے کا سامان تھا جو خراب ہو چکا تھا ایک کمرے میں ریکل کو کچھ لکڑی کے بکس نظر آئے جن میں کچھ فائلیں اور کاغذات رکھے تھے اس نے انہیں چیک کرنا شروع کیا ایک بکس میں سے اسے دو ڈرائیونگ لائسنس ملے یہ بکس ایک بیڈ کے نیچے رکھا تھا کسی نے ان پر سے نام کھرچ کر مٹا دیئے تھے اس کے علاوہ ایڈریس اور لائسنس

نمبر بھی مٹا دیئے گئے تھے اس میں لگی تصویروں کی آنکھیں کھرچ دی گئی تھیں ایک تصویر کسی عورت کی تھی جو خاصی خوبصورت تھی اس کے بال بھی سرخی مائل سنہری تھے دوسرا لائسنس کسی مرد کا تھا جس کے بال اخروٹی رنگت کے تھے ریکل یقین سے کہہ سکتی تھی کہ دونوں لائسنسوں پر ایک ہی ایڈریس لکھا ہوا ہوگا کیونکہ دونوں میں ایک ہی سائز کی جگہ سے ایڈریس کھرچا گیا تھا اور دونوں میں لکھے گئے نام کا آخری حصہ بھی ایک سائز کی جگہ میں رہا ہوگا جو کھرچی ہوئی تھی۔

''میرا خیال ہے یہ ایک ہی جوڑا ہوگا۔'' ریکل نے لائسنس پیک کو دکھاتے ہوئے کہا اور پیک نے اس کے ہاتھ سے لائسنس لے کر بغور دیکھے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''شاید نمبرون کے پیچھے جانے والے کو زیادہ وقت نہیں مل سکا تھا۔'' ریکل نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں اور یہ ہمارے حق میں بہتر ہوسکتا ہے۔'' پیک نے دونوں لائسنس اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

گھر کی تلاشی ختم ہونے کے بعد وہ واپس آگئے تھے ریکل کام کو التوا میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی چنانچہ اس نے آفس پہنچتے ہی دونوں لائسنس اسکین کیے تھے ریکارڈ روم کو بھیج دیا تھا جنہوں نے اپنے ڈیٹا بیس کو بھیج دیا تھا اور ریکل ان تصاویر کا جائزہ لینے لگی تھی جو انہیں موقع واردات سے ملے تھے۔

''قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کررہی ہو؟'' ریکل کو پشت کی سمت سے آواز آئی تو اس نے مڑ کر دیکھا اس کے سامنے میک کونل کھڑا تھا۔

''اس گھر میں 1983ء میں کچھ اموات ہوئی تھیں پھر 2000ء میں بھی کچھ جرائم ہوئے۔'' ریکل نے کہا۔

''جو کوئی بھی ذمہ دار ہو اسے جرم کی سزا ملنا ہی چاہیے۔'' کونل نے کہا۔

''اس سلسلے میں تم مجھ پر بھروسہ کرسکتے ہو۔'' ریکل نے جواب دیا۔

''ہاں...... میں جانتا ہوں...... مجھے تم پر بھروسہ ہے۔'' کونل نے مسکراتے ہوئے کہا اسی وقت فون کی گھنٹی بجی ریکل نے ریسیور اٹھایا اور پھر اپنی نوٹ بک پہ ملنے والی معلومات لکھنے لگی کال ختم ہونے کے بعد اس نے پیک کی سیٹ کی طرف دیکھا وہ ہیڈ فون لگائے بیٹھا تھا اور کسی کرائم رپورٹ کو چیک کررہا تھا' اس کے سامنے رکھی اس کی کافی ٹھنڈی ہوچکی تھی۔

ریکل اس کے قریب رکھی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی اور نوٹ بک پر لکھی ہوئی معلومات پڑھ کر پیک کو سنانے لگی۔

''وہ شادی شدہ جوڑا تھا...... ان کا نام راجر اور حنا ٹیفٹ تھا ان کا تعلق میری لینڈ سے تھا 1990ء میں ان کی لاشیں ملی تھیں یہ انفارمیشن ڈیٹا بیس سے ملی ہیں۔'' ریکل نے کہا اور پیک نے اپنے کمپیوٹر پر اس کیس کے لیے ریسرچ کیا تو اس کے سامنے بہت سی تصاویر آگئیں ایک تصویر میں ایک کرین ایک اسٹیشن ویگن کو جھیل سے نکال رہی تھی اور قریب ہی کچھ پولیس آفیسرز کھڑے تھے' اگلی تصویر میں اسٹیشن ویگن کا دروازہ کھلا ہوا تھا راجر ٹیفٹ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا سر پیچھے کو ڈھلکا ہوا تھا اور حنا کا سر اس کے کاندھے سے ٹکا ہوا تھا اس کے پیٹ میں گولی کا سوراخ تھا۔

''پتہ کرتے ہیں...... اس جوڑے کے بچے لاپتہ ہوگئے تھے۔'' پیک نے ریکل سے کہا اور چند ہی لمحوں میں سات سالہ یوگی اور چھ سالہ وِنا ٹیفٹ کی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں اسکرین پر نظر آنے لگیں۔ لڑکی کو ریکل شناخت نہ کرسکی لیکن اس کے ساتھ موجود لڑکے کے اوپری جبڑے کے باہر نکلے دانت اس کے چہرے کے نقوش بالکل نمبرون سے ملتے تھے۔

''یہ 1992ء کی تصاویر ہیں مجھے یقین ہے تب سے ہی یہ کسی کی قید میں رہا ہوگا۔'' پیک نے کہا اور ریکل سوچنے لگی کہ یوگی ٹیفٹ یا نمبرون وہ جو بھی نام اسے دے میں لکھ اور بول نہیں سکتا تھا اس کی زبان کاٹ دی گئی تھی پتہ نہیں کتنا عرصہ پہلے وہ ایک گھر میں قید تھا جس کی کھڑکیاں بھی بند کردی گئی تھیں جہاں بہت سے بیڈز تھے وہ وہاں اکیلا نہیں تھا اسے نمبرون کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس ہوئی۔

''ابھی میرے ساتھ اس جھیل تک چلو جہاں انہیں ڈبو دیا گیا تھا۔'' ریکل نے کہا اور پھر پیک کے ساتھ وہ وہاں پہنچ گئی تھی سردی بڑھ گئی تھی اور برف گرنا شروع ہوگئی تھی۔

''آخر تم یہاں کیا ڈھونڈنے آئی ہو؟'' پیک نے پوچھا۔

''میں ٹیفٹ فیملی کو ڈھونڈنے آئی ہوں۔'' ریکل نے جواب دیا اور پیک غیر یقینی انداز سے اسے دیکھنے لگا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کا کیا جواب دے۔ ریکل نے جھیل کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا تھا اور وہ پانی میں جھانکتی جا رہی تھی پانی کسی آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔

''کم آن'' ریکل بڑبڑائی نہ جانے اسے کیوں امید تھی کہ بیس سالہ نمبر ون اسے یہاں ملنے ضرور آئے گا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ جھیل میں دور ایک چھوٹی کشتی تیر رہی تھی اس میں ایک بوڑھا ملاح موجود تھا' جس نے ریکل کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو ریکل نے اپنے منہ کے قریب اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اسے زور سے آواز دی اور اس نے چپوؤں کی مدد سے کشتی کو ریکل کی سمت بڑھایا چند ہی لمحوں میں وہ اس کے قریب آ گیا تھا اس بوڑھے نے اپنے گرم کپڑوں کے اوپر تیراکی کا لباس بھی پہنا ہوا تھا سر پر ایک بڑی سی چادر تھی جو اس نے سر کے گرد یوں لپیٹی ہوئی تھی کہ کاندھوں کو بھی ڈھک لیا تھا اس نے کشتی کو ریکل کے قریب کنارے سے لگایا تھا۔

''مجھے تمہاری یہ کشتی چاہیے۔'' ریکل نے اس کے بولنے سے پہلے اپنا بیج دکھا کر اس سے درخواست کی اور بوڑھے نے انہیں کشتی دے دی کچھ ہی دیر بعد ریکل اور پیک جھیل میں کشتی رانی کر رہے تھے اور ہلکی ہلکی برف باری بھی شروع ہو گئی تھی۔

''جب ہم یہ واقعہ میک کونل کو بتائیں گے تو بہت مزہ آئے گا۔'' پیک نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تم نے کبھی کسی سے مانگ کر کشتی نہیں چلائی؟ میرا خیال ہے تم پروفیشنل ہو اور اپنے کام سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی کبھی ایسی صورت حال کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔'' ریکل نے جواب دیا بوڑھا کنارے پر کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ریکل نے اس سے کشتی کس مقصد سے مانگی ہے۔

کچھ دیر بعد ریکل کو احساس ہوا جیسے پانی کے نیچے کوئی چیز حرکت کر رہی ہے وہ کسی عام مچھلی سے سائز میں بڑی تھی اس نے پیک کو اشارہ کیا کہ وہ حرکت نہ کرے۔

''کوئی غیر مرئی چیز ہے شاید۔'' اس نے زیر لب کہا اور پیک نے بھی پانی میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا پھر کشتی خود بخود ہچکولے لینے لگی تھی اور ریکل نے خود کو سنبھالا تھا۔

''تمہیں کچھ محسوس ہو رہا ہے؟'' اس نے پیک سے پوچھا لیکن پیک نے نفی میں سر ہلایا۔

''تھمب......'' اچانک ایک عجیب سی آواز آئی اور کشتی خود بخود سیدھے ہاتھ کی طرف مڑنے لگی۔ بالکل یوں جیسے کوئی اسے دھکا دے کر موڑ رہا ہو پھر ٹھنڈا پانی کشتی میں آ گیا تھا جو ریکل کے جوتوں سے ٹکرا رہا تھا اور ریکل پلکیں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھ رہی تھی پیک بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا کچھ ہی دیر میں کشتی پھر خشک ہو گئی تھی پھر اچانک ریکل نے دیکھا کہ پانی میں سے ایک دبلا پتلا ہاتھ بلند ہوا تھا اور اس نے کشتی کا کنارہ پکڑ لیا تھا اور وہ اسے ایک سمت میں کھینچ رہا تھا اور ریکل اس سے دور ہٹنے کی کوشش کر رہی تھی پھر دوسرا ہاتھ بھی پانی سے بلند ہوا تھا اور اس نے بھی کشتی کا کنارہ پکڑ لیا تھا پیک ریکل کی نظروں کے تعاقب میں اس سمت دیکھ رہا تھا جہاں ریکل کی ساری توجہ تھی۔

''کیا ہوا......؟ وہاں کیا ہے؟'' پیک نے پوچھا لیکن ریکل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اب وہ ہاتھ کشتی کے اندر آ گئے تھے اور سیٹ میں لگی لوہے کی پنی ٹانگوں کو پکڑ لیا تھا پھر یوں لگا تھا کہ کوئی ان دیکھی چیز کشتی میں سوار ہو گئی تھی جس کے صرف ہاتھ نظر آ رہے تھے اور اس کے ان دیکھے جسم سے پانی ٹپ ٹپ کر کشتی میں گر رہا تھا پھر آہستہ آہستہ اس کا جسم ریکل کو نظر آنے لگا تھا اس نے اپنا چہرہ ریکل کی طرف موڑا تھا وہ کوئی مرد تھا اس کے بال اخروٹی رنگ کے اور جبڑا چوکور تھا اور اس کی لمبی نیلی زبان اس کے جبڑے سے باہر لٹک رہی تھی اس نے پرل کلر کا سوئٹر پہنا ہوا تھا اور اپنا سر زور زور سے ہلا رہا تھا اس کی زبان سے نکلنے والے خون اور رال کی چھینٹیں ریکل کی جیکٹ پر گر رہی تھیں اور وہ اپنا خوف چھپا کر خود کو مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی طرح کشتی سے نکل کر کنارے پر پہنچ جائے پھر اچانک پانی میں

سے ایک عورت کا سر ابھرا تھا برف کے گالے جھیل میں گر رہے تھے اس عورت کے سر کے بال سرخی مائل تھے چہرہ خوبصورت تھا لیکن عمر زیادہ تھی اس کی آنکھیں کشادہ تھیں اور وہ پلکیں نہیں جھپک رہی تھی پیک نے محسوس کیا کہ اب ریکل کی توجہ کشتی اور جھیل کے درمیان ہے۔

''کتنے ہیں؟'' پیک نے پوچھا۔

''دو۔'' ریکل نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے یہ حنا اور راجر ٹیفٹ ہیں۔''

''ہماری مدد کرو۔'' پانی میں سے عورت نے سرگوشی کی جس کا سر باہر ابھرا ہوا تھا۔

عورت کے سر کے گرد کا پانی سرخ ہو رہا تھا جیسے اس کے سر میں نظر نہ آنے والا کوئی زخم ہو جس سے وہ رس رہا ہو عورت نے دوبارہ ریکل سے التجا کی اور اس بار ریکل کے سامنے کھڑے مرد نے اپنے سیدھے ہاتھ سے ریکل کے کاندھے کو پکڑ کر اسے کشتی سے باہر پانی میں دھکیلنے کی کوشش کی لیکن پیک کے بازو کی اس کے گرد گرفت نے اسے گرنے سے محفوظ رکھا پھر وہ شخص دوبارہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

''پرسکون رہو...... ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' ریکل نے سرگوشی کی وہ مرد اور عورت اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''جس شخص نے تمہیں مارا تھا اس نے ہی تمہارے بیٹے کو بھی مار دیا اور شاید تمہاری بیٹی بھی اس کے پاس ہو۔'' ریکل نے آہستہ آہستہ کہا اس کی بات پر عورت کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور وہ زور سے چیخی تھی اور کشتی میں موجود مرد نے کشتی کا کنارہ چھوڑ کر پانی میں چھلانگ لگا دی تھی لیکن اس کے پانی میں گرنے سے پانی بالکل بھی نہیں اچھلا تھا بس کچھ دیر کے لیے کشتی کانپی تھی عورت بھی آہستہ آہستہ پانی میں بیٹھتی جا رہی تھی۔

''حنا' رکو۔'' ریکل نے جلدی سے اسے مخاطب کیا ''اب بھی تمہیں انصاف مل سکتا ہے۔'' اس نے کہا۔ تو وہ ریکل کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں تمہارے قاتلوں کو ڈھونڈوں گی...... لیکن تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔'' ریکل نے کہا عورت خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے دکھاؤ...... وہ واقعہ کہاں ہوا تھا...... میں جاننا چاہتی ہوں۔'' ریکل نے کہا اور اس عورت نے پانی میں جاتے جاتے اس سڑک کا نام ریکل کو بتایا اور غائب ہو گئی اب اس جگہ پر برف کے ٹکڑے گر رہے تھے۔

''واپس چلو۔'' ریکل نے پیک سے کہا جو حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا؟'' اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''میں ان سے کچھ پوچھ رہی تھی۔''

'کیا؟ کوئی نئی بات پتہ چلی؟'' پیک نے پوچھا اسے ریکل کی خداداد صلاحیتوں پر یقین تھا وہ بہت سے موقعوں پر اپنی انہی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کئی کیس حل کر چکی تھی۔

جب ریکل اور پیک کنارے پر پہنچے تو بوڑھا ان کا منتظر تھا۔

''تم دونوں کیا ڈھونڈ رہے تھے۔'' اس نے پوچھا۔

''ان سے پوچھو۔'' پیک نے ریکل کی طرف اشارہ کیا۔

''بس کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔'' ریکل نے کہا۔

''کیا تمہیں کچھ ملا؟''

''ہاں شاید...... اپنا خیال رکھنا بہت بڑا برف کا طوفان آنے والا ہے۔'' ریکل نے کہا پھر وہ پیک کے ساتھ اس سڑک تک گئی تھی جس کا نام اسے عورت نے بتایا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب درخت کھڑے تھے ایک جانب درختوں کے ساتھ بڑے بڑے پہاڑ تھے اور دوسری جانب ڈھلان جہاں حفاظتی باڑ لگی ہوئی تھی اور برف سے ڈھکی سڑک دور تک چلی گئی تھی اچانک ریکل نے پیک کی توجہ سڑک کے درمیان کھڑے ہوئے راجر اور حنا کی طرف کرائی۔

''دیکھو...... وہاں...... شاید وہی حادثے کا مقام ہے۔'' ریکل نے کہا اور پیک نے اس کی بتائی ہوئی جگہ پر سڑک کے کنارے گاڑی روک دی پھر وہ ڈیش بورڈ ہیٹر کے سامنے اپنے ہاتھ سینکنے لگا تھا۔

''میرے ساتھ آ رہے ہو؟'' ریکل نے گاڑی سے اترتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' پیک نے اطمینان سے کہا ریکل دروازہ بند کر کے مرد اور عورت کی طرف بڑھ گئی تھی جن کے چہروں

پر کوئی تاثر نہیں تھا جو زندہ نظر آ رہے تھے لیکن سانس نہیں لے رہے تھے اس کے سیدھے ہاتھ پر حفاظتی ریلنگ تھی اور بائیں ہاتھ پر پہاڑوں کی چڑھائی اور عورت نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

''شوٹر۔'' عورت نے انگلی سے پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس حصے کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا وہاں بہت سے درخت لگے تھے اور جھاڑیاں بھی تھیں دن کے وقت تک وہاں چھپنے والے کو دیکھا جا سکتا تھا لیکن رات میں کوئی بھی وہاں چھپ کر سڑک پر نظر رکھ سکتا تھا۔

''اس شوٹر نے کیا کیا تھا؟'' ریکل نے پوچھا۔

''یہاں گاڑی پارک کی۔'' اس نے ریکل کی پشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور راجر کو قتل کیا...... مجھے قتل کیا......'' عورت نے آہستہ آہستہ کہا۔

''اور ونا اور یوگی کا تعاقب کیا......'' عورت نے ڈھلان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم نے قاتل کا چہرہ دیکھا تھا؟'' ریکل نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''اس کی گاڑی کیسی تھی؟'' ریکل نے پوچھا۔

''بوکس ٹرک۔'' عورت نے کہا اور ریکل نے لکھنے کے لیے اپنی نوٹ بک اور قلم نکالا اسی ایک لمحے میں جب ریکل نے آنکھیں جھپکیں تو اسے وہی منظر نظر آیا جو اس نے سرد خانے میں دیکھا تھا جس میں نمبرون نے خود کو ٹرک کے پیچھے چھپا لیا تھا اس نے سوچا شاید حنا بھی اسی ٹرک کا ذکر کر رہی ہو بہت سے سیریل کلرز کوئی ایسی عادت رکھتے ہیں جو ہر جرم میں نظر آتی ہے چنانچہ اس کی توقع کی جا سکتی تھی۔

''لائسنس پلیٹ۔'' ریکل نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کون سا ماڈل تھا؟'' ریکل نے پوچھا اس بار مرد نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن وہ الفاظ صاف ادا نہیں کر سکا۔

''فورڈ۔'' عورت نے بتایا ریکل نے اتنی ہی معلومات کو غنیمت جانا اور واپس اپنی گاڑی کی طرف مڑ گئی۔

''وہ فورڈ ٹرک تھا۔'' ریکل نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ حادثہ 1992ء میں ہوا تھا چنانچہ اس علاقے میں کسی فورڈ ٹرک کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس ریکارڈ میں چیک کرنا چاہیے۔'' پیک نے کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو۔'' ریکل نے کہا اور پیک نے اسی وقت پولیس اسٹیشن سے رابطہ کر کے ٹرک کے بارے میں تفصیل بتائی اور سرچ کرنے کے لیے کہا پھر واپسی پر وہ ایک ریستوران میں شام کا ناشتہ کرنے کے لیے رک گئے تھے اور وہیں ریکل کو اسٹیشن سے کال آئی تھی۔

''ٹرک کا پتہ چل گیا ہے' ہارس کیو روڈ پر ایک 1990ء کا فورڈ ٹرک ملا ہے کیا ہم تحقیقات کریں؟''

''نہیں...... تم اس سے فاصلے پر رہو...... ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس کا مالک کہاں چھپا ہوا ہے؟'' ریکل نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''ہم آ رہے ہیں۔'' ریکل نے اٹھتے ہوئے کہا پھر پیک اور ریکل ریستوران سے نکل گئے تھے۔ ہارس کیو زیادہ دور نہیں تھا وہ جائے وقوع پر پہنچ گئے تھے اور اس پولیس آفیسر کو واپس بھیج دیا تھا جس نے انہیں اطلاع دی تھی اور وہاں سے خود آگے جانے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ ان کے خیال میں پولیس کار کے مقابلے میں ان کی پرائیویٹ کار زیادہ محفوظ تھی کچھ ہی فاصلے پر انہیں وہ بوکس ٹرک نظر آ گیا تھا اور انہوں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا تھا اس کی رفتار بہت تیز تھی اس کی باڈی سفید اور نیلے رنگ کی تھی اور جگہ جگہ زنگ لگی ہوئی تھی اس کے سامنے کا حصہ ایک نارمل فورڈ پک اپ جیسا تھا پیک نے تعاقب کرتے ہوئے اس سے خاصا فاصلہ رکھا تھا اور ریکل نے اس کا لائسنس پلیٹ نمبر اتار لیا تھا' ٹرک پر جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی اور اس کے ونڈ اسکرین کے وائپرز چل رہے تھے جو اسکرین سے برف صاف کر رہے تھے برف کی تہ دبیز ہوتی جا رہی تھی اور تیز ہوا سیٹیاں بجاتی چل رہی تھی۔ ٹرک ہچکولے لیتا پہاڑی کی چڑھائی چڑھ رہا تھا۔

''اس موسم میں اس شخص کو بھی ڈرائیونگ کرنے میں مشکل ہو رہی ہو گی۔'' پیک نے کہا۔

''اگر اس کے پاس ونا ابھی تک ہے تو ہمیں پتہ

کرنا ہوگا کہ اس نے اسے کہاں چھپایا ہوا ہے؟'' ریکل نے کہا۔

''چار ہزار فیٹ کی بلندی پر اتنے سخت برفانی طوفان میں ڈرائیونگ کرنا آسان نہیں ہے۔'' پیک نے پھر کہا۔ میرا خیال ہے پینتالیس منٹ میں اندھیرا چھا جائے گا اور پہاڑی کی چوٹی بھی قریب آ گئی ہے۔''

ایک موڑ پر ٹرک ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا اور ریکل کو خطرے کا احساس ہونے لگا تھا پھر جیسے ہی پیک نے گاڑی کو موڑا تھا وہ کسی چیز سے ٹکرایا تھا وہ ٹرک ہی تھا پھر وہ تیزی سے روڈ پر دوڑنے لگا تھا۔

''اس نے ہمیں کب دیکھ لیا؟'' ریکل نے حیرت سے کہا۔

''میرا خیال ہے اسے شروع ہی سے ہماری موجودگی کا علم تھا۔ ممکن ہے وہ ہمیں خود اپنے پیچھے لگا کر لایا ہو اب تو اس کا تعاقب ہی کرنا ہے۔'' پیک نے کہا اور ریکل نے اثبات میں سر ہلایا روڈ پر برف کی تہہ دبیز ہوگئی تھی اور گاڑی اس پر چلنے کے ساتھ ساتھ پھسل رہی تھی۔

□......□......□

''سراغرساں ریکل' میں ان تمام ڈیوٹی پر موجود یونٹس سے درخواست کر رہی ہوں جو مجھے سن رہے ہیں۔'' ریکل ڈیش بورڈ ریڈیو سے بات کر رہی تھی۔ ''ہم ایک مجرم کا تعاقب کر رہے ہیں جو مسلح ہے اور بہت خطرناک ہے۔'' ریکل نے کہا اور تیزی سے چڑھائی چڑھتی ہوئی گاڑی کے ٹائرز ور سے چرچرائے۔

''سوری ریکل' آپ کو اس وقت صرف زمینی یونٹس کی مدد ہی دی جاسکتی ہے کیونکہ اس وقت برفانی طوفان شدید ہے اور ہیلی کاپٹر اس میں پرواز نہیں کرسکتا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ریکل کو اندازہ تھا کہ اسے یہی جواب ملے گا کیونکہ طوفان بہت شدید تھا۔

''کچھ اسکائنڈ گاڑیاں آپ کی مدد کے لیے آرہی ہیں آپ اپنے ٹارگٹ پر نظر رکھیں۔'' اسے ہدایت ملی۔

''وہ میری نظروں کے سامنے ہے۔'' ریکل نے جواب دیا اور ریڈیو واپس رکھ دیا ٹرک سے ان کا فاصلہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا کیونکہ اس نے رفتار بڑھادی تھی۔

''اوہو پیک کیا تم اور زیادہ تیز نہیں چلاسکتے؟'' اس نے پیک کو ٹوکا تو اس نے مزید رفتار بڑھادی۔ گاڑی کے ونڈ اسکرین پر برف کی تہہ موٹی ہوگئی تھی اور وائپرز کام نہیں کر پار ہے تھے سامنے کا منظر دھندلا گیا تھا اور اب ٹرک کی پچھلی لائٹس کی روشنی ہی میں وہ اس کا تعاقب کر رہے تھے۔

''اوہ خدایا۔'' پیک کے منہ سے اچانک نکلا کیونکہ ٹرک سے ان کا فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا اور ان کے ٹکرانے کا خطرہ تھا ریکل کو اپنے چاروں طرف سے خطرہ اپنی طرف آتا محسوس ہو رہا تھا یا اسے خطرے کی وارننگ مل رہی تھی۔

ٹرک کے بریک چرچرائے لیکن چالیس ہزار پاؤنڈ اٹھارہ پہیوں والا ٹرک ان کی چھوٹی سی امپالہ کے قریب سے قریب تک آتا جا رہا تھا پیک نے تیزی سے اسٹیئرنگ وہیل گھمایا اور امپالہ سیدھے ہاتھ پر پہاڑی کی چڑھائی سے ٹکرائی پھر پیچھے کو لڑھکی اور ٹرک ٹکر مارتا ہوا آگے نکل گیا کار کا پچھلا بمپر ٹوٹ کر گر گیا ریکل نے پچھلے آئینے میں دیکھا ٹرک تیزی سے آگے بڑھ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا' ٹکر بہت شدید تھی پیک کے سر سے خون بہہ رہا تھا شاید اسے شدید چوٹ آئی تھی لیکن اس نے گاڑی سنبھال کر پھر ٹرک کا پیچھا شروع کر دیا تھا وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے تھے اور انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کیونکہ یہاں پر روڈ کافی ہموار تھا ٹرک انہیں تیس فٹ کے فاصلے پر نظر آرہا تھا پھر اس کی اگلی کھڑکی کا شیشہ کھلا تھا اور ریکل خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی سے لمبی نال والے ریوالور کی نال نظر آرہی تھی اور اس کا رخ پیک اور ریکل کی طرف تھا۔ ریکل کو اپنے جسم میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہوئیں اور پیک بھی اپنی سیٹ پر ایک سمت کو جھک کر بیٹھ گیا۔

''بوووم'' ایک زوردار آواز کے ساتھ ریوالور سے سفید شعلہ نکلا اور پیک کے سائیڈ کا شیشہ کرچیوں میں بکھر گیا' پیک نے اس حملے سے بچنے کے لیے گاڑی کو ایک سمت موڑا تھا اور ایک بار پھر پہاڑی سے ٹکرایا تھا۔

''ریکل ہوشیار رہنا...... یہ کوئی موقع چھوڑے گا نہیں......'' پیک نے تنبیہہ کی اور اسی وقت دوسرا فائر ہوا اس بار ان کے ونڈ شیلڈ میں ایک بڑا سوراخ ہوگیا تھا

گولی پیک اور ریکل کے درمیان سے نکلتی ہوئی پچھلے شیشے سے باہر نکل گئی تھی پیک اور ریکل نے اپنے سر دوسری سمت میں جھکا لیے تھے اب سامنے کے شیشے کے سوراخ سے ٹھنڈی یخ ہوا اندر آ رہی تھی۔

''اس شخص کا نشانہ ہم دونوں ہیں۔'' ریکل نے کہا۔

''ہاں' تمہیں اس کا جواب دینا ہوگا۔'' پیک نے کہا اور ریکل نے اپنا پستول نکالا اسی وقت ایک اور فائر ہوا اور پیک کا سر زور سے ڈیش بورڈ سے ٹکرایا ریکل نے خود کو قابو رکھتے ہوئے اگلی کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا تھا اور اپنا پستول والا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالا تھا سرد اور تیز ہوا دستانوں اور جیکٹ کے باوجود اس کے جسم میں گھس رہی تھی اس نے تیزی سے کئی فائر کیے تھے لیکن کوئی بھی نشانے پر نہیں لگا تھا۔

''مجھے اس کا کلیئر نشانہ لینا ہوگا۔'' ریکل نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا اور اپنی سیٹ بیلٹ کھول دی پھر اس نے اپنا آدھا دھڑ گاڑی سے باہر نکالا تھا اس وقت دونوں گاڑیاں ایک پہاڑی موڑ مڑ رہی تھیں اور ریکل کے کانوں میں تیز ہوا کی سیٹیاں سنائی دے رہی تھیں اوپر سے گرتی ہوئی برف اس کی الٹی آنکھ میں چلی گئی تھی ریکل نے اس طرح ٹرک کے ٹائر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا تھا اور بوکس ٹرک کے پچھلے ٹائر سے ایک بڑا ربڑ کا ٹکڑا ٹوٹ کر دور جا گرا تھا۔ ٹرک ڈرائیور ٹرک کا بیلنس درست رکھنے کے لیے اسے کبھی سیدھے ہاتھ اور کبھی الٹے ہاتھ کی طرف گھما رہا تھا ریکل نے پھر کئی فائر کیے تھے لیکن وہ خطا ہو گئے تھے۔ ٹرک ڈرائیور نے پھر فائر کیا تھا اس بار امپالا کی ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ گئی تھی پیک نے کار کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی اور بائیں جانب لگی روڈ کی حفاظتی ریلنگ سے ٹکرایا تھا اور ریکل اس جھٹکے سے کار سے باہر گرتے گرتے بچی تھی اس نے جلدی سے خود کو سنبھالا تھا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی برف اس کی ناک' منہ اور بھنوؤں پر جم گئی تھی اور وہ سردی سے کانپ رہی تھی اس کا چہرہ سن ہو چکا تھا اس نے غصے سے پیک کی طرف دیکھا تھا اور ڈیش بورڈ ریڈیو اٹھا کر چیخی تھی۔

''ہمیں فوراً مدد چاہیے۔''

''طوفان بہت شدید ہے ریکل...... اور ہماری ایک کار راستے میں کھائی میں لڑھک گئی ہے' ہمارا مشورہ ہے کہ تم دشمن سے تھوڑا فاصلہ رکھو...... ہم جلد ہی پہنچ جائیں گے۔''

''نہیں...... ہم اسے کھونا نہیں چاہتے۔'' ریکل نے غصے سے کہا اور ریڈیو واپس رکھ دیا وہ لڑھک کر نیچے گرا تھا اور اس کے قدموں میں جھولنے لگا تھا اسی وقت ایک موڑ آیا تھا اور ٹرک نے بریک لگائے تھے۔

''ریکل۔'' پیک نے اسے خبردار کرنے کے لیے آواز لگائی اور اسی وقت امپالا ٹرک کی پچھلی سائڈ سے ٹکرائی' ریکل نے فوراً اپنے بازو اپنے چہرے کے آگے کر لیے تھے اور وہ ڈیش بورڈ سے ٹکرائی تھی۔ اس کی زبان اس کے دانتوں میں آ کر کٹ گئی تھی اور منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا پیک کار کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بار بار روڈ کی ریلنگ سے ٹکرا رہی تھی۔

ٹرک ڈرائیور نے ایک بار پھر اپنی کھڑکی سے ریکل کا نشانہ لیا لیکن ریکل نے ایک سیکنڈ میں صورت حال بھانپ کر اس پر فائر کر دیا ٹرک کا ایک پچھلا ٹائر ٹرک سے الگ ہو گیا اور وہ ہچکولے لینے لگا اسی وقت ٹرک ڈرائیور نے بھی فائر کیا لیکن اس بار اس کا نشانہ خطا ہو گیا تھا اب ٹرک روڈ ریلنگ کے ساتھ ٹکراتا چل رہا تھا جس سے تیز شور پیدا ہو رہا تھا پھر وہ ڈھلان میں لڑھکتا چلا گیا تھا ایک تیز دھما کا سنائی دیا تھا اور ٹرک نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

پیک نے اپنی گاڑی کو بریک لگائے تھے اور گاڑی تقریباً دس قدم آگے جا کر رکی تھی۔ ریکل نے خود کو سنبھالا تھا اور روڈ پر منہ سے نکلنے والا خون تھوک دیا تھا اس کے گال سے بھی خون رس کر اس کے اسکارف پر گر رہا تھا اس نے ہتھیلی سے مسل کر گال صاف کر دیا' پیک نے گہری سانس لی تھی اور اپنی سردی سے اکڑی ہوئی انگلیاں بہ مشکل اسٹیئرنگ وہیل سے آزاد کی تھیں اس کے کاندھوں میں بھی درد ہو رہا تھا اس نے ریکل کے گھٹنے پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تھی اور پھر گاڑی سے اتر گیا تھا پھر اس نے اپنی جیب سے اپنا پستول نکالا تھا اور اس سمت بڑھا تھا جہاں سے ٹرک نیچے گرا تھا ریکل نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کی تھیں پھر اپنے سامنے لٹکتا ہوا ریڈیو مائیک اٹھایا تھا اور اپنے ساتھیوں کو اپنا محل وقوع سمجھا کر اپنی پستول کے ساتھ گاڑی سے باہر آ گئی تھی اور پیک کی طرف بڑھی تھی۔

طوفان میں کافی کمی آچکی تھی پیک اور ریکل نے ہاتھوں میں پستول سنبھالے نیچے جھانکا تھا باکس ٹرک تقریباً بیس گز نیچے چھوٹے درختوں کے جھنڈ میں اٹکا ہوا تھا پیک نے بہت احتیاط سے آہستہ آہستہ نیچے اترنا شروع کیا تھا ریکل اس کے پیچھے تھی ہر طرف خاموشی تھی صرف ان کے دل کی دھڑکنیں اور ان کے جوتوں کی آواز ہی انہیں سنائی دے رہی تھی یا پھر ٹرک کے دھواں اگلتے انجن کی ہلکی سی آواز تھی۔ جب وہ ٹرک کے سامنے کے حصے کے قریب پہنچے تو ڈرائیور کی سمت کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ٹرک خالی تھا پیک نے فضا میں دو انگلیوں سے اشارہ کر کے ریکل کو بتایا تھا کہ وہ مزید آگے جا کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہتا ہے اور ریکل اس سے کچھ فاصلے پر رک گئی تھی تا کہ ان دونوں کے ایک لائن میں ہونے کی وجہ سے دشمن انہیں ایک ہی گولی سے شکار نہ کر لے ان دونوں میں سے کسی نے بلٹ پروف نہیں پہنا ہوا تھا ٹرک ڈرائیور کے دروازے کے قریب سے قدموں کے نشان برف میں نیچے تک چلے گئے تھے جس کا مطلب تھا کہ ڈرائیور ڈھلان میں کہیں چھپا ہوا تھا۔

''میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔'' پیک نے کہا اور قدموں کے نشانات کے ساتھ ساتھ ڈھلان میں اترتا چلا گیا چند ہی لمحوں میں وہ ریکل کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا' ریکل کو محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی چیز اسے ٹرک کی طرف کھینچ رہی ہے اس نے احتیاط سے اپنی پستول پر اپنی گرفت مضبوط کی اور نپے تلے قدموں سے ٹرک کی طرف بڑھی پھر اس نے جھانک کر ٹرک میں دیکھا ٹرک کی چابیاں اگنیشن میں موجود نہیں تھیں جس کا مطلب تھا کہ ان چابیوں کے ساتھ کچھ اور چابیاں بھی لگی ہوں گی جیسے گھر کی یا کسی اہم جگہ کی جبھی ڈرائیور چابیاں ساتھ لے گیا تھا پھر ریکل نے نوٹ کیا کہ ٹرک کا سامنے کا حصہ پچھلے حصے سے ایک سفید دیوار کے ذریعے الگ کیا گیا تھا پچھلا حصہ جو سامان وغیرہ رکھنے کے کام آتا ہوگا تقریباً 15 فٹ لمبا تھا۔

''پیک......'' ریکل نے پیچھے مڑ کر اپنے ساتھی کو آواز دی لیکن اسے کوئی جواب نہیں آیا۔ ریکل نے سوچا وہ ابھی اتنی دور تو نہیں گیا ہوگا چنانچہ وہ اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئی برف سے پہاڑ اور درخت ڈھکے ہوئے تھے قدموں کے نشانات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شخص بھاگتا ہوا نیچے کی طرف گیا تھا ریکل سوچ رہی تھی کہ وہی اس کا مطلوبہ شخص ہو سکتا ہے کیونکہ کوئی معصوم شہری کبھی بھی کسی پولیس افسر پر فائرنگ نہیں کرے گا' کچھ دور جا کر قدموں کے نشان ایک چھوٹے آبشار کے پاس ختم ہو گئے تھے جہاں سے پانی ایک ندی کی شکل میں بہہ رہا تھا ریکل نے سوچا اس کا حریف بہت اسمارٹ ہے اس نے قدموں کے نشان چھپانے کے لیے پانی میں آگے بڑھنا پسند کیا ہوگا اس نے اپنے ایک ہاتھ کا دستانہ اتار کر پانی میں انگلیاں ڈالیں وہ بہت سرد تھا۔

''پیک؟'' اس نے ایک بار پھر اپنے ساتھی کو پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا اب اس پر خوف طاری ہوتا جا رہا تھا اور بار بار پیک کا خیال آ رہا تھا' وہ اس کی خیریت کی دعائیں مانگ رہی تھی پھر اس نے ندی کے ساتھ ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا' کچھ دور جانے کے بعد ریکل کو اپنی پشت پر ایک آہٹ سنائی دی اس نے ہاتھ میں پکڑی پستول کا رخ اس سمت کر دیا اور جھاڑیوں کا جائزہ لینے لگی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا' تھوڑی دیر بعد پھر اسے آہٹ سنائی دی اس بار کچھ جھاڑیاں ہلی بھی تھیں اس نے بغور ادھر دیکھا چند ہی لمحوں بعد ایک جنگلی ہرن وہاں سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اس نے آنکھیں جھپکیں پھر اپنے کان ہلائے اور آگے بڑھ گیا لیکن ریکل نے پستول پر گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی اسے خطرے کا احساس ہو رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہو وہ پھر احتیاط سے آگے بڑھی ایک بار پھر پیچھے سے آہٹ سنائی دی اس بار ریکل نے گھوم کر پیچھے موجود شے کو پکڑ لیا اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو پیک اس کے سامنے موجود تھا اس کے بال بھیگے ہوئے تھے۔

''کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں شوٹ کر دوں؟'' ریکل نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ غائب ہو گیا۔'' پیک نے ریکل کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے اس موسم میں اب اس کو تلاش کرنا ممکن نہیں ہے واپس چلتے ہیں۔'' ریکل نے کہا اور پھر

اس کے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے وہ دونوں واپس اپنی گاڑی تک آ گئے۔
''میرا خیال ہے امدادی ٹیم جلد ہی پہنچنے والی ہوگی۔'' ریکل نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔
''میرا خیال ہے ہمیں ٹرک کے اندر چیک کرنا چاہیے شاید کوئی نشانی مل سکے۔'' پیک نے کہا۔
''لیکن میرا خیال ہے امدادی ٹیم کا انتظار کرلیا جائے۔'' ریکل نے کہا وہ خاصی تھک گئی تھی لیکن پھر وہ چونکی۔
''پیک تم ٹھیک کہتے ہو مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے وہاں کچھ ہے۔'' ریکل نے کہا پھر وہ دونوں ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف گئے تھے اور پچھلا دروازہ کھول کر ریکل اندر داخل ہوگئی تھی اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہاں کوئی چیز حرکت کررہی تھی پھر دوسرے ہی لمحے ایک چھوٹے قد کا بچہ اس پر چڑھا ہوا تھا اور اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے اس کے چہرے پر کھرونچے مار رہا تھا' ریکل کی گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کررہی تھی جبکہ پیک نے پیچھے ہٹ کر اس پستہ قد کا نشانہ لیا ہوا تھا لیکن فائر کرنے سے قاصر تھا کیونکہ اسطرح ریکل بھی زخمی ہوسکتی تھی۔
''پیک......'' ریکل کی چیخ نکل گئی جب اس پستہ قد نے اپنے تیز دانت ریکل کے بازو میں گاڑھ دیئے حالانکہ اس نے جیکٹ پہنی ہوئی تھی پھر بھی درد سے کراہ رہی تھی۔
''میں اسے نشانہ نہیں بنا سکتا وہ چھوٹی بچی ہے۔'' پیک نے چیخ کر کہا۔ ''یہ مشکل چھ سات سال کی ہوگی۔'' ریکل نے اس کے دونوں ننھی سی کلائیاں پکڑ کر اسے دور دھکیلا اور اٹھ کھڑی ہوئی لڑکی نے ایک ڈنڈی اٹھالی تھی اور ریکل کو مارنے لگی تھی لڑکی کے بالوں سے خون بہہ رہا تھا اور اس نے ایسا لباس پہنا ہوا تھا جیسے اس کے جسم کے گرد کوئی تکیہ غلاف لپیٹ دیا گیا ہو پھر پیک نے اپنی پستول رکھی تھی اور دوڑ کر لڑکی کو ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھالیا تھا لیکن وہ چھوٹ کر بھاگ گئی تھی تب ہی ریکل نے چھلانگ لگا کر اسے پکڑا تھا اس کے ہاتھ سے لڑکی کا بغیر آستینوں والا لباس پشت سے پھٹ گیا تھا اور اس کی پشت پر 9 کا عدد کھدا ہوا تھا ریکل حیران رہ گئی تھی اور پیک کی طرف مڑی تھی جو ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ لڑکی برف میں اوندھی پڑی تھی اور چیخ رہی تھی اسی وقت پیچھے ٹرک سے کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی تھی اور پیک اپنی پستول سنبھال کر پھر ادھر بڑھا تھا اور اسے ٹرک میں دو سائے اور نظر آئے تھے اس نے مڑ کر ریکل کو بتایا تھا اور اسی وقت پولیس کی گاڑیوں کی سائرنوں کی آوازیں سنائی دی تھیں امدادی ٹیم پہنچ گئی تھی۔

□......□......□

اسپتال میں گہری خاموشی تھی کم روشنی والے مدھم بلب کے نیچے سفید چادروں والے تین بستروں پر تین بچے لیٹے ہوئے تھے جنہیں چمڑے کی بیلٹوں سے باندھا گیا تھا اور انہیں نیند کی دوائیں دی گئی تھیں' انہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ہفتوں سے نہائے نہیں تھے ان کے جسم بہت دبلے پتلے تھے ان کی پسلیاں ان کی کھال سے نظر آرہی تھیں اور ان کے پیٹ پیالے کی طرح اندر دھنسے ہوئے تھے ان کے دانت نوکیلے تھے ان سب کو کہیں نہ کہیں زخم لگے ہوئے تھے خاص طور سے ان کی پشت پر کسی ریزر کی مدد سے نمبر کھودے گئے تھے۔
ریکل اور پیک کمرے میں موجود تھے ان کے سر کے بال بکھرے ہوئے اور سردی کی شدت سے چہرے پر کئی جگہ کھال چیخ گئی تھی ان کے سامنے بائیں جانب والے بیڈ پر نمبر 9 لیٹی ہوئی تھی اس کے سر میں زخم تھا جو ٹرک کو حادثے کے وقت لگا تھا اس کے برابر نمبر 4 لیٹی تھی وہ تیرہ سالہ لڑکی تھی اس کے جسم پر بھی جگہ جگہ زخم لگے تھے لیکن وہ ہوش میں تھی۔
''میرا خیال ہے انہیں پکڑنے کے بعد انہیں نمبر لگائے جاتے ہوں گے نمبر ون پہلا ہوگا اور باقی اس کے بعد والی اور نمبر 9 آخری۔'' پیک نے اپنا خیال ظاہر کیا۔
''یہ تو ہم سوچ رہے ہیں...... اس سے زیادہ بھی ہوسکتے ہیں...... ہمیں ان سے بات کرنا ہوگی تم سمجھ رہے ہو میرا مطلب کیا ہے؟'' ریکل نے کہا۔ ''جو کوئی بھی ان بچوں کے ساتھ یہ سب کررہا ہے اسے روکنا بہت ضروری ہے لیکن ہمارے پاس حقیقت جاننے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''
''اس کے لیے ہمیں ان لڑکیوں پر انحصار کرنا ہوگا۔'' پیک نے کہا۔

''ڈرائیور نے فائرنگ کرنے میں پہل کی تھی چنانچہ ہمیں مجبوراً اسے نشانہ بنانا پڑا۔'' ریکل نے کہا۔

''میں جانتا ہوں، ہم نے ان بچیوں کو زخمی تو کیا ہے لیکن ان کی زندگی بھی بچائی ہے۔'' پیک نے کہا۔

''خود کو قصور وار کہنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا ان کی حالت دیکھو۔'' ریکل نے لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کبھی سوسائٹی میں نارمل زندگی نہیں گزار سکیں گی۔''

''خدا پر بھروسہ رکھو وہ ان کی مدد کرے گا۔'' پیک نے کہا۔

''کچھ چیزیں ہوتی ہیں جنہیں ہم واپس نہیں لاسکتے۔'' ریکل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں، لیکن ان کے ساتھ ہمارا رویہ کیسا ہو یہ فیصلہ کرنے میں تو ہم آزاد ہیں۔'' پیک نے جواب دیا اور اسی وقت ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوئی اس کے براؤن بال کاندھوں تک کٹے ہوئے تھے اس کے چہرے پر کوئی میک اپ نہیں تھا اس کے چہرے پر کرختگی تھی اس کے ہاتھ میں ایک کلپ بورڈ تھا اور اس نے سفید کوٹ پہنا ہوا تھا وہ پی ایچ ڈی تھی اور اس کا نام ڈاکٹر لوئیس نورڈن تھا۔

''کیا ہم ان سے مل سکتے ہیں؟'' ریکل نے ڈاکٹر سے پوچھا جب وہ لڑکیوں کے کمرے سے باہر آئی۔

''ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نورڈن نے کہا۔

''بہرحال ہمیں کام تو کرنا ہے۔'' ریکل نے کہا تو ڈاکٹر نورڈن نے انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی کمرے کی سفید دیواریں بے جان لگ رہی تھیں کمرے میں کسی کیمیکل کی بو بسی ہوئی تھی۔ ''ان کی حالت بہت خراب تھی چنانچہ ہم نے ان سب کو غسل دلوایا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا وہ چلتے ہوئے نمبر 9 کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ''ان سب کی کلائیوں کے گرد بھی زخم کے نشان تھے ان کے بالوں میں جوئیں تھیں جو شاید کافی عرصے سے تھیں کیونکہ ان کے سروں میں زخم پڑے ہوئے تھے۔'' ڈاکٹر آہستہ آہستہ تفصیل بتاتی جارہی تھی۔

''اسے اٹھاؤ۔'' ریکل نے نمبر 9 کی طرف اشارہ کیا۔

''میں ایک بار پھر آپ کو تنبیہہ کرتی ہوں یہ بچے بہت ڈرے ہوئے ہیں'' ڈاکٹر نورڈن نے کہا اور نمبر 9 کا کاندھا ہلایا اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

''کیا تمہیں میری آواز آرہی ہے؟'' ریکل نے پوچھا تو نمبر 9 اس کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی پھر اس کی نظر پیک پر پڑی تھی اور اس نے زور زور سے چیخنا شروع کردیا تھا ساتھ ساتھ وہ اپنے ہاتھ بھی چمڑے کی پٹی سے آزاد کروانے کی کوشش کررہی تھی اور پیک جہاں تھا وہیں رک گیا تھا۔

''یہ مردوں کو پسند نہیں کرتیں، خوفزدہ ہوجاتی ہیں جبکہ بڑی عمر کی عورتوں سے نہیں گھبراتیں شاید ماضی میں ان کا واسطہ ان سے ہی پڑا ہو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''کیا انہیں باندھ کر رکھنا ضروری ہے؟'' ریکل نے پوچھا۔

''ہاں کیونکہ نمبر 9 نے دوبار میری اسسٹنٹ کی آنکھیں نوچنے کی کوشش کی تھی تب ہی ہم نے اسے باندھا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا نمبر 9 کی چیخوں سے نمبر 4 بھی جاگ گئی تھی اور اس نے بھی چیخنا شروع کردیا تھا۔

''ان سب کو ایک کمرے میں رکھنے کا آئیڈیا بہت اچھا ہے۔'' پیک نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''انہیں الگ بھی رکھا تھا لیکن لڑکیاں بہت چیخ رہی تھیں میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ بیرونی دنیا سے یہ ان کا پہلا سامنا ہے کافی عرصے بعد۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ ابتک ایکدوسرے ہی کو دیکھتی رہی ہیں انہیں ساتھ رکھنا ہی بہتر ہے اور میں یہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ بغیر پڑھی لکھی اور زبان کے بغیر ہونے کی وجہ سے یہ آپس میں کیسے بات کرتی ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا تو اس کی بات پر ریکل کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ظالم مجرم نے ان سب کی زبانیں کاٹ دی ہیں وہ آہستہ آہستہ نمبر 9 کی طرف بڑھی تو اس نے زیادہ شدت سے چیخنا شروع کردیا وہ بار بار دانت پیس رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔

''میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گی۔'' ریکل نے بیڈ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''فادر جاچکے ہیں۔''

فادر کا نام لیتے ہی لڑکی کے چہرے پر خوف نظر آنے لگا تھا اور اس نے چیخنا بند کردیا وہ بغور ریکل کو دیکھنے لگی

تھی۔
''یہاں فادر نہیں ہیں تم اب محفوظ ہو۔'' ریکل نے اسے یقین دلایا تو لڑکی نے پیک کی طرف خوف سے دیکھا۔
''پیک' تم پیچھے رہو۔'' ریکل نے کہا تو پیک نے اثبات میں سر ہلایا اور پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن کمرے ہی میں تھا وہ ایسی جگہ کھڑا ہو گیا تھا جہاں سے لڑکیوں کو نظر نہیں آ رہا تھا۔
''میرا نام ریکل ہے۔'' وہ لڑکی سے مخاطب ہوئی۔ ''میں نے ہی تمہیں آزادی دلائی ہے میں پولیس کے محکمے میں کام کرتی ہوں کیا تم جانتی ہو پولیس کون ہوتی ہے؟''
اس کی بات پر لڑکی نے سر ہلایا۔
''کیا تم کوئی تصویر بنا سکتی ہو؟'' ریکل نے پوچھا تو لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا جس پر ریکل نے ایک پینسل اور اپنی نوٹ بک اس کی طرف بڑھائی۔
''اس کے ہاتھ کھول دو۔'' ریکل نے ڈاکٹر سے کہا۔
''میں آپ کو اجازت نہیں دوں گی کہ آپ یہ نوکیلی پینسل اس بچی کو دیں۔'' ڈاکٹر نے کہا اور پیک اسی وقت کمرے سے باہر چلا گیا۔
''ڈاکٹر آپ معاملے کی نزاکت نہیں سمجھ رہی ہیں بہت ممکن ہے اس ظالم کے پاس اور بھی بچے ہوں' ہر لمحہ جو گزر رہا ہے وہ بچے اس قصائی کے ساتھ گزارنے پر مجبور ہیں ان کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔'' ریکل نے کہا۔
''میں آپ کی حفاظت کے خیال سے آپ کو آگاہ کر رہی ہوں اس بچی کو کوئی تیز چیز دینا خود بھی خطرے میں ڈالنے کے برابر ہے اور اس کے لیے بھی۔'' ڈاکٹر نے کہا اور اسی وقت پیک کمرے میں واپس آیا۔
''یہ مجھے لابی میں پڑی ملی ہے۔'' پیک نے ایک کریاؤ پینسل ریکل کی طرف بڑھائی۔ ''میرا خیال ہے یہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔'' پیک پینسل دے کر پھر واپس اپنی جگہ پر چلا گیا تھا۔
''اب میری مدد کرو۔'' ریکل نے ڈاکٹر سے کہا تو اس نے بچی کے ہاتھ کھول دیئے اور ریکل نے نوٹ بک اور کلر پینسل اسے دے دی۔
''فادر کیسا دکھتا ہے تم ڈرا کر سکتی ہو؟'' ریکل نے کہا اور لڑکی نے ایک صفحے پر تصویر بنانا شروع کر دی۔ اس نے ایک دبلی سی فیگر بنائی تھی اور سر کی جگہ بڑا سا دائرہ اس کی آنکھیں غصے والی بنائی تھیں۔
''بہت اچھے۔'' ریکل نے کہا۔ ''اچھا اب اپنا گھر بناؤ۔'' ریکل نے کہا تو لڑکی نے ایک گھر بنایا جس کی دو چھتیں تھیں لیکن اس تصویر سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔
''تم ابھی کہاں رکی ہوئی ہو؟'' ریکل نے پوچھا لیکن لڑکی اس کی بات نہیں سمجھی۔
''یہ بتاؤ تم لوگ کھیلتے کیسے تھے؟''
اس بات پر وہ لڑکی مسکرائی تھی اس کے پیلے پیلے دانت نظر آنے لگے تھے اس نے جو گھر بنایا تھا اس کے پیچھے ایک احاطہ بنایا تھا اور ایک قطار میں لکڑیاں لگی تھیں جو درختوں کے علاقے میں گھوم رہی تھی ریکل چند لمحے اسے دیکھتی رہی اور جب اس کی سمجھ میں اس تصویر کا مطلب آیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو لائنیں تھیں وہ دراصل زنجیریں تھیں' ریکل نے وہ صفحہ پھاڑ لیا اور پیک کو دے دیا' جو ابھی تک ایک کونے میں کھڑا تھا' لڑکی اب بھی ڈرائنگ بنا رہی تھی ایک تصویر میں فادر اسے مکے مار رہا تھا' ایک تصویر میں وہ اسے ایک پیالے میں کھانا کھانے پر مجبور کر رہا تھا اور ایسی ہی بہت سی تکلیف دہ مناظر وہ بنا رہی تھی اور پیک ان تصویروں کی تاب نہ لاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا۔
''تم بہت بہادر ہو۔'' ریکل نے لڑکی کی تعریف کی اور ڈاکٹر نورڈن کو اپنا کام ختم ہونے کا اشارہ دیا۔ پھر وہ بھی پیک کے پیچھے کمرے سے نکل گئی تھی۔
پیک اسپتال کے باہر اس کا منتظر تھا اور اداس نظر آ رہا تھا۔
''ان لڑکیوں کو دیکھ کر مجھے اپنی بیٹی کلو کا خیال آ گیا۔'' پیک نے اداسی سے کہا۔
''میں تو تصور ہی نہیں کر سکتی کیونکہ میری تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے لیکن اگر ہم اجنبیوں کے لیے اتنا دکھ محسوس کر سکتے ہیں تو جن کے یہ بچے ہیں ان کو کتنا دکھ ہوتا ہوگا۔'' ریکل نے کہا اسے یاد نہیں تھا کہ وہ آخری بار کب روئی تھی لیکن آج اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی بچوں پر بھی اتنا غیر انسانی ظلم

کرسکتا ہے۔

دوسرے روز ریکل پھر اسپتال پہنچ گئی تھی اس بار اس نے نمبر 4 سے بات کی تھی جس کی عمر تیرہ سال کے قریب تھی اس کی جلد پیلے رنگ کی تھی وہ مسلسل دیوار کو گھور رہی تھی ریکل ایک کرسی لے کر اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی لیکن وہ ریکل کو نظرانداز کررہی تھی پھر اچانک ریکل کو احساس ہوا کہ یوگی اس کے پاس کھڑا ہے وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں تھا اور لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

''میں نمبر ون کو جانتی ہوں۔'' ریکل نے لڑکی سے کہا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''جب اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی تو تم وہاں تھیں؟'' ریکل نے پوچھا لیکن نمبر 4 نے جواب نہیں دیا۔

''میں جانتی ہوں تم تمام قیدی آپس میں بہن بھائیوں جیسا برتاؤ کرتے تھے اگر تم فادر سے دوسروں کو بچانا چاہتی ہو تو ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنا ہوگی۔''

نمبر 4 نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر بند کرلیا۔ شاید اسے اپنی کٹی زبان کا خیال آ گیا تھا پھر اس نے لکھنے کا اشارہ کرکے کاغذ اور پینسل مانگی تھی ریکل نے ادھر ادھر دیکھا ڈاکٹر نورڈن وہاں موجود نہیں تھی چنانچہ اس نے کریان پینسل اور نوٹ بک اسے دے دی تھی۔

''میں تمہارے ہاتھ کھول کر خطرہ مول لے رہی ہوں کوئی غلط حرکت مت کرنا۔'' ریکل نے کا۔

''اس نے تمہیں کیسے پکڑا تھا؟'' ریکل نے پوچھا اور نمبر 4 نے ایک اسکول کی عمارت بنائی وائٹ ٹرک بنایا اور ایک اسٹک جیسی تصویر بنائی جس کے منہ پر فادر نے رومال رکھا ہوا تھا۔

''تم کتنی چھوٹی تھیں؟'' ریکل نے پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کرنے کے لیے کاندھے اچکا دیئے پھر وہ دوسری تصویر بنانے لگی تھی اس میں کئی لڑکے اور لڑکیاں تھے ان کے بالوں کی الگ الگ لمبائی تھی اور ان کی بھی لیکن سب کے چہروں پر خوف تھا قریب کھڑے یوگی نے سب سے لمبے لڑکے کی طرف اشارہ کیا اور پھر اپنی طرف اشارہ کیا پھر اس نے سب سے لمبی لڑکی کی طرف اشارہ کیا اور دو انگلیوں کا اشارہ کیا پھر تیسری فیگر کی طرف اشارہ کرکے تین انگلیوں کا اشارہ کیا اس طرح اس نے تصویر میں موجود تمام فیگرز کے نمبر ریکل کو بتائے جو تعداد میں گیارہ تھے۔

□......□......□

ہائی لینڈ پولیس ڈپارٹمنٹ میں پشت پر نمبر لکھے ہوئے بچوں کی فرضی تصاویر دیوار پر لگی تھیں جن میں سے نمبر 4.7.9 اسپتال میں تھے ریکل اکیلی کمرے میں بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی ان میں تین لڑکے اور باقی لڑکیاں تھیں نمبر ون مر چکا تھا ابھی سات اور تھے جنہیں ریکل کو بچانا تھا۔

ریکل نے اپنا ڈیجیٹل ورک ان بوکس چیک کیا ان باکس میں وائٹ ٹرک کے لائسنس نمبر کا رزلٹ آ گیا تھا وہ کسی بیکٹر کوئن نامی شخص کی ملکیت تھا وہ ایک سیلز مین تھا اس کا تعلق اوہیو سے تھا اور وہ 1989ء میں اپنے ٹرک کے ساتھ غائب ہوگیا تھا وہ غیر شادی شدہ تھا اور اس کی کوئی فیملی نہیں تھی چنانچہ کسی نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی فادر کو ڈھونڈنے کے لیے کوئی نشانی ان کے ہاتھ نہیں لگی تھی اس کے ٹرک سے صرف تین بچے ۹، ۷، ۴ ملے تھے جنہیں وہ کہیں لے جارہا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کے دو ٹھکانے تھے پیک اپنے طور پر پتہ لگانے کی کوشش کررہا تھا لیکن کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ریکل اپنی سیٹ سے اٹھ کر پیک کی میز پر گئی وہ کمپیوٹر پر کچھ سرچ کررہا تھا وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گی۔ قریب رکھے ٹی وی پر شام کی خبروں میں ان بچوں کے بارے میں خبر نشر ہو رہی تھی جنہیں ریکل اور پیک نے وائٹ ٹرک سے باز یاب کرایا تھا۔

''پیک دیکھو ان بچوں کی تصویریں بھی دکھا رہے ہیں۔'' ریکل نے پیک کی توجہ خبر کی طرف مبذول کرائی۔

''ہاں......دیکھو یہ نمبر 4 کی خبر ہے اس کی پشت پر لکھا نمبر 4 بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے فٹ بال کی ٹیم کی جرسی پر نمبر پڑے ہوتے ہیں......'' پیک نے کہا اور ریکل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اوہ یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا...... پیک......'' اس نے حیرت سے کہا۔

''کیا؟''

''یہی کہ ان بچوں کی پشت پر نمبر ایسے کندہ کیے گئے ہیں کہ ایک نظر میں کسی فٹ بال ٹیم کی جرسی کا شبہ ہوتا

ہے...... کہیں ہمارے مجرم کا تعلق کبھی کسی فٹ بال ٹیم سے تو نہیں رہا؟''
''ہو بھی سکتا ہے؟'' پیک نے کہا۔
''دیکھو' بچوں کی تعداد بھی گیارہ ہے ٹیم کی طرح' ان پر نمبر کندہ ہیں اور ہم ایک گھر میں بہت سی فٹ بال کی گیندیں دیکھ چکے ہیں جو ہمارے خیال میں اس کی ملکیت ہو سکتا ہے تم کیا سمجھتے ہو ہمارا سامنا کس قسم کے شخص سے ہے؟'' ریکل نے پوچھا۔
''تمہیں پتہ ہے میں مبہم سوالوں کے جواب نہیں دیتا۔'' پیک نے کہا۔
''تو پھر ریسرچ کرو...... ایسے فٹ بال کے کھلاڑیوں کے لیے جو بھی ٹیم میں رہے ہوں یا تو کھلاڑی یا کوچ اور ان کی بے عزتی کر کے نکالا گیا ہو یا وہ کسی کے ظلم کا شکار ہوئے ہوں۔'' ریکل نے کہا۔
''لیکن یہ بڑا مشکل ہوگا۔''
''مگر ناممکن نہیں۔'' ریکل نے کہا اور پیک سرچ میں مشغول ہوگیا۔
''ہائی لینڈ کے علاقے میں کوئی فٹ بال ٹیم نہ ہے اور نہ کبھی تھی۔'' پیک نے بتایا۔
''تو پھر ایک طریقہ اور بھی ہو سکتا ہے ہمیں معلوم ہے کہ یوگی اس کا پہلا شکار تھا کوئی تو وجہ ہوگی کہ اس کے بعد اس نے بچے اغوا کرنا شروع کر دیئے تھے ہمیں وہ وجہ ڈھونڈنا ہوگی تب ہی ہم مجرم تک پہنچ سکیں گے۔''
''مجھے تو وہ کوئی مخبوط الحواس شخص لگتا ہے جس کے کسی کام کی کوئی وجہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ اذیت پسند ہے۔'' پیک نے اپنا خیال ظاہر کیا۔
''شاید۔'' ریکل نے کہا اور اسے اپنی پشت پر یوگی کی موجودگی محسوس ہوئی وہ اس کے پسینے کی بو پہچان جاتی تھی۔
''کیا وہ ایک کوچ تھا؟'' ریکل نے سرگوشی میں پوچھا جس پر یوگی نے اس کا کاندھا پکڑ کر اسے کھینچا اس کے لمبے ناخن ریکل کی گردن میں چبھے لیکن وہ جانتی تھی کہ اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ پیک بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس کی نظریں اس جگہ مرکوز ہو گئیں جہاں ریکل کی توجہ تھی۔
''کوئی وزیٹر؟'' اس نے پوچھا۔
''1992ء سے یہاں کے اسکولوں کی ٹیموں کے کوچز میں ڈھونڈو۔'' ریکل نے پیک سے کہا اور پیک نے تیزی سے ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔
''کوئی نمایاں واقعہ نہیں مل رہا ہے۔'' پیک نے پرانے آرٹیکلز دیکھتے ہوئے کہا۔
''ٹرک کا مالک ایک سیلز مین تھا اس کا تعلق اوہیو سے تھا وہاں چیک کرو۔'' ریکل نے کہا۔
''وہ مختلف علاقوں میں سفر کرتا تھا تو کسی بھی علاقے میں حادثہ ہو سکتا ہے۔'' پیک نے کہا۔
''کچھ بھی سہی تم سرچ کرو۔'' ریکل نے کہا اور پیک پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔
''یہ دیکھو۔'' پیک نے اس کی توجہ ایک آرٹیکل کی طرف مبذول کرائی۔ ''ایک متمول شخص کی طرف سے ذاتی عناد کی وجہ سے ایک کوچ کو ملازمت سے نکال دیا گیا۔'' اس آرٹیکل پر نظر ڈال کر ریکل نے یوگی کی طرف دیکھا لیکن اس نے کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔
''اچھا...... یہ دیکھو...... اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' پیک نے کوچ کی ایک تصویر دکھائی لیکن اس بار بھی یوگی بے حس و حرکت کھڑا رہا۔
''ہم کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟'' پیک نے پوچھا۔
''اپنے دوست کے ردعمل کا۔'' ریکل نے جواب دیا۔
''آہ......'' پیک نے مایوسی سے کہا اور پھر سرچ کرنے میں مصروف ہوگیا یوگی تب تک وہاں کھڑا رہا تھا جب تک پیک نے کرک ہین کی تصویر نہیں نکال لی تھی اسے دیکھتے ہی یوگی نے طرح طرح کی آوازیں نکالنا شروع کر دی تھیں اور وہ بے چین نظر آ رہا تھا اور ریکل نے پیک کو سرچ روکنے کا اشارہ کیا تھا۔
''ہمارا مطلوبہ شخص یہی ہے۔'' ریکل نے انگلی سے کمپیوٹر اسکرین کو چھوا اور پیک نے وہ آرٹیکل پڑھنا شروع کر دیا۔
''1988 میں حادثہ ہوا تھا 33 سالہ کرک ہین اوہیو کے اسکول ہائی ہل میں کوچ تھا وہ ایک بس میں اسٹوڈنٹس کو لے کر جا رہا تھا کہ اسے حادثہ پیش آ گیا اس میں فٹ بال ٹیم کے گیارہ کھلاڑی تھے جنہیں ان کی جیت کے سلسلے میں

انعامات دیئے جانے تھے وہ سب اس حادثے میں مر گئے تھے اور یہ سب کرک کی وجہ سے ہوا تھا کرک کو بھی سر میں شدید چوٹیں آئی تھیں اور اس کا دماغ متاثر ہوا تھا۔'' پیک نے پہلا آرٹیکل پڑھتے ہوئے بتایا پھر اس نے دوسرا آرٹیکل پڑھنا شروع کیا۔

''کرک نے کوچ کی حیثیت سے اپنا استعفیٰ دے دیا اسکول نے اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی اور حادثے کو اتفاقیہ قرار دیا اس کے بعد سے کرک کے بارے میں کوئی خبر بھی سننے میں نہیں آئی۔'' پیک نے کہا اور ایک تصویر ریکل کو دکھائی جو بیس سال پرانی تھی جس میں کرک 33 سال کا تھا اس کے بال چھوٹے اور براؤن کلر کے تھے اس کا نیچے کا جبڑا چوڑا آنکھیں چھوٹی اور جسم دبلا پتلا تھا اس کا چہرہ نارمل سا تھا لیکن یوگی اسے دیکھ کر چیخنے لگا جیسے وہ کوئی شیطان ہو پھر پیک نے ڈیٹا بیس سے کرک کے بارے میں معلومات جمع کیں اس نے کچھ ٹریفک کی خلاف ورزیاں کی تھیں لیکن کوئی بڑا جرم نہیں کیا تھا' ایک پکچر میں اس کا ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا جو کافی بعد کا تھا اور اس کی تصویر میں اس کی عمر زیادہ لگ رہی تھی۔ لائسنس پر جو پتہ لکھا ہوا تھا وہ سلویا نامی جگہ کا تھا جو ہائی لینڈ سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھی پیک اور ریکل نے فوراً ہی وہاں جانے کا فیصلہ کیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ ایک گھر کے سامنے جا پہنچے جو ایک منزلہ ہی تھا بہت چھوٹا اور لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس کے باہر ایک زنگ آلود کار کھڑی ہوئی تھی اس علاقے میں اس جیسے اور بھی کئی گھر تھے جن میں متوسط طبقے کے لوگ رہتے تھے پیک اپنی پستول سنبھالتے ہوئے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا ریکل اس کے ساتھ ہی گھر میں داخل ہوئی تھی لیکن چند ہی لمحوں بعد وہاں ایک مقامی سیکیورٹی آفیسر آ گیا تھا۔

''کیا تمہارے پاس گھر کی تلاشی کا وارنٹ ہے تم اس طرح کسی کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتے میں کورٹ میں تمہارے خلاف درخواست دائر کروں گا۔'' آفیسر نے غصے سے کہا۔

''اور کیا تم جانتے ہو کہ اگر یہ ہمارا مطلوبہ شخص ہوا تو تمہاری ترقی بھی ہو سکتی ہے۔'' پیک نے اس سے کہا جس پر وہ آفیسر بڑبڑاتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا گھر کو کسی حد تک سجایا گیا تھا لیکن ہر طرف مٹی بکھری ہوئی تھی اور آتشدان پر پرانی فٹبال کی ٹرافیاں بجی ہوئی تھیں اور ہائی مل اسکول کے مرنے والے فٹ بال کے کھلاڑیوں کی تصاویر دیواروں پر لگی ہوئی تھیں یہاں موجود مٹی کی ایک تہہ کو دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ کئی ہفتوں سے یہاں کوئی نہیں آیا ہے فرج خالی تھا فریزر میں کچھ کچے برگر اور پیٹیز موجود تھے اور ایک الماری میں کچھ فٹ بال کی اور دوسرے کھیلوں کی کتابیں موجود تھیں اور اسی الماری کے پیچھے پیک کو ایک بکس میں کچھ اہم دستاویزات ملی تھیں اس میں سوشل سیکیورٹی نمبر' پیدائشی سرٹیفکیٹ' کاروباری کانٹریکٹ (جو لوکل ٹرک کمپنی) کا تھا اور ایک گھر کے پراپرٹی کے کاغذات۔

''دیکھا...... میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ یہ گھر اس نے نمبروں کو پکڑنے سے بھی پہلے لیا تھا۔'' ریکل نے کہا۔

''میں تمہاری روحوں پر یقین نہ کرنے کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔'' پیک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ تمام اہم کاغذات ریکل نے اپنے باس کوئل کو دیئے تھے اور خود ٹرک کمپنی کے مالک سے فون پر رابطہ کیا تھا جس کے لیے کرک کام کرتا تھا۔

''ہم پورے ملک میں جگہ جگہ اپنے ٹرک بھیجتے ہیں' کرک بھی ہمارے ڈرائیوروں میں سے ایک تھا۔''

''آپ کے استعمال میں 18 وہیلرز ہیں؟'' ریکل نے پوچھا۔

''جی ہاں' ہم زیادہ تر بڑے گروسری اسٹورز کا سامان ڈیلیور کرتے ہیں۔''

''کرک کہاں ہے؟'' ریکل نے پوچھا۔

''وہ ابھی چھٹیوں پر ہے کئی سالوں سے وہ اپنی سالانہ چھٹیاں جمع کرتا ہے اور سردیوں میں دو ہفتے کی چھٹی پر جاتا ہے میں یقین نہیں کر سکتا کہ جن بچوں کی خبر نشر ہو رہی ہے وہ ان کے کیس میں ملوث ہے۔''

''ہم اکثر موقعوں پر دھوکا کھاتے ہیں' کیا تم اس کے بارے میں کچھ اور بتا سکتے ہو؟''

''وہ اپنی ذات میں مگن رہتا ہے' فٹ بال سے محبت کرتا ہے' شکار کرتا ہے اور ہر ہفتے جنگل میں جاتا ہے وہ ایک اچھا انسان ہے۔''

''اگر اس کی کوئی اور پراپرٹیز ہیں تو کیا تمہارے علم میں ہیں؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا وہ میرے زیادہ اجرت لینے والے ملازموں میں شامل ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ اپنی رقم کہاں خرچ کرتا ہے ہم تقریباً بیس سال سے ایک ساتھ کام کرتے ہیں وہ ہمارے لیے ایک بند کتاب ہے۔''

''اچھا اگر کوئی خاص بات معلوم ہو تو مجھے یا پیک کو فون کرنا۔'' ریکل نے کہا۔

□......□......□

میک کوئل نے بچوں کے اغوا اور قتل کی خبر جب سے میڈیا کو دی تھی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی لوگوں سے اپیل کی جارہی تھی کہ وہ اگر کوئی مشکوک شخص دیکھیں تو پولیس کو اطلاع دیں کرک کا حلیہ بھی بیان کردیا گیا تھا کئی لوگوں کے فون آچکے تھے جو اپنے اپنے طور پر معلومات دینے کی کوشش کررہے تھے لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوسکی تھی پھر اچانک ایک فوٹو نکال آئی اور ہائی لینڈ کے علاقے میں ایک مشتبہ گھر کی نشاندہی کی گئی جس کے بعد ریکل اور پیک اپنی ٹیم کے ساتھ اس مکان کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ ریکل نے اپنی وردی کے ساتھ ساتھ حفاظتی طور پر بلٹ پروف اور ہیلمٹ بھی لے لیا تھا جس پر فیس گارڈ لگا ہوا تھا گاڑیاں مطلوبہ مکان سے خاصے فاصلے پر روک دی گئی تھیں یہ جنگل کے درمیان بنا ہوا تین منزلہ مکان تھا جس کا گراؤنڈ مضبوط اینٹوں کا لیکن بالائی دونوں منزلیں مضبوط لکڑی کی بنی ہوئی تھیں قریب ہی ایک پن چکی بھی لگی ہوئی تھی جس کے چلنے کی چرچراہٹ دور تک سنائی دے رہی تھی اسے دیکھ کر اندازہ ہورہا تھا کہ وہ کم از کم ایک صدی پرانی تو رہی ہوگی۔

پولیس آفیسرز ایک ایک کرکے گاڑیوں سے اترے تھے رات کی تاریکی اور سردی بڑھ رہی تھی وہ خاموشی سے ریکل اور پیک کی ہدایت پر مختلف سمتوں میں بکھر گئے تھے سب کے ہاتھوں میں گنیں تھیں' ریکل نے گاڑی سے اترتے ہی خود کو زمین پر گرادیا تھا اور رینگتے ہوئے ایک درخت کے پیچھے پناہ لی تھی' اس کے اوپر مکان کی تیسری منزل کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ریکل کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہاں خطرہ تھا پھر ریکل نے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد مکان کی طرف پیش قدمی کی تھی اور اسی وقت اوپر سے ایک فائر ہوا تھا ریکل کے ساتھ چلنے والا آفیسر زمین پر لیٹ گیا تھا۔

□......□......□

''آفیسر......ڈاؤن......آفیسر ڈاؤن'' پیچھے سے کوئی چیخا تھا اسی وقت اوپر سے دوسرا فائر ہوا تھا جس کے بعد کئی آفیسرز نے مکان کی تیسری منزل کی طرف فائر کیے تھے اوپر سے پھر فائر کیے گئے تھے اندازہ ہورہا تھا کہ فائر کرنے والا پولیس افسران کو مکان سے دور رکھنا چاہتا ہے ریکل نہیں جانتی تھی کہ شوٹر اس پر فائر کررہا ہے یا نہیں لیکن وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی اسی وقت اس کے پیچھے موجود پیک نے اپنی رائفل سے لیزر پوائنٹر سے روشنی اوپر کھڑکی پر ڈالی تھی اور فائر کردیا تھا شاید گولی شوٹر کو لگی تھی کیونکہ وہ پیچھے کو گرا تھا لیکن چند لمحوں بعد ہی اس نے دوبارہ فائر کیا تھا اس بار گولی پیک کے سر کے قریب سے گزر گئی تھی۔

''ہمیں پیش قدمی کرنا ہوگی۔'' ریکل نے کہا وہ گھر کے دروازے سے زیادہ قریب تھی اس نے موقع دیکھ کر تیزی سے دروازے کی طرف دوڑ لگادی وہ شوٹر کو موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ مزید فائر کرے اس کا ایک پولیس آفیسر زخمی ہوچکا تھا وہ جانتی تھی کہ اوپر موجود شوٹر بھی اسے نشانہ بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا پھر ریکل نے اندھادھند کھڑکی کی طرف فائر کیے اور دوڑتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ لاک تھا۔

اس نے کئی فائر لاک پر کیے دروازہ کھل گیا اس دوران شوٹر نے کوئی فائر نہیں کیا تھا ریکل کو اندازہ تھا کہ شوٹر جانتا ہے کہ وہ گھر میں داخل ہورہی ہے لیکن اس طرح دوسرے آفیسرز کو بھی موقع مل گیا تھا کہ وہ بھی آگے بڑھیں اس کے ساتھ تین آفیسرز مکان میں داخل ہوئے تھے جن میں پیک بھی شامل تھا اندر بالکل اندھیرا تھا وہ اپنی رائفلز کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے ایک زینہ اوپر کی جانب جارہا تھا نیچے ہال میں کچھ بوریاں رکھی تھیں جن میں گندم اور مکئی بھری ہوئی تھی کچھ خالی پڑی تھیں وہ زینے سے اوپر چڑھنے لگے تھے کچھ آفیسرز نیچے ہی تھے اور کمروں کی تلاشی لے

رہے تھے۔

اوپری منزل کا فرش لکڑی کا تھا' ریکل اپنی رائفل کی روشنی کمرے میں ڈال رہی تھی ایک پلاسٹک کی میز پر اسے پلیٹ میں ڈبل روٹی اور گوشت رکھا نظر آیا جیسے کوئی اسے کھا رہا تھا اس نے رائفل کی روشنی چاروں طرف ڈالی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

''بووم...... بووم......'' اچانک اوپر لکڑی کی چھت سے کسی نے نیچے دو فائر کیے لکڑی کے کچھ تختے ٹوٹ کر نیچے گرے جواب میں ایک پولیس آفیسر نے بھی اوپر لکڑی کی چھت پر فائر کیے ایک تختہ ریکل کے ہیلمٹ کو چھوتا ہوا نیچے گرا تھا۔

''تم سامنے آجاؤ ہم تمہیں آخری موقع دے رہے ہیں کرک۔'' پیک نے چیخ کر کہا لیکن کوئی جواب نہیں آیا اس کے ساتھ ہی ریکل نے پیک کو اشارہ کیا اور وہ دونوں ایک ساتھ تیسری منزل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر پہنچ گئے جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر ہال میں داخل ہوئے تھے ریکل کی نظریں فرش پر پڑی ہوئی رائفل پر گئی تھیں اور سامنے ایک سایہ کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں پستول تھی' اس نے ریکل کی سمت فائر کیا تھا اور وہ تیزی سے ایک صوفے کے پیچھے ہوگئی تھی اس کے ساتھ ہی پیک نے اس سائے پر فائر کیا تھا اور سایہ نیچے گر گیا تھا ریکل تیزی سے آگے بڑھی تھی اور رائفل کی روشنی اس سائے پر ڈالی تھی وہ کرک نہیں تھا بلکہ وہ ایک عورت تھی جس کے بالوں کا رنگ سونے جیسا سنہرا تھا اس کا چہرہ گول تھا اور ناک چھوٹی تھی وہ خوفزدہ نظر آرہی تھی اور زخمی تھی ایک آفیسر نے اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا تھا' کمرے میں ڈبہ بند کھانے رکھے ہوئے تھے وہاں سے چھ بچے ملے تھے جن کے جسموں اور چہروں پر مٹی لگی ہوئی تھی پولیس نے گھر کا چپہ چپہ چھان لیا تھا لیکن کرک وہاں نہیں تھا۔

''فادر کہاں ہے؟'' ریکل نے اس عورت سے پوچھا جو زخمی ہوئی تھی اس کی عمر بیس سال سے زیادہ تھی اس نے اپنی ٹانگ پر لگا گولی کا زخم پکڑا ہوا تھا اور کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''ان بچوں کو جلد از جلد یہاں سے نکالو اور ایمبولینس منگواؤ۔'' ریکل نے چیخ کر کہا پھر ریکل قیدی بچوں کا جائزہ لینے لگی تھی اسے نمبر 4 کی بنائی ہوئی تصویر یاد آئی تھی جو بڑی لڑکی زخمی ہوئی تھی وہ نمبر 2 تھی' ریکل اس میں اور یوگی میں مماثلت دیکھ سکتی تھی۔ ایک کالے بالوں والا لڑکا جوان سب کی حفاظت کر رہا تھا نمبر 3 تھا ایک سترہ سالہ لڑکا جو دبلا پتلا تھا نمبر 5 تھا اور ایک چودہ سالہ لڑکی نمبر 6 تھی اس کے بعد 10-8 اور 11 نمبر لڑکیاں تھیں جن کی عمریں دس سال سے کم تھیں گیارہویں لڑکی کی عمر پانچ سال رہی ہوگی۔

ریکل نے گھر کے اطراف میں بھی آفیسرز کو بھیج کر کرک کو تلاش کروایا تھا لیکن اس کی کوئی نشانی نہیں ملی تھی۔ تمام بچے گھر کے ایک کونے میں ایک کمبل میں چھپے بیٹھے تھے جنہیں بعد میں گاڑیوں میں بٹھا کر وہاں سے روانہ کر دیا گیا تھا۔

□......□......□

ہائی لینڈ پولیس ڈپارٹمنٹ میں کرسمس کی شام منائی جا رہی تھی سارے آفیسرز ہال میں موجود تھے اور ان کا باس میک کونل انہیں کامیاب آپریشن پر مبارک باد دے رہا تھا۔

''تم سب نے جس بہادری سے بچوں کو بازیاب کیا ہے میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔''

''شکریہ کونل...... لیکن ابھی ہمارا کام ادھورا ہے ابھی ہمیں کرک نہیں ملا ہے اور جب تک ہم اسے گرفتار کر کے انجام تک نہیں پہنچاتے ہماری کامیابی ادھوری ہے۔'' ریکل نے کہا۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو لیکن ہدایات جاری کر دی گئی ہیں ایک ایک پولیس آفیسر اس کی تلاش میں ہے۔'' کونل نے بتایا۔ ''وہ اپنے انجام سے بچ نہیں سکے گا لیکن تم لوگوں نے جو زندگیاں بچائی ہیں ان کی بھی بڑی اہمیت ہے۔''

''ان بچوں کا کیا ہوگا جو بازیاب ہوئے ہیں؟'' ریکل نے پوچھا۔

''ان میں سے کچھ کے والدین نے ہم سے رابطہ کیا ہے وہ جلد انہیں لینے آئیں گے اور دوسرے بچوں کے علاج کے لیے لوگ چندہ دے رہے ہیں وہ ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں پھر انہیں فلاحی اداروں کے حوالے کر دیا جائے گا بہترین ڈاکٹرز ان کا علاج کریں گے جو لڑکی تمہارے

فائر سے زخمی ہوئی تھی وہ اب ٹھیک ہے۔''

''اچھا میں چلتا ہوں' میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی تم دونوں کرسمس کی خوشیاں مناؤ۔'' کونل نے کہا اور اپنی کار کی چابیاں گھماتا وہاں سے چلا گیا۔

ریکل کو محسوس ہو رہا تھا کہ کمرے کے ایک کونے میں حنا' راجر اور یوگی کھڑے تھے وہ خوش نظر نہیں آ رہے تھے۔

''میرے مہمان مجھ سے خوش نہیں ہیں۔'' ریکل نے پیک سے کہا اور وہ اس کا مطلب سمجھ گیا۔

''وہ تم سے اس لیے ناراض ہوں گے کہ تم نے کرک کو نہیں پکڑا۔'' پیک نے کہا۔

''ہاں' میں نہیں سمجھ سکی کہ ہم نے اسے کیسے کھو دیا۔'' ریکل نے کمرے کے کونے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم نے سب جگہ اسے ڈھونڈا لیکن وہ نہیں ملا۔''

''وہاں ایک اور بھاری گاڑی کے نشانات تھے اس نے ہمیں دیکھا ہوگا اور وہاں سے نکل گیا ہوگا۔'' پیک نے کہا۔

''لیکن اپنے بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا؟ جبکہ وہ ان سے محبت بھی کرتا تھا تمہیں اندازہ نہیں ہے جب یوگی مرا تھا تو وہ کیسے رویا تھا۔'' ریکل نے کہا۔

''ہاں' جو کچھ اس نے کیا اس سے وہ فرشتہ ثابت ہوتا ہے۔'' پیک نے طنز کیا۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے' وہ بھی ذہنی مریض ہے اور اسے روکنے کی ضرورت ہے علاج کی ضرورت ہے۔'' ریکل نے کہا پھر وہ دونوں اپنے ساتھیوں کو الوداع کہہ کر پولیس اسٹیشن سے نکل گئے تھے۔

''چلو تم مجھے میرے گھر ڈراپ کرتے ہوئے جانا۔'' ریکل نے پیک سے کہا۔

جب وہ دونوں کار میں بیٹھے تو ریکل نے آنکھیں بند کر کے کار کی سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکا لیا اس کے تصور میں کرک اور اس کے قیدی بچوں کی جھلک نظر آئی اور اس نے اپنی نوٹ بک نکال کر فادر کی فیملی کی تصاویر بنانا شروع کر دیں اسے فارغ وقت میں بھٹکی ہوئی روحوں کی تصاویر بنانے کا شوق تھا وہ تین جرنل بھر چکی تھی اور اس کی بنائی ہوئی یہ تصاویر مختلف میگزینز میں شائع بھی ہوتی تھیں اب ان میں گیارہ مزید تصاویر کا اضافہ ہو گیا تھا پیک کار چلاتے ہوئے ریکل کی طرف بھی متوجہ تھا وہ تصویریں اسے بھی متاثر کر رہی تھیں وہ ہیڈلے ہاؤس کی طرف جا رہے تھے جو ریکل کی رہائش تھی سڑک سنسان تھی دونوں اطراف لگے ہوئے درخت برف سے ڈھکے ہوئے تھے اور ریکل سوچ رہی تھی کہ اب اس کا گھر تھوڑے ہی فاصلے پر ہے کچھ دیر بعد وہ اپنے آرام دہ گرم بستر میں ہوگی اور بہت عرصے بعد سکون کی نیند نصیب ہوگی' اچانک کہیں سے یوگی کار کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور اسے دیکھ کر ریکل کی چیخ نکل گئی تھی۔

''روکو...... کار روکو......'' اس نے چیخ کر پیک سے کہا تھا اور پیک نے بے ساختہ بریک لگائے تھے ریکل نے دیکھا یوگی گاڑی سے ٹکرایا تھا اور اچھل کر اس کی چھت کی طرف چلا گیا تھا گاڑی جھول گئی تھی اور ان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک پرانا پک اپ ٹرک سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا تھا اور اس نے سڑک کو بند کر دیا تھا۔

''تم نے دیکھ لیا ورنہ ہم دونوں مارے جاتے۔'' پیک نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

''کچھ گڑبڑ ہے پیک۔'' ریکل نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہا اور پیک نے سڑک کے بیچ میں گاڑی روک دی۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو کچھ گڑبڑ ہے۔'' پیک نے اپنی پستول سنبھالی اور گاڑی سے اترنے لگا پھر وہ آہستہ آہستہ ٹرک کی طرف بڑھا تھا ٹرک کے اندر روشن پیلی روشنی ہر چیز کو واضح دکھا رہی تھی ٹرک اندر سے خالی تھا ریکل کو ہونے والا خطرے کا احساس بڑھتا جا رہا تھا اس نے جلدی سے اپنی سائڈ کی کھڑکی کا شیشہ کھولا اور چیخی۔

''پیک فوراً واپس آ جاؤ۔'' لیکن پیک نے شاید سنا ہی نہیں کیونکہ وہ مسلسل ٹرک کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''میں سراغرساں ریکل بول رہی ہوں۔'' ریکل نے جلدی سے پولیس ریڈیو میں بولنا شروع کیا۔

''ہمارے راستے میں ایک خراب گاڑی کھڑی ہوئی ہے جس نے سڑک بلاک کر دی ہے ہمیں مدد کی فوری ضرورت ہے۔'' ریکل نے کہا۔

''ہم ڈسپیچ سے بات کر رہے ہیں آپ کی طرف موقع

پر موجود آفیسر بھیجا جا رہا ہے۔'' اسے جواب ملا۔
خطرہ محسوس کرنے کے باوجود ریکل اپنے ساتھی کی مدد کرنے کے لیے گاڑی سے اتر گئی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا اور ہوا بھی تیز تھی جس میں آگے بڑھنا ریکل کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ آسمان پر نہ چاند تھا اور نہ کوئی تارہ اور برف کے بڑے بڑے گالے ریکل سے ٹکرا رہے تھے۔ لائٹ کا واحد ذریعہ پیک کی امپالہ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی تھی یا پھر خالی کھڑے ٹرک کے اندر روشن ہلکی لائٹ...... پیک ٹرک کے دروازے کے ہینڈل تک پہنچ گیا تھا' ریکل کو پھر خطرہ محسوس ہوا۔
''پیک جھک جاؤ۔'' ریکل نے کہا اور پیک اس کی آواز پر فوراً بیٹھ گیا اس کے ساتھ ہی ایک زوردار آواز کے ساتھ فائر ہوا تھا۔
''تم ٹھیک ہو؟'' ریکل نے جلدی سے پوچھا۔
''ہاں' واپس کار میں چلو۔'' پیک نے کہا اور ریکل اس کے ساتھ رینگتی ہوئی کار کی طرف بڑھنے لگی اسی وقت پھر فائر ہوا ریکل نے سر نیچے کر لیا اسے ابھی تک اندازہ نہیں ہوا تھا کہ فائر کس سمت سے کیے جا رہے ہیں اس نے رینگنے کی رفتار بڑھا دی تھی' پیک نے بھی اس کی تقلید کی تھی اسی وقت پھر ایک فائر ہوا۔
''وہ کہاں ہے؟'' پیک نے تجسس کا اظہار کیا۔
''میں نہیں جانتی۔''
پیک جب امپالہ کے قریب پہنچا اور اس کی نظر کار کے اگلے ٹائر پر پڑی تو اسے احساس ہوا کہ کس چیز پر فائر کیے جا رہے تھے کار کے تین ٹائر ان فائروں کا نشانہ بن چکے تھے ریکل نے درختوں کی قطار کی طرف غور سے دیکھا تاکہ شوٹر کا سراغ مل سکے پھر ایک فائر ہوا اس کے ساتھ شعلہ بھی چمکا گولی ریکل کے سر کے اوپر سے نکل گئی تھی ریکل نے اسی سمت میں پے در پے کئی فائر کر دیئے پیک نے بھی ایسا ہی کیا تھا ایک درخت کی شاخ ٹوٹ کر گری تھی اور جھاڑیاں ہلی تھیں پھر کسی کے گرنے کی آواز آئی تھی ریکل اور پیک تیزی سے اس سمت بھاگے تھے ہر قدم کے ساتھ ریکل کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا پیک اپنی پسٹول کی ہلکی روشنی میں نیچے برف پر کچھ دیکھ رہا تھا پھر اس کی نظر خون کے سرخ دھبے پر پڑی جو لکیر کی صورت میں جنگل کی طرف چلی گئی تھی وہ دونوں اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے لیکن ایک جگہ جا کر وہ لکیر بھی غائب ہو گئی تھی وہ سڑک سے کافی دور آ چکے تھے نیچے برف پر قدموں کے نشان تھے جو ہر سمت جا رہے تھے گویا شوٹر انہیں چکمہ دینے کی کوشش کر رہا تھا طوفان میں شدت آ گئی تھی جس کی وجہ سے کوئی جانور باہر نہیں تھا' ریکل اور پیک ایک دوسرے سے پشت ملائے کھڑے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے پھر اندھیرے میں جیسے کسی چیز نے حرکت کی' ریکل نے اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہوئی پھر اس کے سامنے موجود درخت کے قریب کسی نے حرکت کی تھی اور ریکل نے فوراً اندازے سے ادھر فائر کر دیا تھا گولی سیدھی راجر ٹیفٹ کے سر پر لگی تھی جو شاید ایک مظلوم روح ہونے کے ناطے اس کی مدد کرنے آیا تھا وہ سیدھا آگے بڑھتا گیا تھا اور ریکل اس کے پیچھے بڑھی تھی' راجر کے سر میں بننے والا گولی کا سوراخ چند ہی لمحوں میں بھر گیا تھا۔
فائروں کی آواز پھر سنائی دی تھی اور پیک تیزی سے اس سمت بڑھا تھا ریکل نے بھی ایسا ہی کیا تھا لیکن اندھیرے میں ایک درخت سے ٹکرا کر گر گئی تھی۔
''اگر ہم نے اسے جلد ہی نہیں ڈھونڈا تو ایک بار پھر ہم اسے کھو دیں گے۔'' پیک نے سرگوشی کی کیونکہ تیزی سے گرتی ہوئی برف ان کے پیروں کے نشان بھرتی جا رہی تھی پھر ایک سمت سرسراہٹ ہوئی اور پیک تیزی سے اس سمت بڑھا اس بار ایک ریوالور کا دستہ زور سے کسی نے اس کی کنپٹی پر مارا تھا اور وہ گر کر بے ہوش ہو گیا تھا جب ریکل وہاں پہنچی تو اس نے پیک کو گرے دیکھ کر اپنا دستانہ اتارا اور اس کی گردن کے قریب اس کی نبض محسوس کی جو چل رہی تھی اس کا مطلب تھا وہ بے ہوش تھا اب جنگل میں ریکل دشمن کے ساتھ تنہا تھی پھر اچانک کسی نے پشت کی جانب سے اس پر چھلانگ لگائی تھی اس کا پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا اور آنے والے نے اس پر مکوں سے بارش کر دی تھی وہ اس کے چہرے پر مکے مار رہا تھا' اس نے دھات کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی جو اس کے چہرے کو زخمی کیے

جارہی تھی۔

''یہ مکا میری ٹیم کے لیے۔'' اس شخص نے کہا۔

''اور یہ میری فیملی کے لیے۔'' اس نے دوسرا مکا مارا اور پھر مارتا چلا گیا تھا ریکل نے ایک مکا اس کی گردن میں مارا تھا وہ ذرا سا لڑکھڑایا تھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اس کی گرفت سے نکل گئی تھی۔ پھر اس کی ہی گن چھین کر ریکل نے اس کے سر پر فائر کردیا تھا وہ اپنی جگہ کھڑا جھومنے لگا تھا لیکن گھنے درختوں کی طرف جارہا تھا' ریکل نے پھر کئی اور فائر اس پر کیے تھے' ریکل کو محسوس ہو رہا تھا جیسے جنگل میں سے بہت سی آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی ہیں اسے خود سے دور پانچ ہیولے کھڑے نظر آرہے تھے جنہوں نے اسے دائرے میں لیا ہوا تھا لیکن برف کی دھند میں وہ واضح نہیں تھے لیکن ریکل نے اندازہ لگایا تھا کہ ان میں سے چار ہیولے روحوں کے تھے جبکہ ایک فادر تھا اس نے فادر پر فائر کردیا تھا اور وہ زمین پر گر گیا تھا اس نے دوسرا فائر کیا تھا جو اس کے بازو میں لگا تھا وہ کراہ رہا تھا۔

''چلاؤ...... گولی چلاؤ...... اور مجھے ماردو۔'' اس نے درد کی شدت سے کراہتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں ماروں گی نہیں میں تمہیں گرفتار کرتی ہوں یوگی' راجر اور حنا کے قتل کے الزام میں اور مختلف بچوں کو اغوا کرنے اور ان پر ظلم کرنے کے الزام میں۔'' ریکل نے کہا۔

''مجھے ماردو......'' فادر دوبارہ کراہا لیکن ریکل نے فوراً ہی اسے ہتھکڑیاں لگادیں۔

''تم جو بھی بولو گے وہ تمہارے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔'' ریکل نے کہا۔

''مجھے ماردو...... خدا کے لیے مجھے ماردو۔'' فادر پھر بولا شاید اسے اپنے انجام سے ڈر لگ رہا تھا۔ ریکل نے اس کی ہتھکڑی سے بندھی زنجیر کو ایک قریبی جھاڑی کے ساتھ لاک لگادیا تھا اور آگے بڑھ گئی تھی۔ اسے اپنی پشت سے فادر کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''چیختے رہو کرک' یہاں کوئی سننے والا نہیں۔'' ریکل نے کہا واپسی پر وہ پیک کو سہارا دے کر اپنے ساتھ لائی تھی۔

''تمہارے چہرے کو کیا ہوا؟'' پیک نے پوچھا۔

''چپ رہو اور چلتے رہو۔'' ریکل نے کہا پھر دور روڈ پر کھڑی اسکاڈ کار کی لائٹیں اسے نظر آئی تھیں اور وہ ادھر بڑھتی چلی گئی تھی آفیسر جان انہیں دیکھ کر ان کی طرف بڑھا تھا۔

''میڈیکل ٹیم بھی پہنچنے والی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اس کی ضرورت ریکل کو ہے۔'' پیک نے کہا۔

''کرک جنگل میں ہے اس سے پہلے کہ وہ سردی سے اکڑ جائے اسے لے آؤ۔'' ریکل نے جگہ بتاتے ہوئے کہا۔

جلد ہی وہ کرک کو لے آئے تھے' موقع پر ہی ریکل اور پیک کو طبی امداد دے دی گئی تھی۔

''مجھے یقین ہے تم دونوں اسپتال تو جانا نہیں چاہو گے؟'' جان نے پوچھا۔

''احمق یہ تو نیو ایئر کی شام ہے ہم یہ منانا چاہتے ہیں۔'' ریکل نے پیک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ اسکاڈ کار میں بیٹھ گئی۔

''ہمیں میرے گھر ڈراپ کردو۔'' ریکل نے کہا۔

پھر جب ریکل اور پیک ریکل کے گھر میں داخل ہو رہے تھے تو دور جنگل میں کھڑی ٹیفٹ فیملی کی روحیں آہستہ آہستہ غائب ہوگئی تھیں انہیں انصاف مل گیا تھا' کیس کلوز ہوگیا تھا اور ریکل پیک کے ساتھ نئی زندگی میں قدم رکھ رہی تھی۔



لغزش

مہتاب خان

ماضی کی کوئی غلطی یا لمحاتی لغزش اچانک عملی شکل میں سامنے آجاتی ہے تو انسان اپنے آپ سے بھی منہ چھپانے لگتا ہے۔

اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا حالانکہ اسے کوئی شرمندہ کرنے والا بھی نہیں تھا

آسمان صبح سے بادلوں سے گھرا ہوا تھا بارش کسی وقت بھی شروع ہوسکتی تھی۔ میری طرح صفیہ کو بھی اندیشہ ہوا کہ بارش شروع ہوجائے گی۔ اسی لیے اس نے آواز دے کر کہا۔

''جلدی ناشتہ کرلیں ورنہ بارش شروع ہوگئی تو آفس جانا مشکل ہوجائے گا۔''

مجھے بھی اس دن جلدی آفس پہنچنا تھا۔ جیسے تیسے ناشتہ کرکے میں باہر نکل گیا۔ گاڑی کے قریب پہنچا تو دیکھا باہر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میرا گھر لب سڑک واقع ہے' جہاں سے بڑی ہیوی ٹریفک گزرتی تھی' کھلے گیٹ سے سامنے سڑک کا منظر نظر آرہا تھا۔ جہاں لوگوں کا ایک چھوٹا سا مجمع اکٹھا تھا' صفیہ بھی میرے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔

مجمع سے ایک شخص ہماری طرف آتا نظر آیا جب وہ قریب پہنچا تو میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا ہوا ہے وہاں؟''

''ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے' کوئی عورت ہے' ٹرک نے مارا تھا۔''

''لوگ مجمع لگائے کیوں کھڑے ہیں' اسے اسپتال لے کر جانا چاہیے نا؟''

صفیہ اپنی فطری رحم دلی کے ہاتھوں مجبور ہوکر بولی۔

''مرچکی ہے......اس نے کہا حاجی صاحب نے دیکھا تھا۔ اس نے پڑوس میں رہنے والے حاجی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ان کا کہنا ہے کہ لڑکی جان بوجھ کر سامنے آئی تھی۔ ٹرک ڈرائیور کا کوئی قصور نہیں تھا۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اسی وقت صفیہ کی نظر ہمارے گیٹ کے باہر بنے مختصر سے چبوترے پر گئی جس پر کوئی پوٹلی سی رکھی تھی۔ وہ لپک کر وہاں گئی۔

''ارے دیکھیں قاسم یہ تو بچہ ہے۔''

تم اندر جاؤ اسے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں۔ پولیس خود نمٹ لے گی۔ لگتا ہے یہ اسی عورت کا بچہ ہوگا۔ نہ جانے کس کا پاپ ہے۔ آفس جانے کی جلدی بھول کر میں بھی اس کے نزدیک آ گیا تھا۔

بچے کو ایک میلی کچیلی اوڑھنی سے ڈھکا ہوا تھا' صفیہ نے اس کے منہ سے اوڑھنی ہٹائی بچہ خاصا خوبصورت تھا۔

بھورے بھورے بالوں والا چھوٹا سا سر' میدے جیسا رنگ' اور ٹمٹماتی ہوئی گول گول آنکھیں۔ میں نے ایک آدھ بار جھک کر اسے غور سے دیکھا۔ میلے کچیلے دوپٹے کی گٹھڑی تھی منہ چھوڑ کر بچے کا کوئی حصہ دکھائی نہ دیتا تھا' معلوم ہوتا تھا کہ دو تین موٹے کپڑوں میں اسے اچھی طرح لپیٹ کر رکھا گیا ہے۔

''نوزائیدہ نہیں ہے ایک دو ماہ کا لگتا ہے۔'' صفیہ نے قیاس آرائی کی۔ حیرت تو اس بات پر تھی کہ وہ بالکل نہیں رویا تھا۔

''لگتا ہے اس کی ماں نے اس کا خوب پیٹ بھر رکھا ہے۔ دیکھو نا کب سے پڑا ہے مگر رونے کا نام نہیں لے رہا۔'' صفیہ کی پیاسی آنکھیں یک ٹک بچے پر جمی ہوئی تھیں۔



"تم اندر جاؤ خواہ مخواہ ہم کسی جھمیلے میں نہ پڑ جائیں۔ اس کی ماں بھی عجیب تھی جو اسے یہاں چھوڑ گئی۔ ایدھی کا جھولا ہے تو اس مقصد کے لیے...... خیر اسے یہیں رہنے دو ابھی پولیس آئے گی اور اسے کسی یتیم خانے میں چھوڑ آئے گی۔"

ابھی تک مجمع کی توجہ ہم پر نہیں گئی تھی۔ اس لڑکی کی لاش کو ایمبولینس میں رکھوایا جا رہا تھا' میں نے گھڑی پر نظر ڈالی اور تیزی سے اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

صفیہ ابھی تک بچے کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے میری جانب دیکھا میں کار اسٹارٹ کر چکا تھا۔ ایسا لگا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو اور کہتے ہوئے ڈرتی بھی ہو۔

اپنی بیوی کی بے چین پیاس کو میں بہ خوبی محسوس کر سکتا تھا...... ہماری شادی کو سات سال ہو گئے تھے اور ہم بے اولاد تھے......اور اولاد ہونے کی امید بھی نہیں تھی۔

ہمارا پہلا بچہ ضائع ہو گیا تھا' اور کچھ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر کو صفیہ کی زندگی بچانے کے لیے اس کا آپریشن کرنا پڑا تھا جس کے نتیجے میں وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

اس کی ماں بننے کی تمنا اداس خاموشی کے پنجرے میں قید ہو گئی تھی اور اس کی بے چین ممتا نے ایک عجیب روپ دھار لیا تھا۔ اس نے اپنی ساری توجہ کا مرکز مجھے بنا لیا تھا۔ وہ میری دیکھ بھال اس طرح کرتی تھی جیسے میں اس کا شوہر نہیں بچہ ہوں۔

اس نے میرے ساتھ بیوی کی محبت سے زیادہ ماں کی شفقت کا سلوک شروع کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ کھو کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور یہی بات مجھے کبھی کبھی تکلیف پہنچاتی تھی۔ حالانکہ میں نے کبھی صفیہ کو اس کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

کئی بار مجھے خیال آیا تھا کہ کسی یتیم خانے سے ہم کوئی بچہ گود لے لیں مگر وہ نہیں مانی...... اس کا کہنا تھا کہ میں عورت ہوں گود میں بچہ آتے ہی میری ممتا بیدار ہوئے بغیر نہیں رہے گی مگر آپ خون کے رشتے کے بغیر کیسے اس سے شفقت کا اظہار کریں گے...... بات بھی صحیح تھی۔ اس کے بعد میں نے یہ خیال ترک کر دیا تھا لیکن آج نہ جانے کیوں اس بچے کو دیکھ کر صفیہ کی ان پیاسی نظروں سے ڈھلنے والی خاموش آواز نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔

ٹھیک بیس منٹ میں میں دفتر پہنچ گیا تھا۔ دروازے پر پہنچتے ہی پیون نے کہا۔ "صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔"

میں ریلوے کے محکمے میں افسر ہوں۔ میرا کام ریلوے ٹریک کی دیکھ بھال اور بحالی سے متعلق ہے۔ میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ میرا زیادہ تر وقت دفتر سے باہر ہی گزرتا ہے۔ آفس میں وقت گزارنا کم ہی نصیب ہوتا ہے۔

میرے باس سلمان صاحب کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ مجھ پر مکمل بھروسہ کرتے تھے...... اسی لیے ذمہ داری والے زیادہ تر کام میرے ہی سپرد کیے جاتے

تھے۔ آج بھی شاید کوئی ایسا ہی کام پڑ گیا تھا۔ بہر حال میں ان کے کمرے میں گیا تو وہ کسی فائل کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر چونکے اور کہا۔ ''بیٹھو...... تمہیں یاد ہے ایک سال پہلے اندرون سندھ کے اس اسٹیشن کے نزدیک مال گاڑی کی تین بوگیاں ٹریک سے اتر گئی تھیں۔ تمہیں ابھی اسی جگہ جانا ہے۔''

''جی یاد ہے لیکن اسے تو ایک سال ہو گیا...... اب کیوں جانا ہے؟'' ''اسی جگہ ٹریک کے بارے میں شکایات موصول ہوئی ہیں۔ تمہیں وہاں جا کر ٹریک کا معائنہ کرنا ہے اگر کوئی خرابی ہو تو اسے دور کرنا ہے۔ تم اپنی ٹیم کو لے کر فوراً ہی روانہ ہو جاؤ۔ میکینکل اسٹاف وہیں موجود ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''بارش کسی بھی وقت شروع ہو سکتی ہے۔'' وہ کھڑکی سے آسمان کی سمت دیکھ کر بولے۔

''دعا کریں وہاں بارش نہ ہو ورنہ معائنہ اور بحالی کے کام میں مشکلات پیش آئیں گی۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا میں گھر سے اپنا بیگ منگوا لوں۔''

وہ سر ہلا کر بول اٹھے۔ ''نہیں نہیں تم فوراً روانہ ہو جاؤ میرا اندازہ ہے کہ وہاں تمہارا قیام زیادہ طویل نہیں ہوگا اور اس مختصر قیام میں تمہیں کپڑوں وغیرہ کی ضرورت تو نہیں پڑے گی۔ پھر بھی میں تمہارا سامان دوسری گاڑی سے بھجوا دوں گا۔'' زیادہ حجت کی گنجائش نہیں تھی۔ ریسکیو آپریشنز میں میں اس قسم کی سچویشن کا عادی تھا۔

اسی وقت میں اپنی ٹیم کو لے کر روانہ ہو گیا تھا چند ہی گھنٹوں میں ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔ یہاں بھی بادل گھر کے آئے ہوئے تھے، مگر ہنوز بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ساتھیوں کو ہدایات جاری کیں، کچھ ہی دیر میں معائنے کا کام شروع ہو گیا تھا۔ ٹریک کو واقعی مرمت کی ضرورت نہیں۔ ساتھیوں کو میں نے بحالی کے کام پر لگا دیا تھا۔ ویسے تو کام کی جگہ مجھے موجود رہنا چاہیے تھا مگر نہ جانے کیوں میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ آج دن کا آغاز ہی کچھ ایسا ہوا تھا، بہر حال میں نے معاون کو دیکھ بھال کا کام سونپ کر خود کچھ فاصلے پر بنے چھپر کے نیچے آ گیا۔

ڈھلتی شام کے دھند لکے میں یہ ویران علاقہ اور زیادہ ویرانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر وہاں چہل قدمی کرتا رہا پھر چھپر کے نیچے بچھی بوری پر جا کر لیٹ گیا۔ رہ رہ کر مجھے اس بچے کا کھلے پھول جیسا چہرہ اور اس کی مرنے والی ماں کا خیال آتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی بیوی کا خیال آ گیا۔ فطرتاً وہ بہت شفیق تھی۔ کہیں اس نے بچے کو اپنانے کا فیصلہ نہ کر لیا ہو۔ ہم خواہ مخواہ کسی مشکل میں نہ پھنس جائیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ پولیس آ کر اسے اٹھا لے گئی ہو۔

دھیرے دھیرے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اسی وقت کنارے کی ٹیکری کے نیچے والی سڑک سے ایک گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو ہمارا سامان لیے گاڑی آ گئی تھی۔ اس میں کھانا اور چائے کے سامان کے علاوہ ہمارا ذاتی سامان بھی تھا اس میں میرا بیگ اور بستر بھی موجود تھا۔ میرا بیگ اور بستر ایک ملازم چھپر کے نیچے لے آیا تھا۔

کچھ دیر بعد نیچے جا کر میں نے جاری کام پر نظر ڈالی پھر سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور ایک ملازم سے کہا آدھے گھنٹے بعد چائے بنا کر اوپر چھپر پر دے جانا۔

نیند آنے لگی تھی مگر رات بھر جاگنا ضروری تھا۔ پھر بھی کچھ دیر لیٹنے کے خیال سے میں نے بستر کھول لیا۔ بستر کھولتے ہی اوپر رکھی ہوئی نئی شال کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ صفیہ کو میرا کتنا خیال تھا۔ حالانکہ اس شال کی ضرورت نہیں تھی۔ موسم زیادہ سرد نہیں تھا، لیکن شاید بارش کے بعد ہونے والی ٹھنڈ کے خیال سے اس نے رکھ دی تھی۔

پچھلے برس میں تقریباً انہی دنوں یہاں آیا تھا اور میرے علم کے بغیر ہی صفیہ نے بستر میں ایک شال رکھ دی تھی جس کے کناروں پر اس نے کشیدہ کاری کی تھی جو کسی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی۔ گمبھیر تاریکی میں دھیرے دھیرے ایک کے بعد ایک، سب کچھ میری نگاہوں میں تیر رہا تھا۔

یہی دن تھے جب اسی جگہ وہ حادثہ ہوا تھا اور میری ٹیم ٹریک کی بحالی کا کام کر رہی تھی اور میں ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس رات اچانک ہی تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے کام عارضی طور پر روکنا پڑا تھا...... مزدور

بارش سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ میں بھی بارش سے بچنے کے لیے جائے پناہ ڈھونڈتا اسی ٹیکری پرآ گیا تھا۔ پہلے یہاں چھپر نہیں تھا۔ مسلسل بارش میں بھیگنے کی وجہ سے میں ٹھٹھرنے لگا تھا۔

بارش کے ساتھ ساتھ سنسناتی ہوئی ٹھنڈی ہوا بھی اتنی ہی قاتل تھی' میں نے اپنے بیگ سے شال نکال کر جسم پر لپیٹ لی تھی پھر بیگ کندھے سے لٹکا کر ٹیکری کے دوسری سمت سے اتر گیا تھا۔

تیز طوفانی بارش میں بھیگتا ہوا کی تیز سنسناہٹ میں تھر تھر کانپتا میں گھٹنوں تک آئے پانی میں آگے بڑھتا رہا۔ پیروں تلے پانی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کی چکنی مٹی والی زمین تھی اور اوپر گرجتا آسمانی بجلی سے کڑکتا آسمان۔

میرے سامنے منزل کا کوئی نشان نہیں تھا۔ گاؤں کا راستہ نہ جانے کہاں رہ گیا تھا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے نہ جانے کب تک چلتا رہا۔

ایک گھنٹے بعد پیر پانی سے بامشکل باہر نکلے تھے' فضا میں بار بار چمکتی لحاتی مگر تیز روشنی میں میں نے اتنا تو دیکھ لیا تھا کہ زمین پر پانی کی مقدار زیادہ نہیں تھی۔

بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا' تھکن سے میرا برا حال تھا' پانی سے باہر آ کر مجھ میں ہمت پیدا ہوئی...... چہرے سے پانی پونچھ کر میں نے اطراف میں نظر دوڑائی' بارش کی دھار چیر کر میری نظر نے دور کچھ اونچائی پر ایک مدھم سی روشنی دیکھ لی تھی۔ زیادہ غور کیے بغیر میں اس سمت دوڑ پڑا۔

سطح زمین سے کچھ اونچی وہ بھی ٹیکری جیسی ہی جگہ تھی۔ بلندی پر چڑھنے کی وجہ سے میری سانس پھول گئی تھی۔ میں کچھ ہی دیر میں اس روشنی کا تعاقب کرتا وہاں پہنچ گیا تھا۔ یہ ایک جھونپڑی تھی اور میں اس کے ٹین کے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ ایک لمحے رکے بغیر میں نے دروازے پر مکے برسا دیئے۔ ٹین کا دروازہ زوردار آواز سے بج اٹھا۔ کچھ ہی دیر میں اندر سے کسی کی سہمی ہوئی سی سریلی آواز آئی۔

''کون ہے؟'' یہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔

''بارش میں رستہ بھٹک گیا ہوں۔ دروازہ کھولو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔
میرے سامنے سترہ اٹھارہ سالہ معصوم صورت دوشیزہ دروازے پر کھڑی تھی۔
اس کے چہرے پر تیرتے ہوئے اندیشے‘ دور سے آتی چراغ کی روشنی میں میری نظروں سے اوجھل نہیں رہے تھے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
’’گھبراؤ مت...... مسافر ہوں کچھ دیر کے لیے ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ میری مدد کرو‘ بارش رکتے ہی چلا جاؤں گا۔‘‘ وہ ایک لمحے میری طرف تکتی رہی پھر جھجکتے قدموں سے ذرا پیچھے ہٹی اور آہستہ سے کہا۔
’’آیئے۔‘‘
میں مسرور قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔
اس نے دراوزہ بند کر دیا‘ میرا پورا جسم پانی سے شرابور تھا۔
میں نے کھڑے کھڑے چاروں طرف نظر دوڑائی...... جھونپڑی کی حالت خاصی خستہ تھی۔ ہم اس وقت مختصر سے صحن میں کھڑے تھے‘ جس کے ایک جانب باتھ روم اور دوسری جانب باورچی خانہ بنا ہوا تھا اور سامنے ایک کمرہ تھا۔
وہ مجھے ساتھ لیے کمرے میں آ گئی تھی۔ کمرہ خاصا بڑا تھا‘ نیچے اینٹیں رکھ کر زمین پکی کی گئی تھی لیکن سیمنٹ کا فرش نہ ہونے کی بنا پر نمی اوپر آ رہی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں چارپائی بچھی تھی اور ساتھ ہی ایک ٹرنک رکھا تھا۔
اس نے اندیشے بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور نرم لہجے میں کہا۔
’’آپ کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جانا ہے؟‘‘
میں نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں کہا۔
’’ابھی میں کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں‘ ذرا تکان ختم ہونے دو۔‘‘ میں نے بیٹھنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔
’’آپ بہت بھیگ گئے ہیں۔ کپڑے تبدیل کریں گے؟‘‘
میں نے کہا۔ ’’کپڑے...... لیکن کپڑے کہاں ہیں...... میرے بیگ میں موجود کپڑے بھی یقیناً بھیگ گئے ہوں گے۔ بڑی طوفانی بارش تھی۔‘‘
’’ٹھہریے۔‘‘ وہ کمرے کے سامنے والے کونے کی طرف چلی گئی جہاں ٹرنک رکھا تھا‘ اس نے ٹرنک کھول کر کپڑے نکالے۔
’’یہ میرے بابا کے کپڑے ہیں۔‘‘ وہ بولی اور میرے قریب آ کر وہ کپڑے میری طرف بڑھا کر بولی۔ ’’گیلے کپڑے اتار کر انہیں پہن لیں۔ غسل خانہ اس طرف ہے۔‘‘ اس نے صحن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
میں اس کے ہاتھ سے کپڑے لے کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت وہ کپڑے مجھے دنیا کے سب سے قیمتی کپڑے محسوس ہوئے تھے۔ میں سردی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ میرے جسم پر فٹ تو نہیں آئے تھے مگر اس وقت ایک نعمت سے کم نہیں تھے۔ میں کمرے میں آ کر چارپائی پر گر سا گیا تھا جس پر صاف ستھرا بستر بچھا تھا۔
’’تمہارے بابا کہاں ہیں؟‘‘ کچھ دیر بعد حواس ٹھکانے آئے تو میں نے اس سے پوچھا۔ اس دوران وہ فرش پر دری بچھا کر بیٹھ گئی تھی۔
’’وہ شہر گئے ہوئے ہیں۔ کل واپس آئیں گے۔ وہ جب بھی شہر جاتے ہیں سانول کی دادی کو میرے پاس چھوڑ جاتے ہیں وہ ان کی غیر موجودگی میں میرے ساتھ ہوتی ہیں۔ مگر شاید آج بارش کی وجہ سے وہ نہیں آ سکیں۔ آپ آرام کریں میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔‘‘
یہ کہتی ہوئی وہ اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔
کچھ دیر بعد وہ گرما گرم چائے لے کر آ گئی چائے کا کپ مجھے تھمایا پھر دوسرے ہاتھ میں تھاما والٹ میری طرف بڑھا کر بولی۔
’’لیجیے آپ کا بٹوہ پتلون کی جیب سے گر گیا تھا۔ میں نے آپ کے کپڑے نچوڑ کر سوکھنے کے لیے ڈال دیے ہیں۔‘‘
میں نے کہا۔ ’’اپنے پاس رکھو جاتے ہوئے لے لوں گا۔‘‘ والٹ اس نے صندوق پر رکھ دیا۔
کچھ دیر بعد میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت مجھے زوردار چھینک آئی۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو زکام ہوگیا ہے۔"

"ہاں۔" چائے پی کر میں نے خالی کپ صندوق پر رکھ دیا اور لیٹ گیا۔ میں نے صحن کی جانب دیکھا جہاں بارش پھر تیز ہوگئی تھی۔

رات کی تنہائی میں اجنبی شخص کو دیکھ کر پیدا ہوجانے والے اندیشے اس کی آنکھوں میں اب کچھ کم ہوگئے تھے۔

وہ مجھ سے کچھ مانوس نظر آرہی تھی۔

میں پیر سکوڑے لیٹا تھا' جسم میں پیوست ہوجانے والی ٹھنڈک کسی طرح کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

اس نے پوچھا۔ "سردی لگ رہی ہے؟"

میں نے کہا۔ "ایک گھنٹے تک بارش میں بھیگا ہوں اس لیے سردی لگ گئی ہے۔"

وہ خاموشی سے اٹھی اور ٹرنک سے ایک کمبل نکال کر مجھے اوڑھا دیا۔

باہر خوف ناک گرج طوفانی ہوا اور بجلی کی کڑک نے ماحول کو اور ہیبت زدہ بنا دیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پار آسمانی بجلی کی لپک نظر آرہی تھی جو دور تک ٹیڑھی میڑھی لکیر سی بناتی چلی جاتی تھی۔ اس کی تیز روشنی میں اس کا روشن چہرہ روشن تر ہوجاتا تھا۔ معصوم سا چہرہ جو اس وقت اتنا خوبصورت لگ رہا تھا کہ میرا دل بے اختیار ہونے لگا تھا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر میں نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مہرو۔" اس نے کہا۔ "اور آپ کا؟"

"قاسم...... یوں کب تک بیٹھی رہوگی سو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہ اچھا نہیں لگ رہا کہ تم زمین پر سو اور میں آرام سے چارپائی پر...... ایسا کرو تم یہاں آجاؤ میں زمین پر لیٹ جاؤں گا۔"

"نہیں میں نیچے دری پر ہی سوتی ہوں' چارپائی پر بابا سوتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد وہ بولی۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"میں ریلوے کے محکمے میں افسر ہوں۔ یہاں ٹرین کو حادثہ پیش آیا تھا' پٹڑی کی مرمت کی نگرانی کے لیے

اچھی بات

- کبھی کسی کو اپنی صفائی نہ دو کیونکہ جو آپ سے پیار کرتا ہے اس کو ضرورت نہیں اور جو نفرت کرتا ہے وہ کبھی یقین نہیں کرے گا۔
- اگر دکھوں کا دریا عبور کرنا ہے تو آنسوؤں کو جذب کرنا سیکھو۔
- مذاق ضرور کرو مگر اتنا یاد رکھو کہ مذاق کرنے اور اڑانے میں فرق ہوتا ہے۔
- کسی کی خاموشی کو تکبر نہ سمجھو' ہوسکتا ہے کہ وہ خود سے (اپنی ذات سے) جنگ کرنے میں مصروف ہو۔
- غریب پر احسان کیا کرو کیونکہ غریب ہونے میں وقت نہیں لگتا۔

زائمہ خان خٹک...... مسلم کالونی' میانوالی

خیال جدائی

- جدا ہونا اتنا اہم اور میٹھا غم ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی میں تمہیں شب بخیر کہتا رہوں گا۔ (ولیم شیکسپیئر)
- محبت میں چند گھنٹے مہینوں کے برابر اور چند دن برسوں کے برابر لگتے ہیں اور ایک لمحے کی جدائی ایک عمر کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ (جان ڈرائی ڈن)
- موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے بیچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کردی ہیں۔ (الیور گولڈ اسمتھ)
- جدائی بعض اوقات دوستی میں رس گھول دیتی اور اسے زیادہ میٹھا بنا دیتی ہے۔ (جے ہوویل)
- جانے والا ان لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتا ہے جنہیں وہ چھوڑ جاتا ہے۔ (ایڈورڈ ڈیولاک)
- ہر جدائی موت سے مشابہت ہے۔ (جارج ایلیٹ)

روبی علی...... سید والا

آیا ہوں۔‘‘

’’اوہ...... اچھا......شاید مال گاڑی تھی۔ بابا بتا رہے تھے۔‘‘

وہ اب دری پر تکیہ رکھ کر نیم دراز ہو گئی تھی۔

اسے اس عالم میں دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے آسمان میں لہراتی بجلی زمین پر اتر کر میرے جسم میں سما گئی ہو۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

باہر طوفان کا شور تھا اور ایک اور طوفان میرے اندر برپا تھا' جس سے میں نبرد آزما تھا۔ اتنے شور میں نیند کیسے آ سکتی تھی۔ کچھ بات کرنے کی غرض سے میں نے اس سے پوچھا۔

’’مہرو یہاں ویرانے میں تم لوگوں نے گھر کیوں بنایا ہے؟‘‘

’’یہاں ہمارا کھیت ہے' اسی لیے۔ پہلے ہمارے چار کھیت تھے لیکن ماں کی بیماری میں وہ بیچنے پڑے اور ماں بھی مر گئی۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ بس اب یہی ایک بچا ہے۔‘‘

مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا بات کرنے کا انداز بہت سادہ اور معصوم تھا۔ مگر آواز میں مجبوری کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

’’صرف ایک کھیت میں کیسے پورا ہوتا ہوگا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اسی لیے تو بابا کو مزدوری کرنے کے لیے شہر جانا پڑتا ہے۔‘‘

ذرا دیر رک کر میں نے پوچھا۔ ’’اس طرح تمہیں اکیلے چھوڑ کر جانے سے بابا کو بڑی فکر ہوتی ہوگی۔‘‘

میں نے آپ کو بتایا تو تھا ان کی غیر موجودگی میں سانول کی دادی میرے پاس آ جاتی ہیں۔ آج بارش کی وجہ سے نہیں آ سکیں۔ ویسے فکر کی کوئی بات بھی نہیں' یہاں گاؤں میں سب اپنے ہیں۔ سب خیال رکھتے ہیں۔ یہاں کھیتوں کے آس پاس کئی گھر ہیں۔ شاید بارش اور اندھیرے کی وجہ سے آپ کو دکھائی نہیں دیئے ہوں گے۔‘‘ وہ ہنس پڑی۔

اس ماحول میں وہ ایک بجلی کی مانند نظر آتی تھی' جو کوند رہی تھی' میں نے کمبل کو اوراچھی طرح لپیٹا اور کہا۔

’’میں کچھ دیر آرام کرلوں ویسے بھی صبح ہونے والی ہے۔ اجالا ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔‘‘

’’آپ کیسے جائیں گے؟ بارش تو رکنے کا نام نہیں لے رہی ہے؟‘‘

بات تو ٹھیک تھی' میں سمجھتا تھا پھر بھی بولا۔ ’’لیکن میں تمہیں بے کار تکلیف کیوں دیتا رہوں جانا تو پڑے گا۔‘‘

وہ حیرت سے بولی۔ ’’تکلیف...... میرے لیے تو اچھا ہوا ورنہ بابا کے آنے تک مجھے تنہا رہنا پڑتا...... میں تو کہتی ہوں بابا کے آنے تک یہیں رہ جایئے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گے کہ اتنا بڑا افسران کے گھر آیا ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’ہاں وہ تو خوش ہوں گے لیکن تب تک تمہاری کیا حالت ہو جائے گی۔ میں آرام سے بستر پر لیٹا ہوں جبکہ تم گیلی زمین پر ہو' ایسے میں میں کیسے سو سکتا ہوں۔‘‘

’’میں یہاں ٹھیک ہوں' آپ سو جائیں۔‘‘ اس نے کہا اور اپنا ایک بازو آنکھوں پر رکھ لیا...... شاید اسے نیند آ رہی تھی۔ اس کی سانسوں کا زیر و بم میرے دل میں ہلچل پیدا کر رہا تھا۔ میری نظریں بار بار بھٹک کر اس کے سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا' میں ایک عجیب کیفیت میں آہستہ آہستہ ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

میں اس کے قریب چلا آیا تھا اور سب کچھ بھول چکا تھا۔

گونجتے کڑاکے میں لرزتا دیا ایک تیز چمک کے بعد بجھ چکا تھا۔ طویل گرج کے ساتھ بجلی کوندی اور وہ خوف کے مارے ایک دم اٹھ بیٹھی' مجھے اپنے اتنے قریب دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ رات گئے بارش رک گئی اور طوفان گزر گیا تھا۔

سویرا اپنے ساتھ میرے لیے ندامت اور تاسف لیے آیا تھا۔ اس کا پورا وجود لرز رہا تھا' اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں تھاما۔

’’مجھے معاف کر دو مہرو مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔

خدا کے لیے مجھے معاف کردو...... میرا اعتبار کرو' میں پھر آؤں گا' تمہیں اپناؤں گا......اور اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گا۔ رونہیں میرا بھروسہ کرو' مہرو چپ ہو جاؤ پلیز۔''

اس کی معصوم آنکھوں میں ان گنت سوال تھے جنہیں برداشت کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں تھا۔ میں اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

میرے بھیگے ہوئے کپڑے سوکھ گئے تھے۔ میں نے تیزی سے کپڑے بدلے اور کمرے میں آیا تو وہ اسی طرح بت بنی بیٹھی تھی۔

میں نے اپنا سامان سمیٹا اور دروازے کی سمت بڑھا...... وہ بیٹھی رہی' میں نے الوداعی نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔

''میں تمہیں اپنانے جلد واپس آؤں گا۔'' میں نے کہا اور تیزی سے دروازہ پار کر گیا۔

میں گھر پہنچا تو صفیہ کی بے چینی کی انتہا کی تھی' طوفانی بارش کی خبر اسے مل چکی تھی۔ مجھے بہ خیریت دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا پھر میرا سامان بیگ سے نکالتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

''اس میں وہ گرم شال نہیں ہے جو میں نے رکھی تھی۔''

میں چونکا وہ شال میں مہرو کے جھونپڑے میں بھول آیا تھا۔ جو اس نے کپڑوں کے ساتھ ہی سوکھنے ڈال دی تھی۔

کیسے جواب دوں؟ کیا جواب دوں؟ میں نے سوچا کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ ''دوڑ بھاگ میں شال کہیں گم ہو گئی ہے۔''

''چلیں کوئی بات نہیں۔ آپ سلامت ہیں میرے لیے یہی بہت ہے' میں آپ کے لیے دوسری شال بنالوں گی۔''

کافی عرصے مجھے مہرو کا خیال بے چین کرتا رہا مگر دوبارہ اس طرف جانا ہی نہیں ہوا اور میں رفتہ رفتہ روزمرہ کی مصروفیات میں گم ہوتا چلا گیا اور اسے فراموش کر بیٹھا۔ اب تو مہرو کا خیال بھی میرے ذہن سے اتر چکا تھا۔

یکا یک میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

''صاحب چائے......'' میں نے چونک کر دیکھا تو یہ ایک مقامی شخص تھا جو میرے لیے چائے لایا تھا۔ چائے کا کپ اس سے لے کر میں نے پوچھا۔

''گزشتہ سال میں یہاں آیا تھا اور طوفانی بارش سے بچنے کے لیے وہاں ٹیکری کے پار کھیتوں کے پاس ایک بوڑھے شخص کے جھونپڑے میں میں نے پناہ لی تھی اس کی ایک جوان لڑکی بھی تھی۔''

''آپ قادر بابا کی بات کر رہے ہیں نا جس کی بیٹی کا نام مہرو تھا۔''

''ہاں یہی نام تھا۔''

''وہ تو مر گیا صاحب چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ اپنا کھیت اور جھونپڑا بیچ کر اس کی لڑکی بھی کہیں چلی گئی ہے۔ معلوم نہیں کہاں گئی ہے۔ یہاں گاؤں میں کسی کو کچھ بتا کر نہیں گئی۔

آگے کچھ اور پوچھنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔ اگلی صبح کام نمٹا کر میں اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔

گھر پہنچا تو یہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ بیڈروم میں ایک جانب بچے کی کوٹ پڑی تھی جس میں بچہ لیٹا ہوا تھا اور صفیہ اس کے قریب کھڑی محبت پاش نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہے صفیہ؟''

''اس دن آپ نے دیکھا تھا نہ ہمارے گیٹ پر جو بچہ پڑا تھا یہ وہی ہے۔''

''تم نے اسے پولیس کے حوالے نہیں کیا؟''

''کر دیتی مگر......'' وہ الماری کی طرف بڑھی۔

''جب میں نے دوپٹہ ہٹایا تو اس میں سے یہ شال نکلی جس میں بچہ لپٹا ہوا تھا۔''

اس نے الماری سے شال نکالی اور میری طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

''یہ وہی شال ہے نا جو آپ نے کھو دی تھی۔''



ہمجان

فارس مغل

آخری حصہ

معروف ناول نگار فارس مغل اردو ادب میں ہوا کے ایک جھونکے کی مانند ہیں ان کے لکھنے کا انداز دوسروں سے یکسر مختلف ہے نئے افق کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ہمیشہ اچھے لکھنے والوں کی پزیرائی کی سو فارس مغل کا ایک انوکھا ناول ''ہمجان'' نئے افق کے قارئین کے لیے قسط وار حاضر ہے یقیناً قاری اسے پسندیدگی کی سند عطا کریں گے بقول خالد شریف فارس مغل کا قلم معجزے تخلیق کرتا ہے وہ نثر میں شاعری کرتا ہے دہلی انڈیا کے ڈاکٹر نگار عظیم کے مطابق فارس مغل نے ہمجان میں زبان و بیاں کو ایک نیا پیراہن عطا کیا ہے کرافٹ اور تکنیک نے اس موضوع کو کمال کا بنا دیا ہے بقول محمود ظفر اقبال ہاشمی فارس نے ہمجان کی کہانی کو کسی فول پروف پراجیکٹ پلان کی طرح کچھ اس مہارت سے تراشا ہے کہ ناول کے مطالعہ کا تجربہ کسی سپر ہٹ فلم کی طرح لگتا ہے۔

آیئے آپ بھی مطالعہ کیجیے اور اپنی رائے دیجیے کہ آپ نے اسے کیسا پایا





ڈاکٹر قدرت کرسی پر اپنی ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے غفران کے سامنے بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں غفران اور زمین کی کہانی اور چہرے پر افسوس کے تاثرات تھے "مجھے زمین کی وفات کا افسوس ہے۔" اس نے دکھ کا اظہار کیا

غفران کا چہرہ پہلے تو کسی بھی قسم کے تاثر سے عاری تھا لیکن آہستہ آہستہ شدتِ غم سے اس کے ہونٹ لرزنے لگے

ڈاکٹر نے اسے دلاسا دیتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ جما دیا "میں حیران ہوں غفران کہ اس زمانے میں بھی ایسی محبتوں کا وجود ہے تمہاری اس کہانی کو پڑھنے کے بعد نا جانے کیوں مجھے اپنا پیشہ بہت حقیر محسوس ہو رہا ہے ہم مسیحائی کا دعویٰ کرنے والے مریض کو مرض کی تشخیص کر کے صرف دوا دیتے ہیں یا چیر پھاڑ کر کے بیماری دور کرنے کو علاج کہتے ہیں لیکن علاج تو کچھ اور شے ہے، وہ تو محبت اور بھرپور توجہ سے ہوا کرتا ہے اور زمین کی طرح مجھے بھی افسوس ہے کہ کاش تم اسے پہلے ملے ہوتے ۔آہ۔اتنی دیر نہ ہوئی ہوتی کہ۔خیر جو ہوا سو ہوا۔"

غفران اپنے آنسوؤں پر مکمل ضبط کیے ہوئے اضطراب کی حالت میں اپنے ہونٹوں کو کاٹنے لگا ڈاکٹر نے ناخن سے اسکا زخم کرید ا تھا زخم کے درد اور زمین کی یاد نے تکلیف بڑھا دی تھی

"غفران، میں ڈاکٹر ہوں اور میرا باپ بھی ایک نامی گرامی ماہرِ نفسیات تھا لیکن مجھ میں کبھی یہ احساس نہیں جاگا کہ میں کسی معذور لڑکی سے محبت کر کے اس کا سہارا بن جاؤں میری جوانی سراسر کتابی تھی ہمیں شروع ہی میں پڑھا دیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر کو مریض کے معاملے میں اپنا دل سخت رکھنا چاہیے کوئی رحم، ہمدردی اور محبت جیسے جذبات کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دینا اور یقین مانو اگر کوئی زمین جیسی لڑکی میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تو اس کے لیے میرے دل میں ہمدردی تو ضرور پیدا ہوتی لیکن محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ مجھے اپنا کیریئر بنانا تھا ڈاکٹر بن کر اپنی پڑھائی پر خرچ ہونے والی رقم کو پورا کرنا اور اس کے بعد اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر انہیں تعبیر کا جامہ پہنانا تھا۔بیوی بچے اور ایک شاندار اور نا مور زندگی گزارنا تھی۔ اور دیکھو، آج میں وہ سب کچھ پلان کے مطابق حاصل کر چکا ہوں بالکل ایک روبوٹ کی طرح!

تمہاری اور زمین کی داستان پڑھ کر مجھے بار بار ایک ہی خیال ستاتا رہا کہ انسانی جسم کے لیے محبت سے زیادہ پُر اثر کوئی اینٹی بائیوٹک نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے چمکتی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔

غفران جواب تک خاموشی سے نظریں جھکائے ڈاکٹر کی باتیں سن رہا تھا حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا "اگر ایسا ہے تو زمین پر کیوں میری محبت کا اینٹی بائیوٹک کارگر ثابت نہیں ہوا؟"

"ہر کام اپنے مقررہ وقت پر اچھا لگتا ہے دوست ۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں ہے کیونکہ آپ خود ابھی تازہ تازہ محبت کے مفہوم سے آشنا ہوئے ہیں۔" غفران کے لہجے میں تیزی تھی۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم سوچ رہے ہو میں ضرور اس کا جواب دوں گا۔"

کمرے میں یکا یک خاموشی چھا گئی جیسے بجلی کے چلے جانے سے چلتا ہوا پنکھا رک جانے پر ہوتی ہے

"ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ تم بہت اچھا لکھتے ہو یونہی اچھا لکھتے رہنا۔" ڈاکٹر نے اسے کہانی لوٹاتے ہوئے کہا

اس نے کہانی کو کسی مقدس صحیفے کی طرح اپنی گود میں رکھ دیا

ڈاکٹر اسے ٹکر ٹکر دیکھتے ہوئے گویا ہوا "آج میری تمہارے ساتھ اس کمرے میں آخری ملاقات ہے، یوں کہہ لو کہ آج تمہارے علاج کا آخری دن تھا۔"

اس نے چونک کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا •

وہ سنجیدہ تھا

"آپ ہار مان رہے ہیں؟۔" غفران نے طنزاً کہا

"ہاں۔شاید۔" ڈاکٹر کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا "مجھے پتہ چل چکا ہے کہ تم ایک بہادر انسان ہو یہ بیماری آج

نہیں تو کل ضرور تمہارے آگے گھٹنے ٹیک دے گی۔''

اسے ڈاکٹر کی بات بہت عجیب لگی لیکن اندر خوشی کا احساس بھی جاگا کہ بالآخر ڈاکٹر کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کی بیماری بھی نرمین کی بیماری کی طرح لاعلاج ہے اور اب وہ ڈاکٹر کے مشوروں سے بالکل آزاد ہو کر باقی ماندہ زندگی میں کچھ ادھورے کام مکمل کر کے مر جائے گا۔ نرمین کے پاس چلا جائے گا

''اب تک کے علاج کے لیے آپ کا بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب اور ان تمام تلخ باتوں کے لیے معذرت چاہوں گا جو جانے انجانے میں میرے منہ سے نکلتی رہی تھیں۔'' غفران نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا

ڈاکٹر سر ہلاتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا ''شکریے اور معذرت کی کوئی ضرورت نہیں میں ہمیشہ تمہارے لیے دعا گو رہوں گا دوست۔''

ڈاکٹر نے دونوں ہاتھوں سے اس کے رخساروں کو تھپتھپایا اور مصافحہ کرتے ہوئے کمرے کے باہری دروازے کی جانب بڑھ گیا دروازے پر پہنچ کر اچانک کسی خیال نے اس کے قدموں کو روک دیا اس نے مڑ کر غفران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''میں تمہاری اس بیماری کے حوالے سے فائنل رپورٹ کچھ دنوں میں تمہارے گھر بھجوا دونگا۔''

اس نے جواباً اطمینان سے سر ہلایا اور ڈاکٹر اپنے چہرے پر گہری تشویش کے آثار لیے کمرے سے باہر نکل گیا

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد اسے پورا یقین تھا کہ ابھی تمام گھر والے آ کر اس کی بدقسمتی کا ماتم کریں گے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا سب کے رویے ویسے کے ویسے ہی تھے جیسے انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ڈاکٹر اس کے علاج سے دستبردار ہو کر لوٹ گیا ہے اور اب وہ کبھی نہیں آئیگا۔

☆

اگلی صبح غفران معمول سے ذرا پہلے جاگ گیا اور اس کی وجہ وہ خواب تھا جو اس نے غالباً فجر کے وقت دیکھا تھا

وہ اس عجیب و غریب سے خواب کی بابت سوچنے لگا۔ کہ وہ ایک وسیع و عریض تپتے ہوئے صحرا کے بالکل وسط میں پیاس سے نڈھال ایک سوکھے ہوئے پیڑ کے سہارے کھڑا ہے اس کی آنکھیں زندگی کے آثار ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چکی ہیں کوئی اڑتا ہوا پرندہ، پانی کی ایک بوند، کوئی تازہ ہوا کا جھونکا، بہت دور سے ہی سہی کسی انسان کی آواز۔۔ کچھ بھی تو نہیں تھا، سر کے اوپر دہکتا ہوا سورج اور پاؤں تلے گرم ریت کے سوا بس خاموشی تھی گہری خاموشی۔ کیا اسی کو موت کہتے ہیں؟ جب زندگی کے آثار نگاہوں سے اوجھل ہو کر انسان کو دم توڑنے پر مجبور کرتے ہیں کیا یہی موت کی شکل ہے؟

''نہیں۔'' اچانک نا جانے کہاں سے ایک بے انتہا خوبصورت چڑیا سوکھے ہوئے شجر پر آ کر چہکی ''کیا تم نے ابھی تک اپنے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کی آواز نہیں سنی؟۔'' چڑیا کی چہکار اس کے لیے قابل فہم تھی ''بولو کیا تم زندہ نہیں ہو، اگر ہو تو پھر کیوں تم زندگی کو اپنے آس پاس تلاش کر رہے ہو اپنے وجود میں کیوں نہیں جھانکتے؟ اگر خدا نے تمہیں اس صحرا کی ویرانیوں میں بھی زندہ رکھا ہوا ہے تو تمہارے لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم اپنے ہنوز زندہ رہنے کی حکمت تلاش کرو بجائے اس کے کہ تم موت کے بارے میں بیکار سوچ کر پروردگار کی دی ہوئی نعمت کی نا شکری کرو۔''

وہ حیران و پریشان بیٹھا بس چڑیا کی باتیں سنتا رہا

چڑیا پھدک کر اس کے کاندھے پر آن بیٹھی ''یاد رکھنا خدا انہی انسانوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے جن کے حوصلوں میں اس کی آزمائش جھیلنے کی سکت ہوتی ہے۔''۔ اس کے بعد چڑیا اڑتے اڑتے اس کے سامنے آئی اور یہ کہہ کر دور افق میں کھو گئی ''زندگی کی خواہش ہی زندگی کی ضمانت ہے اور اگر یہ خواہش مر جائے تو انسان کو بزدلی کی موت مرنا ہی پڑتا ہے۔''

غفران نے اس خواب کا کسی سے بھی تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ جسے بھی یہ خواب سنائے گا وہ خوامخواہ ضرور اس خواب کا تعلق اس کی بیماری سے جوڑ کر نصیحتیں گلے میں ڈال دیگا

ڈاکٹر قدرت کو الوداع کہے پورا ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور وہ خوش تھا کہ تمام علاج معالجے سے اس کی جان چھوٹ چکی ہے اب تو اس کے ابو اسے ورزش کا بھی نہیں کہتے۔

گھر میں عجیب سی چپ کا راج تھا شاید ڈاکٹر نے سب کو بتا دیا تھا کہ اب میں لاعلاج ہو چکا ہوں بس اب کسی دن اسپتال میں دم نکلنا باقی ہے۔ نرمین کی طرح!

سوا دس بجے کے قریب جب کہ وہ بستر پر نیم دراز کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا کمرے کے سامنے والی کھڑکی جو کہ برآمدے میں کھلی ہوئی تھی اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی کے ہاتھوں میں ایک کاغذ ہے جس پر لکھی تحریر کو وہ انہاک سے پڑھ رہا ہے اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے مطالعے کے بعد اس نے وہ کاغذ کھڑکی کے پاس پڑی میز پر رکھا اور ایک اچٹتی نگاہ کمرے کے اندر ڈالتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

غفران نے چند لمحے اس کاغذ اور بھائی کی تشویش پر غور کیا اور دوبارہ کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گیا ابھی دس منٹ ہی بمشکل گزرے ہوں گے کہ غفران کی بہن سنبل جو اس سے پانچ سال چھوٹی تھی اس میز کے قریب آئی اور اس کاغذ کو اٹھا کر چلی گئی کچھ دیر بعد واپس آئی اور کاغذ کو تہہ کر کے دوبارہ میز پر رکھتے ہوئے ایک نگاہ کمرے میں ڈالی اور یہ دیکھ کر کہ وہ اسے ہی دیکھ رہا ہے بوکھلا کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

اب غفران نے اس کاغذ کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا کہ آخر یہ کاغذ کیا ہے کوئی خط کوئی نوٹس یا پھر۔ او میرے خدایا میری فائنل میڈیکل رپورٹ ہو گی جو کہ ڈاکٹر قدرت نے بھجوائی تھی۔ وہ اسی سوچ میں غرق تھا کہ سنبل کمرے میں آئی اس کے کپڑوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کہیں جانے کی تیاری میں ہے

''آج کالج میں ہماری فیئر ویل پارٹی ہے بھائی جان میں وہاں جا رہی ہوں آپ کا کوئی کام ہو تو بتا دیجیے۔''

''کام تو ہے لیکن تمہیں دیر ہو جائے گی تم جاؤ گڑیا۔'' اس کو پتہ نہیں کیوں محسوس ہوا جیسے سنبل کی آنکھوں میں اداسی ہے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے پوچھ لے کہ وہ جو کھڑکی کے باہر میز پر کاغذ دھرا ہے وہ کیسا کاغذ ہے لیکن وہ اس سے کیوں پوچھے جبکہ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ کاغذ ہو نہ ہو ڈاکٹر قدرت کی بھیجی ہوئی رپورٹ تھی اور ویسے بھی وہ اسوقت اسے مزید اداس نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اپنے کالج کی الوداعی تقریب میں شرکت کرنے جا رہی تھی ایسی تقریب جس کا تعلق پہلے ہی سراسر اداسی سے تھا!

''کام بتا دیجیے میں ابھی کیے دیتی ہوں۔'' سنبل نے اصرار کیا

غفران نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اسے الوداعی کلمات سے رخصت کر دیا ''نہیں، جب واپس آؤ گی تو بتا دونگا، تم جاؤ اور اپنا بہت خیال رکھنا۔''

سنبل نے مسکراتے ہوئے خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی

اس کو سنبل کی مسکراہٹ بھی مصنوعی معلوم ہوئی اس نے اضطراب سے اپنے ہونٹوں کو کاٹنا شروع کر دیا اس کی نگاہیں اس کاغذ پر مرکوز تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ سوچ کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا اسے اپنے ابو کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے وہ اس کے دروازے پر تھے ''میں ابھی کچھ دیر میں بازار جاؤں گا تمہیں کوئی چیز منگوانی ہو تو بتا دو۔''

''نہیں ابو جی، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' اس نے مختصرا جواب دیا

ابو سر ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے اور جونہی اس میز کے قریب پہنچے کاغذ اٹھا کر دائیں طرف باورچی خانے کی جانب چلے گئے۔ وہ خود کو یہ یقین دلا چکا تھا کہ یہ کاغذ اس کی فائنل میڈیکل رپورٹ ہے جس نے سب کو تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے کچھ دیر بعد اس کے اندر اس رپورٹ کو پڑھنے کا تجسس مچل اٹھا، اسے ایسا محسوس ہو رہا جیسے یہ کاغذ ایک ہتھوڑا ہے جو مسلسل اس کے دماغ پر ضرب لگا رہا ہے یکا یک اسے یونیورسٹی کے پروفیسر مبین الدین یاد آ گئے جن کے خیال میں، بس لمحہء موجود ہی زندگی ہے باقی آنے والا ہر ایک پل فریب گمان اور کھلا

دھوکہ ہے۔اس نے زیرلب ایک موٹی سی گالی بکتے ہوئے سوچا کہ یہ آنے والا پل ہی تو اصل عذاب ہے زندگی کے خوبصورت یا بدصورت ہونے کا دارومدار آنے والے پل ہی سے وابستہ ہے صرف ایک پل ہنستی آنکھوں کو رلانے اور آئندہ کی زندگی کو روگ لگانے کے لیے کافی ہوتا ہے اور فقط ایک لمحہ نگاہوں سے نگاہوں کا ٹکرانا اجاڑ دلوں میں بہار کو اتار لاتا ہے لیکن بہار کے بعد خزاں پھر سے لوٹ آتی ہے آہ۔لعنت ہو اس زندگی پر۔اسی لمحے ذہن میں نرمین کی صورت ابھر آئی اور اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور نرمین اس کے سامنے آن بیٹھی وہ اس وقت تک بیٹھی رہی جب تک اس کا عکس دھندلا نہیں گیا۔

غفران کی امی ابو دبی آواز میں باتیں کرتے ہوئے کھڑکی کے سامنے آئے اس مرتبہ وہ کاغذ اس کی امی کے ہاتھ میں تھاما ہوا تھا اور دونوں کے چہروں پر تشویش اور افسوس کے ملے جلے آثار ہویدا تھے۔امی نے کاغذ میز پر رکھا اور کھڑکی سے زبردستی مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا ''چائے بنادوں؟۔''

اس نے خود پر طاری کیفیات سے نکلتے ہوئے آہستہ سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے استفسار کیا ''امی یہ کاغذ کیسا ہے۔''

سادہ لوح ماں نے گویا گھبرا کر دائیں طرف کھڑے اپنے مجازی خدا کی جانب دیکھا اور بولیں ''کچھ نہیں بیٹا ایسے ہی پراپرٹی ٹیکس کا نوٹس ہے۔''

اس نے محسوس کیا کہ ماں جھوٹ بولنے کی کوشش میں ناکام رہی ہے

''کیسا نوٹس ہے؟ لائیے میں بھی ذرا دیکھوں۔''

اس کی نظریں ماں کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں

اس مرتبہ اس کے ابو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا

''کچھ خاص نوٹس نہیں ہے۔تم پریشان نہ ہو۔''

''آپ سب لوگ مجھے کوئی پاگل سمجھ رہیں ہیں یا پھر میری معذوری کا مذاق اڑا رہے ہیں۔'' اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ''میں جانتا ہوں یہ ڈاکٹر قدرت کی بھیجی ہوئی میری فائنل میڈیکل رپورٹ ہے جس میں یقیناً میری زندگی کی مہلت لکھی ہوئی ہے اور یہ ساری تحریر میں آپ سب کے چہروں پر صاف طور پر پڑھ رہا ہوں، دو ماہ، چار یا زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کی مہلت ہی ہوگی۔''

''بکواس مت کرو غفران۔'' اس کی ماں کا تو جیسے سینہ ہی شق ہو گیا ''کچھ بھی سمجھ لیتے ہو، یہ کوئی تمہاری رپورٹ نہیں ہے۔''

اس نے دیکھا کہ ماں کی برسات آشنا آنکھوں میں گہرے بادل امڈ آئے تھے۔اس نے فوراً پشیمان ہو کر سر جھکا لیا اور کافی دیر تک خاموشی میں ڈوبا خود کو کوستا رہا کہ آج اس کی وجہ سے اس کی ماں کا دل دُکھا ہے کیا خبر اس کی ماں ٹھیک ہی کہہ رہی ہو کہ وہ کوئی نوٹس ہی ہو اگر اس کی رپورٹ ہوتی تو یوں اس کے سامنے میز پر کیوں دھری رہتی اگر چھپانا ہی مقصود تھا تو کسی اور کمرے میں رکھی جا سکتی تھی ویسے بھی اس میز پر نئے یوٹیلیٹی بلز ہی رکھے جاتے ہیں تاکہ بروقت جمع کروائے جا سکیں یہ تمام بہلاوے وقتی ثابت ہوئے انکے باوجود اس کے دل میں بہرحال ایک بےچینی گھر کر چکی تھی اور وہ بےچینی اسوقت تک دور ہونے کا نام نہیں لے سکتی تھی تاوقتیکہ وہ کاغذ اس کے ہاتھ میں نہ آ جائے۔

شام کو سنبل جب اس کے لیے کمرے میں چائے لے کر آئی تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا تجسس خود بخود ایک بار پھر اس کاغذ کی بابت جاگ اٹھا۔اس نے پہلے تو سنبل سے اس کے کالج کے فیئر ویل فنکشن کے بارے میں دریافت کیا اور جب دیکھا کہ وہ ایک دوست کی طرح اسے تفصیلات سنا کر محظوظ ہو رہی ہے تو باتوں باتوں میں اچانک غفران نے اس کاغذ کے متعلق اس یقین سے پوچھ لیا کہ وہ اب جھوٹ نہیں بولے گی لیکن کاغذ کا سنتے ہی ایک ہلکی سی بوکھلاہٹ اس کے چہرے پر نمایاں ہو کر غائب ہو گئی ''کونسا کاغذ بھائی جان۔''

''وہی جو سامنے میز پر دھرا ہے اور صبح جسے پڑھ کر تم اداس ہو گئی تھی۔'' اس کی نگاہیں بالکل کسی ماہرِ نفسیات کی طرح سنبل کے چہرے پر جمی ہوئیں تھیں

''اچھا وہ۔وہ کوئی نوٹس وٹس ہے، کیوں؟۔''

''مجھے لا کر دکھاؤ۔'' اس نے لاپرواہی سے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا

''جی اچھا۔''سنبل نے آہستہ سے کھڑکی کی جانب دیکھا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی اور ایسی گئی کہ دوبارہ لوٹ کر واپس نہیں آئی۔اسے سنبل کی اس حرکت پر شدید غصہ آیا وہ چاہتا تو شور مچا کر تمام گھر سر پر اٹھا لیتا لیکن اس نے خود کو ایسا کرنے سے باز رکھا کہ ابھی صبح ہی اس کے تیز لہجے کی وجہ سے ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

رات کا کھانا اس نے خلاف معمول اپنے کمرے میں یہ کہہ کر منگوا لیا کہ اس کے سر میں شدید درد ہے اس کے ابو ڈسپرین کی گولیاں اس کے سرہانے رکھتے ہوئے ''یاد سے لے لینا۔'' کی تاکید کرتے ہوئے لوٹ گئے۔ کھانے کے بعد گھر کے افراد ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ گئے اور غفران اپنے پلنگ کے عقب میں لٹکتے ہوئے ٹیوب لائٹ کے بٹن کو آف کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔

رات کے دو بج چکے تھے!

غفران کو نیند کی بجائے رونا آ رہا تھا آج پہلی مرتبہ اسے اپنی محتاجی پر سخت افسوس ہو رہا تھا ''اس محتاجی کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔'' اس نے غصے سے زیر لب کہا وہ بالکل بے بس و لاچار بستر پر چت پڑا چھت میں لٹکے پنکھے کو دیکھے جا تا تھا اسی دوران اچانک اسے خواب والی چڑیا یاد آ گئی ''یاد رکھنا خدا انہی لوگوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے جن میں اس کی آزمائش میں پورا اُترنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔''

اب وہ خدا کے متعلق سوچنے لگا ستّر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا کیوں اپنی مخلوق کو اذیت دیتا ہے یہ کیسا غفور و رحیم ہے جو اپنی مخلوق کو تڑپتا دیکھ کر خوش ہوتا ہے جسے میری ماں کے آنسو دکھائی نہیں دیتے اور بوڑھے باپ کی چٹختی ہڈیوں کی آواز سنائی نہیں دیتی یہ کیسا رب ہے۔اسکا ذہن ابھی مزید خدا کے متعلق اول فول سوچنے پر آمادہ تھا مگر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں

ابھی کچھ دیر ہی گزری ہوگی کہ اسے اپنے دماغ میں ڈاکٹر قدرت کی آواز گونجتی ہوئی سنائی دی ''کفر سوچنے سے بہتر ہے کہ تم آج ایک فیصلہ کر لو کہ آئندہ تمہیں زندگی میں کس کا محتاج رہنا ہے۔؟ لوگوں کا یا پھر خدا کا؟؟ نادان انسان اگر تم نے یونہی قدم قدم پر لوگوں کو سہارا بنا کر زندگی گزارنی ہے تو تمام عمر اس محتاجی کے تیشہ سے اپنے خواب، خواہشیں اور ارمان توڑ توڑ کر پاش پاش کرتے رہو گے روتے تڑپتے اور اپنے آپ کو یونہی کوستے رہو گے لاچار نگاہوں سے مصروف زمانے کے دل کھٹکھٹاتے رہو گے یہ چار گز کے فاصلے پر پڑا ہوا کاغذ کا ٹکڑا اسی طرح روپ بدل بدل کر تمہاری زندگی میں آتا رہے گا اور تمہاری معذوری اور محتاجی کی آگ کو ہوا دیتا رہے گا۔ ہاں اگر تم خود کو زمین پر خدا کا نائب تسلیم کرتے ہو تو اٹھو۔ اٹھو غفران، اور تھام لو اپنے خالق کا ہاتھ کہ خدا کے سہاروں کا آرزو مند کبھی دنیا کا محتاج نہیں رہتا۔ اٹھو غفران کہ تم کو آزمانے والا رب تمہارے حوصلوں کی صدائے لبیک کا منتظر ہے۔اٹھو بے شک تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش میں گر کیوں نہ جاؤ کہ تمہارا یہ گرنا بھی تمہاری ہمت کی دلیل ہے۔اپنے وجود اور بندگی کو خدائے بزرگ و برتر کے سپرد کر کے اٹھو۔ تمام میڈیکل رپورٹس پر اپنی ہمت کو فوقیت دے کر اٹھو۔ اس یقین کے ساتھ اٹھو کہ تمہیں تھامنے والا تمہاری شہہ رگ سے زیادہ تمہارے قریب ہے!

اس کا جسم پسینے سے شرابور اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے''میں اٹھوں گا، میں اٹھوں گا۔'' اس نے زیر لب یہ کہتے ہوئے ایک جوش کے ساتھ بستر پر بیٹھ کر لائٹ آن کی اور اپنے پاؤں پلنگ سے نیچے اتار کر اپنی آستین سے آنسو پونچھ ڈالے۔برآمدے میں اندھیرا تھا جس کی وجہ سے اسے میز نظر نہیں آ رہی تھی لیکن ایک جنون اس کے اندر موجزن تھا وہ تہیہ کر چکا تھا کہ چاہے وہ کاغذ میز پر ابھی تک دھرا ہو یا نہ ہو وہ آج کھڑکی تک ضرور پہنچ کر دم لے گا۔

گھر میں مکمل خاموشی تھی سب سو رہے تھے

اس نے ایک نظر سامنے کھڑکی پر ڈالی تو وہ اسے کوسوں دور دکھائی دی اس نے قریب رکھی ہوئی کرسی کو مزید کھینچ کر پلنگ کے قریب کیا اور بہت ہی مشکل اور صبر آزما مرحلے کے بعد خود کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے کرسی پر بٹھا لیا ایک جوش اس کے ذہن و دل میں ابل رہا تھا سانس

پھول چکی تھی۔ تھوڑے توقف کے بعد اس نے کرسی کی ہتھیوں پر اپنے ہاتھ مضبوطی سے جماتے ہوئے اپنے وجود کو کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ہر بار اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ کر تھک ہار جاتیں اس کے باوجود وہ مسلسل کوشش میں لگا رہا کہ کسی طرح کھڑا ہو کر دیوار کو تھام لے کافی دیر گزر گئی تھکن کیساتھ اس نے محسوس کیا اس کی ٹانگوں میں حرارت در آئی ہے گرمیوں میں بھی سرد رہنے والی ٹانگیں اب گرم تھیں۔ اس نے ایک بار پھر پُرجوش طریقے سے کوشش کرنے کا فیصلہ کیا اور بالآخر بہت ہی آہستہ آہستہ کھڑا ہوتا چلا گیا پسینہ اس کے سر سے نکل کر کنپٹیوں سے نیچے بہہ رہا تھا اب وہ دیوار تھام کر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا اس کامیابی پر ایک مدھم سی خوشی کا احساس اس کے دل میں ابھر کر فوراً غائب ہو گیا کیونکہ اسوقت وہ ایسی پوزیشن پر کھڑا تھا کہ اگر ذرا سے بھی دیوار سے ہاتھ ہٹتے تو وہ زمین بوس ہو جائے گا۔ اس کا اگلا ہدف کرسی کی پشت کو تھامنا تھا جو کہ ہاتھ بھر فاصلے پر رکھی ہوئی تھی اس نے اپنی کانپتی ٹانگوں کو سکون میں آنے کیلئے وقت دیا اور جب ٹانگوں کی کپکپاہٹ کافی حد تک تھم گئی تو اپنا دائیاں ہاتھ مضبوطی سے دیوار پر جماتے ہوئے بائیں ہاتھ کو کرسی کی پشت پر رکھ دیا۔ جب ہاتھ کرسی پر مضبوطی سے جم گیا تو اس نے کرسی کو ذرا سا کھینچ کر اپنی طرف کیا اور خود کو ہلکا سا کرسی کی جانب خم دیکر دایاں ہاتھ بھی اس کی پشت پر رکھ دیا

اب وہ کرسی کے سہارے کھڑا تھا اسی کرسی کے پیچھے ایک اور کرسی تھی اس نے تمام ہمت جمع کرتے ہوئے جوں ہی اس دوسری کرسی کی جانب قدم بڑھانا چاہا تو اسے اپنی ٹانگوں میں سخت نقاہت محسوس ہوئی اس کا دل چاہا کہ وہ وہیں اس کرسی پر بیٹھ جائے لیکن اس نے خود کو ایسا کرنے سے باز رکھا اور اپنی آنکھیں بند کر کے یہ محسوس کرنے کی کوشش کی کہ خدا کا ہاتھ یہیں آس پاس موجود ہے دو چار لمحوں بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو دماغ کو پُرسکون پایا اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم ہلکا پھلکا سا ہو گیا ہے۔ اس بار اس نے قدم بڑھایا تو بہت ہی آہستہ [illegible] کی جانب بڑھتا ہوا اس کے سہارے کھڑا [illegible]

ہوا گیا قدم بڑھانا ویسے بھی اس کیلئے کوئی مشکل عمل نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے بھائی اور باپ کے سہارے ایسے ہی قدم بڑھاتے ہوئے کمرے میں آتا جاتا تھا لیکن اس وقت اسے گرنے کا خوف نہ ہوتا جبکہ لمحہ موجود میں اسے کسی بھی غلط قدم کی پاداش میں گرنے کی سزا مل سکتی تھی۔ کھڑکی ابھی بھی اس کے مطابق کافی دور تھی اس کا سانس اوپر نیچے اور ذہن میں شور مچا ہوا تھا کہ کرسی پر بیٹھ جاؤ ورنہ گر جاؤ گے مگر دل میں ایک اذان گونج رہی تھی جس میں جوشِ بلال تھا اس نے جوش کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے اگلا قدم بڑھا کر دیوار کے ساتھ رکھے شوکیس کو تھام لیا پسینہ ہتھیلیوں کو بھگو چکا تھا ہاتھوں میں پھسلن ہونے لگی اس نے ایک ایک کر کے اپنی دونوں ہتھیلیوں کا پسینہ اپنی چھاتی سے پونچھا اور انتہائی آہستہ سے قدموں کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے کھڑکی سے ملحقہ دیوار کی جانب روانہ ہو گیا۔

اب کھڑکی دھیرے دھیرے اس کے نزدیک ہوتی جا رہی تھی مگر اس کی نگاہ اور توجہ اپنے قدموں پر تھی جنہیں وہ بہت قرینے سے آگے بڑھا جاتا تھا۔ دو گز لمبے شوکیس کا فاصلہ اس کے لیئے دو میلوں جیسا تھا آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے بالآخر وہ دیوار تک پہنچ گیا اس کا پورا جسم گویا بخار سے دہک رہا تھا اسکا ہدف چونکہ کھڑکی تک پہنچنا تھا سو یہ تمام تکالیف اس کے لیے بے معنی تھیں گو کہ اس کی رفتار چیونٹی سے بھی کئی گنا زیادہ کم تھی لیکن اس کا جنون سمندر کی خودسر لہروں کی طرح چٹانوں سے ٹکریں مارتا رہا اسے محسوس ہوا دیوار سے کھڑکی تک پہنچنے میں گویا اسے زمانے لگ جائیں گے حالانکہ فاصلہ ڈیڑھ گز سے زیادہ نہیں تھا ذرا سی حرکت پر سانسیں بے قابو ہونے لگتیں لیکن منزل ان تمام رکاوٹوں سے پرے اس کے استقبال کے لیے بے چین تھی اور وہ وصالِ منزل کیلئے تڑپتا ہوا اس کی جانب روانہ تھا جوں جوں منزل قریب آ رہی تھی اس کا دل خوشی سے چیخنے کو چاہا اور پھر بہت دیر بعد وہ لمحہ اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا جس میں اس کی منزل ہاتھ بھر فاصلے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔

آخر خدا نے بندے سے پوچھ ہی لیا، بتا تیری رضا کیا ہے۔ اس نے اپنی تقدیر کا نا قابلِ یقین لمحہ خدا سے [illegible]

ہاتھوں سے تحریر کیا تھا شاید اتنی خوشی ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والوں کو ہوتی ہوگی۔ شاید اس سے کم!
جب اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی میں نصب لوہے کی سلاخوں کو تھاما تو باہر آسمانوں میں کوئی فرشتہ جیسے ندا لگا رہا تھا کہ "کوئی ہے اپنے پروردگار سے مانگنے والا۔ کوئی ہے اپنی حاجت روائی کا طلبگار۔"
کھڑکی کے بالکل ساتھ باہر برآمدے میں رکھی میز پر اسے وہی کاغذ پڑا دکھائی دیا۔ اس کا نقاہت سے برا حال تھا جیسے ابھی ابھی وہ کے ٹو سے اتر کر ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچا ہو اور اب سامنے، اس کے قدموں تلے دنیا کا دلنشین نظارہ تھا۔ اوپر نیچے ہوتی سانسوں کو بحال کرنے میں اسے کافی وقت لگ گیا جونہی اسے لگا کہ اب وہ اس قابل ہے کہ کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر اس کاغذ کو اٹھا لے تو ایک خوشی کا احساس اس کے اندر سر سے پاؤں تک رینگ گیا چہرہ تمتما اٹھا اور اس نے وہ کاغذ میز سے اچک لیا۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو کھڑکی کے ساتھ جوڑ کر کھڑا تھا کپکپاتی انگلیوں سے اس نے تہ شدہ کاغذ کھولا۔ چند لمحوں کے لیے اس کے ماتھے پر بل آ کر غائب ہو گئے۔
کاغذ کے سرے پر "غفران کے نام۔" جلی حروف سے لکھا ہوا تھا
اس کی نگاہیں کاغذ پر لکھی باقی ماندہ تحریر پر دوڑنے لگیں
ڈیئر غفران!
مجھے اس بات کا مکمل یقین تھا کہ تم آج نہیں تو کل ضرور اس خط تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ گے اور تم پر اس بات کا یقین کرنے کی ایک وجہ بھی ہے اور وہ مجھے تمہاری کہانی پڑھ کر معلوم ہوئی۔ اس کہانی میں تم مجھے محبت کی دونوں انتہاؤں پر کھڑے عاشق دکھائی دیئے تھے۔
ایک انتہا وہ جہاں محبت ہوتی نہیں بلکہ محبت کی جاتی ہے۔ اور میرے نزدیک محبت کا ہو جانا کوئی انہونی بات نہیں ہے یہ تو بالکل اسی طرح ہے جیسے بارش کو ہونا تھا، سو ہو گئی لیکن اس کے برعکس کسی سے جان بوجھ کر محبت کرنا ایک مشکل اور صبر آزما عمل ہے بالکل ایسے ہی جس طرح ہم تمام اچھے برے حالات میں خود کو زندہ رکھنے کی تگ و دو کرتے ہیں۔ ہاں تم نے زرمین سے محبت کی تھی تمہیں محبت ہوئی نہیں تھی۔ تم نے ایک معذور لڑکی سے محبت کرنے کا چیلنج قبول کیا تھا اور تمہیں یہ چیلنج تمہارے اندر کے اس حساس شخص نے دیا تھا جو اس مادہ پرست زمانے میں بہت کم لوگوں کے اندر زندہ ہے۔ تم باکمال انسان ہو دوست کہ جسے سب قابل رحم سمجھتے ہوں اس شخص سے محبت بڑا مشکل عمل ہے!
محبت کی دوسری انتہا وہ ہے جسے صرف شاعری اور افسانوں کی حد تک دنیا جانتی اور مانتی ہے کہ ایک شخص محبت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر اپنے محبوب کی تکلیف کو بھی اپنے وجود میں اتارنے سے گریز نہیں کرتا۔ اس کے تمام رنگ اپنے اوپر ڈال لیتا ہے گویا رانجھا رانجھا کہتی میں خود ہی رانجھا ہوگئی۔
تم نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ زرمین پر تمہاری محبت کے اینٹی بائیوٹک نے کیوں اثر نہیں کیا؟ تو سنو دوست، وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی کہ تم واقعی بہت دیر سے اس کی زندگی میں محبت کا گلدستہ لے کر آئے تھے۔ تم سے پہلے وہ موت اور مایوسی کے رومانس میں مبتلا ہو چکی تھی اور جب تمہاری محبت نے اسے زندگی کی طرف لوٹانا چاہا تو تمہاری دی ہوئی اینٹی بائیوٹک کا الٹا اثر تم پر ہو گیا تمہاری محبت بے انتہا شدید تھی۔ تم اس امید پر اس کے درد کو اپنے اندر سموتے رہے کہ شاید اس کا درد کم ہو جائے لیکن ایسا کیسے ممکن تھا۔ اور اس کے مرنے کے بعد تم نے دانستہ طور پر اس کی تمام تکالیف کو محبت کا تحفہ سمجھ کر ذہنی طور پر قبول کر لیا۔ تم اس کی طرح درد میں جینا اور مرنا چاہتے ہو۔
محبت کی انہی دو انتہاؤں پر تمہیں کھڑا دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے بس محبت کا ایک شدید درد ہے جو تمہارے ذہن و دل سے نکل کر تمام بدن میں پھیلا چکا ہے۔ اور آج وہ درد سمیٹ کر تم نے اپنے ارد گرد حصار کیے ان رشتوں کے اداس دلوں کو ایک نئی زندگی کی نوید دی ہے جو تمہارے ساتھ قطرہ قطرہ مر رہے ہیں۔
میں یہ خط تمہارے تمام گھر والوں کے سامنے بیٹھ کر لکھ رہا ہوں اور تمہیں اس خط تک پہنچانے میں اس تمام

ڈرامے کا ہدایتکار میں ہی ہوں۔ میں تمہارا معالج ہوں اور جتنا عرصہ تم میرے زیر علاج رہے ہو میں تمہاری نفسیات سے بخوبی آگاہ ہو چکا ہوں کہ تم میں غصے کے ساتھ ساتھ تجسس اور چیلنج قبول کرنے کی ہمت بھی بہت زیادہ ہے۔ جب تم اس خط تک پہنچو گے اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم چل کر پہنچو گے کہ تمہارے جیسے حوصلہ مند لوگ گھٹنوں کے بل رینگنا اپنی توہین سمجھتے ہیں تو یقین مانو جتنی خوشی تمہارے سب گھر والوں کو ہوگی شاید اس سے کئی زیادہ خوشی بطور معالج مجھے ہوگی کیونکہ یہ محض ایک خط نہیں ایک معالج کا یقین ہے جیسے یہ دعویٰ ہے کہ اس کا مریض اپنی بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی نکالنے کی بھرپور قوت رکھتا ہے۔

میں اپنی بات پر قائم ہوں کہ اب میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا بلکہ میں تمہارا کلینک میں اپنے پاؤں پر چل کر آنے کا منتظر رہوں گا۔

تمہارا

دوست معالج

ڈاکٹر قدرت علی

کچھ دیر تک غفران نے خط پر نگاہیں جمائیں رکھیں آہستہ آہستہ اس کا چہرہ پرسکون ہوتا چلا گیا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اسے اپنا وجود ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا اس نے خط کو میز پر رکھ کر کھڑکی کو مضبوطی سے تھام لیا اور نگاہیں آسمان پر جما دیں

اللہ اکبر اللہ اکبر

خاموش نیم مردہ اندھیرے میں مؤذن کی آواز نے جیسے زندگی پھونک دی

اشہد ان لا الہ الا اللہ

چڑیوں کی چہچہاہٹ نے خدا کی وحدانیت کی قسم اٹھائی

اشہد ان محمد الرسول اللہ

مکانات روشن ہوتے چلے گئے اور آہنی دروازوں کے کنڈے کھلنے کی آوازوں نے عشاقِ محمدؐ کی بیداری کی گواہی دی

حی علی الصلوٰۃ

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ بوڑھے ماں باپ اپنے جوان بیٹے کو پاؤں پر کھڑا دیکھ رہے تھے ان کے آنسو آنکھوں سے نکل کر زمین پر سجدہ ریز ہونے کو تڑپنے لگے۔

حی علی الفلاح

اس نے دھیرے سے مڑ کر نم آنکھوں سے دیکھا تو ماں باپ نے اپنی بانہیں پھیلا دیں

الصلوٰۃ خیر من النوم

وہ کھڑکی سے ہاتھ چھوڑ کر دیوار کو تھامتے ہوئے دھیرے دھیرے چلنے لگا اس بار اس نے اپنی ٹانگوں کی کپکپاہٹ اور نقاہت کو یکسر نظر انداز کر رکھا تھا

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ

کمرے کے دروازے پر اب اس کے ماں باپ کے ساتھ اس کے بہن بھائی بھی موجود تھے

اسے یوں چلتا دیکھ کر سب کی آنکھوں میں بھرے اشکوں کی زبان پر صرف ایک ہی کلمہ تھا۔ الحمدللہ!

ہجر کا پہلا چاند

جب ویرا کی آنکھ کھلی، دن کے بارہ بج رہے تھے اس نے نیم وا آنکھوں سے دیوار پر لٹکے ہوئے وال کلاک کی جانب دیکھا اور زیر لب بڑبڑائی "آج اتنی دیر کیسے ہوگئی۔"

وہ کچھ دیر یونہی بستر میں دبکی رہی اور پھر دھیرے دھیرے اس کی یاد کے پردے پر گزشتہ شب کا سارا منظر روشن ہوتا چلا گیا اس کے باوجود ایک الجھن لاکھ کوشش کے سلجھ نہ سکی کہ آخر وہ گھر کب اور کیسے پہنچی تھی اور دیر سے آنے پر شیزا کا ردعمل کیا تھا؟۔ اور۔

اب اس کی آنکھیں اور دماغ مکمل طور پر بیدار ہو چکے تھے۔ وہ شب ماہتاب میں جھیل کا نظارہ اور ارمان کے ساتھ رقص۔ کیا وہ سب خواب تھا؟ اس کی سوچ کے دھاگے الجھے ہوئے تھے۔

کھڑکی سے دھوپ اندر کود کر کمرے کے قالین پر بچھی ہوئی تھی ویرا بار بار ارمان کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیتی مگر کسی حسین فسوں کے تابع اسکا دل گزشتہ شب کی رومانوی واردات کی جانب دوڑ جاتا اور اسکا بدن محبت کی میٹھی میٹھی آنچ پر تپکنے لگتا

وہ بہت دیر تک بستر میں بے حس و حرکت لیٹی ارمان کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں غور کرتی رہی ایک ایک لفظ اسے یاد آتا چلا گیا

''نہیں یہ خواب نہیں ہوسکتا۔'' اس نے اپنے خیال کی تردید کرتے ہوئے آہستہ سے کہا اور ایک مرتبہ پھر سامنے لگے وال کلاک پر نگاہ ڈالتے ہوئے بستر سے نکل کر غسل خانے میں گھس گئی۔

گھر میں پُر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی

جب وہ غسل خانے سے باہر آئی تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ کمرے کا منظر بدلا ہوا تھا

وہ ارمان کو صوفے پر مزے سے نیم دراز دیکھ کر بری طرح چونک اٹھی ''تم؟ یہاں۔ کیسے۔''

وہ خاموش رہا۔ اس کے ہاتھ میں علامہ اقبال کی کتاب ''بالِ جبرئیل۔'' تھی جسے پڑھنے میں محو تھا

وہ اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی ''کچھ پوچھا ہے میں نے۔'' ابھی کچھ اور کہنے کے لیے اس نے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ ارمان نے ایک لمحے کے لیئے کتاب سے نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا

اس نے اپنے گیلے بال جس انداز سے سفید تولیہ میں باندھ رکھے تھے اس میں وہ بالکل کوئی جل پری دکھائی دیتی تھی

''بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے دوبارہ نگاہیں کتاب پر جما دیں

یہ سن کر پہلے تو اس نے تیوری چڑھائی اور پھر یکا یک اسکا چہرہ حیا کی سرخی سے تمتما اٹھا اور لب خود بخود مسکرانے لگے ''کسی لڑکی کی خلوت گاہ میں یوں بنا اجازت داخل ہونا جرم ہے۔''

وہ ہلکا سا مسکرا دیا

''آپکو جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔'' اس نے شرارت سے ابرو اٹھا کر کہا

''معذرت خواہ ہوں۔'' اس کی نظریں بدستور کتاب پر مرکوز تھیں

نا جانے کیوں اسکا دل اسے تنگ کرنے کو چاہا ''نہیں۔ اس غلطی کی سزا ملے گی۔'' وہ اس کے ہاتھوں سے کتاب اچک کر مسکرائی

ارمان نے بھرپور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا

''اچھا، بتاؤ۔ کیسی سزا دینا چاہتی ہو۔''

اس کی نظروں سے وہ سٹپٹا کر رہ گئی ''ابھی سوچی نہیں۔''

وہ مسکراتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھا اور بالکل اس کے روبرو کھڑا ہوگیا ''جانتی تو ہو۔ میں پہلے ہی تم سے دوری کی سزا کاٹ رہا ہوں اور ویسے بھی میں اب۔۔''

ویرا نے کتاب اس کے ہونٹوں پر رکھ دی اور اس کی آنکھوں میں اتری اداسی دیکھ کر پریشان سی ہو گئی ''بس آگے کچھ مت کہنا پلیز۔''

کبھی کبھی حقیقت کو تسلیم کرنا کس قدر کٹھن ہوتا ہے مگر حقیقت ہوتی کیا شے ہے؟ جسکی گواہی ہمارے حواسِ خمسہ دیتے ہیں؟ بس؟ کیا وہ حقیقت نہیں ہوتی جو حواسِ خمسہ کی دسترس سے باہر ہو جسے آپکے علاوہ کوئی اور دیکھ، سُن، چھو نہ سکے جو آپکے سوا کسی سے ہمکلام نہ ہو جسکی خوشبو صرف آپ کا طواف کرتی ہو۔ جیسے خدا اور اس کے فرشتے بھی ایسی ہی حقیقتیں ہیں کیا ہم انھیں تسلیم نہیں کرتے!

اور کیا یہ ضروری ہے جسے ساری دنیا حقیقت مانے صرف وہی حقیقت ہو؟ ہر انسان کے اندر اس کی اپنی دنیا آباد ہوتی ہے جس میں وہ بہت سی ایسی تخلیقات کیساتھ رہتا ہے جسے لوگ نہیں جانتے، نہیں مانتے لیکن اس کے اندر کی ساری کیفیات سچائی پر مبنی ہوتی ہیں۔ چاند پر انسان کے قدموں سے پہلے اسکا دل اور دماغ پہنچا تھا۔ آج تک انسان، انسان کو آنکھوں دیکھی زمینی حقیقتیں بھی مکمل طور پر نہیں منوا سکا کجا کہ اپنے ذہن اور دل کے طلسم کدوں میں آباد دنیاؤں میں رونما ہونے والے واقعات کی سچائیوں کا یقین کرواتا پھرے۔

دونوں چند لمحوں لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دور تک ایک ساتھ چلتے رہے اور جب کمرے کا سناٹا گہرا ہوگیا تب ویرا نے کھوئے کھوئے انداز میں لب کھولے "کاش یہ وقت یہیں تھم جائے۔"

کاش ۔ یہ لفظ تیر کی طرح ارمان کے دل میں پیوست ہوگیا اس نے اپنے ہونٹوں پر رکھی کتاب کو اس کے ہاتھوں سمیت تھام کر اپنے سینے پر جما دیا۔

ویرا اس کی گرم سانسوں کو اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگی مگر ساتھ ہی نگاہوں سے برفانی ہوا چھن چھن کر اس کے تپتے جذبات کو سرد کرتی جارہی تھی اُن چھوئے کنوارے ہونٹ زندگی میں پہلی مرتبہ گناہ و ثواب کے سرد خانے سے آزاد ہوکر من مانی کی آگ میں دہکتے تھے مگر دوسری جانب ارمان پتھر کا مجسمہ بنا ہوا تھا جس کے ہونٹ اپنی جگہ جامد تھے۔آگ بجھانے کی قوت سے عاری!

ویرا کے جسم کی آنچ اس کے ملبوس کی خوشبو میں گھل کر فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔کمرے کا موسم بدلنے لگا، وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ روحیں جذبات سے خالی ہوتی ہیں یا نہیں۔

بدلتے موسم کا اثر بالآخر ارمان پر ہونے لگا اس کی آنکھوں میں برفانی ہوا کا دروازہ بند ہوگیا اور برف پگھلنے کا سماں بندھ گیا۔دو آنسو تیزی سے اس کے گالوں پر رینگ کر ویرا کے ہاتھوں پر گرے۔جامد ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور اس کے ماتھے پر ثبت ہوگئے ویرا نے آنکھیں موندلیں اسے یوں محسوس ہوا جیسے نرم بوسے میں اس کے جذبات کی ساری تپش سمٹ گئی ہو۔ارمان کے سینے پر دھرے ہاتھوں پر غم کا مینہ برسنے لگا اور جب کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے دونوں ہاتھوں کو سامنے ہوا میں معلق پایا۔

ارمان جاچکا تھا

اچانک کتاب اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گرگئی اور اس میں سے ایک کاغذ برآمد ہوا۔اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کاغذ کو کھول کر اس پر لکھی تحریر کو دھندلی آنکھوں سے پڑھا "میں آج دوپہر تمہارا ہیلیپ کیفے کے باہر انتظار کروں گا۔"

اس نے کاغذ کو اپنے بھیگے ہوئے ہاتھوں میں سمیٹ کر ہونٹوں سے لگالیا

☆

ویرا دو بجنے سے ذرا پہلے گھر سے نکل کر کیفے کی جانب چلنے لگی

نومبر کی ٹھٹھری ہوئی اجلی دھوپ میں زمین پر بکھرے درختوں کے زرد پتے چمکتے تھے۔دور دور تک بادل کی چھوٹی سی ٹکڑی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی حالانکہ گزشتہ شب برسنے والی بارش کی پھوار سے شارع کے ساتھ مٹی والا حصہ نم تھا۔سوندھا سوندھا احساس سانسوں میں گھلتا تھا

اس نے اپنے دونوں بازو کالی شال کے اندر سمیٹ رکھے تھے۔کیفے کے قریب پہنچ کر اس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن ارمان کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو وہ دو بجکر پانچ منٹ کا اعلان کر رہی تھی۔کچھ توقف کے بعد وہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے صنوبر کے دیو قامت درخت تک آئی اور بائیں جانب دیکھا تو کیفے کے دروازے پر اسے حلیم خان دکھائی دیا اس نے اپنے سالم ہاتھ کے اشارے سے اس کا حال چال پوچھ کر اسے کھانے کی دعوت دیتے ہوئے اندر آنے کو کہا لیکن ویرا نے اشاروں میں اسکا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ کھانا کھا چکی ہے اور اب اسے کسی دوست کا انتظار ہے

حلیم خان انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے OK کا اشارہ بنا کر ہنستے ہوئے کیفے کے اندر چلا گیا

وہ اضطراب میں دانتوں سے انگلی کا ناخن چباتے یونہی ٹہلتے ہوئے درخت کی اوٹ میں ہوگئی۔کیفے کے باہر بے وقوفوں کی طرح یوں تنہا کھڑا ہونا اسے سخت برا محسوس ہو رہا تھا۔اسی اضطرابی کیفیت میں یکا یک اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر کوہِ مہر در کی جانب اٹھ گئیں۔مہر در کی فلک بوس چار چوٹیاں اسے چہار کوہان والے اونٹ سے مشابہہ دکھائی دیں۔وہ بچپن سے اس پہاڑ کے رومانس میں گرفتار تھی سب سے پہلے اس کے ابو نے مکان کی چھت سے اس پہاڑ کا نظارہ کرواتے ہوئے

اسے بتایا تھا کہ اسی پہاڑ کے پیچھے سے روزانہ صبح چمکتا ہوا سورج نکل کر کوئٹہ شہر کے آسمان پر اپنے سفر کو نکلتا ہے۔ مہر در یعنی سورج کا دروازہ۔

کوہِ مہر اور سورج پر اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے سوچا "طلوع آفتاب کا منظر کتنا دلکش ہوتا ہوگا جس سے میں کبھی بھی لطف اندوز نہیں ہوسکی کتنی بدنصیبی کی بات ہے۔" یکا یک سوچ نے کروٹ لی "نا جانے ہم کیوں اپنے اردگرد پھیلے ہوئے دلفریب مناظر پر توجہ نہیں دیتے یا پھر ہماری نگاہ میں انکی کوئی اہمیت نہیں ہوتی حالانکہ یہ نظارے انمول ہوتے ہیں بہرحال مناظر کا کیا جاتا ہے بدنصیبی تو ہماری اپنی ہے۔"

ابھی وہ اسی خیال میں گم تھی کہ ارمان نے عقب سے آکر اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی "مہر در سے نیچے اتر آؤ۔"

وہ چونک اٹھی اور ابھی پلٹ کر اس سے مخاطب ہونا ہی چاہتی تھی کہ ارمان کا ہاتھ پیار سے اس کی آنکھوں پر جم گیا۔

وہ ساکت اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی اس کی سانسیں اور دھڑکنیں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگیں اسے اپنے آلہء سماعت کو پگھلاتی ہوئی ارمان کی سرگوشی سنائی دی "چلو۔ یہاں سے کہیں بہت دور چلتے ہیں۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہاں تھے تم۔" اس نے تنک کر کہا "اتنی دیر سے بے وقوفوں کی طرح کھڑی تمھارا انتظار کررہی ہوں۔"

ایک اور سرگوشی ابھری "یہیں تھا تمھارے آس پاس۔"

اس کے کان کی لوئیں سرخ ہوگئیں "آس پاس کیوں؟ سامنے کیوں نہیں؟۔"

"تم سے چھپ کر تمھیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔" ارمان کے لب اس کے کان کے بالکل قریب حرکت کر رہے تھے اور اسکا دایاں ہاتھ ویرا کی آنکھوں پر جما ہوا تھا

"کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ۔" ویرا کا لہجہ نرم اور غصہ دھواں ہوگیا

"خوبصورتی کو دیکھنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔"

یہ سنتے ہی اسکا چہرہ حیا سے تمتمانے لگا اور اب کے بار اس نے کہا "تم کہیں دور چلنے کو کہہ رہے تھے۔"

ارمان نے اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ بلند کیا اور چند لمحوں کے بعد اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹا دیا

☆

اب منظر یکسر بدل چکا تھا!

ویرا کے منہ سے بے اختیار نکلا "او میرے خدا۔"

اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب اس دیکھا کہ وہ دونوں اس وقت کوہِ مہر در کے وسطی دامن میں کھڑے تھے۔ کوئٹہ شہر کا دھندلا یا منظر ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اتنی بلندی سے شہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک شہر کا بغور جائزہ لیتی رہی دھیرے دھیرے منظر صاف ہونے لگا اچانک اس کے جی میں ناجانے کیا بات سمائی کہ وہ کسی بچے کی طرح اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگی "ارمان، مجھے میرا مکان ڈھونڈ کر دکھاؤ۔ پلیز۔"

"خود ہی تلاش کرلو۔" ارمان نے مسکراتے ہوئے ایک نظر اس کی کیفیت کا جائزہ لیا اور پھر شہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آج تو ویسے بھی شہر کا منظر کل شب ہونے والی بارش اور اس چمکتے ہوئے سورج کی وجہ سے قدرے صاف دکھائی دے رہا ہے ورنہ تو گاڑیوں کے دھوئیں اور گرد و غبار کے دبیز بادلوں میں کچھ بھی دیکھنا محال ہوتا ہے۔"

"دور بین کے بغیر اپنا مکان تلاش کرنا ناممکن ہے۔" ویرا نے ہار مانتے ہوئے کہا

ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے آخر اسے ایک لمبی سڑک دکھائی دی "وہ شارع زرغون ہے ناں۔" اس نے بچوں کی طرح اچھلتے ہوئے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا

"ہاں اس جانب کنٹونمنٹ کا ایریا ہے یہیں کہیں کل شام ہم ٹہل رہے تھے۔"

اسکا ہاتھ سامنے نیچے کی جانب ہوا میں معلق تھا اور وہ کوئٹہ شہر کو گویا نئے سرے دریافت کرنے پر تلی ہوئی

تھی ''وہ لیاقت بازار ہے جناح روڈ۔ اُف کتنا آلودہ منظر ہے۔'' اس کے چہرے پر پھیلی خوشی میں یکدم کوفت کے آثار نمودار ہو کر غائب ہو گئے

''ہر طرف دھواں دھواں ہے۔''

اس نے شہر کے آخری حصے کی جانب نگاہ کی ''وہ سریاب روڈ ہے اور بلوچستان یونیورسٹی۔'' اس نے گردن گھما کر ارمان کی جانب دیکھا ''تم نے یقیناً یہیں سے ماسٹر کیا ہوگا۔''

''ہاں۔ یہیں سے۔'' اس کی آواز میں اداسی کا ہلکا رنگ تھا

ویرا نے اداسی کو محسوس کرتے ہوئے اسکا ہاتھ تھام کر آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور پھر چہرہ بائیں جانب گھما کر اشارہ کیا ''وہ مری آباد ہے۔ ہائے کتنے خوبصورت دکھائی دے رہے ہیں پہاڑ کے دامن میں بنے ہوئے یہ مٹی کے گھروندے۔''

''ہاں۔ بالکل پہاڑ کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔''

''اور وہ علمدار روڈ'' اس نے روڈ کے اوپر اپنی انگلی لہراتے ہوئے کہا ''وہ میزان چوک۔ بلدیہ پلازہ، کتنی بلند عمارت ہے اور اس وقت ماچس کی ڈبیا سے بھی چھوٹی دکھائی دے رہی ہے۔''

''کوئٹہ جیسے زلزلہ زون شہر میں بلند عمارتیں بنانے پر پابندی ہے۔'' ارمان نے افسوسناک لہجے میں کہا ''اور کتنی عجیب بات ہے کہ انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی ہلاکت کا سامان تیار کرتا ہے۔ یہ بلند و بالا عمارتیں اور گلیوں میں تین تین منزلہ مکانات ہتھیار ہی تو ہیں جو کسی بھی زمینی جھٹکے سے انسانی جانوں کو تباہ برباد کر کے رکھ دیں گے۔ کسی کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے اور کسی کو اپاہج۔'' وہ اس سے آگے کچھ کہتے کہتے رک گیا ویرا کی نگاہیں جھک گئیں۔

اس نے فوراً اسے بہلانے کی غرض سے شہر کے رہ جانے والے حصوں کی جانب اشارہ کیا ''اس طرف تو دیکھو وہ کاسی روڈ۔ پشتون آباد۔ سیٹلائٹ ٹاؤن اور وہ ایسٹرن بائی پاس۔'' اس کا ہاتھ ہوا میں لہرانے لگا ''اور وہ اس طرف۔'' ہاتھ دائیں جانب گھوم گیا ''نواکلی۔ جناح ٹاؤن۔ شہباز ٹاؤن۔ بی۔ ایم۔ سی کمپلیکس۔'' اسکا بایاں ہاتھ ویرا کے ہاتھ میں اور دایاں ہاتھ ہوا کے کینوس پر کوئٹہ شہر کی ڈرائنگ میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس نے بازو گرا کر ویرا کی جانب دیکھا تو اس کی نگاہیں ایک جگہ ٹکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر خوف اور اداسی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ ارمان نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو شہر کے اندر بسے ہوئے شہرِ خاموشاں۔'' پر جا ٹھہریں جہاں ہزاروں دیگر دنیا سے کوچ کر جانے والوں کے ساتھ اس کے ماں باپ اور اس کے بھائی کی قبریں بھی موجود تھیں۔

ارمان نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے گال پر رکھتے ہوئے چہرہ اپنی طرف گھمایا ''مجھے تمھارے دکھ کا اندازہ ہے۔'' اس کا لہجہ دل کے زخم پر مرہم رکھنے جیسا تھا

ویرا سرد آہ بھرتے ہوئے مسکرائی لیکن آنکھوں کی نمی کو نہ چھپا سکی

''دیکھو۔ اگر تم یونہی اداس رہی تو میں تم سے زیادہ اداس ہو جاؤں گا اور میں اداس ہو گیا تو یہاں سے غائب ہو جاؤں گا اور تم یہاں تنہا رہ جاؤ گی۔ بالکل تنہا۔''

ویرا نے ابرو سکیڑ کر اس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا

ارمان بولتا چلا گیا ''اور پھر تمھیں واپسی کے لیئے رستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے شام ہو جائیگی۔ شام سے یہاں بے حد سرد ہوائیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں اور تم ان سرد ہواؤں میں بالکل جم جاؤ گی اور اس کے بعد غالب گمان ہے کہ کوئی مم تمھیں اٹھا کر لے جائے۔'' اس نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا

وہ سچ مچ ڈر گئی۔ مم؟

''ہاں۔ مم! کیا تم اس کے بارے میں نہیں جانتی؟'' ارمان نے آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے کہا

ویرا کے چہرہ پر بڑا سا سوالیہ نشان تھا ''نہیں۔ یہ کیا بلا ہے۔''

''ہاں یہ بلا ہی ہے۔ سنو! میں بتاتا ہوں، یہ جو کوئٹہ شہر ہے ناں، اسے انگریزوں نے hill station بنا رکھا تھا۔'' اس نے اپنے دونوں بازو شہر کی جانب

پھیلاتے ہوئے کہا" وہ کبھی یہاں آ کر گرمیوں کا موسم گزارتے اور کبھی سردیوں میں برف باری کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے۔ اس زمانے میں یہ شہر منی لندن کہلاتا تھا۔ اس کی حدود میں بغیر اجازت نامے کے کوئی عام آدمی داخل نہیں ہوسکتا تھا خاص کر وہاں تو بالکل بھی نہیں جہاں انگریزوں کی رہائشگاہیں ہوتیں۔ 1935ء کے زلزلے سے پہلے یہ شہر انتہائی صاف ستھرا اور دلکش عمارتوں میں گھرا بے حد خوبصورت ہوا کرتا روزانہ شہر کی شاراہوں کو پانی سے دھویا جاتا اور ٹرین کو لپور جنکشن پر جراثیم کش ادوایات کے اسپرے کے بعد شہر میں داخل ہوا کرتی۔"

"تم مم کے بارے میں بتاؤ۔ اتنی تو مجھے بھی اپنے شہر کے بارے میں معلومات ہیں۔" اس نے اپنا بایاں ابرو اٹھا کر کہا

"واقعی؟۔" ارمان نے شرارت سے کہا اور پھر یک دم سنجیدہ ہو گیا "انگریز راج کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مخلوق جسکا چہرہ عورت اور بدن جانور سا تھا پہاڑوں سے اتر کر کسی آدمی کو اٹھا کر لے جاتی اور کئی دنوں بعد اس آدمی کا پنجر پہاڑ کے کسی غار سے ملتا۔ وہ اس کا سارا خون چوس لیا کرتی تھی کچھ لوگوں سے روایت ہے کہ وہ پہلے اس آدمی کے پاؤں کے تلوؤں کو اپنی زبان سے چاٹ چاٹ کر اسے ہلاک کرتی اور پھر خون پی کر اس کا پنجر وہیں کسی غار میں چھوڑ دیا کرتی۔"

ویرا، اس کی طرف یوں دیکھنے لگی گویا وہ اس کے قہقہہ لگا کر یہ کہنے کی منتظر ہو کہ "تم ڈر گئی۔ میں مذاق کر رہا تھا۔" لیکن ارمان نے اسی سنجیدگی سے باتِ جاری رکھی "اور پھر کسی دن ایک انگریز فوجی نے اس مم کو مار دیا۔ شاید اسی لیئے لوگ اسے کوہ مہردر کی بجائے کوہ مُردار کہتے ہیں۔"

یکا یک ارمان کے لب خاموش ہوگئے۔

پہاڑ پر گہرا سناٹا چھا گیا

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔" ویرا نے خوف کا تاثر چھپاتے ہوئے حیرت سے پوچھا

"بالکل سچ۔"

اس نے خاموشی سے ارمان کا بازو تھام لیا۔

"تم ڈر گئیں۔" ارمان نے مسکرا کر پوچھا

"اس وقت میں سچ نہیں بولنا چاہتی اس لیے میرا جواب ہے، نہیں۔" ویرا نے اس کے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا

"مگر آج تمہیں میرے ہر سوال کا جواب سچ سچ دینا ہوگا۔" ارمان نے شوخی سے کہا اور اس کی گرفت سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے چند قدم آگے جا کر اپنے منہ کے دونوں جانب ہاتھ رکھ کر زور سے چلایا "تم میری کون ہو۔ ویرا۔"

ویرا۔ ویرا۔ ویرا کی آوازیں ہر طرف گونج اٹھیں

اس کی آواز ہلکی سی گونج کے ساتھ شہر کی فضاؤں کی طرف روانہ ہوگئی۔ ہاتھ نیچے کر کے اس نے ویرا کی جانب دیکھا

"یہ کیا کر رہے ہو۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا

"تمہیں اسی انداز میں جواب دینا ہوگا۔" ارمان نے اسے آگے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

"ایسا کرنے سے کیا فائدہ۔" اس نے وہیں کھڑے کھڑے مسکراتے ہوئے پوچھا

"تم جانتی ہو کہ ازل سے آج تک جتنی باتیں، آوازیں، چیخیں، سسکیاں، دعائیں، بددعائیں انسانوں کے حلق سے نکل کر فضا کا حصہ بنی ہیں وہ سب صدائیں اس دنیا میں قیامت تک موجود رہیں گی۔" ارمان نے فلسفیانہ انداز میں کہا "اور میں چاہتا ہوں کہ ہماری باتیں بھی ریکارڈ ہو جائیں Loud & Clear۔"

وہ خاموش رہی۔ جانتی تھی کہ ارمان ایسا کیوں چاہ رہا ہے، اس وقت اسے اپنے دل کے اندر ایک ٹیس اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی مگر وہ فوراً اسے دباتے ہوئے اس کی خوشی میں شریک ہونے کے لیے تیار ہوگئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لمحہ موجود کی خوشی کو آنے والے کل کے دکھ کے حوالے کر کے اسے افسردہ کردے

وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے چند قدم آگے بڑھی اور ایک نگاہ ارمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو منہ کے دائیں بائیں رکھ کر زور سے چلائی "میں

تمہاری ہمجان ہوں، ارمان۔"
ارمان۔ ارمان۔ ارمان کی بازگشت چٹانوں سے ٹکرانے لگی
دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے
ارمان کی آواز ایک مرتبہ پھر گونجی "تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے ویرا۔"
وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی اور ہونٹوں کے گرد ہاتھوں کا ہالہ بنا کر چیخی "بہت! بہت! بہت زیادہ۔"
اس کی سانس ہلکی سی پھولی ہوئی تھی لیکن مسکراہٹ کا رنگ پورے چہرے پر چڑھا ہوا تھا
"تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو ویرا۔" وہ پورا زور لگا کر چیخا
اور جواباً وہ بھی اتنی قوت سے ہی چلائی "اپنی زندگی تمہیں سونپ چکی ہوں ارمان۔"
گونجتی آواز میں اداسی ہوا میں گھلنے لگی
"کیا تم میرے لیے مر سکتی ہو ویرا۔" وہ بلا جھجک چلایا
ویرا نے محبت سے لبریز نگاہیں اس کی طرف اٹھائی "خدا کی قسم ہاں! ابھی اسی وقت یہاں سے کود سکتی ہوں۔"
"کیا میری خاطر جی سکتی ہو۔"
"ہر سانس تمہارے نام کر چکی ہوں۔"
کوہِ مہر در میں محبت گونج رہی تھی
"میرے بعد زندگی کیسی ہوگی۔"
ارمان کی آواز کی گونج سے ویرا کو اپنا دل لرزتا ہوا محسوس ہوا۔ مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی لیکن وہ اس کڑوے گھونٹ کو پی گئی
"بند مٹھی میں خوشبو کی مانند۔" ہر طرف خوشبو مہکنے لگی
"مجھ سے جدائی سہہ لوگی۔"
ارمان کے سوالات تلخ ہوتے جا رہے تھے لیکن ویرا کو نا جانے کیوں جواب دینے میں لطف آ رہا تھا اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر موجود تمام عمر کی گھٹن کو بالآخر باہر نکلنے کا رستہ مل گیا ہو۔ اپنی آواز کی گونج سن کر اسے اپنے "ہونے۔" کا نشان مل گیا ہو۔
"نہیں تم سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" اس کی آواز میں کسی اَن دیکھے خوف کا شائبہ تھا۔
دونوں ایک دوسرے سے نگاہیں چرا کر کھڑے تھے۔ دونوں کی نظریں شہر کی جانب تھی چند لمحوں کی خاموشی جان لیوا ہوگئی۔
"حقیقت سے نظریں نہیں چرایا کرتے۔" صدا میں شکایت تھی
"میرے لیے محبت سے بڑی کوئی حقیقت نہیں۔"
آواز پہلے کے مقابل قدرے مدہم تھی
"تم سے جدائی میری مجبوری ہے۔" ارمان کی آواز کی گونج میں پہاڑ میں شگاف کرنے جیسی قوت تھی
"مجبور لوگوں کا محبت سے کیا واسطہ۔" ویرا کی صدا نے خود اس کے اپنے دل کو چیر کر رکھ دیا
ارمان اس مرتبہ بنا منہ کے اردگرد ہاتھ رکھے چلایا
"محبت کو مجبوری کا دکھ کیوں محسوس نہیں ہوتا۔ کیوں۔"
کیوں۔ کیوں۔ کیوں کی بازگشت پتھروں سے سر پھوڑنے لگی۔
ویرا کی سانسیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں اس کا حلق خشک اور دل میں آنسوؤں کا دریا شور مچا رہا تھا وہ بڑی مشکل سے ضبط کرتے ہوئے بولی "محبت کے اپنے دکھ کم تو نہیں ہوتے۔۔" آواز گلے میں رندھ گئی اور اس نے ارمان کا بازو پکڑ کر اس کے کاندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔
ارمان کا حلق بھی جواب دے چکا تھا اس نے بہت آہستہ سے کہا "زندگی کے دکھوں سے زیادہ تو نہیں۔"
ویرا نے اس کے کاندھے پر اپنا سر مارتے ہوئے کہا "ہاں! ہاں! مانتی ہوں۔"
کوہِ مہر در پر سرد ہوا کے جھونکے چمکیلی دھوپ کو لحہ لحہ نیچے سرکانے میں مصروف تھے۔
اندر کی گھٹن باہر نکال کر ویرا خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی تھی
تنہائی اور روحانیت کا واسطہ پہاڑوں سے منسوب ہے شاید اسی لیے انسان نے جتنی بھی دنیاوی ترقی میں کمال و عروج حاصل کیا ہے وہ مختلف علاقوں میں منتقل

کے بعد کیا ہے آج بھی جب انسان اپنے اندر گھٹن محسوس کرتا ہے، شہروں اور دیہاتوں میں ہمہ وقت مصروف رہ کر تنگ آ جاتا ہے تو اسے پہاڑوں کی یاد ستاتی ہے وہ نادانستہ طور پر پہاڑوں کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے کیونکہ اس کی روح کو تازگی درکار ہوتی ہے جسم کے تقاضوں کو پورا کرتے کرتے انسان روح کی ضرورتوں کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے اور جب روح اس سلوک سے تنگ آ کر چیختی ہے تو آدمی کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اس کے تقاضوں کی طرف بھی توجہ کرے، ایسے میں آدمی پہاڑوں کا رخ کرتا ہے پہاڑوں پر جا کر لوگ خود کو آزاد اور خوش محسوس کرتے ہیں درخت پھول پودے جنگلی حیات چٹانیں اور نگاہوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر ان کی روح تسکین پاتی ہے وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے بلند و بالا پربتوں کو دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ کچھ لوگ ان پر چڑھ کر اوپر سے اوپر جانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی اس آرزو کے در پردہ یہ سائیکی کارفرما ہوتی ہے کہ چوٹی سر کرنے کے بعد جب وہ وہاں سے نیچے کا نظارہ کریں تو انہیں تمام دنیا بونی نظر آئے، حقیر چیونٹیوں کی مانند رینگتے ہوئے لوگ اور ماچس کی ڈبیوں کی مانند بڑی بڑی عمارتیں جبکہ کچھ لوگ چوٹی پر پہنچ کر اپنے ہاتھ سے آسمان کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں دل ہی دل میں یہ سوچ کر دعائیں مانگتے ہیں کہ اپنے گھروں اور مسجدوں میں بیٹھ کر دعا مانگنے کی بہ نسبت اس وقت وہ خدا کے زیادہ قریب ہیں۔ جیسی روحیں ویسی آرزوئیں!

شور کے مارے ہوئے لوگوں کو پہاڑوں کی گود میں سکون ملتا ہے، پریشان حال، بیمار، اداس، دنیا کے جھمیلوں میں جکڑے ہوئے لوگوں پر پہاڑوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے، تنہائی کی تلاش میں جانے والوں کو پہاڑ اپنا دوست بنا لیتے ہیں جبکہ خوشی کے متلاشی کو روحانی خوشیوں سے مالا مال کرتے ہیں، محبت کے ڈسے ہوئے لوگوں سے وہاں اپنی ذات سے ملاقات ہوتی ہے اور اپنی ذات کی تلاش میں جانے والوں کی خدا سے!

پہاڑوں سے عشق کرنے والے جانتے ہیں کہ پہاڑوں کے لبوں پر اقراء اقراء کا ورد جاری ہے۔ پہاڑ انسان سے مخاطب ہیں اقراء۔ پڑھ! اور زمین پر کھڑے ہو کر میری جانب نگاہیں اٹھا۔ میری بلندی کے بارے میں سوچ اور پھر میرے خالق کی قدرت میں گم ہو جا۔ اس کی عظمت کا معترف بن کر زمین پر نگاہیں جھکا کر چل۔ پڑھ! اور اس دنیا کو وہاں سے دیکھ جہاں سے میں دیکھتا ہوں کہ تجھے یہ حقیر اور بہت محدود دکھائی دے گی اور یہی اس کی حقیقت ہے۔ پڑھ! اور سوچ کہ کس نے تجھے اس قابل بنایا کہ آج تُو نے میرا غرور توڑ رکھا ہے میرے سر پر تیرے پاؤں ہیں۔ کوئی ہے جو خدا کے سوا غرور کر سکتا ہے تُو یا میں؟۔ پڑھ! اور میری طرح پُرسکون ہو جا۔ پھر جو بھی تیرے اندر چھپے علم کو حاصل کرنا چاہے اس پر میری طرح اپنے پوشیدہ خزانوں کے منہ کھول دے طالب علم کی طلب کو پورا کر کے امر ہو جا۔ پڑھ! اور زمین پر سجدہ کرنا سیکھ ورنہ میری طرح پتھر بنا دیا جائے گا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے شہر کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں نا جانے کتنے ہی ارمانوں اور ویراؤں کی کہانیاں مقدر کے کاغذوں پر لکھی، ہوا کے دوش پر اڑتی پھر رہی تھیں

☆

اسپتال میں بیمار خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

غفران ایک بیساکھی کا سہارا لیے ہوئے اپنے قدموں پر آہستہ سے چلتا ہوا ڈاکٹر قدرت کے کمرے میں داخل ہوا تو ڈاکٹر اپنی نشست سے اٹھ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔ غفران کا چہرہ ایک نئی زندگی کی روشنی سے دمک رہا تھا اور ڈاکٹر کی آنکھوں میں وہ چمک تھی جیسے کڑی محنت کے بعد اپنے تخلیق کردہ مجسمے کو دیکھتے ہوئے کسی سنگ تراش کی آنکھوں میں ہوتی ہے

''آخر تمہاری ہمت اور حوصلے نے تمہاری مایوسی کو شکست دے ہی دی۔''

''نہیں، سر آپ کے یقین کی روشنی نے میرے اندر کی مایوس تاریکی کو مٹا دیا۔''

''ہمیں یقیناً خدائے بزرگ و برتر کا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' ڈاکٹر نے انگشت شہادت ہوا میں اٹھاتے ہوئے کہا

غفران نے سر کو جنبش دی ”بے شک۔“
”بیٹھو“ ڈاکٹر خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اپنی نشست پر بیٹھ گیا
”سر، میں جان بوجھ کر اس وقت آیا ہوں شام کو آپ کے پرائیویٹ کلینک پر ملنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔“
”وہ کیوں بھئی۔“
”آپ کے کلینک کے باہر مریضوں کا ہجوم دیکھ کر لگتا ہے کہ سارا شہر ہی بیمار ہے۔“
”اوہ، خیر، اچھا یہ بتاؤ کہ کیسا لگ رہا ہے۔“
”جیسے بارش کے بعد سب کچھ دھلا دھلا سا لگتا ہے، ایک دم تازہ۔“
”ابھی دو ہفتے ہوئے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ بیساکھی بھی چھوڑ دو گے۔“
”جی سر، بس انسانوں کی محتاجگی سے نجات مل گئی۔ اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔“
غفران نے نوٹس کیا کہ ڈاکٹر کا چہرہ کچھ بجھا بجھا سا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ وجہ دریافت کرتا ذرا سے توقف کے بعد ڈاکٹر نے خود ہی لب کھول دیئے ”دوست، چودہ برس کا ایک مریض بچہ ہے جسکا نام کبیر ہے۔ دو سال کی عمر میں اسے ٹائیفائیڈ ہوا اور وہ اپنے ہی جسم پر اپنا کنٹرول کھو بیٹھا انہیں ہم میڈیکل ٹرم میں CP Children کہتے ہیں۔
گذشتہ ماہ کا واقعہ ہے میں اسی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ کبیر کی ماں میرے پاس افسردگی کے عالم میں آئی۔ میں حیران تھا اس مرتبہ کبیر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے گزشتہ روز پیش آنیوالا واقعہ بیان کیا کہ عصر سے ذرا پہلے کبیر نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے اسے چپ کرانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بدستور روئے جا رہا تھا۔ میں نے اس کا سر دبایا پیٹ پر ہاتھ رکھ کر تکلیف کا پوچھا لیکن وہ نفی میں سر ہلاتا رہا اور آنسو اس کے گالوں پر بہتے رہے۔ باپ مزدوری سے واپس آیا تو اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا وہ اسے یونہی روتا ہوا وہیل چیئر پر بیٹھا کر گھر سے باہر لے گیا، دکان سے آئسکریم دلائی لیکن وہ کسی صورت خاموش نہیں ہوا۔ پھر وہ اس ارادہ سے واپس گھر آیا کہ اسے آپ کے پرائیویٹ کلینک پر لے جائے گا مگر میں نے اسے یہ کہہ کر مزید پریشان کر دیا کہ آج اتوار ہے، کلینک بند ہوگا۔ کبیر کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں اسے دورہ نہ پڑ جائے لیکن ایک حد کے بعد خدا کو بندے پر رحم آ ہی جاتا ہے۔ اسی اثنا میں کبیر کو بیت الخلاء لے جانے کا وقت ہو گیا اور وہیں اس کے رونے کی وجہ بھی معلوم ہو گئی اس کی ران پر ایک موٹی کالی چیونٹی چپکی ہوئی تھی اور جونہی اس کے باپ نے وہ چیونٹی کھینچ کر ہٹائی اس کے آنسو تھم گئے اور میرا بچہ بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مسکرانے لگا!
یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر قدرت کی افسردگی میں اضافہ ہو چکا تھا۔
غفران نے افسوس سے سر ہلایا
”اور جانتے ہو اس کی ماں، سگی ماں، میرے پاس کیوں آئی تھی۔“ ڈاکٹر کسی اور ہی عالم میں گم تھا
غفران نے نفی میں سر ہلایا
”اس کی ماں نے کہا ڈاکٹر صاحب میرے بچے کی زبان ہے لیکن وہ بول نہیں سکتا۔ اپنی تکلیف بتا نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھ ہیں لیکن اس میں انہیں استعمال کرنے کی حس نہیں ہے۔ وہ چل نہیں سکتا بلکہ رینگتا ہے، بغیر مدد کے کھا اور پی نہیں سکتا۔ وہ ایک سانس لیتی ہوئی لاش ہے اور بس۔“ اس کی ماں کافی جذباتی ہو چکی تھی، اس کے جسم میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ اور رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ میں نے اسے دلاسا دیا تو وہ میرے پاؤں پڑ گئی، اس کا لہجہ ملتجیانہ اور مطالبہ دل ہلا دینے والا تھا
غفران سانس روکے ڈاکٹر کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا
”وہ مجھ سے۔۔“ ڈاکٹر کا حلق جیسے خشک ہو گیا پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے دوبارہ بات کا آغاز کیا ”وہ مجھ سے کسی ایسے انجکشن کا مطالبہ کر رہی تھی، جس سے اس کے بچے کو اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا مل سکے۔“
غفران کو محسوس ہوا جیسے چند لمحوں کیلئے اس کا دل

کسی نے زور سے مٹھی میں دبوچ کر چھوڑا ہو
''ایک ماں اپنی جنمی ہوئی اولاد کیلئے موت کا مطالبہ کر رہی تھی۔''
غفران یہ سن کر کانپ اٹھا۔ ڈاکٹر نے اپنا چشمہ اتار کر ٹیبل پر کھسکا دیا اور کرسی پر پشت لگا کر آنکھیں موند لیں
''جانتے ہو میں نے کیا کیا۔''
غفران خاموش رہا
''اس کا کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا مطالبہ بھی بالکل بجا تھا اور یقین مانو ایک لمحہ کیلئے میرا دل چاہا کہ میں اسے کوئی ایسا انجکشن یا دوا لکھ دوں۔۔''
غفران کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں
''لیکن میں نے سوچا کبیر کوئی دنیا کا واحد بچہ نہیں اس جیسے ہزار ہا بچے اسی دنیا میں موجود ہیں جو ایک زندہ لاش کی طرح کمروں میں پڑے سانس لے رہے ہیں۔ بس اسی خیال نے مجھے انسانیت کے منصب سے گرنے نہیں دیا
اس کی ماں میرے سامنے اپنی غربت کو رونا رونے لگی۔ اسکا شوہر کسی دکان میں ادنٰی سیلز مین تھا۔ کبیر کے علاوہ پانچ بچے اور تھے اور گزر اوقات بے انتہا مشکل سے ہوتا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی شوہر کی مرضی سے میرے پاس یہ مطالبہ لے کر آئی ہے۔ مجھے اپنی لاچاری ،مجبوری کے واسطے دیئے۔ لیکن میں نے ایسا نہ کیا۔ میں نے مجبوراً اپنے چپڑاسی کو بلا کر اسے کمرے سے باہر کروایا اور پھر وہ اس روز کے بعد کبھی میرے پاس لوٹ کر نہیں آئی۔
ماحول انتہائی غمگین ہو چکا تھا
کچھ توقف کے بعد ڈاکٹر نے گلاس سے پانی کے دو گھونٹ لیتے ہوئے شکستہ لہجے میں کہا
''دوست، اس وقت میرے ذہن میں بڑی کتابی باتیں تھیں۔ ایسے قصے تھے جو میں اس کی ہمت بندھانے کیلئے اسے سنا تو سکتا تھا لیکن اس وقت ایک جذباتی اَن پڑھ عورت کو سمجھانے سے قاصر تھا۔ میرا سارا علم اور مسیحائی کبیر کی جذباتی، غریب، مجبور ماں سے منہ چھپاتی پھر رہی تھی۔''

کمرے میں کچھ دیر کیلئے خاموشی چھا گئی
''''یقیناً کبیر کے جسم سے پھوٹنے والی سرخ روشنی سفید ہو چکی ہو گی۔''۔''غفران کا لہجہ غم ناک تھا
ڈاکٹر نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا
''میں آپ سے ایک عجیب و غریب خواب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔''غفران نے اپنے دونوں بازو ٹیبل پر جما دیئے

☆

ویرا اور ارمان کوہ مہر در پر افسردہ کھڑے تھے
دونوں کی آنکھوں میں شہر کا نظارہ دھندلا چکا تھا وہ ایک دوسرے کو پہلو میں لیے آہستہ آہستہ ایک چٹان کی طرف بڑھنے لگے دونوں ایک بڑی سی چٹان پر بیٹھ گئے۔ ارمان نے اس کی شال کو کھول کر اس کا دوسرا سرا اپنے شانوں پر پھیلا دیا اور ویرا نے چپ چاپ اس کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ اس کے بال ارمان کے سینے پر پھیل گئے۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد ارمان نے نہایت پیار سے اسے مخاطب کیا''ویرا! کبھی تم نے کسی پتنگ باز کو اپنی پتنگ ہوا کے حوالے کرتے اور پھر اسے دور بہت دور آسمان کا رنگین ستارہ بنتے ہوئے دیکھا ہے۔''
ویرا نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا
''اس کا چہرہ خوشی فخر اور احساس برتری سے سرشار ہوتا ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنی پتنگ کو کبھی دائیں کبھی بائیں غوطے دے کر سینہ پھولاتا ہے اس وقت اسے محسوس ہوتا ہے کہ پورے شہر میں اس سے بڑا پتنگ باز اور کوئی نہیں لیکن جب پتنگ کٹ کر اس کی نگاہوں کے سامنے نا معلوم مقام کی طرف روانہ ہو جاتی ہے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر باقی ماندہ کٹی ہوئی ڈور کو دونوں ہاتھوں سے اپنی طرف کھینچ کر اسے چرخی پر لپیٹنا شروع کر دیتا ہے، اسے پتنگ کے کٹ جانے کا دکھ ضرور ہوتا ہے لیکن وہ یہ جانتا ہے کہ یہی ڈور دوبارہ کسی نئی پتنگ کو ہوا میں اڑانے کا سہارہ بنے گی اگر ڈور نہ رہی تو ہزار ہا پتنگوں کے ہونے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔'' ارمان نے ذرا ٹھہر کر ایک گہرا

سانس لیا اور پھر گویا ہوا ''اسی طرح انسان بھی کٹ جایا کرتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ بچھڑنے والے کی یادوں کی ڈور کو زیادہ سے زیادہ اپنے دل کی چرخی پر لپیٹ لیں۔ یادوں کی ڈور پاس ہو تو آسمان بھی محبت کی پتنگوں سے خالی نہیں ہوتا، ڈور مضبوط ہو تو تیز ہوا بھی اس کے ہاتھ سے پتنگ کا دامن نہیں چھڑا سکتی۔ وصل کے لمحات ہی فرقت کی یادوں کو جنم دیتے ہیں، ہر آنے والا لمحہ، لمحہء موجود کو یاد کی وادی میں دھکیل کر نمودار ہوتا ہے۔ ہم بھلے اس صدی کے انسان ہیں لیکن ہماری ذہن میں ایستادہ یادوں کے شجر کی جڑیں لاکھوں کروڑوں سالوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہم اگر سوچنے بیٹھیں تو عقل دیوانگی اور کفر کو چھونے لگے، انسان کا سکون اسی میں ہے کہ وہ ماضی قریب کی یادوں سے مستقبل قریب کی پتنگ کو سہارا دے۔''

''یادیں اذیت ناک ہوتی ہیں۔'' ویرا کے لب ہولے سے کھلے ''تم بھی بس یادیں سونپ کر لوٹ جاؤ گے۔''

ارمان نے خاموشی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا ''تم اگر مجھے بے وفا جان کر یاد رکھو گی تو ساری عمر واقعی اذیت میں کٹے گی اور اگر مجھے صرف اپنا ہمجان سمجھ کر میری رفاقت کو یاد کرو گی تو میری محبت تمہیں قدم قدم پر سہارا دے گی، میری یاد تیز ہوا میں بھی تمہارا دامن نہیں چھوڑے گی، بالکل اسی طرح جیسے تمہاری یاد اب حشر تک مجھے عالم ارواح میں سرشار رکھے گی۔''

پہاڑ پر سناٹا مزید گہرا ہو چکا تھا۔ دھوپ اپنی چادر سمیٹنے میں مصروف تھی کہیں دور درہ سے کوئی آواز خاموشی پر یوں گرتی جیسے گرم زمین پر پانی کی بوند ٹپکتے ہی غائب ہو جاتی ہے۔

ویرا کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو خشک ہو چکے تھے اس کے گیلے ہونٹ شبنم میں بھیگی گلاب کی پنکھڑیاں دکھائی دیتے تھے وہ سیاہ زلفوں میں اپنا ملائم چہرہ چھپائے ارمان کے شانے کے ساتھ آنکھیں موندے چپ تھی۔

'' ارمان۔'' اس نے کچھ توقف کے بعد اپنی آنکھیں کھول دیں

''ہم۔''

'' معذور افرد کیوں اس بات پر مطمئن نہیں ہو جاتے کہ وہ محبت کے نہیں صرف ہمدردی کے مستحق ہیں، وقتی طور پر کی جانے والی ہمدردی کے قابل ہوتے ہیں۔''

''محبت کی بارش ساری زمین پر یکساں برستی ہے وہ نہیں دیکھتی اس کے قطروں کا سینہ کسی کانٹے میں پیوست ہوا ہے یا کسی پھول کی آغوش میں ٹپکا ہے یہ ہم انسان ہیں جو اپنی انا اور مجبوریوں کے حصار میں قید ہو کر خود کو اس بارش سے محروم رکھتے ہیں۔''

''نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ تم غلط کہہ رہے ہو بے بنیاد بات ہے بے کار تسلی ہے میں نہیں مانتی۔''

''ویرا، تم۔۔۔'' ارمان نے اسے سمجھانا چاہا

مگر وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی ''کبھی تم نے وہ بنجر زمینیں، تپتے ہوئے صحرا، خشک چٹیل بے آب و گیاہ علاقے نہیں دیکھے جنہیں خدا نے برسات سے محروم کر رکھا ہے برسوں بعد پانی کا لمس چکھنے والے معذور خطے جہاں ذرا سی بارش سے حدِ نگاہ پھیلی ہوئی دراڑوں کے منہ بھی پانی سے نہیں بھر پاتے اور بادل اگلے دس، بیس، چالیس، پچاس اور کبھی کبھی صدیوں تک لوٹ کر اس طرف نہیں آتے۔'' اب اسکا لہجہ تلخ اور جسم دھکنے لگا تھا۔

''محبت میں سے ہمدردی نکال دو تو خود غرضی رہ جاتی ہے۔'' ارمان نے ہولے ہولے لب وا کیے ''محبوب کے ساتھ صرف خوشیاں بانٹ کر اس کے درد کو نظر انداز کر دینا کہاں کی محبت ہے۔ اس کے جسم کو سیراب کر کے اس کی روح کو پیاسا رکھنا ہوس کہلاتا ہے۔ ہمدردی کرنے والا شخص درحقیقت ہم سے ایسی محبت کرتا ہے جس کا تعلق خالعتاً روح سے ہوتا ہے، بناوٹ سے یکسر پاک لیکن چونکہ ہم ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں جھوٹ، منافقت اور بناوٹ کا دور دورہ ہے اسلیے ہم ایکدوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کسی کا خلوص بھی ہمیں اس وقت تک ہضم نہیں ہوتا جب تک ہم کسی وجہ سے مجبور نہیں ہوتے یا پھر جب تک ہمارے اندر سے ''قبول کر لو'' کی صدا بلند نہیں ہوتی۔''

''تمہیں نہیں پتہ۔ تم کچھ نہیں جانتے۔'' ویرا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہر شخص مجبور ہوتا ہو گا لیکن ایسی مجبوری جسے معاشرہ معذوری کے زمرے میں ڈال دے ایسے کلنک کے ساتھ تمام عمر زندہ رہنا بہت تکلیف دہ عمل ہے ساری زندگی کی سزا ہے، پل پل پھانسی پر ٹانگنے والی نظریں کیسی ہوتی ہیں تم کبھی نہیں جان پاؤ گے سانس لیتے انسان کو زندہ لاش کہتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرنے والے لوگوں سے کب تمہارا واسطہ پڑا ہے، تم ایسے المیوں کے کرب سے کب آشنا ہو؟ پاگل ہیں وہ سب معذور افراد جو محبت کی بات کرتے ہیں انہیں تو پہلے اس بے حس معاشرے میں خود کو انسان تسلیم کروانا ہو گا۔ آہ آہ! کتنے ظلم کی بات ہے ناں ارمان کہ انسان خود کو انسان تسلیم کروانے کی جنگ لڑ رہا ہے اور وہ بھی انسانوں کے خلاف۔''

وہ اپنے درد کی شدت کے ساتھ سفر میں تھی اسے روکنا محال تھا

ارمان اس سفر میں اسکا ہمسفر بن کر اسے چپ چاپ سنتا گیا

''مجھے محبت چاہیے! ایسی خالص جذباتی محبت جو میرے خوابوں کے گلشن پر دیر تک شبنم بن کر برسے تاکہ میرے تانبے جیسے تپتے جذبات کا درجہ حرارت نارمل ہو سکے۔ ایسی محبت جو میری محرومیوں کے خالی خانوں میں رنگ بھر سکے جس کی خاموشی بھی میرے لیے قابل فہم ہو۔ کوئی تو ایسا چاہنے والا ہو جسے لوگ میرے ساتھ دیکھیں تو میری معذوری کو بھول کر میری قسمت پر رشک اور اپنے مقدر کا ماتم کریں۔''

اسی لمحے دُور آرمی فائرنگ رینج سے رائفل فائر کی آواز ابھری اور کوہ مہر در کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر آن ہی آن میں ریزہ ریزہ ہو گئی

فضا میں ایک مرتبہ پھر خاموشی چھا گئی۔ ارمان ہنوز چپ تھا

جب کوئی جواب نہ آیا تو ویرا اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا ہوئی'' مجھے غلط نہ سمجھنا ارمان، یہ سب نیچرل ہے اب یہ باتیں میں ہر کسی سے نہیں کہہ سکتی ناں۔ ساری دنیا کو نہیں سمجھا سکتی کہ صرف قوت سماعت سے محروم ہونے کی وجہ سے میں باقی جذبات سے محروم نہیں ہوں۔'' اس کی آواز حلق میں ڈوب گئی۔

ارمان نے اس کا ہاتھ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ سرد موسم میں بھی اس کا ہاتھ تپتا تھا

سورج مغربی پہاڑیوں میں غروب ہوا چاہتا تھا ہوا میں خنکی بڑھنے لگی۔ شہر کا منظر مزید دھندلا چکا تھا کوہ مہر در کے ماتھے پر دھوپ کا آخری بوسہ ثبت تھا۔

''مایوس لوگ اپنے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔'' ارمان نے خاموشی توڑی

''میں مایوس نہیں ہوں بہتر زندگی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک چکی ہوں یہ سب میری تھکی ہوئی باتیں ہیں۔''

''یہاں کچھ مستقل نہیں ویرا۔ اچھے کی امید رکھو۔''

''ہاں تمہارا ساتھ بھی مستقل نہیں۔ ارمان میرا جی چاہتا ہے کہ اس سے پہلے کہ تم مجھے چھوڑ دو میں تمہیں چھوڑ دوں، کم از کم ٹھکرائے جانے کے دکھ سے تو نجات مل جائے گی۔''

''آہ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے تمہارے دل میں میرے لیے محبت نہیں بلکہ صرف پسندیدگی کا جذبہ ہے۔''

''محبت سے پہلے پسند کی ضرورت تو ہوتی ہے نا ں ہم صرف اسی انسان سے محبت کرتے ہیں جو ہمارے لیے کسی نہ کسی حوالے سے اہمیت کا حامل ہو۔''

''ٹھیک کہا تم نے مگر پسندیدگی کے معاملے میں ہمیشہ کچھ کھونے یا مسترد ہونے کا خطرہ رہتا ہے اور یہ خوف تم میں بدرجہ اتم موجود ہے۔''

''کیا تم یہ باور کروانے کی کوشش کر رہے ہو کہ مجھے تم سے محبت نہیں؟ میرے جذبات ڈھونگ ہیں۔''

''اس کا فیصلہ تم خود کرو۔ میں صرف یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جب ہم پسندیدگی کے جذبے کے ساتھ اپنے من پسند شخص کی جانب بڑھتے ہیں تو ہمیشہ یہ خوف رہتا ہے کہ اگر ہم اس کے قریب ہوئے وہ شخص ہم سے دور ہو جائے گا اور ہمیں پہلے سے زیادہ تکلیف دہ حالت میں چھوڑ جائے گا اور ہم اس کے ہجر میں مر جائیں

گے ۔کس قدر احمقانہ سوچ ہے کہ پھول سے صرف اس لیے پیار نہیں کرنا کہ اس نے ایک دن مرجھا جانا ہے، کسی پر اعتماد اس لیے نہیں کرنا کہ اعتماد کو ٹھیس پہنچی تو تکلیف ہوگی، کسی پر انحصار نہیں کرنا محض اس واسطے کہ وہ پلٹ کر آپ کو بے عزت نہ کردے۔''

ارمان نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بات مکمل کی

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ پسندیدگی کی قیمت تکلیف ہوتی ہے۔''

''ہاں ۔اور جو لوگ زندگی میں رسک لینے سے ڈرتے ہیں انھیں محبت نہیں کرنی چاہیے بلکہ شادی بھی نہیں کرنی چاہیے اور اولاد بھی پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ مستقبل کے بارے میں سوچنا چھوڑ دینا چاہیے۔ رشتے داریوں کو ترک اور دوستوں کو خیرباد کہہ دینا چاہیے حتی کہ ایسے احمق لوگوں کو ہر اس کام سے گریز کرنا چاہیے جس سے زندگی جاندار نمایاں اور بامعنی دکھائی دیتی ہے۔''

ویرا نے محسوس کیا کہ ارمان کے لہجے میں غصہ تھا

''بھرپور زندگی تکالیف سے بھرپور ہوتی ہے۔'' وہ جذبات کی رو میں بہہ چکا تھا ''محبت کے لیے بہادری کی ضرورت ہوتی ہے ویرا، اپنی ذات کو وسعت دینے کے لیے نئے اور غیر مانوس علاقوں میں داخل ہونا پڑتا ہے اور پھر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ محبت کے سفر میں ہمارا ہمسفر کوئی امیر ہے یا غریب۔ گورا ہے یا کالا۔ اپنا ہے یا غیر۔ کوئی معذور فرد ہے یا غیر معذور۔ محبت ہمیں آدمی سے انسان بناتی ہے، ہم صرف محبت کا ہاتھ تھام کر ہی انجانی زمینوں پر قدم رکھ سکتے ہیں۔ محبت میں کبھی بھی اس قسم کا خوف جنم نہیں لے سکتا کہ اس سے پہلے کہ تم مجھے چھوڑ دو میں تمھیں چھوڑ دوں گی۔''

رات کا سرمئی آنچل پھیل چکا تھا

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' ویرا کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی ''شاید معذور لوگوں میں چاہے جانے کی اس قدر پیاس ہوتی ہے کہ ان میں محبت کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی وہ فاقہ زدہ۔'' بھوکے ننگے لوگوں کی طرح کھانے کی تلاش میں ادھر ادھر کریدتے پھرتے ہیں ان کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا، کچھ بھی نہیں۔''

''تم کیوں میری باتوں کا غلط مطلب نکال رہی ہو۔''

''نہیں ارمان، میں جانتی ہوں کہ مجھ میں خالی پن بھرا ہوا ہے، ایک بے پیندہ صراحی بھرے جانے کی خواہش میں کتنا ہی پکار لے لیکن کبھی بھی پوری نہیں بھری جا سکتی، میں کبھی بھی مکمل پن محسوس نہیں کرسکتی، مجھے ہمیشہ اپنا کوئی حصہ گمشدہ محسوس ہوتا رہے گا، مجھے اس بے چارگی کے ساتھ تنہائی جھیلنی ہے۔''

''اگر چاہے جانا تمہارا مقصد ہے تو اسے پورا کرنے میں تم ناکام رہوگی ،محبت حاصل کرنے کا واحد طریقہ خود کو محبت کرنے کے قابل بنانا ہے۔''

''مجھے تم یہ کیوں نہیں بتاتے کہ اپنی محبت کو یقینی بنانے کے لیے تم سے اپنی وابستگی کو کیسے پختہ بناؤں بولو ارمان۔''

''زندگی میں ہمارا بنیادی مقصد کوشش کیے بغیر چاہے جانا ہو تو ہم کبھی بھی قابل محبت نہیں ہوسکتے۔''

''مجھے یہ فضول کا کتابی فلسفہ مت سمجھاؤ۔'' ویرا نے جھنجھلا کر کہا ''مجھے ڈسپرین جیسی بات بتاؤ، جس سے فوراً میرا درد ختم ہوجائے، میری آرزوؤں کو قرار آجائے۔''

''میں مانتا ہوں کہ احساس معذوری کی ایک بنیادی وجہ محبت کی عدم موجودگی ہے۔۔''

ویرا اسکی بات کاٹتے ہوئے بولی ''تو پھر مجھے محبت دو ،میری روح کی پیاس بجھا کر میرے آدھے وجود کو مکمل کر دو، ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے میری زندگی میں آجاؤ۔ تم کیسے ہیجان ہو، اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے۔''

ارمان نے ذرا تیز لہجے میں کہا ''محبت کا مرکز صرف کوئی ایک شخص نہیں ہوتا ویرا۔ تم کچھ دیر کے لیے اس لیلا مجنوں کی رومانوی محبت سے نکل آؤ اور میری بات پر دھیان دو۔''

ویرا کا آنسوؤں سے تر چہرہ چاند کی روشنی میں چمکتا تھا

''محبت کی تعریف آفاقی ہے، محبت کی بہت سی

جھتیں ہیں، کسی سنگ تراش کے شاہکار مجسمے کو کیا کہو گی؟ صادقین، چغتائی گل جی کے انمول فن پاروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ سات ہزار سال قدیم مہر گڑھ کے کھنڈرات سے نکلنے والی مورتیوں کے متعلق کیا رائے ہے؟ کیا یہ بے جان چیزیں اپنے خالقوں کی محبوب نہیں تھیں، کیا ان کی خوبصورتی کا ہنر مند ہاتھوں، خوابوں، خیالوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا؟ کیا فطرت کے دلکش اور حسین مناظر کو دیکھ کر خالقِ حقیقی یاد نہیں آتا؟ ساز کے تاروں سے نکلنے والی کوئی مدھر دھن ہمیں کیوں متاثر کرتی ہے؟ مسرت کے لمحوں میں آنسوؤں کا کیا کام؟ محبت کو آسان مت سمجھو ویرا، محبت صفر کی مانند ہے یہ صفر اپنے مقابل آنے والے صفر سے چاہے ضرب کھائے یا تقسیم، جمع، تفریق ہو آخر میں جواب صفر ہی آتا ہے۔ دو ممالک کی جنگ میں آمنے سامنے آنے والی دونوں فوجوں کے سپاہی اپنے اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہو کر ایک دوسرے کو خون میں نہلاتے ہیں، جنگ میں مارنے والے بھی محبت میں گرفتار اور مرنے والے بھی محبت کے اسیر اور آخر میں شکست دونوں میں سے چاہے کسی بھی فوج کی ہو لیکن فتح محبت کی ہوتی ہے، لاشوں پر آنسو بہانے والی بھی محبت اور جشنِ فتح میں قہقہے لگانے والی بھی محبت!۔''

اسی لمحے شمال کی جانب رات کی چادر پر پہلا ستارہ ٹمٹمایا

ویرا نے بھیگی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ کر لب وا کیے

''کیا محبت کی راہ پر چلتے ہوئے واپسی ممکن ہے ارمان، محبت ہمیں اتنا اختیار دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ سکیں؟۔''

''کسی چیز سے دستبردار ہونے کے لیے اس کی ملکیت حاصل کرنا لازمی ہے۔ محبت کی منزل کو جانے والی راہ انسان کی اپنی ذات میں سے گزرتی ہے۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔''

''ویرا، مجھے ہر وقت یہ بات ستاتی ہے کہ تم سننے سے محروم ہو، اس لیے کوئی تم سے محبت نہیں کرتا صرف تمہاری خوبصورتی کو دیکھ کر تمہارے جسم تک پہنچنا چاہتا ہے لیکن اس دنیا میں محبت کے معاملے میں بیشتر سے زیادہ لوگوں کا یہی حال ہے جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو اسے اپنی توجہ دیتے ہیں اس کی باتوں کو غور سے سنتے ہیں۔ ہم سننے میں بے شمار وقت خرچ کرتے ہیں مگر زیادہ تر ضائع ہو جاتا ہے، بیکار، بے سود۔ جانتی ہو کیوں؟۔''

ارمان نے اس کے بال رخسار سے پیچھے سمیٹے

''کیوں؟''

''کیونکہ ہمیں سننے کا سلیقہ نہیں آتا۔ ہم اپنے بچوں کو سکول میں لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں، لکھنے اور پڑھنے میں بہت سا وقت صرف کرتے ہیں اور بولنے کا ڈھنگ سکھانے میں بہت کم محنت کرتے ہیں جبکہ ''اچھا سننے۔'' کی تربیت بالکل نہیں دیتے، انہیں کب کسی کی بات توجہ اور صبر سے سننے کی مشق کرواتے ہیں، محبت توجہ مانگتی ہے اور ہمیں توجہ دینے کا سلیقہ نہیں آتا۔ پھر تم کیوں خوامخواہ خود کو محروم سمجھ کر خود کو اذیت دے رہی ہو ہم سب محروم ہیں جب کوئی شخص اپنے مخاطب کو پوری توجہ کے ساتھ سنتا ہے یہ بھی محبت کا اظہار ہے اور پھر تم ہر شخص کے ہلتے ہوئے لبوں سے پوری توجہ کے ساتھ لفظ چن کر سکتی ہو۔ تم سے بہتر محبت کون کر سکتا ہے۔''

ویرا نے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا ''تم بہت عجیب ہو ارمان، کبھی تو مجھے محبت کے ''م۔'' سے بھی ناواقف قرار دیتے ہو اور کبھی محبت کے تخت پر لا بٹھاتے ہو۔''

ارمان نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا

''میری خواہش ہے کہ تم ضرورت کی محبت سے نکل کر محبت کی ضرورت بن جاؤ۔ تمہارا احساسِ محرومی احساس زندگی میں ڈھل جائے۔ نظر سے ہٹ کر نظارہ بن جاؤ۔ مخلوق کی تعریف و تنقید کو نظر انداز کر کے اپنے خالق کا تعارف بن جاؤ۔''

''کیا ایسا ممکن ہے ارمان۔''

''''خدا ہمارے وجود کا حصہ ہے ویرا، وہ ہمارے اندر مقیم ہے۔ عظیم فلسفیوں، سائنسدانوں، مفکروں، مصنفوں، شاعروں کو کیسے اپنے سوالات کے جوابات مل جایا کرتے ہیں، یہ لوگ تنہائی میں پوری یکسوئی کے ساتھ

اپنے اندر آواز لگاتے ہیں، خدا سے مدد طلب کرتے ہیں اور پیچیدہ مسائل کا حل پاتے ہیں، باقی دنیا کی نگاہوں سے مخفی راز انہیں صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کسی بیمار کو ڈاکٹر، حکیم، وید، سنیاسی، تعویز، دم سے شفاء نہ مل رہی ہو تو اسے چاہیے کہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے اندر رجوع کرے کیونکہ جو خدا اندر بیٹھا ہے وہ ہر شے پہ قادر ہے۔''

'''' ارمان مجھے بتاؤ کہ میں کیسے اپنی محبت کے چھوٹے سے پُر جوش دریا کا رخ آفاقی محبت کے پر سکون ساگر کی طرف موڑ سکتی ہوں۔''

''اپنی شناخت کیساتھ۔''

دونوں کا رخ نیچے شہر کی جانب پھیلی جگمگاتی روشنیوں کی جانب تھا۔ ویرا شال میں لپٹی ہوئی اس کے پہلو میں بیٹھی تھی، اس کی زلفیں سرد ہوا میں لہراتی تھیں لیکن سردی کا احساس مفقود تھا

''ویرا۔'' ارمان نے اسے مخاطب کیا ''خود کو کھونے سے پہلے پانا لازمی ہے، شناخت قائم کرنے کے بعد ہی اسے اتار کر پھینکا جاسکتا ہے۔''

ویرا یوں ہمہ تن گوش تھی جیسے کوئی دیوداسی اپنے دیوتا کے سامنے ہو

''شکوہ کرنے والوں اور سہاروں کے متلاشی لوگوں کی شخصیت ہمیشہ ادھوری رہتی ہے، لوگ کبھی بھی کسی کی ضروریات پورا نہیں کر سکتے میرے نزدیک وہ شخص معذور ہے جو اپنی مفلوج روح کا بوجھ اپنے اندر اٹھائے پھرتا ہے، جس کا دامن دنیاوی غلاظتوں سے بھرا رہتا ہے اور تم یاد رکھنا کہ جو لوگ اپنے کسی جسمانی عذر کو دیکھ کر خود کو محتاج اور اپاہج محسوس کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ بدترین سلوک کرتے ہیں۔''

''میں خود پر اختیار کیسے حاصل کروں، مجھے آزادی کا مفہوم سمجھاؤ ارمان۔ اس معذوری کی مہر کو اپنے ماتھے سے کیسے صاف کروں، انسان کہلانے کا سرٹیفکیٹ اس دنیا میں کہاں سے لوں۔''

'''''اس دنیا میں ہر شخص اپنی زندگی کا سفر نیلے آسمان تلے رہ کر ہی جاری رکھے ہوئے ہے اور آسمان والے کے فیصلوں کو مکمل طور پر قبول کر کے چلنے والے ہی ''آزاد لوگ، کہلاتے ہیں، جب تک کوئی بھی شخص آسمانی فیصلوں کو صدق دل سے قبول نہیں کرتا اس وقت تک وہ اپنے آپ کو فریب خوردہ، شکست خوردہ اور ناکارہ تصور کرتا رہے گا۔''

ویرا نے افسوس سے سر ہلایا ''یہ محبت بھی کتنی عجیب ہوتی ہے ناں، اسے پانے کی خاطر انسان اپنے آپ کو تباہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔''

ارمان نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا'''' محبت ایک درخت کی مانند ہوتی ہے۔ جو اپنی جڑوں میں زندہ رہتی ہے بہار کے موسم میں یہ اپنی جڑوں سے نکل کر شاخوں میں نمودار ہوتی ہے لیکن یہ اس کے اظہار کا چھوٹا سا حصہ ہے جو خزاں کی آمد کے ساتھ ہی غائب ہو جاتا ہے اس لیے جب کسی سے محبت کرو تو فقط محبت کے اظہار کی ہریالی کو ہی کل محبت نہ سمجھ بیٹھنا بلکہ اس جڑوں میں اتر کر محبت کی طاقت کا نظارہ کرنا۔''

خاموشی کا وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ سرد ہوا سے آسمان میں ستارے اور کوئٹہ شہر کی روشنیاں ٹھٹھرنے لگیں۔ مری آباد کی طرف پہاڑ کے دامن میں جگنگ کرتے ہوئے کھنڈروں کے اوپر سرد چاند نمودار ہو چکا تھا ہوا میں چاندنی گھلی ہوئی تھی

کوہ مہر در کی آغوش میں محبت اداس تھی!

''ویرا۔'' ارمان نے لب کھولے تو اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے لبوں پر رکھ دیا، شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اب کیا کہنا چاہتا ہے، وہ جانتی تھی کہ اسے جانا ہے اور وہ جانا چاہتا ہے لیکن وہ اس حقیقت سے انکاری تھی۔

''کاش! میرا جدا ہونا نہ ہونا میرے اختیار میں ہوتا مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔''

ویرا کی آنکھوں سے آنسو ایک بار پھر آہستہ آہستہ گالوں پر بہنے لگے اور ارمان کا دامن بھیگتا چلا گیا

''تمہیں میری زندگی میں آنا ہی نہیں چاہیے تھا ارمان، اگر آ ہی گئے تھے تو یہ نہیں بتانا چاہیے تھا کہ تم میرے ہمجان ہو، یہ کیا ظلم کیا تم نے۔''

تاروں بھرے آسمان میں جہاز مسافروں کو لیے اپنی منزل کی جانب محوِ پرواز تھا

’’جدا میں نے ہونا ہے تم نے نہیں۔ زندگی میری ختم ہوئی ہے تمہاری نہیں۔ تمہارا ہمجان مرا ہے تم نہیں۔ کیا ہوا اگر تمہارے نصیب میں لکھا شخص تم کو نہیں مل سکا لیکن وہ شخص جس کے نصیب میں تم لکھی ہو وہ تمہیں ضرور ملے گا۔ ایک انسان سے دوسرے انسان سے منسلک، ایک محبت سے دوسری محبت سے بندھا ہوا یہ نصیب کا جال پوری کائنات پر پھیلا ہوا ہے۔‘‘

یہ کہتے ہوئے اس نے ویرا کو خود سے علیحدہ کیا اور چٹان پر کھڑا ہو گیا اس کا رخ شہر کی جانب تھا، روشنیوں میں بھیگا ہوا شہر۔ ویرا کے آنسوؤں میں ڈوبا ہوا شہر۔

سرد ہوا میں تیزی آ چکی تھی۔

ارمان نے اپنے دونوں بازو ایک مرتبہ ہوا میں بلند کیے اور آنکھیں موند کر کہا ’’اب مجھے اجازت دو۔ رخصت کی گھڑی آن پہنچی۔‘‘

ویرا گھٹنوں کے بل اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اس کے بال ہوا کے ساتھ لہرانے لگے۔ سیاہ شال اس کے بدن سے کسی غم گسار کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگ چکا تھا۔ اس کی سسکیاں کوہ مہردر کی سنگلاخ چٹانوں میں دراڑیں ڈالنے لگیں

’’نہیں تم مجھے نصیب کا کھلونا دے کر یوں نہیں جا سکتے، پلیز، میں مرجاؤں گی۔‘‘

ارمان کے چہرے پر پہلی مرتبہ افسردگی کے آثار نمایاں ہوئے اور اس نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ’’نصیب کو آنسوؤں کے ذائقے سے آشنا مت کرو، اس کی پرورش مسکراہٹوں میں کرو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔‘‘

’’میں اس نصیب کو کیسے اپنی مسکراہٹ دے دوں جو میری نگاہوں کے سامنے میری خوشیاں چھین رہا ہے۔‘‘

ویرا کی شدت جذبات سے رندھی ہوئی آواز سن کر اچانک ارمان کی بند پلکوں سے آنسوؤں کے دو قطرے برآمد ہوئے ’’ویرا۔ میں تمہارے نصیب کے بارے میں وہ کچھ نہیں بتا سکتا جو میں جانتا ہوں، کیونکہ میں مجبور ہوں بس اتنا جان لو کہ بہت جلد کسی صبح کا سورج تمہارے زخموں کے لیے مرہم لے کر مہردر کے عقب سے طلوع ہوگا اور پھر اس کے بعد آنے والا کوئی دن تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔‘‘

’’نہیں۔ مجھے جاننا ہے کہ تمہارے بعد میرا کیا ہوگا، مجھے بتاؤ کہ تمہاری جدائی کا روگ کب میرے اندر کینسر بن کر مجھے فنا کرے گا مجھے بتاؤ۔ مجھے سب جاننا ہے ارمان۔‘‘ ویرا نے بھیگا ہوا چہرہ اپنی بانہوں میں جکڑی ہوئی اس کی ٹانگ سے رگڑتے ہوئے کہا ’’اس درد کو سہہ لو ویرا کہ ہر درد ایک اشارہ ہے مقصد کی تکمیل کا اشارہ۔ بھٹکے ہوئے مسافروں کو صحیح سمت دکھانے کا اشارہ۔‘‘

’’تم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو ارمان، تمہیں خدا کا واسطہ۔‘‘

’’کاش میں وہ سب کچھ کرسکتا جو تم چاہتی ہو لیکن۔ ۔‘‘

’’کیا خدا کو مجھ معذور پر۔ ۔‘‘

ارمان نے قریباً چیختے ہوئے اس کی بات کاٹی ’’مت سناؤ مجھے یہ خودساختہ فینومینا، جب کوئی معذور فرد یہ کہتا ہے کہ میں معذور ہوں تو دراصل وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ مجھ پر ترس کھاؤ۔‘‘

’’ہاں، مجھ پر رحم کرو۔ ترس کھاؤ پلیز۔‘‘

ارمان کے آنسو اس کے گالوں پر راستہ بنا چکے تھے وہ ہوا میں معلق اپنے بازوؤں کو نیچے گراتے ہوئے جھکا اور ویرا کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر قدرے تیز لہجہ میں بولا ’’تم جانتی تھیں ویرا کہ میں نے ایک دن تم سے جدا ہو جانا ہے اور اسی جاننے کے خوف نے اس وقت تمہاری یہ حالت بنا رکھی ہے۔ میری جان کچھ باتوں کا نہ جاننا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔‘‘

ویرا نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اس کی آنکھوں میں نگاہیں جما دیں اور ارمان کے آنسو اس کے چہرے پر ٹپ ٹپ گرتے چلے گئے۔ وہ اس کے چہرے کو آہستہ آہستہ اپنے چہرے کی جانب کھینچنے لگی دونوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی اور ہونٹ لرزتے تھے اور جہاں انکی سانسیں ایک دوسرے کی حرارت میں مدغم ہونے لگیں اس نقطہ پر ارمان نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا لیکن ویرا کی آنکھوں میں محبت کا وہ چراغ جل رہا

تھا جسے قریب جا کر پھونک مارے بغیر بجھانا مشکل تھا۔ نم آنکھوں میں لپکتی ہوئی آگ کا منظر۔ کتابوں میں پڑھے ہوئے جذبات کو چھو کر دیکھنے کی آرزو۔ احساس محرومی سے چھٹکارے کا ایک تجربہ۔ ازل سے چلی آنے والی کشش میں بندھے ہوئے نیگیٹو اور پازیٹو چارج۔ ویرا اور ارمان۔ احساس محبت کے تابع احساس محرومی کی دھند میں احساس گناہ فراموش تھا۔ وصال کے آخری لمحات پر ہجر کا اولین بوسہ ثبت تھا۔ بہتے ہوئے چہروں کے بیچ سلگتی ہوئی آرزوئیں بجھنا چاہتی تھیں۔ کوئٹہ شہر کی جانب خوشبو میں لپٹی نم آلود ہواؤں کا کاروان روانہ تھا، چاند، مہر در کے تاج پر اپنی ٹھوڑی کو ٹکائے پلکیں جھپکانا بھول چکا تھا

کاش شہر سے کوئی دیکھ پاتا کہ دور بہت دور کوہسار نے آسمان کے لبوں پر اپنے ہونٹ رکھے ہوئے تھے!

☆☆☆

بہار کا پہلا بوسہ

غفران سر جھکائے بیٹھا تھا

ڈاکٹر نے اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے استفسار کیا ”بتاؤ کیسا خواب دیکھا تم نے۔ بیان کرو میں ضرور سننا چاہوں گا۔“

وہ ذرا سی دیر اپنے ذہن کو ٹٹولتے ہوئے گویا ہوا

میں نے دیکھا کہ میں آسمان کے ایک ستارے پر معذوری کی دیوی کے ساتھ بیٹھا زمین کی جانب دیکھ رہا ہوں

”معذوری کی دیوی؟۔“

”جی، معذوری کی دیوی۔ اس نے مجھے اپنا نام۔ گالا بتایا تھا۔“

”گالا۔“ ڈاکٹر نے حیرت کا اظہار کیا ”میں نے اس سے پہلے کبھی معذوری کی دیوی کے بارے میں نہ کچھ سنا نہ کبھی پڑھا۔ خیر تم اپنا خواب بیان کرو۔“

”گالا بے انتہا خوبصورت تھی جیسے شبنم کے قطروں سے اس کی تخلیق کی گئی ہو۔“

”کیا وہ خود بھی معذور تھی؟۔“

””اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس روئے زمین کی پہلی معذور انسان ہے اور وہ اندھی جنمی گئی تھی۔ ہزاروں لاکھوں سال قبل جب وہ زمین پر تھی تب اتنی خوبصورت ہرگز نہیں تھی جتنی کہ وہ اس وقت نظر آ رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ آدم کے خدا نے شاید ایک صنف نازک ہونے کے ناطے مجھے اس لیے معذوری عطا کی تھی تا کہ میرا باپ اور چھ بھائی جنہیں مرد ہونے کے ناطے خدا نے طاقت ور بنایا تھا میری حفاظت اور دیکھ بھال کر سکیں۔ مجھے ایک آزمائش سمجھ کر اس میں پورا اترنے کی کوشش کر سکیں لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ وہ مجھے بوجھ سمجھنے لگے بلکہ سارے قصبہ والوں کیلئے میں ایک عذاب اور گناہ ایک بے جان و محتاج سانس لیتی ہوئی مٹی کی ادھوری مورت کے سوا کچھ بھی نہیں تھی۔ میری زندگی پہلے ہی سیاہی میں گھلی تھی اس پر اپنوں کے ناروا سلوک نے اندھیر مچا رکھا تھا۔ میری چار بہنیں تھیں اور چاروں بڑی ہونے کے ناطے مجھے ہر کام پر جھڑک دیتیں چنانچہ میں دن کا بیشتر حصہ گھر سے باہر قصبہ کی گلیوں میں گھومتے پھرتے لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنتے گزار دیتی۔

ایک روز دوپہر کی وقت میں اپنے ہم عمر بچوں سے جھگڑ کر روتے ہوئے دیواروں کو ٹٹولتے گھر کی جانب روانہ تھی کہ اچانک ایک آدمی نے مجھے پیچھے سے آ کر گود میں اٹھا لیا اور میرے منہ پر سختی سے ہاتھ جما کر کہیں دور لے گیا اس وقت میری عمر دس برس تھی اس نے مجھے زمین پر لٹا کر میرے کپڑے اتارے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میں بہت روئی چیخی لیکن آسمان اور زمین دونوں خاموش تھے۔ اس نے مجھ سے زبردستی کرنا چاہی تو میری زبان سے یہ الفاظ خود بخود جاری ہو گئے” اے آدم کے خدا !اے آدم کے خدا!۔“ یہ الفاظ میں اپنی ماں کی زبان سے اس وقت سنتی جب مجھ سے کوئی کام غلط سرزد ہوتا۔ وہ آدمی جونہی مجھ پر جھکا تو اچانک زمین نے بہت زور سے ہلنا شروع کر دیا حرکت اتنی تیز اور شدید تھی کہ میں نے اس

آدمی کو چیختے چلاتے سنا جب کہ میں خود بھی بری طرح زمین پر اچھل رہی تھی نہ جانے کب۔ لیکن جب مجھے ہوش آیا تو میری دنیا بدل چکی تھی مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا میں دیکھ سکتی تھی!

میری سب سے پہلی نظر اپنی عریانی پر پڑی میں نے فوراً اپنے کپڑے پہنے ذرا سے فاصلے پر زمین میں ایک بہت بڑا شگاف تھا۔ میں نے شگاف میں جھانک کر دیکھا تو وہاں ایک عریاں آدمی منہ کے بل زمین میں دھنسا ہوا تھا۔ یک دم میرے ذہن میں اپنے ساتھ ہونے والی واردات گھوم گئی میں نے بوکھلا کر تیزی سے ننگے پاؤں ایک سمت میں بھاگنا شروع کر دیا۔ جب میں ایک جگہ پہنچی تو کیا دیکھا ایک بستی بالکل اجڑی ہوئی تھی زمین میں بڑی بڑی دراڑیں تھیں جن کے اندر سے رونے کراہنے کی آوازیں اور چیخ و پکار بلند ہو رہی تھی۔ میرا دل خوف سے لرزنے لگا اور میں اپنی آنکھوں میں وحشت لیے ایک مرتبہ پھر بھاگ کھڑی ہوئی۔ مجھے اپنے بہن بھائی ماں باپ سب کی تلاش تھی میں روتی پکارتی اور بھاگتی جا رہی تھی کہ اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں ایک شگاف میں گر گئی وہ شگاف اتنا گہرا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ہوا میں قلابازیاں کھا رہی ہوں۔

پہلے تو گھور اندھیرا تھا مگر آہستہ آہستہ بے حد خوبصورت مناظر آس پاس دکھائی دینے لگے میرے ذہن سے اجڑی ہوئی بستی کا خیال یکسر محو ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو خشک اور دل میں ایک مسحور کن احساس ٹھہر چکا تھا۔ ابھی میں اسی سحر کے حصار میں تھی کہ اچانک غائب سے ایک آواز نے مجھے چونکا دیا

''تم گالا ہو۔''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور میں نے کہا ''ہاں میں گالا ہوں۔'' حالانکہ میرا نام گالا نہیں تھا۔ لیکن اس آواز میں اتنی مٹھاس اپنائیت خلوص اور محبت تھی کہ میں اس آواز کی باندی بن گئی۔

میں اپنا نام بھول چکی تھی صرف یاد تھا۔ گالا

میری آنکھیں بند ہو گئیں اور جب کافی دیر بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک بلور کے محل میں پایا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ آدم کے خدا نے مجھے معذوری کی دیوی کا منصب عطا فرمایا ہے۔ میں نے خود کو آئینہ میں دیکھا اور خوشی سے سارے محل میں گنگنانے ناچنے لگی۔ میرا محل اسی ستارے پر ہے جہاں اس وقت میں اور تم بیٹھے ہیں۔ میں روزانہ اسی ستارے پر بیٹھ کر نیچے زمین کی طرف ان روشنیوں کو دیکھتی ہوں

''کیسی روشنیاں۔'' میں نے حیرت سے پوچھا

اس نے زمین کی طرف اشارہ کیا میں نے نیچے دیکھا تو مجھے ہری، نیلی، سنہری، سرخ روشنیوں کا جگ مگ کرتا ہوا انبار نظر آیا۔ یہ ہرگز وہ روشنیاں نہیں تھیں جو کہ بنی نوع انسان نے اپنی راتیں روشن کرنے کے لیے ایجاد کر رکھی تھیں بلکہ یہ ایسی روشنیاں تھیں جن کی چمک آسمان تک بلند تھی۔

میں حیران آنکھوں سے ان روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

گالا نے مجھے ان روشنیوں کے بارے میں بتایا کہ یہ روشنیاں دنیا میں موجود تمام معذور افراد کے جسموں سے پھوٹتی ہیں

ہری روشنیاں۔ ان معذور افراد کے جسموں سے نکلتی ہیں جن کی معذوری معمولی نوعیت کی ہے۔

نیلی روشنیاں۔ ایسے معذور افراد کی نمائندگی کرتی ہیں جو اپنی معذوری کو خدا کی رضا سمجھ کر معاشرتی رویوں کا مقابلہ کرتے ہیں ہر حال میں خوش رہنے کا فن جانتے ہیں۔

سنہری روشنیاں۔ ان معذور افراد کے جسموں سے پھوٹتی ہیں جن کی معذوری سنگین نوعیت کی ہوتی ہے وہ ایک پل مایوس اور دوسرے پل امید کا دامن تھام لیتے ہیں۔

سرخ روشنیاں۔ ان معذور افراد کا پتہ دیتی ہیں جو اپنے گھر والوں اور پیاروں کی نفرت کا شکار ہوتے ہیں

وہ آبدیدہ ہو گئی۔

میں نے زمین کی طرف دیکھا تو مجھے سرخ روشنیاں باقی تمام روشنیوں سے بہت زیادہ جگمگاتی دکھائی دیں۔

میں ہمیشہ نفرت اور تفریق کا شکار رہی لیکن آج بھی انسان چاند سے آگے نکل جانے کے باوجود جاہلانہ طور

طریقوں کو ختم نہیں کر سکا سائنس کے کرشمات میں گم انسان اپنی انسانیت کھو بیٹھا ہے۔ میں نے ہر دور ہر زمانے میں معذور افراد کے اندر حوصلہ پیدا کیا ہے۔ ان کی ہمت کو مرنے نہیں دیا ایسی سینکڑوں مثالیں میں اس وقت تمہیں بتا سکتی ہوں لاکھوں داستانیں تمہیں سنا سکتی ہوں لیکن تم شاید یقین نہ کر سکو کیونکہ تم اس زمانہ کی پیداوار نہیں ہو انسان میں یقین اور بے یقینی کی ایک حد مقرر ہے اس حد کو پار کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ ایسی مثالوں کو صرف عقل والے ہی سمجھ سکتے ہیں

''تم معذور افراد کیلئے کیا کرتی ہو۔''

''میں روزانہ زمین پر اترتی ہوں۔ جہاں میرا سفر روشنی کی رفتار سے ہزار گنا زیادہ تیز ہے۔ میں معذور افراد کے دلوں کو محبت کے شفاف پانی سے دھوتی ہوں لیکن اگلے روز ان میں سے بیشتر کے دلوں پر ایک بار پھر اداسی غم اور نفرتوں کی دھول جمی ہوتی ہے اور یہ دھول ان کے ارد گرد اشرف المخلوقات انسانوں کا معاشرہ اڑاتا پھرتا ہے میں روز اس دھول کو صاف کرتی ہوں کہ خداوند نے مجھے یہی کام سونپ رکھا ہے۔

جب کوئی سرخ یا سنہری روشنی نیلی روشنی میں بدلتی ہے تو میں دوبارہ جوان ہو جاتی ہوں۔ میں ازل سے اب تک اسی لیے جوان ہوں کہ بے شک مایوس اور ستم رسیدہ لوگوں کو خوشی اور راحت دینے میں خداوند میری مدد فرماتا ہے۔ وہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا سب کو آزماتا ہے اور آزمائش سے باہر نکالتا ہے۔ سب اسی کی بادشاہت ہے اس کے ہر عمل میں ایک حکمت پوشیدہ ہے بھلائی کا راز پنہاں ہے۔''

''یقیناً تمام سنہری اور سرخ روشنیاں نیلی روشنی میں تبدیل نہیں ہوتی ہونگی۔'' اچانک میرے ذہن میں مایوس سوال ابھرا

''ہاں۔'' وہ اداس ہو گئی ''تم نے ٹھیک کہا جو سنہری روشنیوں والے اپنی سنگین معذوری سے ہار مان لیتے ہیں اور سرخ روشنیوں والے اپنے گھر والوں، پیاروں اور احباب کے ناروا سلوک اور ستم در ستم سے چیختے ہیں تو ان کی چیخیں ان کی آہیں میرے بلور کے محل سے اوپر بہت اوپر ساتویں آسمان پر خدا کا عرش ہلاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی سنہری اور سرخ روشنیاں سفید ہو جاتی ہیں۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا۔''

اس کی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو تھے ''اس کا مطلب کہ وہ معذور افراد اپنی معذوریوں، دنیا اور زندگی کے قید و بند سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آزاد ہو گئے۔''

میری نگاہیں خود بخود زمین پر پھیل گئیں۔ میں نے دیکھا کہ کئی سرخ و سنہری روشنیاں تیزی سے سفید ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ مجھ میں گہری اداسی نے ڈیرا ڈال لیا۔

''خدا کے عرش کو ہلا دینے والے معذور افراد کی فریاد رائیگاں نہیں جاتی۔'' گالا نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا ''وہ ان سفید ہو جانے والی روشنیوں کی آزمائش ان لوگوں میں بانٹ دیتا ہے (جن کے ستم آمیز سلوک بے پرواہی اور نفرت کی وجہ سے اس کے معذور بندے تکلیف میں مبتلا رہے) تاکہ انہیں اس انسان کے درد کا احساس ہو سکے جو ان کی محبت توجہ اور حسن سلوک کا مستحق تھا۔ اور یہی خداوند کا نظام ہے جو وہ اپنی مخلوق میں رائج رکھتا ہے۔''

''بے شک۔ لیکن ان کے لیے کیا انعام ہے جو معذور افراد کا خلوص دل سے خیال رکھتے ہیں۔ انہیں اپنا جیسا انسان سمجھتے ہیں۔''

''جو کوئی کسی معذور فرد کی آزمائش کو اپنی آزمائش سمجھ کر اس کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے اسے کسی انعام کی لالچ نہیں ہوتی اسے خدا سکون قلب کی نعمت سے نوازتا ہے اور دنیا میں اگر زندگی کے بعد کوئی نعمت سب سے عظیم نعمت ہے تو وہ دل کا سکون ہے۔ اس نعمت کو پانے کیلئے لوگ عبادات کا اہتمام کرتے ہیں، جنگلوں، پہاڑوں، بیابانوں میں اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہ وہ نعمت ہے جو خریدی نہیں جا سکتی۔''

''کیا تم اس وقت میرے جسم سے پھوٹنے والی روشنی کا رنگ بتا سکتی ہو۔''

''''زرد۔''۔'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا

میں نے ایک نظر اپنی طرف دیکھا اور دوسری نگاہ

زمین کی طرف ڈالی تو مجھے زمین پر زرد روشنیاں نمایاں مگر کم تعداد میں دکھائی دیں
''یہ زرد روشنیوں والے کون ہیں۔''
''یہ روشنی ایسے معذور افراد کی عکاسی کرتی ہے جنہیں خدا نے لاکھوں کروڑوں انسانوں سے بہترین صلاحیتوں سے نوازا ہوتا ہے یہ تخلیق کے مادے سے مالا مال ہوتے ہیں لیکن اپنے باغی پن کی وجہ سے ان صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا پاتے بس خدا سے ایک ہی سوال کی رٹ لگائے رکھنا ان کا مشغلہ ہوتا ہے why, me کے میں ہی کیوں۔ کیوں مجھے ہی معذور بنایا۔''
''تم ایسے افراد کیلئے کیا کرتی ہو۔''
''''میں ان سے ایسے کام کرواتی ہوں جو وہ نہیں جانتے کہ وہ کر سکتے ہیں۔''
''مطلب کیسے کام۔''
''زرد روشنی کا حامل شخص دیگر معذور افراد کیلئے مشعل راہ بن سکتا ہے۔اگر وہ اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہمت سے کام لے تو مایوسی میں گھرے معذور افراد میں جینے کی تازہ امنگ پیدا کر سکتا ہے۔ why me کی گردان چھوڑ کر why not me کی راہ پر چلتے ہوئے لاکھوں کروڑوں افراد کی رہنمائی کا بیڑا اٹھانے کی قابلیت ان میں موجود ہوتی ہے۔''
''مثلاً میں کیا کام کروں جس سے میری صلاحیتیں کھل کر سامنے آ سکیں۔''
گالا نے اپنا چہرہ مجھ سے پھیر کر دوبارہ میری طرف دیکھا تو میں دم بخود رہ گیا۔ چہرہ بدل چکا تھا اب وہ گالا نہیں بلکہ نرمین تھی اداس آنکھوں تلے نرم ہونٹوں پر وہی مونالیزی مسکراہٹ پھیلائے میری طرف تکتی ہوئی، میری محبت!
''تم نے میری بات نہیں مانی نا۔'' اس کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی اور یوں محسوس ہوا جیسے بہار نے خزاں رسیدہ پیڑ پر اپنے ہونٹ رکھ دیے ہیں۔ میں اس کے لہجے کے سحر میں گرفتار اسے آخری دم تک سننے کیلئے تیار بیٹھا تھا۔ الفاظ میرے حلق میں جکڑے ہوئے تھے۔ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا کہ کہیں وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔
''جی۔ میری آرزو تھی کہ تم مجھ جیسے عدم محبت کا شکار، مرنے کی تمنا میں زندہ رہنے والے معذور افراد کے بارے میں کچھ لکھ کر زمانے کو دکھاتے لیکن شاید تم میری خواہش فراموش کر چکے ہو۔'' اس کی مسکراہٹ آنکھوں کی اداسی سے دھیرے دھیرے ہم آغوش ہوتی چلی گئی اور اس سے پہلے کہ میرے حلق میں اٹکے گنگ الفاظ کو زبان ملتی۔ میری آنکھ بجلی کے بلب کی طرح روشن ہو گئی!
غفران نے ٹشو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سر جھکا لیا
کچھ دیر تک ڈاکٹر سوچتے ہوئے سر ہلاتا رہا اور پھر یک دم کرسی سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے غفران کو مخاطب کیا
''پھر تم نے کیا سوچا؟۔ میرا مطلب ہے اس خواب سے کیا نتیجہ اخذ کیا۔''
اس نے سر اٹھایا اور پُر عزم جواب دیا
''میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں ایک ناول لکھوں گا۔ اور یہ کام میں شروع کر چکا ہوں۔''
''Bravo, Excellent۔ کب تک مکمل ہو جائے گا۔''
''شاید تین چار ماہ میں۔''
اچانک ڈاکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے میز سے گاڑی کی چابیاں اٹھا کر غفران کی طرف دیکھا ''چلو۔''
''کہاں۔''
''ایک ایسی جگہ جہاں تمہاری ضرورت ہے اور یقیناً تم بھی اس جگہ کو پسند کرو گے۔''
''دلچسپ۔ چلیے۔'' غفران چلنے پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے اٹھا کھڑا ہوا

☆☆

جب ویرا نیند سے بیدار ہوئی تو اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔
اس نے دیکھا کھڑکی کے کانچ پر رات کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے نگاہ وال کلاک کی جانب اٹھائی جو سوا چھ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ چت لیٹے

ہوئے اٹھنے کی کوشش کی مگر سر بوجھل محسوس ہوا اور اس سے بیٹھا نہ گیا۔ وہ یوں تعجب سے اپنے کمرے کا جائزہ لینے لگی جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ ''کچھ تو ہے جسکی کمی محسوس ہو رہی ہے۔'' اس نے دھڑکتے دل کیساتھ سوچا اور دوسرے ہی لمحے اس پر خوف کی سی کیفیت طاری ہوتی چلی گئی۔ ذہن پر زور دیا تو دھیرے دھیرے ارمان کا چہرہ آنکھوں کے آگے لہرا گیا وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی جیسے اسے سب یاد آ گیا ہو ہنہ جھیل، رقص، فٹ پاتھ، خزاں رسیدہ زرد پتے اور۔ کوہ مہر درکا دامن، چاند، ارمان اور جدائی کا منظر۔ آہ! اس کے دل میں ٹیس اٹھی

اور وہ اداسی میں ڈوب گئی۔

ابھی اس کی افسردہ روح فراقِ یار کا سوگ منا رہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ شیزا نے کمرے میں جھانکا اور اسے بیدار دیکھ کر کمرے میں چلی آئی۔ ویرا نے بے خیالی میں شیزا کی جانب دیکھا جو پلنگ پر اس کے قریب بیٹھ چکی تھی

''کیا ہوا میری جان۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' شیزا نے ماتھا چھوتے ہوئے اسے مخاطب کیا

ویرا نے آہستہ سے سر ہلایا اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ ذہن کہیں اور بھٹک رہا ہے

''مجھے تشویش ہوئی کہ دن بارہ بجے سے ابھی تک تم بالکل بے سدھ سو رہی تھیں اب دیکھو مغرب ہو چکی ہے۔'' اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ویرا کی آنکھوں میں جھانکا

وہ پہلے ہی کھڑکی کی جانب دیکھ چکی تھی چنانچہ اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اگر نہ بھی دیکھا ہوتا پھر بھی کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ اس وقت وہ اداسی تلے دبی بے حس و حرکت بیٹھی ارمان کی یاد میں غرق تھی۔

''ویرا۔'' شیزا نے ایک مرتبہ پھر پیار سے مخاطب کیا

اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر ضبط کر رکھا تھا ابھی وہ کچھ بولنا چاہتی تھی اچانک اس کے سر میں درد کی ٹیس اٹھی اور جونہی سر پکڑنے کیلئے اپنے ہاتھوں کو حرکت میں لایا تو دائیں ہاتھ کی مٹھی میں کوئی سخت سی چیز دبی ہوئی محسوس ہوئی۔ جب مٹھی کھول کر دیکھا تو اس میں ارمان کی انگوٹھی دبی ہوئی تھی۔ وہی انگوٹھی جس میں نیلم جڑا تھا۔

ارمان ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جا چکا تھا۔ درد کی لہر دل سے اٹھ کر دماغ سے ٹکرا گئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلیں

شیزا گھبرا گئی اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا ''کیا ہوا باجی کی جان۔ سب ٹھیک تو ہے ناں۔''

ویرا کے آنسو رخساروں پر بہنے لگے اور اس نے اپنے بازو و شیزا کے گرد سختی سے لپیٹ لیے۔ شیزا کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ اس کا ذہن کوئی ناخوشگوار واقعہ سننے کیلئے خود کو تیار کرنے لگا زبان پر یا اللہ خیر کا ورد جاری تھا اور دل طرح طرح کے وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس نے بڑی بہن ہونے کے ناطے اپنی بھرپور مامتا کے ساتھ اسے آغوش میں لے رکھا تھا۔

کچھ دیر بعد ویرا نے اپنے آنسوؤں پر ضبط کرتے ہوئے لب کھولے ''باجی۔'' اس کے لہجے میں کسی معصوم بچے کی طرح پکار تھی

شیزا نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا ''جی باجی کی جان۔'' اس کا حلق خشک ہو چکا تھا

''آپ فکرمند نہ ہوں۔ ویسا کچھ بھی نہیں ہوا جیسا اسلام آباد میں ہوا تھا۔ بلکہ شاید کچھ ہوا ہی نہیں۔'' اسکا لہجہ غمناک تھا۔

شیزا اس کا بھیگا ہوا چہرہ اپنی ہتھیلی میں اوپر اٹھا کر مخاطب ہوئی ''اگر کچھ ہوا ہی نہیں تو یہ آنکھوں میں بارش کیسی؟۔'' اس نے غور سے اس کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کی لیکن الجھ کر رہ گئی۔

ویرا نے ٹشو پیپر سے اپنی نم آنکھوں اور رخساروں کو پونچھا اور کان میں اپنا آلہ سماعت درست کرتے ہوئے اطمینان سے اس کے کاندھے پر سر رکھ کر اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا

ہتھیلی پر ارمان کی انگوٹھی پڑی تھی۔

شیزہ نے تعجب سے انگوٹھی کو دیکھا اور پھر ہاتھ میں لے کر الٹتے پلٹتے ہوئے کہا ''یہ کیسی انگوٹھی ہے اور کہاں

سے آئی ہے۔''

ویرا نے کچھ توقف کے بعد بات کا آغاز کیا''باجی۔ آپ کو ارمان یاد ہے۔''

شیزا نے انگوٹھی واپس اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بھنوئیں سکیڑ کر کہا''کون ارمان۔''

وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی''اوہ ہاں۔ نہیں۔آپ نہیں جانتیں۔مائی کو بلا کر پوچھیں، مائی نے اسے دیکھا ہے۔''

دونوں کی آنکھیں آمنے سامنے تھیں۔دونوں کی نگاہوں میں ایک دوسرے کیلئے تشویش کے آثار نمایاں تھے۔

''وہ یہاں ہمارے گھر آیا تھا۔ پرسوں نو نومبر یوم اقبال تھا ناں۔'' ویرا نے ذہن کو ٹٹولتے ہوئے کہا''آپ نے مجھے علامہ اقبال کی کتاب بالِ جبریل تحفہ میں دی تھی۔''

شیزا کے دل کی دھڑکن ایک لحظہ کیلئے رک سی گئی۔اس کی تشویش مزید بڑھ گئی''تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو ناں۔''

ویرا حیرت سے اسے تکنے لگی اور پھر آہستہ سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا''باجی آپ مائی کو بلائیں ناں، میں بالکل مذاق نہیں کر رہی۔میں پتہ نہیں کیوں آپکو نہیں بتا سکی لیکن وہ یہاں آیا تھا۔''

''ویرا آج نو نومبر ہے اور صبح ہی میں نے تمہیں وہ کتاب دی تھی۔'' شیزا نے میز پر پڑی کتاب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا

ویرا کو دھچکا سا لگا پہلے تو وہ کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی اور پھر یقین و بے یقینی کی کیفیت میں پلنگ سے نیچے اتری۔اپنے ہینڈ بیگ سے گھڑی نکالی جو وقت کے ساتھ دن اور تاریخ بھی بتاتی تھی۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' اس کی نظریں گھڑی پر جم سی گئیں اور وہیں بت بنی کھڑی رہ گئی

شیزا اس کے پاس آئی اور گھڑی ہاتھ سے لے کر واپس ہینڈ بیگ میں ڈال دی

ویرا بالکل گم سم تھی

''تم نے ضرور کوئی عجیب خواب دیکھا ہوگا۔'' شیزا نے اسے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا

ویرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا

''ہاں۔ کبھی کبھی ہم جب کوئی عجیب سا خواب دیکھ لیتے ہیں تو کچھ دیر کیلئے ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ حقیقت میں ہوا تھا یہ ہماری سوچوں کا تصویری عکس ہوتے ہیں۔نیند کی اپنی دنیا ہوتی ہے اس میں دکھائی دینے والے خواب ہی حقیقت ہوتے ہیں۔''

کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی وال کلاک کی ٹک ٹک سے ایک مرتبہ پھر اسے ارمان کی یاد ستانے لگی اور وہ گھٹنوں پر سر ٹکائے چپ چاپ بیٹھی رہی

شیزا اسے پہلو سے لگاتے ہوئے پیار سے بولی''جو تم نے دیکھا وہ ایک خواب تھا خود کو سمجھاؤ میری جان۔''

''ارمان کوئی خواب نہیں ہو سکتا وہ میرا ہمجان تھا۔ میرا آدھا وجود۔ ہم نے ایک دوسرے کی رفاقت میں وقت گزارا ہے یہ سب خواب کیسے ہو سکتا ہے۔'' ویرا کی آواز میں بلا کا درد تھا

شیزا کی تشویش میں بتدریج اضافہ ہو گیا''ہمجان؟ آدھا حصہ۔۔تم پھر اسی چکر میں پڑ گئی۔''

ویرا نے مٹھی کھول کر ایک مرتبہ پھر اسے انگوٹھی دکھاتے ہوئے کہا''یہ انگوٹھی ارمان کی ہے باجی۔ہاں اس نے مجھ سے کہا تھا جب یہ انگوٹھی اس کی انگلی سے اتر کر میرے ہاتھ میں رہ جائے گی اسی وقت وہ بھی عالم ارواح کو لوٹ جائے گا۔ وہ لوٹ چکا ہے یہ سب خواب کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ ایک خاص State Of Mind میں تھی

''عالمِ ارواح؟'' شیزا نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے غور سے دیکھا

''ہاں باجی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی رفاقت میں نہ جانے کتنے میلوں کا سفر طے کیا۔میں مانتی ہوں یہ سب عام انسانوں کیلئے ناممکن سی بات ہے لیکن۔'' ویرا نے ایک لحظہ کیلئے ٹھہر کر اس کی جانب دیکھا اور بولی''لیکن ارمان کیلئے یہ سب ناممکن نہیں تھا کیونکہ وہ زندہ نہیں تھا۔''

شیزا کا دل بیٹھنے لگا اس نے جھنجھوڑتے ہوئے اسے

پکارا ''ویرا۔تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ ہوش میں آؤ۔تم دن کے وقت کیفے سے لوٹ کر سوگئی تھیں اور ابھی اس وقت جاگی ہو۔۔آج ہی یوم اقبال ہے خدا کے لیے پاگل مت بنو۔''

ویرا گہری سوچ میں ڈوب گئی آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں نم اترتا چلا گیا اس نے بے چارگی کے عالم میں بہن کی جانب دیکھا ''باجی یہ سب خواب نہیں ہوسکتا۔ پلیز۔''

شیزا نے اسے گلے سے لگا لیا ''خواب تھا میری جان۔تم نے خواب دیکھا ہے۔''

☆

اگلے روز جب اپنے آفس میں شیزا، ویرا کی وجہ سے پریشان خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی اسی وقت ایک ادھیڑ عمر بارلیش آدمی کمرے میں داخل ہوا۔وہ کلین شیو کوٹ ٹائی میں ملبوس صوفی منش احمد جمال صاحب ایڈمن کے شعبہ میں شیزا کے کولیگ تھے حال ہی میں عمرہ کر کے لوٹے تھے شیزا کو یوں پریشان دیکھ کر وجہ دریافت کی اور اس نے بھی ویرا کی داستان سناتے دیر نہیں لگائی

احمد جمال صاحب نے اس کی تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد سر ہلایا اور گویا ہوئے

مشہور و معروف عظیم صوفی شاعر جامی کا ایک شعر یاد آ گیا

کل مافی الکون وہم او خیال
اوعکوس فی المرایا اوظلال

(جو کچھ کائنات میں ہے وہم اور خیال ہے یا آئینوں میں نظر آنے والے عکس ہیں) یعنی کچھ بھی حقیقی نہیں ہے محض خیال و خواب کی دنیا ہے۔

شیزا ہمہ تن گوش دلچسپی سے احمد جمال کو سننے لگی

''دیکھو۔جس وقت انسان حالتِ نیند میں ہوتا ہے دراصل اس وقت وہ عالمِ غیب میں ہوتا ہے اور بیداری کے بعد عالمِ شہادت یعنی موجود دنیا میں خود کو پاتا ہے۔ یوں مان لو کہ انسان بیک وقت دو دنیاؤں میں حاضری دیتا ہے صوفیائے کے نزدیک یہ دونوں دنیائیں دھوکہ ہے حقیقی ذات صرف اللہ کی ہے انسان اس کائنات کا مرکزی کردار ہے سارے جہان اسی کے اردگرد طواف کرتے ہیں

جہاں تک ویرا کے خواب کا تعلق ہے میں تمھیں اس کی بابت سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ہر وہ شے جسے ہم محسوس کرتے ہیں اگر حقیقت اسے مان لیا جائے تو اپنے بستر پر حالت خواب میں بھی ہم ہر کام کرتے ہیں اور اسے محسوس بھی کرتے ہیں مثلاً اگر خواب میں ہم خود کو پھول توڑتا دیکھ رہے ہیں اور اسی لمحے انگلی میں کانٹا چبھتا ہے تو اسکا درد ہم خواب میں محسوس کرتے ہیں یا کوئی ہمیں پہاڑ سے نیچے دھکا دینے کی کوشش کرتا ہے اسی دوران اچانک خوف سے ہماری آنکھ کھل جاتی ہے اور ہمارا جسم پسینے سے شرابور ہوتا ہے۔

حقیقی کونسا جہان ہے؟ یہ جس میں ہم کھلی آنکھوں سے موجود ہیں یا وہ جو خوابوں میں آباد ہے۔اسکا فیصلہ ممکن نہیں ہے

''کہیں ایسا تو نہیں کہ ویرا نے اپنے لاشعور سے ابھرنے والے خیالات کے ساتھ وقت گزارا ہو جن میں اسکا ہمجان اس سے محوِ گفتگو تھا۔'' شیزا نے استفسار کیا

''اگر وہ نیند میں تھی تو ایسا صرف خواب ساطع کی صورت میں ہوسکتا ہے یہ بھی خواب کی ایک قسم ہے جس میں خواب دیکھنے والا عالمِ نیند میں بھی یہ جانتا ہے کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے اور خواب کو اپنی مرضی کے مناظر میں ڈھال سکتا ہے

ویرا کا کیس تم یوں بھی لے سکتی ہو جیسے طویل کوما میں انسان باہری دنیا سے کٹ جاتا ہے نیند میں وہ جس دنیا میں ہوتا ہے وہی اس کی حقیقی دنیا ہوتی ہے وہ اس دنیا کو مکمل طور پر محسوس کر سکتا ہے اسکا گوشت پوست کا جسم کس حال میں اس کی اسے پرواہ تک نہیں ہوتی کہ روح اصل حقیقت ہے دراصل تمام جہانوں میں ہمارا معاملہ روحانی ہے۔جو ہم کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اسکا تعلق خوابوں سے کسی نہ کسی حوالے سے جڑا نظر آتا ہے اور جو کچھ ہم خواب میں دیکھتے ہیں اس کی تعبیر جاگتی آنکھوں سے تلاش کرتے ہیں دونوں معاملات میں جھوٹ کچھ نہیں ۔سب حقیقی ہے۔''

احمد جمال صاحب نے بات مکمل کی تو شیزا نے سوال اٹھایا ''حقیقت وہی نہیں ہوتی جسے سب تسلیم کریں اجتماعی طور پر؟۔''

''ایسا نہیں ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنی الگ دنیا میں مقیم ہے اس کے اپنے محسوسات ہیں وہ اپنی داخلی حقیقت میں زندہ ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے

وہی جہاں ہے تیرا جس کو تُو کرے پیدا
یہ سنگ وخشت نہیں جو تیری نگاہ میں ہے

عالم نیند کی دنیا، عالم بیداری کی دنیا اور وہ دنیا جہاں بعد از موت آنکھ کھلے گی ان تمام دنیاؤں کے اپنے قاعدے اور اصول ہیں اگر ایک دنیا میں جو کام ناممکن ہے دوسری دنیا میں وہ ناممکن نہیں رہتا اور پھر قرآن میں حضرت یوسف کا ذکر ملتا ہے جنہیں خوابوں کی تعبیر کا فن اللہ پاک نے عطا فرمایا کیا اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ خوابوں کی دنیا حقیقی ہے۔''

''لیکن کوئی خواب سے انگوٹھی اٹھا کر نہیں لا سکتا۔'' شیزا نے نیلم کی اس انگوٹھی کے بارے دریافت کیا جو بقول ویرا ارمان کی تھی

احمد جمال صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے ''ممکن ہے کہ وہ نوجوان جب حادثے میں ہلاک ہوا تھا تب کہیں اسے یہ انگوٹھی پڑی ملی ہو۔''

''نہیں جائے وقوعہ پر یہ بے ہوش ہو گئی تھی اسے اٹھا کر وہ پہنچایا گیا تھا۔''

''اچھا۔ پھر کچھ وقت انتظار کرو کہ کبھی کبھی چند باتیں محض اشارے ہوتے ہیں اگر ویرا کی حالت بہتری کی بجائے ابتری کی جانب مائل ہو تب تشویش کی بات ہو گی لیکن اگر حالت بہتر ہونے لگے تب سمجھ لینا کہ خواب اچھا تھا اس کی تعبیر بھی اچھی ہو گی۔''

شیزا نے انکا شکریہ ادا کرتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا احمد جمال صاحب کی باتوں سے اس کے دماغ میں چلنے والے بہت سے سوالات کی تشفی ہو چکی تھی

☆

دوسری جانب رات گئے تک جاگنا ویرا کا معمول بن چکا تھا۔

وہ کمرے میں بیٹھ کر کھڑکی سے چھن کر آنے والی چاندنی میں پہروں نیلم کی انگوٹھی کو دیکھتی رہتی کبھی اسے مٹھی میں سختی سے بھینچ کر چپ چاپ چاند کو تکنے لگتی۔ شیزا کے بے حد اصرار کے باوجود وہ کسی ماہر نفسیات کے پاس جانے کو تیار نہ ہوئی۔ شاید کہ اس نے خود کو یہ باور کروا لیا تھا کہ ارمان کی رفاقت ایک خواب تھا لیکن یہی بات ماننے کیلئے اس میں بالکل حوصلہ نہیں تھا اور پھر ارمان کی انگوٹھی اس کے پاس تھی اس کے بعد کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ اس تمام واقعہ کو ایک خواب سمجھ کر بھول جائے۔

☆☆

غفران جونہی ڈاکٹر کے پیچھے چلتا ہوا ہیلپ کیفے میں داخل ہوا تو ہال میں شور برپا ہو گیا۔

اس نے دیکھا وہاں موجود تقریباً سب لوگ ڈاکٹر کی آمد پر خوشی سے اپنے بازو ہوا میں لہرا رہے تھے جیسے ہر ایک کی یہ خواہش ہو کہ ڈاکٹر اس کے پاس آ کر بیٹھے۔

غفران حیرت میں ڈوبا آہستہ آہستہ بیساکھی کے سہارے آگے بڑھتا گیا۔ اس کے سامنے نوجوان لڑکے لڑکیاں ہاتھوں میں چائے کے کپ تھامے وہیل چیئرز پر بیٹھے خوش گپیوں میں معروف تھے

یکا یک ٹک ٹک کی آوازوں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔ اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو قوت بینائی سے محروم افراد کی ایک ٹولی خاموشی سے اپنی سفید چھڑیوں کو زمین پر ٹٹولتی ہوئی اس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ گھبرا کر تیزی سے ایک طرف ہٹ کر ستون کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ابھی اس کی نگاہیں اس ٹولی پر جمی تھیں کہ ہال کے کونے سے ٹیبل پیٹنے کی آوازوں نے اس کا رخ اپنی سمت گھما دیا۔ اس نے دیکھا نوجوانوں کا ایک گروہ ہاتھوں کے اشاروں سے ڈاکٹر کے ساتھ گپ بازی میں مگن ہے وہ کبھی خوشی سے ڈاکٹر کے ہاتھ پر تالی مارتے اور کبھی کسی بات پر زیادہ خوش ہو کر ٹیبل کی شامت لاتے۔ کئی کرسیوں کے ساتھ اسے بیساکھیاں ٹکی ہوئی نظر آئیں

''یہ واقعی ایک دلچسپ جگہ ہے۔'' اس نے دل میں سوچا اور مسکرا دیا

ڈاکٹر قدرت کے علاوہ کئی اور غیر معذور افراد بھی وہاں موجود تھے کچھ دیر بعد ڈاکٹر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا اس نے بڑی مشکل سے سب کی توجہ حاصل کرنے کے بعد غفران کو متعارف کروانے لگا۔ اس نے دیکھا ڈاکٹر اپنی بات کے ساتھ ہاتھوں کے اشاروں سے بھی کام لے رہا ہے اور اس کا رخ اس ٹیبل بجانے والے نوجوانوں کے گروہ کی طرف تھا جب سب کو یہ معلوم ہوا کہ غفران ایک شاعر اور ادیب بھی ہے تو سب نے تالیاں بجا کر اسے گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ ڈاکٹر نے سب کو اس کی مختصر کہانی سنائی کہ کیسے اس نے اپنی ناامیدی کو اپنے یقین سے شکست دی اور آج صرف ایک بیساکھی کے سہارے اپنے قدموں پر کھڑا ہے۔

جونہی ڈاکٹر نے اپنی بات مکمل کی اچانک ایک فرد نابینا کی آواز ہال میں گونجی ''کیا کوئی خدا کا بندہ یا بندی مجھے غفران کے بارے میں بتائے گا کہ وہ دیکھنے میں کیسا ہے۔''

''کیوں بھائی ارادے کیا ہیں۔'' ہال کی دوسری طرف سے آواز ابھری

ہال میں قہقہے گونج اٹھے اور غفران جھینپ گیا

''ارادے نیک ہیں بھائی۔ بات یہ ہے میں نے بچپن میں کبھی سنا تھا کہ نوجوان شاعر بڑے رومینٹک اور خوبرو ہوتے ہیں بس یہ سننا چاہ رہا تھا کہ یہ نوجوان شاعر دیکھنے میں کیسا ہے۔''

ہال میں سرگوشیوں کا شور تھا

''میں بتاتی ہوں۔'' وہیل چیئر پر بیٹھی ایک موٹی سی خاتون نے سب کو خاموش کروایا اس کا ایک ہاتھ ہوا میں ایستادہ تھا جب کہ دوسرے ہاتھ سے وہ اپنی وہیل چیئر کو چلاتے ہوئے غفران کے سامنے پہنچ گئی۔ خاتون چالیس کے پیٹے میں تھی اس نے پہلے اسے سرتاپا غور سے دیکھا اور پھر اس کی آواز ہال میں گونجنے لگی

''سرخی مائل گندمی صاف رنگت۔''

ہال میں بیٹھے تمام افراد نے یک زبان ہو کر ''ماشاء اللہ۔'' کہا تو اس کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر کی طرف بے بس نظروں سے دیکھا ڈاکٹر نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کندھے اچکا لیے

''ذرا ہلکے گھنگھریالے سیاہ بال۔''

سب نے ایک بار پھر یک زبان ہو کر'' ماشاء اللہ۔'' کی تان لگائی

''یونانی دیوتاؤں جیسے پتلے پتلے حسین و جمیل نقش۔''

''ماشاءاللہ۔''

''اُف۔ کالی روشن جادوئی آنکھیں۔''

''ماشاءاللہ۔''

غفران اپنے منہ کے سامنے ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگا

''اور مسکراہٹ ایسی کہ قلوپطرہ دیکھے تو فدا ہو جائے۔''

''ماشاءاللہ۔''

''ویسے مسکراہٹ والی قلوپطرہ نہیں تھی مونا لیزا تھی بی بی۔'' ہال کے ایک کونے سے آواز آئی

خاتون نے قہقہہ لگایا ''ہاں، ہاں، وہی وہی۔''

''چھ فٹ کی مجسماتی قامت۔ اُف۔''

''ماشاءاللہ۔''

''بی بی اپنے جذبات پر قابو رکھ کر بتاؤ۔'' اسی فرد نابینا نے خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

تمام ہال ایک مرتبہ پھر قہقہوں کے شور سے گونج اٹھا

خاتون ہنستی ہوئی ایک طرف ہو گئی

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے غفران کو گلے لگایا۔ ہال میں اس کی نگاہوں کے سامنے زندگی اپنے اصلی روپ میں موجود تھی۔ اس کیفے سے باہر کی دنیا اب اسے محض ایک فریب گاہ محسوس ہونے لگی تھی جہاں انسانیت کے علاوہ باقی سب کچھ دستیاب ہے۔

ہال کے شور میں بھی اسے اپنے دل میں سے گالا کی آواز سنائی دی کہ اگر روئے زمین پر خدا اور اس کی خدائی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ کہیں موجود ہے تو یقین مانو وہ اس ہال کے اندر ہے!

☆

شیزا ویرا کو باقاعدگی سے اسے اپنے ساتھ آفس لے جاتی رہی جہاں احمد جمال صاحب کمال محبت اور

شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے زندگی کے بارے میں بتایا کرتے

انھیں بہت عرصہ لگ گیا اسے یہ سمجھانے میں کہ دنیاوی وقت کا وجود کے اندر کے وقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دنیا کی نیند سے اندر کے سفر کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ارمان اس کے وجود کے اندر نازل ہوا تھا وہ اس کے زخموں پر مرہم رکھتا رہا جو اس کی روح پر اسلام آباد میں لگے تھے۔ وہ اس کے اندر کی توڑ پھوڑ کی مرمت میں لگا رہا۔ مایوسی کے جالوں کو صاف کرتا رہا اور اسے یہ بات اچھی طرح سمجھا کر چلا گیا کہ معذور افراد بھی محبت کے قابل ہوتے ہیں۔

اس دوران وہ اکثر پہروں ارمان کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ایک لمحہ کو سوچتی رہتی۔ اس کی باتوں کو دل میں دہراتی اور واحد نشانی نیلم کی انگوٹھی کو ہونٹوں سے لگا کر کبھی رونے لگتی کبھی جل تھل آنکھوں سے ہنسنے لگتی مگر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ کم ہوتا چلا گیا اور شیزا نے بھی محسوس کیا کہ اب وہ نارمل ہورہی ہے پھر بھی انتظار کا موسم اس کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا دکھائی دیتا تھا!

انسان اپنے پرانے زخموں کو بھلانے کی کوشش میں انہیں یاد کے ساتھ باندھ کر خود کو فریب دینے سے کبھی باز نہیں آتا بظاہر وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر نظر آتا ہے لیکن ذہنی طور پر کسی اور ہی دنیا کے سفر پر ہوتا ہے۔ خواہشات زنگ آلود ہونے لگتی ہیں۔ محبت کے نام سے خوف آتا ہے۔ دل میں ان دیکھے حوادث کا خوف پنپنے لگتا ہے۔ ہونٹوں پر یقینی و بے یقینی کی چپ لگ جاتی ہے۔ وہ بھی اسی چپ میں گرفتار تھی بظاہر نارمل لگتی لیکن اس کے دماغ میں اک کشمکش کیتلی میں چائے کی طرح ابلتی رہتی۔

کوئٹہ کی جان لیوا سردیوں کا موسم اس نے محض ایک شال اوڑھ کر صحن میں ٹہلتے ہوئے گزار دیا تھا

☆

مارچ میں بسنت کا تہوار بہار کی اولین مسکراہٹ اور ویرا کی آنکھوں سے بہنے والا آخری آنسو ثابت ہوا تھا

اس روز سینکڑوں پتنگیں فضا میں اڑتی تھیں ایسا دکھائی دیتا جیسے کسی مصور کے برش نے نیلے آسمان کے کھلے کینوس پر رنگ بکھیر دیئے ہیں۔

سنہری گلابی دھوپ میں ویرا کی نگاہیں صرف اس پتنگ کو تلاش کر کے اس کا تعاقب کرتیں جو ڈور سے کٹ کر آزادی سے ہوا میں ڈولنے لگتی۔

شیزا لان میں پھولوں کو پانی دینے میں مگن تھی کہ اسی اثناء میں دروازے پر کسی نے کال بیل بجائی۔ اس نے ویرا کی طرف دیکھا لیکن اس کا چہرہ آسمان کی جانب اٹھا ہوا تھا۔ مجبوراً اسی نے دروازہ کھولا اور سامنے ایک نوجوان کو کھڑا پایا۔ اس نے شیزا کو ایک دعوت نامہ تھمایا اور اپنی بائیک اسٹارٹ کر کے وہاں سے چلا گیا۔ دعوت نامہ ہیلپ کیفے کی جانب سے ویرا کے نام تھا جس میں اسے غفران کے ناول کی تقریب رونمائی میں مدعو کیا گیا تھا۔ وہ دعوت نامہ ویرا کے ہاتھ میں تھما کر دوبارہ پھولوں کو پانی دینے لگی۔

ویرا نے آسمان سے نظریں اتار کر دعوت نامہ پر مرکوز کر دیں کچھ لمحوں بعد شیزا نے ایک لحظہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا ''تم جاؤ گی ناں؟''

ویرا نفی میں سر ہلاتے ہوئی دوبارہ اپنی نگاہیں آسمان کی جانب اٹھا کر دعوت نامے کو ہاتھوں میں آہستہ آہستہ گھمانے لگی۔

''چلی جاؤ۔ کافی عرصہ ہوا تم نے کیفے کا رخ نہیں کیا لیکن دیکھو کیفے والوں نے پھر بھی تمہیں یاد رکھا۔''

ویرا نے کوئی جواب نہیں دیا

تھوڑے توقف کے بعد شیزا نے گویا حتمی فیصلہ کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا ''میں چاہتی ہوں کہ تم جاؤ اور تم جارہی ہو بس۔''

ویرا نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھا اور پھر دھیما سا مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا ''بس آپ کی خوشی کے لیے چلی جاؤں گی۔''

شیزا نے ہونٹوں کو سکیڑ کر دور سے اس کی طرف بوسہ اچھالا اور ہلکے ہلکے گنگناتے ہوئے پھولوں کو پانی دینے لگی!

☆☆☆

کیفے کا ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا
''معذوری انسان کے اندر جنم لیتی ہے ۔جب انسان ہار مان لیتا ہے تب معذور ہو جاتا ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی حوالے سے معذور ہوتا ہے لیکن اصل معذور وہ ہے جسے دوسرے انسانوں سے اپنی معذوری کی تصدیق درکار ہوتی ہے ۔جو لوگوں سے ہمدردی بٹورتا ہے اور جب لوگ اس کی جانب توجہ نہیں دیتے تو عدم تعاون کا احساس اسے مفلوج کر دیتا ہے۔''

اسٹیج پر غفران کرسی پر بیٹھا تھا اس کے عقب میں ایک خوبصورت قد آدم بینر آویزاں تھا جس پر اس کے ناول کے سرورق کے ساتھ اس کی تصویر بنی ہوئی تھی ۔وہ اپنے ناول سے عین معذوری پر لکھے گئے اقتباسات پڑھ کر حاضرین کو سنا رہا تھا

''معذوری ایک زاویہ نظر ہے۔ ہر معذوری ضروری نہیں کہ ظاہراً نظر بھی آئے کچھ لوگوں کے دل نابینا افراد کی آنکھوں کے پردوں سے زیادہ سیاہ اور بے نور ہوتے ہیں ۔ وہ ایسے معذور ہوتے ہیں جنہیں کوئی اپنے قریب بٹھانا گوارا نہیں کرتا ۔معذوری دراصل ذہن کی تخلیق ہے اور ذہن کی اصلاح کے بغیر اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔''

اچانک ہال میں سے کسی نے سوال کیا'' کیا معذور افراد خدا کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔''

اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواباً کہا'''' میرے نزدیک خدا سے ان لوگوں کے قربت کی انتہا کوئی کیا جانے جو کسی سہارے کے بنا کھانا تک نہیں کھا سکتے لیکن اس کے باوجود خود کو معذور کہلانا گناہ سمجھتے ہیں اسے خدا کی ناشکری تصور کرتے ہیں اور وہ لوگ جو بستر پر لیٹ کر تکبیر کہتے ہوئے کانوں تک ہاتھ نہیں اٹھا سکتے لیکن نماز نہیں چھوڑتے ۔اور وہ معذور افراد جو اپنی معذوری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دیگر معذورین کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو کبھی ملال نہیں ہوتا کبھی اپنے اندر کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا وہ تنہائی میں خدا سے یوں ہم کلام ہوتے ہیں جیسے کوئی اپنے دوست سے گفتگو کرتا ہے۔''

''معذور افراد کے لیے معاشرے کا رویہ اتنا غیر انسانی کیوں ہوتا ہے۔'' حاضرین میں سے سوال آیا ۔

'' یہ بات درست ہے کہ معاشرے کا حقارت آمیز رویہ کسی بھی معذور فرد کے اندر احساس محرومی کو بڑھا وا دیتا ہے لیکن سوال یہ ہے آخر معاشرہ ایسا رویہ کیوں اختیار کرتا ہے۔اس کی ایک وجہ جو مجھے سمجھ آئی ہے کہ ہوسکتا ہے لوگ جب معذور افراد کو دیکھتے ہیں تو انہیں خود معذور ہو جانے کا خوف گھیر لیتا ہو ۔انہیں اپنے بچوں کی سلامتی کی فکر لگ جاتی ہو۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ کسی معذور فرد کی وہیل چیئر کو ہاتھ لگاتے ہوئے یا کسی نابینا فرد کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ڈرتے ہیں جیسے انہیں ہاتھ لگاتے ہی وہ خود معذور ہو جائیں گے اور یہی خوف لاشعوری طور پر ناپسندیدگی کے روپ میں ان کے چہروں سے عیاں ہو کر معاشرے میں غیر انسانی رویوں کا سبب بنتا ہے جسے دیکھ کر معذور افراد کی سائیکی اور ان کا خود اعتمادی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔''

''بحیثیت ایک فردِ معذور آپ کو معاشرے کے کس رویئے پر سب سے زیادہ غصہ آتا ہے۔'' ایک خاتون رپورٹر نے سوال کیا

'' میرے وطن میں ہزاروں ایسے معذور افراد ہیں جن کی معذوری کی نوعیت انتہائی سنگین قسم کی ہے جو خود اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھا سکتے ،اٹھ بیٹھ نہیں سکتے ،کوئی بھی کام کسی سہارے کے بغیر نہیں کر سکتے ۔انہیں ہمہ وقت کسی attendent کی ضرورت رہتی ہے جو ان کا خیال رکھ سکے ۔ان کے گھر والے بیچارے معاش کے لیئے انہیں جبراً تنہا چھوڑ کر گھر سے باہر نہ جائیں تو کھائیں کہاں سے ؟؟اور ستم ظریفی دیکھیئے کہ وطنِ عزیز کا صدر، وزیراعظم سے لے کر وزراء تک، آرمی کے افسران سے لے کر سول بیوروکریٹس تک سب درجنوں ماتحت سرکاری ملازموں کی فوج اپنے ساتھ رکھتے ہیں جو ان کے ہاتھ میں قلم پکڑانے ،پانی کا گلاس تھمانے ،گاڑی کا دروازہ کھولنے سے لے کر ان کے بچوں کو گود میں اٹھا کر دودھ پلانے تک کا کام سرکاری تنخواہ پر سرانجام دیتے

ہیں۔ ہمارے اور آپ کے ٹیکس کے پیسوں پر عیاشی کرنے والے انہی لوگوں کی بے حسی دیکھ کر مجھے شدید غصہ آتا ہے جن معذور افراد کو attendents کی ضرورت ہے انکو قید تنہائی میں مرنے کے لیئے چھوڑ دیا گیا ہے اور جن لوگوں کو خدا نے ہاتھ پاؤں سلامت دے رکھے ہیں وہ خود اپنی نشست سے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولنا بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ حکمرانوں اور اربابِ اختیار کی اسی مردہ ضمیری کو دیکھ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ پتہ نہیں کب ان لوگوں کو خدا احساس کی دولت عطا فرمائے گا۔''

ہال میں کچھ دیر کے لیئے خاموشی طاری ہوگئی

''احساس معذوری کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔''

ایک سماعت سے محروم لڑکی نے ہاتھوں کے اشارے سے سوال کیا جسے وہاں موجود انٹر پریٹر نے غفران کو سمجھایا

''احساس معذوری سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ بندہ اپنے رب کے قریب ہو جائے۔ خدا سے دوری ہی احساس معذوری کو جنم دیتی ہے اپنے ارادوں کو عمل کے حوالے کر دو احساس معذوری ختم ہو جائے گا۔ جو کچھ بھی حاصل ہے اس پر سجدہ شکر ادا کرو احساس معذوری مٹ جائے گا۔ معذوری کچھ بھی نہیں یہ ہمارے اندر کے خوف کا تراشا ہوا بت ہے اس لیے جب کوئی معذور فرد دل کے کعبہ میں خدا کو لا کر بٹھاتا ہے تو یہ بت پاش پاش ہو کر دل سے نکل جاتا ہے۔

دوستو یاد رکھنا معذوری کوئی بیماری نہیں ہوتی بلکہ احساس معذوری ضرور ایک مرض ہے۔ جب لوگوں کو کسی معذور فرد سے یوں ملتا دیکھو گویا وہ اسے معذور تصور ہی نہیں کر رہے بلکہ اس کی شخصیت میں گفتار اور کردار سے متاثر نظر آتے ہیں تو سمجھ لینا کہ اس معذور فرد کے وجود میں موجود حوصلہ چٹانوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ خدا تعالی انسان کی استطاعت سے زیادہ بوجھ اس پر نہیں ڈالتا۔ بس انسان کو اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت ہے۔'' ''

ویرا مقررہ وقت سے کچھ تاخیر سے ہال میں داخل ہوئی اور جونہی اس کی نگاہ غفران پر پڑی وہیں ساکت ہو گئی اس کی نگاہیں غفران پر جمی ہوئی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی سب سے پچھلی نشست پر جا کر بیٹھ گئی اس وقت وہ مکمل حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ہال میں موجود حاضرین غفران کو انہماک سے سن رہے تھے لیکن وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ کافی دیر بعد اس کی سہیلی نے اس کے گھٹنوں پر تھپکی دی تو اس نے یوں چونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے ابھی ابھی نیند سے جاگی ہو وہ چند لمحوں تک اپنی سہیلی کو خالی آنکھوں سے تکتی رہی اور پھر یک دم اس کی نگاہیں سٹیج کی جانب گھوم گئیں لیکن اب وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا بلکہ ہال میں گہما گہمی کا سماں تھا۔

محفل ختم ہو چکی تھی۔

تمام حاضرین کیلیئے چائے کا انتظام کیا گیا تھا شرکائے محفل اپنے ہاتھوں میں چائے کا کپ تھامے ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ویرا بے خیالی میں اپنی سہیلی کے سامنے سے اٹھ کر روانہ ہو گئی جیسے وہ اسے جانتی ہی نہیں تھی وہ ہال میں بغیر کسی کی پرواہ کیے غفران کی تلاش میں نکل پڑی اور ذرا سی تلاش کے بعد ہی وہ اسے ایک کونے میں چند لوگوں کے گھیرے میں بیٹھا دکھائی دیا۔

''اوہ میرے خدایا۔'' اس کی سانس ایک مرتبہ پھر تھم کر رہ گئی اس نے دھیرے سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کو ایک طرف ہٹایا اور جونہی غفران کی نگاہیں اس سے چار ہوئیں اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا کپ بھی لرز کر رہ گیا۔ لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ غائب اور ماتھے پر پسینے کی باریک بوندیں چمکنے لگیں۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے

اب کے ویرا کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری ''کیا میں صرف پانچ منٹ کیلیئے آپ سے تنہائی میں بات کر سکتی ہوں۔''

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چائے کا کپ سامنے میز پر رکھا۔

ویرا نے ارد گرد موجود لوگوں کی طرف دیکھا تو سب باری باری ادھر ادھر کھسک گئے۔

وہ اس کے سامنے والی نشست پر آرام سے بیٹھ گئی

دونوں کے بیچ میں شیشے کی میز تھی اور دونوں پر خوشی اور حیرت کی ملی جلی کیفیات طاری تھیں۔

ویرا نے ایک نظر ہال پر ڈالتے ہوئے سرگوشی میں اس سے مخاطب ہوئی ''تم اور یہاں۔ یہ کیا مذاق ہے؟۔''

غفران کی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں

''بولو ناں۔'' ویرا نے نیلم کی انگوٹھی سے ٹیبل بجائی ''اسے پہچانتے ہو۔'' اس نے انگوٹھی دکھاتے ہوئے سوال کیا

''تم کون ہو؟۔'' غفران کے حلق سے بڑی بالکل مشکل سے آواز نکلی

''اب کوئی ڈرامہ نہیں چلے گا ارمان، پلیز۔''

''ارمان؟۔'' اس نے عجیب لہجے میں نام دہرایا اور گھور کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اس کی دماغی کیفیت پر شک ہو

دونوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھنے لگے

''تم۔۔'' غفران نے اپنا ہاتھ ٹیبل پر سرکا کر اس کے ہاتھ کو چھوتے ہوئے مخاطب کیا ''تم زرمین ہو یا کوئی اور۔''

''زرمین؟۔'' اس بار ویرا نے سنجیدگی سے نام دہرایا

دونوں ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گئے

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اس لیے حیران اور پریشان تھے کہ غفران سراپا ''ارمان۔'' سے مشابہہ تھا جبکہ ویرا ہو بہو ''زرمین۔'' کا عکس تھی۔

''میرا نام ارمان نہیں غفران ہے۔''

ویرا کے خانہء دل میں ہلکی سی ارتعاش کے بعد ارمان کی آواز گونجی

''ویرا تمہارا ہمجان مرا ہے تم زندہ ہو۔ کیا ہوا اگر تمہارے نصیب میں لکھا شخص تم کو نہیں مل سکا لیکن وہ شخص جس کے نصیب میں تم لکھی ہو وہ تمہیں ضرور ملے گا ایک انسان دوسرے انسان سے منسلک ہے ایک محبت سے دوسری محبت سے بندھا ہوا یہ نصیب کا جال پوری کائنات پر پھیلا ہوا ہے۔ بس دل کی آواز پر کان رکھنا۔'' اسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ سکون کی لہر سر سے پاؤں تک سرایت کرتی چلی گئی چہرے پر اطمینان اور آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اس نے ایک لمبی سانس بھر کر کچھ توقف کے بعد لب کھولے'' میرا نام بھی زرمین نہیں۔ ویرا ہے۔''

غفران اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا'' میں یوں آپ کو حیرت سے دیکھنے پر شرمندہ ہوں۔''

''کیا میں حیرانگی کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔''

زرمین کے ذکر پر اداس ہو جانے والا غفران اس کے سوال پر مسکرا دیا''اگر زرمین میری نگاہوں کے سامنے مر نہ گئی ہوتی تو میں ہرگز یقین نہ کرتا کہ آپ کا نام ویرا ہے۔ زرمین میری محبت تھی۔''

''اوہ اچھا۔ ویسے میری غلط فہمی کی وجہ بھی کچھ ایسی ہی ہے۔'' ویرا نے اپنی ٹھوڑی تلے ہتھیلی جماتے ہوئے اسے دیکھا'' میرا ہمجان بھی ایک حادثے میں مر چکا ہے لیکن آپ کو دیکھ کر اُس آنکھوں دیکھے حادثے پر بالکل یقین کرنے کو دل نہیں مان رہا۔''

''ہمجان؟۔'' غفران کو لفظ عجیب سا لگا

''SoulMate۔ ہمارے وجود کا آدھا حصہ۔''

ویرا نے وضاحت کی

''دلچسپ۔'' اس نے اپنے دونوں بازو میز پر پھیلا دیے'' میں کسی روز آپ سے ضرور اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہوں گا۔''

''مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر وہ دن کل کا ہو۔''

دونوں کے لبوں پر ایک بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔

ڈاکٹر قدرت کے عقب میں کھڑے پروفیسر جادوگر سمیت ہال میں موجود تمام حاضرین مجلس کی نگاہیں ان دونوں پر مرکوز تھیں۔

شیشے کی میز پر دونوں کے عکس نمایاں تھے مگر حیرت انگیز طور پر جہاں ویرا کا عکس ہونا چاہیے تھا وہاں غفران کا عکس تھا اور اسی طرح غفران کے عکس کی جگہ ویرا کا عکس ٹھوڑی تلے ہتھیلی جمائے غفران کے سحر میں گم تھا!!



اصل مجرم

ریاض بٹ

مجرم کا کام جرم کرنا ہے، اس جرم کی پس پشت پیسہ ہی ہوتا ہے
لیکن یہ بھی حقیقت ہوتی ہے کہ مجرم ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں
ہوتا وقت اور حالات ہی اسے عام انسان سے مجرم بناتے ہیں۔
ایک جواں سال خوبرو خاتون کے قتل کے احوال۔

اسے آدھی رات کو اس کے گھر سے دور کھلی سڑک پر چاقو گھونپا گیا تھا

چند دن سے اخبار میں یہ خبر تواتر سے آ رہی ہے کہ کوئی جنونی شخص چاقو سے وار کر کے خواتین کو زخمی کر رہا ہے...... اور یہ وارداتیں کراچی میں ہو رہی ہیں...... کل ایک اور خبر بھی نظروں سے گزری، جس کا ذکر میں آخر میں کروں گا، ابھی سنانے والی بات یہ ہے کہ یہ دو خبریں پڑھ کر میرے ذہن میں ایک کیس تازہ ہو گیا، میں نے اپنی ڈائری میں درج اس کیس کی چیدہ چیدہ باتیں ذہن میں تازہ کیں تو ماضی کے ان دنوں میں پہنچ گیا جب میں تھانیدار ہوا کرتا تھا۔

وہ نومبر کا مہینہ تھا، سردی کافی حد تک اپنے پنجے گاڑھ چکی تھی، اس وقت رات کے آٹھ بج چکے تھے، میں تھانے میں موجود تھا، اتنی رات گئے میری تھانے میں موجودگی ان حالات کی وجہ سے تھی جو آج کل ہمارے تھانے کی حدود میں چل رہے تھے، گزشتہ چار پانچ راتوں سے ہمارے تھانے کی حدود میں چاقو زنی کی وارداتیں ہو رہی تھیں او ران وارداتوں میں صرف عورتوں کو نشانہ بنایا جا رہا تھا...... عورتیں صرف معمولی زخمی ہو رہی تھیں، پانچ رپورٹیں ہم درج کر چکے تھے، وارداتیں اس شہری علاقے میں ہو رہی تھیں جو ہمارے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ گاؤں دیہات میں تو لوگ رات کو خاص کر سردیوں کی راتوں میں جلد اپنے بستروں پر چلے جاتے تھے لیکن شہر میں تو دس بجے تک لوگ سردیوں میں بھی سڑکوں اور بازاروں میں نظر آتے تھے، وارداتیں زیادہ تر آٹھ اور نو بجے کے درمیان ہوئی تھیں۔

اب تو شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا، سات بجے کے بعد بازار اور سڑکیں عورتوں سے خالی ہو جاتی تھیں۔

مین بازار ایسوسی ایشن کے صدر اور جنرل سیکرٹری اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

صدر کا نام شاہ جہان اور سیکرٹری کا نام امتیاز تھا۔ صدر صاحب کہہ رہے تھے تھانیدار صاحب، ہمارا تو کاروبار تباہ ہو رہا ہے، آپ کو تو پتہ ہے کہ ہمارے بازار کا کاروبار زیادہ تر خواتین کی وجہ سے چلتا ہے، اب تو دن کو بھی خواتین پہلے کی نسبت کم آتی ہیں، صرف وہی آتی ہیں جن کو کوئی ایمرجنسی خریداری کرنی ہوتی ہے، میں نے چند لمحے بغور ان کے چہروں کی طرف دیکھا، پھر سنجیدگی سے کہا۔

''شاہجہان صاحب مجھے موجودہ حالات کی وجہ سے بہت ٹینشن ہے، میں نے سفید کپڑوں میں چھ اہلکاروں کی پہلی واردات کے بعد سے ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے، انشاء اللہ جلد ہی مجرم ہماری آہنی گرفت میں ہوگا۔''

''جناب، ہمیں آپ سے یہی توقع ہے ہم تو آپ کو اپنے حالات سے آگاہ کرنے آئے ہیں۔'' جنرل سیکرٹری امتیاز نے کہا۔

''میں اپنی پوری توانائی کے ساتھ مجرم کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہوں لیکن اس سلسلے میں مجھے آپ لوگوں کے تعاون کی بھی ضرورت ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔



''تھانیدار صاحب' ہم ہر طرح حاضر ہیں۔ آپ حکم کریں.....'' صدر صاحب نے گویا خلوص دل سے کہا۔

''لیکن' جناب آپ کا تعاون اس طرح کا نہیں ہونا چاہیے' جس طرح کا تعاون کل ایک صاحب کر گئے ہیں۔''

''کیا مطلب ......؟'' امتیاز نے تجسس بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے چند لمحے توقف کیا پھر بات ان کے گوش گزار کردی۔

''کل بھی میں دیر تک تھانے میں بیٹھا رہا تھا' شام سے ذرا پہلے چوڑیوں کی دکان کا مالک میرے پاس آیا' اس کے ساتھ ایک بائیس تیئیس سالہ جوان بھی تھا۔

جوان کا رنگ صاف' نین نقش تیکھے تھے۔ اس نے گرم کپڑے اور ہاتھوں سے بنا ہوا گلابی رنگ کا سوئیٹر زیب تن کیا ہوا تھا۔

میں نے ان سے آنے کا مقصد پوچھا تو بات یہ معلوم ہوئی۔

''جناب' میرا نام ملک رفیق ہے اور میری مین بازار میں چوڑیوں کی دکان ہے' یہ جوان مجھے مشکوک لگا اس لیے میں اسے آپ کے پاس لے آیا ہوں۔''

''رفیق صاحب' یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا' لیکن یہ حرکتیں کیا کررہا تھا' جس کی وجہ سے یہ آپ کو مشکوک لگا اور آپ اسے یہاں لے آئے' میں نے ملک رفیق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں تھانے دار صاحب یہ میری دکان میں بیٹھی خواتین کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

میں نے بغور جوان کی طرف دیکھا' وہاں مجھے اس کی آنکھوں میں صرف حیرانگی اور خوف نظر آیا' ایسا خوف جو کبوتر کی آنکھوں میں اس وقت نظر آتا ہے جب وہ اپنے آپ کو کسی باز کے پنجے میں بے بس پاتا ہے۔

خیر...... آپ اسے میرے پاس چھوڑ جائیں میں دیکھتا ہوں' کہ یہ کون ہے اور اس کے ارادے کیا ہیں؟'' میں نے ملک رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے' تھانیدار صاحب...... میں چلتا ہوں' میری دکان کا حرج ہو رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے' آپ جائیں لیکن جانے سے پہلے محرر کے پاس اپنا ایڈریس لکھوا جائیں۔''

وہ چلا گیا اور میں نے اپنی توجہ جوان کی طرف مبذول کردی۔ وہ ابھی تک کھڑا ہوا تھا' میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا' وہ آہستہ آہستہ اس طرح چل کر آیا جیسے اس کے قدم من من بھر کے ہوگئے ہوں۔

''ہاں نوجوان' تمہارا نام کیا ہے؟''

''جی' جی جناب جاوید......'' اس نے بامشکل اس طرح کہا جیسے زور لگا کر اسے یہ الفاظ نکالنے پڑے ہوں۔

''تم ملک رفیق کی دکان پر کیا لینے گئے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب' میری آپ سے ایک التجا ہے۔'' اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھو...... اداکاری نہ کرو' ہاتھ کھولو اور سیدھی طرح میرے سوالوں کے جواب دو' ورنہ اتنے جوتے لگواؤں گا کہ کئی دن بیٹھ نہ سکو گے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں اداکاری نہیں کر رہا۔ صرف یہ التجا کرنا چاہتا ہوں کہ جو باتیں میں آپ کو بتاؤں انہیں اپنے تک محدود رکھیں' ورنہ بات وہی ہو جائے گی نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں۔''

''تم پوری اور سچی بات بتاؤ' پھر میں کوئی فیصلہ کروں گا۔''

''دراصل میں وہاں شمع کے لیے گیا تھا' اس نے مجھے پانچ دن پہلے بتایا تھا کہ وہ آج چوڑیوں کی دکان پر آئے گی۔''

''شمع غالباً وہ لڑکی ہے جس سے تم محبت کرتے ہو۔''

''جی ہاں۔ اسی لیے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ یہ بات اپنے تک رکھیں۔''

''مجھے اس نوجوان پر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ میں نے ہنسی کا گلہ گھونٹتے ہوئے اپنے لہجے میں تلخی کی آمیزش کرتے ہوئے کہا۔

''جوان جس رستے پر تم چل رہے ہو اس سے شمع بھی بدنام ہوگی اور ساتھ تم بھی ذلیل و خوار ہوگے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے والدین کو شمع کے گھر بھیجو اور رشتے کی بات چلاؤ۔''

''تھانیدار صاحب آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں' میں انشاء اللہ ایسا ہی کروں گا۔''

میں نے محرر کو بلا کر اس کا ایڈریس نوٹ کروایا...... اور اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم کسی چکر میں دوبارہ میرے پاس آؤ پھر میں تمہیں ایسا چکر دوں گا کہ تم سیدھے جیل میں جا کر گرو گے۔''

''تھانیدار صاحب میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ اور میں آپ کو ایک اور بات بھی بتانا چاہتا ہوں۔''

''بتاؤ...... بھئی ذرا جلدی کرو' میں بہت عدیم الفرصت ہوں۔''

''دراصل مجھے ملک رفیق صاحب کی طرف سے جان کا خطرہ بھی ہے کیونکہ شمع ان کی بھانجی ہے۔''

میں نے خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نرے احمق ہو' اس کے باوجود تم اس کی دکان پر چلے گئے۔''

''دراصل یہ بات آج ہی میرے علم میں آئی ہے بلکہ راستے میں آتے ہوئے ملک صاحب نے بتائی ہے۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ اور فوری طور پر اپنے والدین کو رشتے کے لیے بھیج دو۔''

وہ چلا گیا......

یہ کہانی سن کر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''تھانے دار صاحب' ہماری بھی روزی روٹی کا مسئلہ ہے' انشاء اللہ ہم ارد گرد کڑی نظر رکھیں گے اور پوری تسلی و تشفی کر کے بندہ آپ کے پاس لائیں گے'' میں نے انہیں

رخصت کر دیا پھر شبینہ ڈیوٹی والے سنیئر اہلکار کو بلا کر اسے چند ہدایات دیں اور آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

ان دنوں میرے بیوی بچے بھی آئے ہوئے تھے۔ میں ان کو سردیوں میں بلا لیتا تھا' رات کے کسی پہر بیوی نے مجھے جگا کر بتایا کہ تھانے سے کوئی اہلکار آیا ہے کہہ رہا ہے ایمرجنسی ہے۔''

میں نے اٹھ کر جلدی جلدی شب خوابی کا لباس اتارا اور سادہ کپڑے پہن کر گھر سے باہر آ گیا۔

تھانے سے سپاہی انور آیا تھا۔

میں نے اس کے ساتھ تھانے کی طرف چلتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیوں بھئی کیا ایمرجنسی ہو گئی ہے؟''

''سر کسی عورت کی لاش ملی ہے' جسے غالباً چاقو مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔''

تھانے میں پہنچ کر میں نے ضروری تیاری کی اور سپاہی انور کو ہی ساتھ لے کر جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

میں نے وقت بچانے کے لیے راستے میں ہی سپاہی انور سے سارے حالات معلوم کر لیے تھے۔

انور بھی ان اہلکاروں میں شامل تھا جن کی ڈیوٹی میں نے سفید کپڑوں میں لگائی تھی۔

بات اس طرح تھی...... کہ دو دو ٹولیوں کی شکل میں اہلکار پھر رہے تھے۔ انور کے ساتھ کانسٹیبل منور تھا' وہ جونہی ایک گلی میں پہنچے' کانسٹیبل منور کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا' بڑی ٹارچ انور کے پاس تھی' منور کے بلانے پر جب وہ آیا تو ٹارچ کی روشنی میں انہیں ایک عورت زمین پر پڑی نظر آئی۔

بعد میں انہوں نے نیچے بیٹھ کر اس کا جائزہ لیا' تو یہ عقدہ کھلا کہ عورت مری ہوئی ہے' چاقو یا کسی تیز دھار آلے کے دو زخم نظر آئے' ایک دل کے مقام پر تھا' جبکہ دوسرا زخم گردے کی جگہ پر تھا' یہ گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی' چوڑائی زیادہ سے زیادہ دس فٹ ہو گی۔

اس وقت کافی لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے' کیونکہ کانسٹیبل منور نے سپاہی انور کو تھانے بھیجنے سے پہلے تین چار گھروں کے دروازے کھٹکھٹا دیئے تھے۔ اندر سے آنکھیں ملتے ہوئے مرد نکل آئے تھے۔ جب بات ان کے پلے پڑی تو ہر طرف یعنی پورے محلے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ دروازے کھلنے شروع ہو گئے اور اس وقت غالباً پورے محلے کے مرد وہاں جمع تھے اور انہوں نے روشنی کا بندوبست کر دیا تھا۔ میں نے بغور لاش کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ دونوں زخم کمانی دار چاقو کے ہیں۔ وہاں کافی مقدار میں خون بہہ کر جم گیا تھا۔ جس سے دو باتیں ظاہر ہوئی تھیں ایک یہ کہ عورت کو یہاں ہی قتل کیا گیا تھا اور عورت کو قتل ہوئے تقریباً پانچ سے چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔

صحیح صورت حال تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بتانی تھی لیکن جو اندازے اور قیاس میں نے لگائے تھے وہ آپ کے گوش گزار کر دیئے ہیں۔ ضروری کاغذی کارروائی کرتے اور محلے کے مردوں سے سوال و جواب کرتے صبح کے چھ بج گئے۔ لاش کو کانسٹیبل منور کی معیت میں پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج کر میں اور سپاہی انور تھانے واپس آ گئے۔

عارف نامی بندے کو ہم ساتھ لے آئے تھے۔ محلے کے چند بندوں نے اپنا نام خفیہ رکھنے کی استدعا پر یہ کہا تھا کہ عارف نامی اس بندے کے گھر میں اس عورت کا آنا جانا ہے اور ان کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔ عارف کی اپنی بیوی سے چپقلش رہتی تھی اور وہ زیادہ تر روٹھ کر اپنے میکے چلی جاتی تھی اور وجہ یہ عورت ہی تھی۔

اب ذرا میں آپ کو عورت کے متعلق بتا دوں' عورت خوبصورت تھی' جنس مخالف کے لیے اس میں کشش تھی خون نکل جانے کے بعد تو اس کا چہرہ سفید لٹھے کی طرح ہو گیا تھا لیکن خدوخال چیخ چیخ کر اس بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ اس میں مردوں کو دیوانہ بنانے کا سامان موجود تھا' عورت کی عمر کا اندازہ میں نے تیس سال کے اریب قریب لگایا تھا۔

عارف نامی بندے کو میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان (جو کہ آج کل رات کی ڈیوٹی کرتا تھا) کے حوالے کیا اور خود آرام کرنے کوارٹر میں چلا گیا۔ عورت کے گھر کا پتہ مجھے عارف کی زبانی پتہ چل چکا تھا۔ میں نے سپاہی عظمت کو کہا تھا کہ وہ اطلاع دے آئے۔

ان کے آنے تک میں آرام کرنا چاہتا تھا' تاکہ تازہ دم

ذہن کے ساتھ تفتیش کرسکوں۔ صبح دس بجے میں نے ناشتہ کیا اور سرکار کی دی ہوئی وردی جسم پر سجا کر تھانے میں پہنچ گیا۔

وہاں اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے برآمدے میں میں نے تین مردوں اور ایک ادھیڑ عمر عورت کو دیکھا۔

میں نے اپنی سیٹ سنبھالنے کے دس منٹ بعد ہی ان کو اپنے کمرے میں بلالیا اور انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہہ کر کاغذات نمٹانے میں لگ گیا۔

یہ میں نے جان بوجھ کر کیا تھا تاکہ وہ خود گفتگو کا آغاز کریں۔

''تھانے دار صاحب یہ کیا ہوگیا؟ ادھیڑ عمر عورت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ ایک فربہ اندام عورت تھی۔ نین نقش مقتولہ سے ملتے جلتے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ مقتولہ کی بڑی بہن ہے' مقتولہ کا نام عندلیب تھا' دو مرد ان کے پڑوسی تھے' جبکہ ایک مقتولہ کا خاوند تھا۔ خاوند کی عمر پچاس سال سے اوپر تھی' شکل بھی بس واجبی سی تھی۔ نام اس کا سرور معلوم ہوا۔ یہ ایک بڑا زمیندار تھا۔ عظمت آباد میں رہتا تھا' یہ باتیں مجھے ظاہر ہے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن کہانی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے پہلے بتادی ہیں۔

میں نے ادھیڑ عمر عورت کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

'بی بی...... جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے...... لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ آپ کی بہن رات کے وقت وہاں کیوں گئی تھی؟''

تھانے دار صاحب میں تو خود حیران ہوں...... کیونکہ وہاں ہمارا کوئی رشتے دار بھی نہیں رہتا' لیکن تھانیدار صاحب...... آخر اس کو مار کون گیا؟''

میں اس کو وہ باتیں بتا سکتا تھا' جو مجھے اس گلی کے مکینوں نے بتائی تھیں لیکن میں نے ابھی اس بات کو خفیہ رکھنا تھا...... اس لیے میں نے عام سے لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہی تو معلوم کرنا ہے کہ قاتل کون ہے؟'' لیکن میں نے چند لمحے توقف کرکے سب کے چہروں پر نظر ڈالی اور پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''سب سے بڑا اور اہم سوال یہ ہے کہ قتل کی وجہ کیا ہے؟''

''یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے۔ تھانیدار صاحب کیونکہ ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے۔''

زمیندار سرور نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

''دیکھیں جناب کوئی بغیر کسی وجہ کے کسی کو قتل نہیں کرتا' آپ لوگ مجھے کوئی بات بتائیں گے تو میں آگے بڑھ سکوں گا۔ میں نے حقیقت حال کھول کر ان کے سامنے رکھدی۔

ان سے باتیں کافی لمبی چوڑی ہوئیں...... لیکن وہ تو کوری تختی ثابت ہوئے' میں نے انہیں یہ کہہ کر رخصت کردیا کہ کل آکر لاش لے جائیں کیونکہ مجھے قوی امید تھی کہ کل تک لاش پوسٹ مارٹم ہو کر آجائے گی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے عارف کو اپنے کمرے میں بلالیا۔

عارف ایک لانبے قد کا خوبرو نوجوان تھا۔ عمر مقتولہ جتنی ہوگی' اگر ان کی شادی ہوجاتی تو لوگ اسے چاند سورج کی جوڑی کہتے۔

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا...... اور تیکھی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''عارف صاحب...... اپنی محبوبہ کو قتل کیوں کیا؟''

وہ یوں اچھلا جیسے اس کے پاؤں پر سانپ نے ڈس لیا ہو۔

''تھا...... نیدا...... ر...... صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے۔'' ہوا میں اس قسم کے تیر ہم اکثر چلاتے تھے جو کبھی کبھی ٹھیک نشانے پر جالگتے تھے۔

''تھانیدار صاحب' میں تو عندلیب کو جانتا تک نہیں ...... وہ نروس ہو چکا تھا...... اور اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''بہت خوب...... میں نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اسے کہتے ہیں کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے۔''

اس کی زبان سے عندلیب کا نام نکل چکا تھا۔ وہ اس تیر کی طرح واپس کمان میں نہیں جاسکتا تھا جو کمان سے نکل چکا تھا۔

''دراصل...... جناب...... میں یہ کہنا چاہتا تھا...... کہ

وہ......‘‘یوں خاموش ہوگیا جیسے سوچ رہا ہو کہ اس دلدل سے کیسے نکلے جس میں وہ گر چکا ہے۔

’’دیکھو...... عارف......‘‘ میں نے تکلف کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ’’دو جمع دو برابر ہے چار والی بات کرو ورنہ تمہیں اس وقت ایک ایک کے چار چار نظر آئیں گے۔ جب میں تمہیں کسی اہلکار کے حوالے کروں گا اور میں تمہیں یہ بھی بتادوں کہ ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اس کام کا ماہر ہے۔‘‘

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا...... وہاں ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

’’جناب...... میں ساری باتیں آپ کو بتادوں گا لیکن یقین کریں میں نے قتل نہیں کیا۔‘‘

’’شروع ہوجاؤ۔‘‘

’’تھانیدار صاحب میری ٹانگوں میں جان نہیں رہی اگر آپ مجھے بیٹھنے کی اجازت دے دیں تو مشکور ہوں گا۔‘‘ اس نے بھیک مانگنے والی آواز میں کہا۔

یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی ہمت جواب دے چکی ہے وہ یقیناً پہلی بار کسی تھانیدار کے سامنے کھڑا تھا اور اگر بیٹھانہ تو میرے کمرے کے فرش پر ڈھیر ہوجائے گا۔

میں نے اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی اور آفس بوائے کو بلا کر اسے پانی بھی پلادیا۔

اب وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا لیکن لگتا یہی تھا کہ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے پھر اس نے جو کہانی سنائی وہ میں اپنے لفظوں میں ذرا اختصار سے سنا دیتا ہوں۔

جب انسان کے ذہن پر جنسیت کا قبضہ ہوجائے تو ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سرور کی بیوی دو سال پہلے ٹائیفائڈ کا شکار ہوکر مرگئی تھی اس کے دو بیٹے جوان تھے...... بڑے کی عمر پچیس جبکہ چھوٹا اٹھارہ سال کا تھا درمیان میں دو بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں ساجدہ اور ماجدہ دونوں اپنے پیا دیس سدھار گئی تھیں۔ بیٹوں کے نام وزیر محمد اور کبیر محمد تھے۔

بیٹے ابھی غیر شادی شدہ تھے یہ ساری کہانی عندلیب کی زبانی عارف تک پہنچی تھی۔ پھر اچانک یہ پتہ چلا کہ سرور نے بجائے اپنے بڑے بیٹے وزیر محمد کی شادی کرنے کے اپنی دوسری شادی رچالی...... عندلیب کا باپ شہر کے کسی دفتر میں چپراسی تھا۔ وہاں اس کا کلرک ریاست سے جھگڑا ہوگیا پھر سارا ملبہ عندلیب کے باپ لیاقت پر ڈال کر اسے نوکری سے نکال دیا گیا...... لیاقت روتا دھوتا زمیندار سرور کے پاس آیا کہ سارا قصور ریاست کا تھا لیکن یک طرفہ فیصلہ کرتے ہوئے اسے نوکری سے نکال دیا گیا...... سرور نے اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا اور کہا کہ وہ کوشش کرے گا کہ اسے بحال کردیا جائے۔ ویسے عندلیب نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ سب ڈرامہ تھا اور یہ ڈرامہ زمیندار سرور کی ایما پر کھیلا گیا تھا سرور نے ایک ماہ پہلے عندلیب کو دیکھا تھا اور اس پر لٹو ہوگیا تھا اور اپنی ایک نوکرانی کے ذریعے اس کے گھر شادی کا پیغام بھیجا تھا۔ لیاقت نے معذرت کردی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو زمیندار کی عمر زیادہ تھی دوسرے اس کے دو بیٹے جوان تھے بے شک غربت کی وجہ سے ابھی تک عندلیب کے ہاتھوں میں سہاگ کی مہندی نہیں لگ سکی تھی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے بیٹی کو کنویں میں پھینک دیتا...... لیکن جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے...... سرور نے ایک دن لیاقت کو بلا کر کہا۔

’’دیکھو لیاقت میری دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہوگئی ہیں بیٹے اپنی دنیا میں مگن ہیں...... میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں...... اور تمہیں پتہ ہے کہ اس عمر میں جیون ساتھی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ میرے اعصاب جواب دینے والے ہیں میں تمہیں نوکری پر بحال کروادوں گا اور کچھ مالی مدد بھی کردوں گا تم اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو...... میں اسے رانی بنا کر رکھوں گا۔‘‘ جب زمیندار سرور خاموش ہوا تو لیاقت سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں چلا گیا...... اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اگر وہ نوکری پر بحال نہ ہوا تو نوبت فاقوں تک پہنچ جائے گی...... لیکن دوسری صورت میں وہ ضمیر کی سولی پر ٹنگ جاتا...... یہ نازوں میں پالی ہوئی بیٹی پر ظلم تھا...... زیادتی تھی کہنے کو تو وہ زمیندار سے کہہ سکتا تھا کہ اگر آپ نے اپنی سونی زندگی کو آباد کرنا ہے تنہائی کو دور کرنا ہے اور جیون ساتھی کی ضرورت ناگزیر ہے تو اپنی عمر کی کسی عورت کا انتخاب کریں ہماری مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا کیوں سوچ رہے ہیں؟

مگر...... وہ یہ سب کچھ کہہ نہ سکا...... کیونکہ مجبوریوں کی جس دلدل میں وہ پھنس گیا تھا اس نے اس کی زبان پر بے بسی کا تالا لگا دیا تھا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا کہ میں سوچوں گا۔

وہ کئی دن سوچتا رہا...... ڈھکے چھپے لفظوں میں زمیندار نے یہ کہہ دیا تھا کہ اس کی ملازمت پر بحالی اس کے بیٹی کا رشتہ دینے کے ساتھ مشروط ہے۔

اس طرح کافی دن گزر گئے' عندلیب باپ کو پریشان دیکھ کر کافی کچھ سمجھ گئی تھی۔ آخر ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ باپ کے پاس بیٹھ گئی۔

''ابا جان...... آپ جو بھی بات ہے مجھے بتاویں اکیلے سوچوں کے ساتھ لڑ لڑ کر آپ ہلکان ہو جائیں گے' ویسے مجھے کافی حد تک اندازہ تو ہے کہ زمیندار نے کیا کہا ہوگا؟''

''بیٹا......'' لیاقت اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر رو پڑا...... اور اس کے آنسوؤں نے وہ ساری کہانی سنا دی جسے وہ کافی دنوں سے اپنے دل میں دبا کر بیٹھا ہوا تھا۔

''عندلیب نے کمال جرات سے کہا...... ابا جان آپ نے سنا نہیں کہ انسان حالات کے سامنے بے بس ولاچار ہو جاتا ہے' آپ ہاں کہہ دیں۔''

''لیکن بیٹا!'' لیاقت نے کہنا چاہا۔

''بس ابا جان لیکن اگر' مگر کی کوئی گنجائش نہیں ہے میرے دو چھوٹے چھوٹے بہن بھائی بھی ہیں' جن کے سروں پر ماں کا سایہ بھی نہیں ہے' ہاں کرنے سے پہلے ایک بات زمیندار کے کانوں میں ضرور ڈال دیں کہ رخصتی اس وقت ہوگی جب آپ ملازمت پر بحال ہو جائیں گے۔ اور ہمیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں ہے' اس طرح مجبوریوں کا کفن پہن کر عندلیب زمیندار کی بیوی بن گئی۔

یہ ساری کہانی سننے کے بعد میں نے عارف سے کہا۔

''چلو...... یہ سب کچھ تو ہو گیا' لیکن تمہارے تعلقات عندلیب سے کس طرح استوار ہوئے۔

''تھانیدار صاحب......'' عارف نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ یہ بھی ایک ٹریجڈی ہے دراصل میں اور عندلیب کافی عرصہ پہلے ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ میں نے والدین سے بات کی تھی' لیکن وہ میری تایازاد فاطمہ کو بیاہ لائے' ادھر عندلیب زمیندار کے گھر دلہن بن کر چلی گئی لیکن فاطمہ کے ساتھ میری ایک دن بھی نہیں بنی...... اس کے اور میرے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

''اور...... اس فرق کو عندلیب کی محبت نے اور بھی زیادہ وسیع کر دیا تھا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں...... تھانیدار صاحب...... میں نے سینے پر پتھر کی سل رکھ کر ساری توجہ اور محبت فاطمہ کی طرف مبذول کر دی تھی' لیکن آپ نے وہ بات تو ضرور پڑھی ہوگی...... کہ جب محبت کا کسی پر اثر نہ ہو تو انسان کدو کی ہری بیل میں سوکھے پھول کی طرح لٹکتا رہ جاتا ہے۔

بہر حال عندلیب اس کی طرف دوبارہ کیسے راغب ہوئی تھی اس کا ذکر آگے آئے گا' البتہ ایک بات یہاں ہی بتا دیتا ہوں کہ عندلیب تقریباً شادی کے ایک ماہ بعد ہی اس سے ملنے آنے لگی تھی...... جب اس کی بیوی میکے میں ہوتی تھی تو رات رات بھر وہ اس کے پاس رہتی تھی اور وہ عموماً اس وقت آتی تھی جب اس کے والدین سو چکے ہوتے تھے' جس میں وہ رات گزارتے تھے...... اس کمرے کا ایک دروازہ پچھلی طرف بھی تھا۔

اور...... کافی عرصے سے یہ کھیل جاری تھا۔

جس رات عندلیب کا قتل ہوا تھا' اس رات اس نے آنا تو تھا لیکن وہ عارف کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی قتل ہو گئی تھی۔

کچھ باتیں دانستہ میں نے چھپالی ہیں...... جن کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔ بہر حال میں نے عارف کو اس تاکید اور تنبیہہ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی کہ وہ تھانے میں بتائے بغیر کہیں نہیں جائے گا۔ ایسے حالات میں شک سیدھا سیدھا زمیندار کی طرف جاتا تھا لیکن میں اس سے ایک بھرپور انٹرویو کرنے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ سکتا تھا۔ اگلے دن کے بجائے اسی شام لاش اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی میں نے پیغام بھجوا کر عندلیب کے لواحقین کو بلوا کر' ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لاش ان کے حوالے کر دی۔

اور میری نظریں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پر پھسلنے لگیں۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کے جسم پر دو زخم تھے جو کسی کمانی دار' اور تیز دھار چاقو کے تھے' ایک نے

دل چیر دیا تھا‘ دوسرا گردے کے آرپار ہوگیا تھا۔ موت کا وقت رات دس بجے کے اریب قریب تھا۔ مقتولہ کافی دلیر تھی...... بلکہ دیدہ دلیری کے ساتھ رات کے اس پہر اس گلی میں پہنچ گئی تھی۔

میں نے رپورٹ کاغذوں میں سنبھال کر رکھ دی اور آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

وہاں بیوی نے ڈی ایس پی کی طرح پوری رپورٹ مجھ سے سنی اور آخر میں بولی۔

”کچھ لوگ اتنے عاقبت نااندیش کیوں ہوتے ہیں؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اگر لوگ اس قسم کی حرکتیں اور حماقتیں نہ کریں تو ہم بے کار بیٹھ کر مکھیاں مارتے رہ جائیں۔“

”چلیں چھوڑیں‘ آپ پہلے جسمانی اور ذہنی طور پر تھکے ہوئے ہیں یہ میں نے کون سی تفتیش شروع کردی ہے......“ اس نے بھی ایک قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”دراصل یہ سب آپ کا جھوٹا اور میٹھا کھانے کی وجہ سے ہے۔“

بہرحال اگلی صبح میں تیار ہوکر تھانے پہنچا‘ تو اچانک تیز ہوائیں چلنی شروع ہوگئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہوگئی۔ جس نے سردی میں اضافہ کردیا‘ بارش دن دو بجے تک جاری رہی اور میرے کمرے میں انگیٹھی کا اضافہ ہوگیا۔ اس دور میں کوئلوں والی انگیٹھی عام تھی۔

مجھے امید تھی کہ رات کو ہی عندلیب کی لاش سپرد خاک کردی گئی ہوگی۔ آج میرا ارادہ سرور کے گھر جانے کا تھا۔ چار بجے کے قریب میں نے کانسٹیبل منور اور سپاہی عظمت کو ساتھ لیا اور سرور کے گھر پہنچ گیا۔

اس کا گھر کیا تھا؟ ایک کنال پر بنی ہوئی حویلی تھی...... وہ ہمیں حویلی کے ایک سجے سجائے کمرے میں لے گیا...... کمرے کے سامان سے زمیندار کی امارت ٹپکتی تھی لیکن اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دنیا کا مفلس ترین آدمی ہو...... یہ شاید اس وجہ سے تھا کہ اس کی حسین بیوی اس سے چھن چکی تھی۔

اس نے میرے منع کرنے کے باوجود کشمیری چائے اور دیسی گھی سے بنے ہوئے حلوے سے ہماری تواضع کا بندوبست کروادیا۔

نعمت خداوندی سے اپنے معدوں کو بھرنے کے بعد‘ میں نے کانسٹیبل اور سپاہی کو باہر گاڑی کے پاس جانے کے لیے کہا اور سرور سے کہا۔ کہ وہ دروازے کے کواڑ آگے کردے۔

اس نے میرے کہنے پر عمل کرتے ہوئے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

اور میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔

”سرور بھائی ......خدا کو جو منظور تھا وہ ہوگیا ہے اب آپ کو حوصلے کی ضرورت ہے۔“ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”تھانے دار صاحب......میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں‘ مجھ سے غلطی ہوئی‘ بس میرے سر کے اوپر عشق کا بھوت سوار ہوگیا تھا۔ فیثا غورث نے صحیح کہا تھا کہ عشق ایک ایسا لالچ ہے جو تباہ کن غم تک پہنچا کر چھوڑتا ہے......وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔

اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا بندہ ہے اور اس کی معلومات اور جنرل نالج بہت ہے۔

میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور اس کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

دو تین منٹ بعد اس کے لب ہلے۔

تھانیدار صاحب‘ اس عمر میں جواں سال عورت کے ساتھ شادی کرنا خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے...... اور......“ یہاں میں نے اس کی بات ٹوکتے ہوئے کہا۔

”کیا مقتولہ کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا؟“

”وہ عارف نامی بندے سے محبت کرتی تھی...... یہ مجھے شادی کے بعد معلوم ہوا...... جوان عورت میرے جیسی عمر کے مرد کے ساتھ مطمئن نہیں رہ سکتی...... شادی کے پندرھویں دن اس نے مجھے میری حیثیت یاد دلادی۔

میں نے اسے کہا......میں تمہیں آزاد کردیتا ہوں۔“

‘لیکن اس کے دل میں شاید مجھ سے انتقام لینے کا خیال جاگزیں ہوگیا تھا۔

”نہیں......چوہدری صاحب......اس نے سختی سے کہا‘ اس طرح میری اور میرے باپ کی عزت خاک میں مل

جائے گی ...... طلاق یافتہ لڑکی اور اس کے والدین کو یہ معاشرہ جن نظروں سے دیکھتا ہے اس کا احساس شاید آپ جیسے جاگیردار کو نہ ہو...... سنگ مرمر اور مخملیں قالینوں پر چلنے والوں کو دکھوں اور مجبوریوں کے کانٹوں پر چلنے والوں کے کرب اور دکھ کا احساس ہو ہی نہیں سکتا...... اب اگر میں آپ کی مردانگی پر انگلی اٹھا دوں تو کیسا رہے۔''

میں برف کی سِل بنا اس کی باتیں سن رہا تھا' مجھے گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ میں نے اپنی انا اور امارت کے بت کو اس کے قدموں میں ڈھیر ہوتے دیکھا۔

اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایف اے پاس ہے' میں نے بھی اتنی ہی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس وقت میرے ذہن سے سارے الفاظ اور جواب نکل چکے تھے۔

میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو...... عندلیب مجھے یوں رسوا نہ کرو...... میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا' میں اپنی غلطی کی تم سے معافی مانگتا ہوں' جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔''

''ٹھیک ہے' چوہدری صاحب' میں آپ کی بھی خدمت کرتی رہوں گی لیکن جیسا کہ یہ بات آپ کے علم میں آ چکی ہے کہ میں عارف سے محبت کرتی ہوں اس نے چند لمحے توقف کیا پھر بولی۔

اگر میں آپ سے مطمئن ہوتی تو عارف کا خیال آہستہ آہستہ دل سے نکالنے کی کوشش کرتی...... لیکن؟ اب ...... آپ مجھے صرف اتنی اجازت دے دیں کہ میں عارف سے ملتی رہوں' ورنہ میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر اتنا بدنام کروں گی جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

سرور خاموش ہو گیا' آگے اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ صرف محسوس کرنے والی بات تھی۔

میرے خیال میں' وہ اندر سے بزدل تھا' ویسے بھی وہ عندلیب کو حاصل کرنے کے لیے جو کچھ کر چکا تھا' وہی احساس اس کے ضمیر پر ایک بھاری پتھر تھا جی ہاں اس نے اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ عندلیب کو حاصل کرنے کے لیے ریاست کے ساتھ سازباز کی تھی' یہ سب تو آپ پڑھ چکے ہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو روز جینے'' اور روز مرنے والی بات ہے' مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے ہی عندلیب کی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش کروا دی ہے۔''

وہ مالٹے کی خشک پھانک جیسی مسکراہٹ لبوں پہ سجاتے ہوئے بولا۔

''میرے اوپر شک کی گنجائش بنتی ہے...... تھانیدار صاحب' حالات ہی ایسے ہو گئے تھے لیکن میں بالکل بزدل ہو گیا ہوں' مجھ سے خون کے گھونٹ پینے کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو سکا...... اب تو وہ رات رات بھر گھر سے باہر رہنے لگ گئی تھی۔''

''سرور بھائی ...... انسان کو اتنا بھی بزدل نہیں بن جانا چاہیے کہ غیرت کی لاش کاندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرے۔'' میں نے اسے گرمانے کے لیے کہا۔ کیونکہ مجھے شک تھا کہ اس نے ہی عندلیب کو اپنے راستے سے ہٹوا دیا ہے۔

''تھانے دار صاحب' اب اتنا بڑا الزام تو نہ لگائیں' ہو سکتا ہے وہ چاقو زنی کرنے والے جنونی کا شکار ہوئی ہو...... وہ بہت دور کی کوڑی لایا۔

میں اس طرح ہنس پڑا' جیسے اس نے بچوں والی بات کی ہو پھر اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن میرا تجربہ کچھ اور کہتا ہے' میرے خیال میں کسی نے چاقو زنی کی آڑ میں یہ کام کیا ہے۔''

وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اس سے کافی گھما پھرا کر سوال کیا اور اس کے جوابوں میں سے مزید سوال نکال کر اس پر پھینکے' لیکن...... وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ اس نے نہ عندلیب کو قتل کیا ہے اور نہ کسی کرائے کے قاتل سے یہ کام کروایا ہے۔

اس کے بعد ہم تھانے میں آپس آ گئے تھے۔

ویسے میں نے اسے مشتبوں کی فہرست سے خارج نہیں کیا تھا۔ عارف بھی مشتبہ تھا۔

اب مجھے نئے سرے سے ادھر ادھر دیکھنا تھا اور یہ دیکھنا تھا کہ کوئی اور بھی ایسا ہے' جس کے پاس عندلیب کو قتل کرنے کا جواز موجود تھا۔ گلی پکی ہونے کی وجہ سے اس بندے یا بندوں کا کوئی کھرا بھی نہیں ملا تھا' جس نے واردات کی تھی۔

اس کے لیے دن کی روشنی میں بھی اے ایس آئی آفاق اور سپاہی فیروز گئے تھے لیکن مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا...... البتہ کافی گھروں کے دروازے کھلے تھے...... اور عورتوں نے متجسس نظروں سے پولیس کو دیکھا ضرور تھا۔

میں نے سپاہی انور کو بلا کر اسے حکم دیا کہ وہ عارف کی بیوی کے متعلق پتہ کرائے کہ وہ اپنے میکے میں ہے یا عارف کے پاس واپس آ چکی ہے' جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ قتل والی رات وہ اپنے میکے میں تھی اس لیے عندلیب عارف کو ملنے گئی تھی لیکن اس کے پاس پہنچنے سے پہلے قتل ہو گئی تھی۔

سپاہی سائیکل پر گیا تھا...... اس کو واپس آنے میں ایک گھنٹے سے بھی کم وقت لگا...... وہ یہ خبر لایا تھا کہ عارف کی بیوی فاطمہ ابھی اپنے میکے میں ہی ہے' اس پہ بھی شبہ یا شک کیا جا سکتا تھا اس کے بھائی بھی عندلیب کو قتل کر سکتے تھے کیونکہ اس کی وجہ سے ان کی بہن دن رات کانٹوں پر لوٹتی تھی...... پھر بہنیں تو بھائیوں کو پیاری ہوتی ہیں۔ میں نے وردی میں ہی ان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا' سپاہی انور کو ہی ساتھ لے لیا۔

جب ہم ان کے محلے میں پہنچے تو شام ہونے والی تھی...... ہر طرف سنسنی پھیل گئی' کئی عورتیں سرگوشی میں یہ کہتی سنی گئیں' فاطمہ کے گھر پولیس آئی ہے' اللہ خیر کرے' ہم نے لوگوں کی باتوں پر دھیان تو نہیں دینا تھا اپنا کام کرنا تھا...... دستک کے جواب میں ایک پچاس سالہ عورت نے دروازہ کھولا۔ اس کا نام بعد میں زلیخا معلوم ہوا۔

اس نے ہماری طرف حیران نگاہوں سے دیکھا پھر نرم لہجے میں بولی۔ ''آپ کو کس سے ملنا ہے؟ اس وقت کوئی مرد گھر میں نہیں ہے۔''

میں نے آگے ہوتے ہوئے کہا۔ ''بی بی ایک عورت قتل ہو گئی ہے ہم اس سلسلے میں تفتیش کرنے آئے ہیں' اگر تم تماشہ ہی لگوانا چاہتی ہو تو دروازے پر ہی اپنی بیٹی فاطمہ کو بھیج دو۔''

آپ پچھلی طرف آئیں میں بیٹھک کا پچھلا دروازہ کھولتی ہوں۔'' بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم اس کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت اس عمر میں بھی خوبصورت لگتی تھی۔

''ہاں تھانیدار صاحب' اب بتائیں کہ آپ فاطمہ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ ویسے ہمارا اس قتل کے ساتھ کیا تعلق ہے؟''

''دیکھو بی بی...... ہمیں تفتیش کے سلسلے میں بہت سے لوگوں سے پوچھ گچھ کرنی پڑتی ہے...... بے شمار دروازوں پر دستک دینی پڑتی ہے۔''

''تو آپ اس حرامزادی کے خاوند کو شامل تفتیش کریں نہ۔''

میں اس کو جھڑک سکتا تھا یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ مجھے تھانیداری نہ سکھائے لیکن اس کی بات سن کر میں ہنس پڑا...... اور اس کے دل سے مزید باتیں نکلوانے کے لیے عام سے لہجے میں بولا۔

''بی بی...... اس کو شامل تفتیش کیوں کروں؟''

''اس کی بیوی اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر میرے داماد عارف سے ملتی تھی...... اس کو پتہ چل گیا ہوگا اور اس نے اس چھاپاں کٹنی کو قتل کروا دیا ہے' اس کے پاس کافی بدمعاش ہیں۔''

آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہیں؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب...... سامنے کی بات ہے۔''

''میں بی بی اس کو بھی دیکھ رہا ہوں' تم اپنی بیٹی کو بھیج دو۔''

اس کے پاس اپنی بیٹی کو بھیجنے کے علاوہ کوئی آپشن نہیں تھا نہ وہ کوئی عذر پیش کر سکتی تھی۔

فاطمہ جب میرے سامنے آئی تو میں نے بغور اس کا جائزہ لیا...... وہ دھان پان سی ایک قبول صورت لڑکی تھی...... اس نے سر پر چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میں نے سپاہی کو پہلے ہی باہر بھیج دیا تھا۔

''دیکھو...... فاطمہ تم مجھے اپنا بھائی سمجھو...... مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے' تمہارے حق پر ڈاکہ ڈالا گیا ہے۔'' میں نے اس کا دل اپنے قبضے میں کرنے کے لیے کہا۔

''تھانیدار صاحب...... عورت اپنی قبر پر آئی ہوئی سوکن بھی برداشت نہیں کرتی ...... میرے خاوند نے ڈنکے کی

چوٹ پر اس حرافہ کے ساتھ تعلقات قائم کیے ہوئے تھے ......شکر ہے اس کو سزا مل گئی۔

مجھے اس کے قاتل کی تلاش ہے' وہ جیسی بھی تھی' لیکن قانون کو ہاتھ میں لینے کی سزا تو ہے نہ..... قاتل کو اس وجہ سے کھلی چھٹی نہیں دی جاسکتی کہ مقتولہ بری تھی۔''

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے' تھانیدار صاحب لیکن اسے کس نے قتل کیا؟''

''یہی تو جاننے کے لیے میں یہ سارے پاپڑ بیل رہا ہوں' تم یہ بتاؤ کہ تمہارے بھائی اس معاملے میں کیا کہتے تھے؟''

''بھائی.....'' وہ میرے اس سوال پر صاف ہچکچاہٹ کا شکار نظر آئی۔

پھر بولی۔''بھائیوں کو مجھ سے بہت پیار ہے..... وہ تو کہتے تھے کہ کسی دن.....'' وہ خاموش ہوگئی۔

''ہاں ...... ہاں کہو..... شاباش..... اگر بہن کی محبت میں بھائیوں نے کچھ کر بھی دیا ہے تو میں ان کو بچالوں گا...... میں مقدمہ اتنا کمزور بناؤں گا کہ انہیں بہت کم سزا ہوگی۔'' میں نے مصلحت آمیز جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب' انہوں نے صرف اتنا کہا تھا کہ کسی دن ہم چار بندے لے کر زمیندار سرور کے پاس جائیں گے اور اسے غیرت دلائیں گے کہ اپنی بیوی کو کنٹرول میں رکھے۔''

''کیا پتہ انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو اور عندلیب کو قتل کردیا ہو۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑھتے ہوئے کہا۔

'تھانیدار صاحب..... میرے بھائی قانون کو ہاتھ میں لینے والے بندے نہیں..... آپ میرے بھائیوں کے پیچھے پڑنے کی بجائے زمیندار سرور کے گرد گھیرا تنگ کریں۔'' فاطمہ نے زور دے کر کہا۔

میں نے اسے واپس بھیج کر اس کی ماں کو اسی کے توسط سے بلالیا۔

''دیکھو..... بی بی تمہارے بیٹے کہاں ہیں؟''

''تھانیدار صاحب..... آپ کو ان پر کیا شک ہے؟''

''تم اس بات کو چھوڑو..... کہ مجھے ان پر کیا شک ہے' یا کیا شک نہیں ہے' تم میرے سوال کا جواب دو.....'' میں نے لہجے کو ذرا تیز کرتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے ایک دوست کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے گجرات گئے ہوئے ہیں..... تین دن تک آجائیں گے.....اور میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ جس رات عندلیب کا قتل ہوا ہے' وہ گجرات میں تھے اور وہ رات وہاں ان کی پہلی رات تھی۔''

''ٹھیک ہے بی بی آپ لوگوں کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ جونہی تمہارے بیٹے آئیں انہیں تھانے کی راہ دکھادینا۔''

پھر ہم وہاں سے تھانے میں واپس آگئے تھے۔

کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا' بظاہر سارے اشاروں کا رخ زمیندار سرور کی طرف تھا۔

اگلی صبح میں نے اے ایس آئی آفاق کو اپنے کمرے میں بلالیا اور اب تک کی ساری تفتیش اس کے سامنے رکھ دی' اس نے چند لمحے غور کیا پھر بولا۔

''سر..... یہ کیس عجیب گورکھ دھندہ ہے' مشتبہ تو بہت ہیں..... لیکن ہمیں پکا ثبوت چاہیے..... تاکہ کیس عدالت میں جاکر چوپٹ نہ ہوجائے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو..... کیس کا دارومدار استغاثہ کی مضبوطی پر ہوتا ہے میں نے چند لمحے غور کیا پھر دوبارہ بولا۔

''میرے خیال میں مخبروں سے کام لینا چاہیے۔''

''بالکل..... سر..... اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے..... میں مخبروں کو میدان میں اتار دیتا ہوں..... ویسے میرے خیال میں مقتولہ کی ایک دو راز دان سہیلیوں کو بھی ٹٹول لینا چاہیے..... پھر فاطمہ کے بھائیوں کو بھی دیکھنا ہے۔''

''دیکھو..... آفاق اس کیس کے سلسلے میں پہلے ہی بہت دیر ہوچکی ہے' ڈی ایس پی صاحب کا آج بھی فون آیا تھا' کہہ رہے تھے ابھی تک قاتل کیوں نہیں پکڑے گئے؟''

''بس سر..... جلد ہی یہ کیس انشاء اللہ پایہ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ چاقو زنی والا بندہ بھی ابھی تک گرفت میں نہیں آسکا ہے''

"آفاق...... اس معاملے کو ذرا الگ ہی رکھو...... یہ کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔"

"ٹھیک ہے سر...... میں ابھی سے اپنے کام میں جت جاتا ہوں۔"

ایک بات کی وضاحت کردوں کہ مجھے جاوید اور شمع والے معاملے میں کچھ ابہام نظر آئے تھے' سب سے بڑا ابہام یہ تھا کہ شمع نے جاوید کو اپنے ماموں کا پتہ کیوں بتایا تھا...... یعنی دکان کا...... جی ہاں قارئین یہ اسی جاوید کا قصہ ہے' جسے ملک رفیق میرے پاس لے کر آیا تھا۔

جب مخبروں نے عندلیب کی دو قریبی اور رازداں سہیلیوں کا ذکر کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ایک سہیلی شمع ہے...... اور دوسری کا نام زاہدہ ہے۔ میں نے اپنی مخبر نوراں کو کہا کہ وہ دونوں کو پیغام دے آئے کہ وہ کسی ایک گھر میں اکٹھی ہو جائیں۔

شام کو میں سادہ کپڑوں میں شمع کے گھر بیٹھا اس سے سوال وجواب کر رہا تھا۔ میرے ساتھ کانسٹیبل منور بھی آیا تھا۔ اسے میں نے حسب معمول باہر ہی بیٹھنے کے لیے کہا۔

یہ ایک نیچی چھت والا کمرہ تھا' کمرہ پندرہ بائی بارہ فٹ تھا' کمرے میں دو پلنگ تھے' جن پر اجلی چادریں بچھی ہوئی تھیں' ایک پلنگ پر میں بیٹھ گیا' اور اپنے سامنے شمع کو بٹھالیا۔

شمع کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا...... وہ ایک درمیانے قد اور تیکھے نقوش والی ایک شوخ وچنچل لڑکی تھی۔

میں نے اس کے ساتھ رعب والی کوئی بات نہیں کی...... بلکہ نرم لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم تو بڑی فنکارہ ہو...... جاوید کو الو بنا دیا۔"

"کیا مطلب تھانیدار صاحب۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوفزدگی کے تاثرات نظر آئے۔

"تم نے جاوید کو اپنے ماموں کا پتہ بتا دیا یعنی اس سے یہ کہا کہ تم اسے ان کی چوڑیوں والی دکان پر ملو گی۔"

"کیا اس نے کوئی شکایت کی ہے کیونکہ مجھے پتہ چلا تھا کہ ماموں اسے تھانے لے گئے تھے۔"

'اس بات کو چھوڑو...... میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں دراصل اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی' وہ میری دل لگی کو محبت سمجھ بیٹھا تھا...... اب تو اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا ہے' اس کے والدین رشتہ مانگنے آئے تھے' میرے والدین نے انکار کر دیا۔"

"خیر یہ بات ہے خطرناک...... آئندہ ایسا نہ کرنا۔"

"کیا آپ مجھے پکڑ کر تھانے لے جائیں گے...... میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں کروں گی......" اس نے بھولپن سے کہتے ہوئے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔

"ٹھیک ہے' لیکن اس سلسلے میں میری ایک شرط ہے؟"

"کیسی شرط؟" اس کی آنکھوں میں حیرانگی لہریں لینے لگی۔

"عندلیب تمہاری سہیلی تھی؟"

"بہت گہری تھانیدار صاحب...... وہ بہت بدقسمت تھی...... اس نے اپنے باپ کی خاطر اتنی بڑی قربانی دی تھی...... میں نے دیکھا کہ دل کا درد اس کی آنکھوں میں پانی بن کر تیر رہا ہے' اس کی ایسی ہی جذباتی کیفیت کی مجھے ضرورت تھی۔

"مجھے پتہ ہے کہ تمہیں اپنی اتنی پیاری اور دکھی سہیلی کے قتل ہونے کا بہت زیادہ دکھ ہے' جن کا اظہار تمہاری آنکھوں سے ہو رہا ہے' مجھے اس کے قاتل یا قاتلوں کو پکڑنا ہے' اس سلسلے میں تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔"

تھانیدار صاحب! اگر میرے بس میں ہو تو میں قاتل کو پکڑ کر آپ کے سامنے پیش کر دوں' میں ہر قسم کے تعاون کے لیے حاضر ہوں۔" اس نے چٹانی لہجے میں کہا۔

"وہ تمہارے ساتھ اپنے دکھ درد شیئر کرتی ہوگی...... وہ ساری باتیں میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

وہ شروع ہوگئی...... درمیان میں اس کی ہچکیاں نکل گئیں...... آواز دھیمی ہی تھی جو کمرے سے باہر نہیں جا سکتی تھی' اس لیے مجھے اطمینان تھا۔ اس نے ایک دو باتوں کے علاوہ ساری باتیں وہی بتائیں جو میں پہلے مختلف لوگوں سے سن چکا تھا' اور جنہیں آپ پڑھ چکے ہیں۔

دو جو فالتو باتیں اس نے سنائیں انہوں نے میرا دماغ روشن کر دیا۔ اس طرف تو میرا دھیان ابھی نہیں گیا تھا۔

اب مجھے مقتولہ کی دوسری سہیلی سے سوال وجواب کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

لیکن چونکہ اسے بلالیا تھا اس لیے خانہ پری کے لیے اس سے بھی چند سوال کر لیے۔

اور میری توقع کے عین مطابق وہ مزید کوئی بات نہ بتا سکی۔ میں نے اسے بھی رخصت کر دیا۔

تھانے میں واپس آ کر میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی فیروز کو کہا کہ وہ تیاری کریں...... ہمیں زمیندار سرور کے باغ والے ڈیرے پر جانا ہے' یہ ڈیرہ میری معلومات کے مطابق سرور کی حویلی سے چند کوس کے فاصلے پر تھا۔

لیکن وہاں ہمیں ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا جس کی توقع مجھے تو کم از کم نہیں تھی۔

جونہی ڈیرے کے باہر ہماری پولیس والی گاڑی رکی' ڈیرے کے اندر ہلچل نظر آئی۔

پھر کوئی شخص جس نے سفید کپڑے اور کالی واسکٹ پہنی ہوئی تھی ڈیرے کی عقبی دیوار پر چڑھتا نظر آیا' اس سے پہلے کہ میں سروس ریوالور نکال کر اسے للکارتا...... یا ہوائی فائر کرتا' وہ دوسری طرف کود گیا اور جب تک ہم پچھلی طرف پہنچتے......وہ نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔

لیکن میں نے چونکہ ہیڈ کانسٹیبل کو ڈیرے کے اندر جانے کا حکم دے دیا تھا اس لیے ڈیرے میں موجود باقی لوگوں کو بھاگنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

اور ہم انہیں گرفتار کر کے تھانے میں لے آئے تھے۔

یہ تعداد میں چار تھے۔

'میں نے فی الحال انہیں حوالات میں بند کروا دیا اور خود اپنے کمرے میں آ گیا۔ اے ایس آئی آفاق بھی تھانے میں موجود تھا۔

وہ بھی میرے کمرے میں آ گیا تھا۔

بھاگنے والے کے متعلق مجھے زیادہ فکر نہیں تھی کیونکہ وہ جو کوئی بھی تھا زیادہ دنوں تک ہماری دسترس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ جن بندوں کو ہم پکڑ لائے تھے ان کے پیٹ سے ہم نے سب کچھ نکال لینا تھا۔

میں نے سپاہی عظمت کو بلا کر اسے حکم دیا کہ جا کر زمیندار سرور کو لے آئے۔

ایک گھنٹے بعد سرور ہمارے پاس بیٹھا ہوا تھا...... اسے پتہ چل چکا تھا کہ ڈیرے پر کیا ہوا تھا اور ڈیرے سے ہم چار بندوں کو پکڑ لائے ہیں...... اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے' اور اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھی۔

''سرور صاحب کیا آپ کو پتہ ہے کہ فرار ہونے والا جوان کون ہے؟''

''نہیں جناب میں تو حویلی میں آرام کر رہا تھا...... آج کل میں بہت زیادہ ڈپریشن کا شکار ہوں۔''

''سرور بھائی...... اس طرح کے کاموں میں اس طرح تو ہوتا ہے'' وہ خاموش رہا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو' خالی الذہن لگ رہا تھا۔

میں نے اسے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کے ساتھ بھیج دیا کہ وہ اسے کسی کمرے میں بٹھا دے۔

یہ میری مجبوری تھی۔

اب ان چار بندوں کی بھی سن لیں...... یہ ویسے ہی جرائم پیشہ بندے تھے۔ جسے سرور جیسے زمیندار اپنے پاس رکھتے ہیں۔ یہ ان کے باڈی گارڈ بھی ہوتے ہیں اور ان کے حکم پر ان کے وہ کام بھی کرتے ہیں جن کی قانون اجازت نہیں دیتا...... اور ان کو تحفظ بھی دیتے ہیں۔ مجھے مخبروں کی زبانی یہ بات پتہ چلی تھی کہ یہ زیادہ تر باغ والے ڈیرے پر ہوتے ہیں۔

ان کے نام کچھ اس طرح تھے......لطیف عرف طافا' شبیر عرف شکرا' اکرم عرف اکو' اور وقار عرف وکی۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان کو کہا تھا کہ وہ سرور کو بٹھا کر واپس میرے کمرے میں آئے۔

وہ ہائی الرٹ تھا...... اسے یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ اب کیا ہونے لگا ہے۔

میں نے اسے کہا کہ سب سے پہلے شکرے کو لے کر آئے۔

چند لمحوں بعد ایک ڈشکرا ٹائپ بندہ میرے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں شکرے جیسی چمک تھی۔

ہیڈ کانسٹیبل کو بھی میں نے کمرے میں ہی رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

ہاں تو شکرا صاحب مزاج گرامی کیسے ہیں؟"
"اللہ کا شکر ہے جناب۔"
"تم لوگ ڈیرے پر کیا کر رہے تھے اور جو بندہ فرار ہوگیا ہے وہ کون تھا؟"
"جناب ہم تو ویسے ہی گپ شپ لگا رہے تھے۔"
"ادھورا جواب نہ دو..... بتاؤ وہ بندہ کون تھا؟ میں نے میز کے اوپر اپنی اسٹک مارتے ہوئے کہا۔
"وہ تو جناب...... عنایت تھا...... کبھی کبھی گپ شپ لگانے ہمارے پاس آ جاتا تھا۔"
"وہ فرار کیوں ہوگیا تھا؟ گپ شپ لگانا کوئی جرم تو نہیں ہے۔"
"دراصل وہ کالی وردی سے بہت ڈرتا ہے۔"
'عنایت وہی تو نہیں جس کے گال پر بڑا سا تل ہے' او راس کی بائیں آنکھ میں کوئی نقص ہے۔"
"جناب وہی ہے۔"
"مجھے یاد آ گیا کہ تھانے میں ایسے بندے کا ریکارڈ موجود ہے اسے ایک بندے کو چاقو سے زخمی کرنے کے جرم میں چھ ماہ قید ہوئی تھی اور یہ واقعہ میرے اس تھانے میں آنے سے پہلے کا تھا۔ ریکارڈ میں یہ لکھا تھا کہ یہ شخص انتہائی کائیاں ہے لڑائی مار کٹائی کا ماہر ہے اور چاقو زنی میں طاق ہے۔
کڑیاں ملنی شروع ہوگئی تھیں اس شخص کا نام عنایت تھا۔ لیکن اس کے ٹھکانے سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ میں نے باقیوں کو بھی بلا کر ان سے سوال وجواب کیے تھے۔ ان پر کافی تشدد بھی کروایا تھا لیکن اس کے ٹھکانے سے کوئی واقف نہیں تھا۔
البتہ کافی مار کھا کر اکرم عرف اکو نے اس کے گھر کا پتہ بتادیا تھا۔
ہمارے لیے اتنا ہی کافی تھا' میں نے چاروں کو اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھ لیا تھا وہ کسی طرح بھی عندلیب کے قتل میں ملوث نہیں تھے اگر عنایت نے عندلیب کو قتل کیا تھا تو اس کی اس کے ساتھ کیا دشمنی تھی۔ یہ تو وہ ہمارے ہتھے چڑھتا تو پتہ چلتا۔
اور مجھے قوی یقین تھا کہ وہ فرار ہو کر اپنے گھر نہیں گیا ہوگا۔ میں نے کانسٹیبل منور اور سپاہی شہباز کو حکم دیا کہ وہ عنایت کے گھر جائیں' اگر وہ گھر میں نہ ملے تو اس کے باپ کو لے آئیں' تقریباً دو گھنٹے بعد وہ واپس آئے' ان کے ساتھ ایک مسکین سا پچپن سالہ بندہ تھا۔
میں نے اسے عزت سے بٹھایا۔ اسے دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اسے کیوں بلایا......لیکن اگلے ہی لمحے میں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ اس کو بلانا ہماری مجبوری تھی کہتے ہیں اولاد باپ کے بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے مگر کچھ ناخلف اولاد ایسی بھی ہوتی ہی جو ان کو بڑھاپے میں ذلیل وخوار کرتی ہے۔
"بزرگو عنایت کہاں ہے؟"
"جناب' کیا اس نے پھر کوئی گل کھلا دیا ہے؟"
"اس بار شاید اس نے کوئی بڑا ہی گل کھلایا ہے۔"
"کیا مطلب جناب؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور ہاتھ کانپنے لگے' اس کی حالت کے پیش نظر میں نے اسے مزید کچھ بتانے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔
"ہمیں آپ کے بیٹے کی ضرورت ہے' جب تک وہ مل نہیں جاتا آپ کو ہمارا مہمان رہنا پڑے گا۔"
"حوالات میں......" اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔
"نہیں ...... دیکھیں حوصلے سے کام لیں' کبھی کبھی ہمیں ایسے ناپسندیدہ کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔"
"پھر......!
میں نے سپاہی عظمت کو بلا کر کہا۔
"انہیں لے جاؤ...... سرور کے پاس ہی بٹھا دو...... اور ان کے چائے پانی کا بندوبست کردو۔"
ہمیں بہت پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ مشتبوں اور مخبروں کو پکڑنے کے سلسلے میں دوسرے دن عنایت میرے پاس آیا۔
میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا' کیونکہ میں اس کی تصویر اور ریکارڈ دیکھ چکا تھا۔
میں نے اسے بیٹھنے نہیں دیا...... اور سپاہی شہباز کو بھی بلا لیا۔
اس نے التجا بھرے لہجے میں کہا میرے باپ کو چھوڑ دیں' انہوں نے کچھ نہیں کیا۔"

''ان کو تو میں نے عزت و احترام کے ساتھ رکھا ہوا ہے اور عزت و احترام کے ساتھ ہی گھر بھیج دوں گا' اگر تم فرار نہ ہوتے تو۔ ہمیں انہیں تھانے میں نہ بٹھانا پڑتا۔''

اس کا سر جھک گیا' اس نے ہمیں ذرا بھی پریشان نہیں کیا سب کچھ بتا دیا۔

اس نے عندلیب کے قتل کا اقرار کرلیا۔

لیجیے اس کی زبانی سنیے۔

''تھانیدار صاحب میں آپ کو اپنی کہانی سنا کر کسی رعایت کا نہیں کہوں گا' صرف اس لیے اپنی کہانی سناؤں گا کہ یہ بتا سکوں کوئی بھی پیدائشی مجرم یا بدمعاش نہیں ہوتا...... یہ معاشرہ اور حالات اسے جرائم کی دنیا میں لے آتے ہیں۔ میں نے شرافت سے جینا چاہا لیکن معاشرے کے ان ٹھیکیداروں نے مجھ سے میری شرافت چھین کر مجھے بدمعاش بنا دیا...... جس آڑھت کی بڑی دکان پر میں کام کرتا تھا وہاں کا منشی میرے پیسے رکھ لیتا تھا مجھے پورا معاوضہ نہیں دیتا تھا' ایک دن میں نے اسے کہا دیکھو منشی جی مجھے میرا پورا معاوضہ دیا کرو' میں نے بہن کی شادی بھی کرنی ہے' لیکن وہ ہنس کر کہتا تھا' ہمارے ساتھ بھی پیٹ لگا ہوا ہے' ایک دن میں نے اس کے پیٹ میں چاقو مار دیا...... چاقو ذرا تر چھا لگا تھا...... مجھے چھ ماہ کی سزا ہوگئی' جیل میں مجھے بڑے جرائم پیشہ مل گئے...... انہوں نے کہا اس دنیا میں جینا ہے تو شرافت کا لبادہ اتار پھینکو ورنہ یہ لوگ تمہاری شرافت کو تمہاری بزدلی اور کمزوری سمجھتے ہوئے تمہارے ساتھ ظلم اور زیادتی کرتے رہیں گے' اور جہیز کے بغیر تمہاری بہن کی شادی تمہارے لیے ایک خواب بن کر رہ جائے گی۔ مختصراً یہ کہ میں جب رہا ہو کر آیا تو میرا ذہن بدل چکا تھا' جیسے میری برین واشنگ کردی گئی ہو' زمیندار سرور کا بیٹا وزیر محمد میرا دوست بن گیا کیونکہ ایک دفعہ بازار حسن میں اس کا جھگڑا وہاں کے ایک بدمعاش سے ہوگیا تھا میں نے اس کی مدد کی تھی یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ عندلیب کے ساتھ میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی...... میں نے وزیر محمد کے کہنے پر عندلیب کو قتل کیا تھا...... میری بہن کی شادی کا مسئلہ تھا' واقعی بہن کے سسرال والوں نے جہیز کا مطالبہ کردیا تھا میں نے وزیر محمد سے بات کی اس نے کہا...... میں تمہیں اتنے پیسے دوں گا کہ تم دھوم دھام سے بہن کی شادی کرنا' صرف عندلیب کا کانٹا نکال دو...... مجھے پتہ چل چکا تھا کہ اس کا باپ دولت کے نشے میں ایک جوان عورت بیاہ لایا ہے...... عندلیب کے سارے حالات میرے علم میں تھے' اور مجھے یہ بھی پتہ چل چکا تھا کہ وہ زمیندار کے بس میں نہیں رہی پتہ نہیں اس کے باپ سرور نے اسے کیوں کھلی چھٹی دی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے آپ وزیر محمد کو بھی پکڑ کر اسے بھی شامل تفتیش کریں گے مجھے اب اس کے ساتھ بھی کسی قسم کی ہمدردی نہیں رہی ہے کیونکہ اس نے بھی میری مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے قاتل بنا دیا ہے ورنہ اب تک میں صرف ڈرا دھمکا کر اپنا کام چلاتا رہا ہوں۔ میری بہن کی شادی ہوگئی ہے...... صرف تین دنوں میں یہ سب ہوگیا تھا کیونکہ مجھے میری چھٹی حس نے خبردار کردیا تھا کہ میں عنقریب پکڑا جاؤں گا' اگر بہن کی شادی سے پہلے میں پکڑا جاتا تو شادی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا...... آگے جو اللہ کو منظور ہوگا...... وہی ہوگا' وزیر محمد نے عندلیب کو قتل کیوں کروایا...... اس کی تفصیل مجھے نہیں پتہ...... شہر میں پہلے ہی چاقو زنی کی وارداتیں ہو رہی تھیں اسی کی آڑ میں' میں نے یہ سب کچھ کرنے کی کوشش کی ہے پھر بھی مجھے کھٹکا تھا' کہ میں بچ نہیں سکوں گا...... اور یہی ہوا......'' وہ خاموش ہوگیا میں پتھر کا بت بنا یہ سب کچھ سن رہا تھا' لیکن یہ جذباتی ہونے کا وقت نہیں تھا۔

میں نے قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے اسے باقاعدہ گرفتار کرلیا اور اس کے باپ کو جانے کی اجازت دے دی...... اب مجھے وزیر محمد کا انتظار تھا۔

وہ غائب ہوگیا تھا' جیسے کبھی گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوئے تھے۔

مجھے یہ احساس بھی ہوگیا تھا کہ سرور کو بٹھانا فضول ہے' کیونکہ جو حالات مجھے معلوم ہوئے تھے ان کی روشنی میں یہی لگ رہا تھا کہ بیٹے کو باپ کی پروا نہیں ہے' میں نے سرور کو یہ بتا کر کہ اس کے بیٹے وزیر نے ہی اپنی سوتیلی ماں کو قتل کروایا ہے اور جو شخص اس دن دیوار پھاند کر فرار ہوگیا تھا' وہی قاتل ہے' اس کا نام عنایت ہے اور وہ کرائے کا قاتل ہے...... جانے کی اجازت دے دی۔

اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے...... تقریباً ایک ہفتے بعد وزیر محمد ہمارے ہتھے چڑھا...... ہم نے اس کے بہنوئی کو تھانے میں بٹھایا تھا۔

''اس نے اس طرح بات کی جیسے اس کے ساتھ کوئی بہت بڑی زیادتی ہوگئی ہو۔

''میں کوئی مجرم تو نہیں تھا' تھانیدار صاحب' آپ نے میرے بہنوئی کو تھانے میں کیوں بٹھالیا ہے۔''

میں نے اس کے کان کے کیڑے جھاڑنے کے لیے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ تمہارے دوست عنایت نے سب کچھ بتادیا ہے۔''

''میرا کسی عنایت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے وہ حرامزادہ جھوٹ بولتا ہے۔''

وہ حرامزادہ اس وقت جیل میں تھا' ورنہ میں اسے لاکر اس کے سامنے کھڑا کردیتا لیکن اس دوران ہم نے اپنا ہوم ورک مکمل کرلیا تھا۔ ہم نے اس بدمعاش کو تھانے میں بٹھایا ہوا تھا جس کے ساتھ اس کی لڑائی ہوئی تھی' جب وہ سامنے آیا تو اس کے اعتماد کا پہاڑ ریت کا پہاڑ ثابت ہوا اور بینک سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں اس سے پوچھا کہ فلاں تاریخ کو اتنی بڑی رقم نکلوا کر اس نے کہاں خرچ کی۔ عنایت نے ہمیں رقم بتادی تھی...... اور یہ اتنی ہی رقم تھی جتنی وزیر نے بینک سے نکلوائی تھی۔ قاتل اور قتل کروانے والے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا کہاں خیال رکھتے ہیں' وزیر چپ ہوگیا اور سر جھکالیا۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور میری آنکھوں میں موجود سوالات پڑھ کر وہ پھٹ پڑا۔

''تھانیدار صاحب بے شک آپ مجھے پھانسی چڑھوادیں...... لیکن میں ڈنکے کی چوٹ پر یہی کہوں گا کہ مجھے اس حال کو پہنچانے والا کوئی اور نہیں میرا باپ ہے اس نے ایک جوان عورت کے ساتھ شادی کرکے ایک ایسی حماقت کی جس کا ازالہ کسی طرح بھی ممکن نہیں پھر جس طریقے سے عندلیب کو حاصل کیا گیا وہ بھی آپ کے علم میں آچکا ہوگا...... شادی کے ایک ہفتے بعد جب میں نے اپنی سوتیلی ماں کے گلے میں اپنی ماں کا ہار کانوں میں میری ماں کی بالیاں اور ہاتھوں میں اپنی ماں کی انگوٹھیاں دیکھیں تو میرا خون کھولنے لگا اور میں نے اسے غصے سے کہا تم میری ماں کی جگہ نہیں لے سکتیں...... تم ڈائن ہو...... اس نے مجھے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا...... اپنی ماں کا زیور میرے پاس دیکھ کر تم جل کر کباب ہوگئے ہو' جاؤ اپنے باپ کے ساتھ لڑائی کرو' اگر مجھے آنکھیں دکھانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا......! میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا...... اور جاکر اپنے والد محترم سے بات کی...... انہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا' انہوں نے فرمایا (یہاں اس نے دانت پیستے ہوئے یہ بات بتائی) اپنے کام سے کام رکھو میرے منہ لگنے کی کوشش نہ کرنا'' اس وقت اس حرافہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا' پھر مجھے پتہ چلا کہ وہ آدھی حویلی اس کے نام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں...... میں نے انہیں کہا کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو خون خرابہ ہوجائے گا' انہوں نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ فی الحال پر ان کا زیادہ زور تھا...... میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ابھی میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ یہ بات میرے کانوں میں پڑی کہ میری سوتیلی ماں میرے باپ کے ہاتھ سے نکل گئی ہے...... اور عارف نامی بندے سے ملتی ہے' اور اکثر گھر سے رات رات بھر غائب رہتی ہے۔ میں نے باپ سے بات کرنا فضول سمجھتے ہوئے یہ کانٹا نکالنے کا فیصلہ کرلیا......!

پھر وہ رات آئی میں نے عنایت سے سارا معاملہ طے کرلیا تھا' اس نے اپنے ایک ساتھی ذاکر کی مدد سے یہ کام کردیا...... وہ بھی مجبور تھا' اور میں بھی مجبور تھا...... دونوں کی مجبوریوں نے مل کر یہ کام کردیا۔

عنایت نے کمال مہارت سے اپنے ساتھی ذاکر کا نام نکال دیا تھا۔ بعد میں ہم نے اسے بھی گرفتار کرلیا تھا' ویسے بھی یہ بات بعید از قیاس تھی کہ ایک آدمی نے ایک جوان عورت کو پکڑ کر اکیلے قتل کردیا...... چاقو زنی کرنے والے جنونی بندے کے متعلق مجھے پھر کبھی بھی معلوم نہ ہوسکا۔

کیونکہ اس کیس کے نمٹانے کے چند دن بعد اس تھانے سے میری ٹرانسفر ہوگئی تھی...... یہ کہانی پڑھ کر آپ خود اندازہ لگائیں کہ اصل مجرم کون ہے؟ اب اس خبر کے متعلق بھی بتادوں جو میں نے کہا تھا کہ آخر میں بتاؤں گا۔ خبر یہ تھی کہ بیٹے نے اپنی ماں کو قتل کردیا۔



ذوقِ آگہی

سباس گل

مقامِ ختم المرسلین ﷺ

سیدنا آدم علیہ السّلام سے لے کر ہمارے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ تک ہر نبی دنیا کو ہدایت دینے کے لیے آیا۔ ان پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی' فرشتہ آیا' کشف ہوا اور خواب میں بھی وحی اتری۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہر پیش گوئی کو سچا کیا اور انہیں ہر مقام پر سچا کہا گیا۔

نبی کی بات اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ کا وجود باقی ہے اور اس میں کوئی جھوٹ نہیں، اسی طرح اللہ کے نمائندے نبی و رسول کی بات بھی سچ اور حق ہے۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا تعارف کراتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ترجمہ: ''ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لیے مہربانی کا نمونہ بنا کر بھیجا ہے۔'' (انبیاء)

جس شخص نے دنیا کی زندگی میں آپ ﷺ کے ساتھ ایمان کا تعلق قائم کرلیا' وہ دنیا میں ہی اس پاکیزہ تعلق کی برکات محسوس کرے گا اور مرنے کے بعد آپ ﷺ کا فیض اس کو قبر اور حشر میں جہنم سے محفوظ کر کے جنت میں لے جائے گا۔ معراج اس کا نام نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو آسمانوں پر لے گیا اور واپس لے آیا۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ میرے رسول محمد ﷺ دنیا میں تو جلوہ افروز ہیں ہی اور انسان ان کے نورِ ہدایت سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ لیکن فرشتے بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ ان کو جلوہ آسمان پر ہی دکھانا تھا۔ پہلے آسمان کے دروازے سے لے کر ساتویں آسمان تک اور پھر عرش معلیٰ تک جتنے فرشتے ہیں، ان سب کو بتانا تھا کہ جس انسان کے پاس تمہارے سردار جبریل امین کو بھیجتا ہوں' اب وہ آئیں گے۔ دیکھنا میں نے ان کا درجہ کتنا بلند کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو متاثر کیا جو انسانوں اور فرشتوں کی تحقیق اور پہنچ سے باہر ہے۔

کہتے ہیں نور کی ایک گاڑی ''رَف رَف'' لائی گئی۔ اس میں نبی کریم ﷺ کو بٹھایا گیا۔ جبریل پیچھے رہ گئے تو پوچھا۔ ''آپ ساتھ کیوں نہیں چلتے؟'' کہنے لگے ''میرے پر جل جائیں گے' آگے نہیں جا سکتا' مجھے یہیں تک آنے کا حکم تھا۔ اب آپ جانیں اور اللہ جانے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کو کہاں تک جانا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام فرشتوں کو اپنے حبیب کریم ﷺ کا جلوہ دکھایا اور مقام بتلایا کہ وہ ہیں تو بشر مگر درجہ یہ ہے کہ اب ان کے اور میرے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ سب پیچھے رہ گئے اور حبیب میرے پاس آ گئے۔ ورفنا لک ذکرک

جانشین امیر شریعت مولانا سید ابوذر بخاری رحمتہ اللہ

(اقتباس خطاب: فیصل آباد: ۱۹۸۷ء)

شہروز خان......کراچی

سوال

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''قیامت کے دن حساب کے لیے بارگاہ الٰہی میں جب پیشی ہوگی تو آدمی کے پاؤں اپنی جگہ سے سرک نہ سکیں گے جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کا سوال نہ کرلیا جائے گا۔''

۱:۔ اول یہ کہ اس کی پوری زندگی اور عمر کے بارے میں کن کاموں میں گزاری۔

۲:۔ اور دوسرے اس کی جوانی (اور جوانی کی قوتوں) کے بارے میں کہ کن مشاغل میں جوانی اور اس کی قوتوں کو بوسیدہ اور پرانا کیا۔

۳:۔ تیسرے مال و دولت کے بارے میں کہاں اور کن طریقوں اور کن راستوں سے اس کو حاصل کیا۔

۴:۔ اور اس دولت کو کن کاموں اور کن راہوں میں صرف کیا۔

۵:۔ پانچواں سوال یہ ہوگا کہ جو کچھ معلوم تھا اس کے بارے میں کیا عمل کیا۔

(جامع ترمذی، معارف الحدیث)

(کتاب: اسوۂ رسول اکرم ﷺ)

ایس حبیب خان......کراچی

عشق

عشق کے تین حروف ہیں ع ش اور ق۔

میرے نزدیک ان تینوں حروف کے الگ الگ مطلب ہیں عشق کا عین ہمارے تعاقب میں آتا ہے مطلب ہمارا

عاقب ہے شین بھی عشق کا ہی حصہ ہے شک وشبہات بھی ہمارے عاقب ہیں شکوک کی حلاوت بھی اسی آٹے میں گندھی ہوتی ہے اور قاف کے معنی یہ ہیں کہ اس میں رنگ ونسل اور ذات پات کی تفریق نہیں ہوتی رن وفا کسی اکبر کا دربار نہیں ہوتا نام نسب ذات پوچھی جائے عشق ہمیں نظر آتا ہے اس دنیا کے پیچھے اس کائنات کے پیچھے کہ اس کائنات کی تخلیق عشق کے باعث ہوئی عشق ہمیں غزوہ تبوک کے موقع پر نظر آتا ہے جب امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیقؓ نے گھر کے بڑے اسباب سے لے کر سوئی تک ہر کہن ونو چیز نبی ﷺ کے قدموں میں ڈھیر کر دی عشق کا جذبہ ہمیں خیبر کے موقع پر نظر آتا ہے جب مولا علیؓ نے جذبہ عشق کی ترجمانی کرتے ہوئے لشکر کفار کو للکارا اور سب سے بڑھ کر عشق کے قفس میں مقید کرنے کے لیے وہ واقعہ کافی ہے کہ جب کربلا کی ریت پر خانوادہ رسول ﷺ نے اپنا سارا کنبہ راہ خدا میں نثار کر دیا اس سے آگے چلیں تو عشق نظر آتا ہے حضرت امیر خسروؒ کے راگوں کی صورت میں اور عصر حاضر میں دیکھیں تو عشق کو تو لوگوں نے مذاق بنالیا ہے نہیں عشق آج بھی رہے ابن صفی کی صورت میں مولانا شبلی کی صورت میں اشفاق احمد کی صورت میں مریم مختار کی صورت میں معین اختر کی صورت میں اور یہ عشق محض فرضی ناولوں تک ہی محدود نہیں بلکہ آج بھی ماہا ملک، نمرہ احمد، عمیرہ احمد، نازیہ کنول نازی کے ناولوں کے کرداروں میں زندہ ہے کیونکہ ان کے ناولوں کے کردار زندہ ہیں عشق کی صورت میں۔

محمد فرقان رومان......مہرو پیلو، چکوال

حال دل

رات دن جس کی خلش جاتی نہیں
بات اک ایسی ابھی تک دل میں ہے
حال دل کس سے کہیں تہذیب ہم
ہر کوئی اپنی کسی مشکل میں ہے

راؤ تہذیب......حسین تہذیب

میری ڈائری کا ایک ورق

دنیا کو تمہارے ماضی سے غرض نہیں ہے، دنیا صرف حال دیکھتی ہے کہ تو اب کیسا ہے ہاں لوگ ایسا بولتے ہیں کہ کل اس کا یہ حال تھا اور آج یہ معتبر بنا پھرتا ہے، یہ بھی ٹھیک ہے لیکن وہ ایسا تبھی بولیں گے جب آپ ان کے مطلب پر پورا نہیں اترو گے ورنہ جس حال میں آپ ہیں لوگ آپ کے قریب آئیں گے ورنہ پیچھے ہٹ جائیں گے پس انسان کو چاہیے کہ اللہ جس حال میں بھی رکھے خوش رہے دنیا کی پروا نہ کرے حال میں رہے ماضی پر افسوس نہ کرے بلکہ سبق سیکھے اور مستقبل سے کبھی خوف نہ کھائے اور اس کے لیے اچھی تیاری کرے کیونکہ مستقبل اسے مواقع فراہم کرتا ہے اب یہ انسان کا فرض ہے کہ اس کے لیے اچھی منصوبہ بندی کرے۔

عبدالجبار رومی انصاری......قصور

انمول موتی

☆ توکل سیکھنا ہے تو پرندوں سے سیکھو کہ جب وہ شام کو گھر جاتے ہیں تو ان کی چونچ میں کل کے لیے کوئی دانا نہیں ہوتا۔

☆ ہر روز کسی کے ہاں آنا جانا محبت اور پیار کو گھٹا دیتا ہے۔

☆ اگر تم حق وصداقت کا خیال رکھتے ہو تو ہر شخص تمہارا احترام کرے گا۔

☆ صبر کی تلخی، علم کی شیرینی اور عمل کی سختی وہ دور ہے جس سے دل کی ہر بیماری کا علاج کر سکتے ہیں یعنی اس میں اگر بغض، حسد اور کینہ ہے۔

☆ پاکیزہ حسن بناؤ سنگھار کے بغیر ہی دل موہ لیتا ہے۔

☆ کسی سے یہ مت پوچھو کہ وہ تمہیں کتنا چاہتا ہے بلکہ تم خود سوچو کہ تم اس کو کتنا چاہتے ہو۔

☆ شہرت دراصل وہ ہے جو کسی بہادری یا تگ ودو کے بعد حاصل ہو۔

☆ مرجھائے ہوئے درخت بہار میں پھر ہرے ہو جاتے ہیں مگر گزرے ہوئے دن کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔

☆ اگر کسی نے تمہیں تنگ کرنے یا دکھ دینے کے لیے تمہاری راہ میں کانٹے بچھا دیے ہیں تو تم ان کو ہٹا دو کیونکہ جواب میں اگر تم نے بھی کانٹے بچھا دیے تو ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔

☆ اچھے اور مخلص دوست کبھی بھی نہیں بچھڑتے جو چلے گئے وہ ہماری یادوں میں زندہ ہیں اور ہمیں رہیں گے۔

☆ کسی کے چہرے پر مت جاؤ کیونکہ انسان ایک بند کتاب کی مانند ہے جس کا سرورق کچھ اور ہوتا ہے اور تحریر کچھ اور ہوتی ہے۔

☆ سچائی ایک ایسا کڑوا گھونٹ ہے جسے پینے سے انسان کو بہت کچھ کھونا پڑتا ہے لیکن انسان کی عظمت اسی میں ہے۔

☆ مانا کہ دل انتہائی نازک ہے مگر اس میں اس قدر استقامت پیدا کرو کہ یہ اگر پتھر سے بھی ٹکرائے تو ریزہ ریزہ نہ ہونے پائے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

نشانہ

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا ''یار میری بیوی گزشتہ چھ ماہ سے چیزیں کھینچ کھینچ کر مار رہی ہے کوئی علاج تو بتاؤ۔''

دوست نے حیرت سے پوچھا ''یار وہ تمہیں گزشتہ چھ ماہ سے مار رہی ہے اور تم اب مشورہ مانگ رہے ہو۔''

اس شخص نے کہا ''پہلے ڈر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔''

دوست ''پھر اب کیا ہوا؟''

اس شخص نے بے بسی سے جواب دیا ''پہلے اس کا نشانہ خطا ہو جاتا تھا مگر اب ہر نشانہ پکا ہو گیا ہے۔''

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

معجزہ

ایک بادشاہ کسی خوفناک مرض میں مبتلا ہو گیا یونانی طبیبوں کے ایک گروہ نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا کہ اس کی بیماری کی کوئی دوا نہیں البتہ چند خاص صفات رکھنے والے آدمی کے پتے سے اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے ایسے نوجوان کو تلاش کرنے کا حکم دے دیا ایک دہقان کا لڑکا ایسا ہی مل گیا جیسا کہ طبیبوں نے بتایا تھا بادشاہ نے اس کے ماں باپ کو بلایا اور بہت سی دولت دے کر خوش کر دیا اور انہیں اس بات پر رضا مند کر لیا کہ ان کا بیٹا شاہ وقت پر قربانی کر دیا جائے۔

ادھر قاضی نے فتویٰ دے دیا کہ رعیت کے کسی شخص کا خون بہانا بادشاہ کی سلامتی کے لیے جائز ہرگز نہیں ہے۔

جب جلاد نے اس لڑکے کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور مسکرانے لگا۔

بادشاہ نے پوچھا ''یہ ہنسی کا کون سا موقع ہے۔''

لڑکے نے کہا ''اولاد کا ناز ماں باپ پر ہوتا ہے جو قاضی کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتے ہیں اور بادشاہ سے انصاف چاہتے ہیں اب کیفیت یہ ہے کہ ماں باپ نے دنیاوی مال کے لالچ میں مجھے قتل ہونے کے لیے سونپ دیا ہے قاضی نے میرے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے اور بادشاہ اپنی سلامتی میری ہلاکت میں دیکھتا ہے اب سوائے خدائے بزرگ و برتر کے میں کوئی پناہ نہیں دیکھتا۔

اے بادشاہ تیرے ظلم کی فریاد میں کسی کے آگے کروں، میں تیرے ہاتھ سے تیرے ہی سامنے انصاف چاہتا ہوں۔

لڑکے کی باتیں سن کر بادشاہ کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہنے لگا اس بے گناہ بچے کا خون بہانے سے میرا مر جانا بہتر ہے۔

یہ کہہ کر اس کا منہ چوما اور اسے گود میں اٹھا لیا پھر اسے بہت سا مال و دولت دے کر آزاد کر دیا۔

کہتے ہیں کہ اس ہفتے کے اندر منصف بادشاہ صحتیاب ہو گیا کہ اس کے انصاف کو خدا کے حضور پسند فرما لیا گیا تھا۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف

ہر کام غلط کرتے ہو

جنگ عظیم دوم کے زمانہ میں امریکن سپاہی فرانس کے ریلوے اسٹیشن پر ریل میں بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا ایک جگہ ایک بڑھیا کے ساتھ والی سیٹ پر اس کی کتیا بھی بیٹھی تھی۔

بڑے اخلاق سے کتے کی جگہ بیٹھنے کی اجازت مانگی۔ تم امریکن بڑے بدتمیز ہوتے ہو تم دیکھ نہیں رہے ہو میری پیاری کتیا بیٹھی ہے۔'' سپاہی کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔ تمام ٹرین میں جگہ نہ ملی وہ پھر وہی آیا اجازت مانگنے پر پھر بڑھیا نے بے عزت کر کے رکھ دیا۔

سپاہی خاموشی سے آگے بڑھا اور کتیا کو ٹرین سے باہر پھینک کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بڑھیا نے شور مچا دیا کچھ فاصلے پر ایک انگریز بیٹھا تھا اور تماشہ دیکھ رہا تھا۔ وہ امریکن سے بولا۔ ''تم امریکی ہمیشہ ہر کام غلط کرتے ہو کھانا کھاتے وقت فورک غلط ہاتھ میں پکڑتے ہو گاڑی داہنی جانب بالکل غلط چلاتے ہو اب دیکھو تم کو بڑی بی کو باہر پھینکنا چاہیے تھا اس کی جگہ تم نے بے چاری کتیا کو پھینک دیا۔

عبدالرحمان...... کراچی



خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

کام دریا سے اور لوں گا میں
اس سے پانی نہیں بھروں گا میں
تب مرا اصل دیکھنے آنا
راکھ سے جس سمے اُٹھوں گا میں
چاک کو بھی خبر نہیں اس کی
تیرے ہاتھوں سے کیا بنوں گا میں
جب مجھے دنیا دیکھنی ہو گی
تیری آنکھوں میں جھانک لوں گا میں
تُو نے دو باتیں بھی سنائیں اگر
چارپائی سے جا لگوں گا میں
میں تو چائے نہیں بنا سکتا
تُو نہ ہو گی تو کیا کروں گا میں
گھر بناتے ہوئے نہ سوچا تھا
گھر زیادہ نہیں رہوں گا میں
ہجر کا دُکھ اگر سمجھنا ہوا
دو منٹ تجھ سے رُوٹھ لوں گا میں
تُو اگر آج بھی نہ آیا تو
ان پرندوں سے کیا کہوں گا میں

سید فاخر رضوی......جرمنی

غزل

شہر جا کر کر بھی نہ بیچا ہے سخن گاؤں کا
نقش ہر نقش سنبھالا ہے ترے پاؤں کا
ہم کہ چشموں کے ٹھنڈے پانی کے عادی تھے بہت
کیسے بھاتا ہمیں پانی ترے دریاؤں کا
جیپ ریلی کے وقت دوڑ کے آتے ہیں سبھی
کون جانے ہے اذیت کبھی صحراؤں کا
ایک وہ اے - سی کی ٹھنڈک کی رسیا لڑکی
ایک میں ناپتا رہتا ہوں جسم چھاؤں کا
اپنے ارمانوں کا رک رک کے گلا گھونٹا ہے
خون کرتا ہے کوئی ایسے تمناؤں کا

فرخ حجاز

ڈاکٹر شاہد لطیف کے نام

جو کوئی دوسرا نہ کر پایا آپ وہ کام کرتے ہیں
بھلا یا جا چکا کب کا، سبق وہ عام کرتے ہیں
زہر اگل رہے ہیں لہجے سبھی کے آج کل
دیتا ہے سکوں دل کو، آپ وہ کلام کرتے ہیں
فراہم کر رہے ہیں خزانے شفا کے لوگوں کو
اس ٹوٹی بکھری انسانیت پر آپ احسان کرتے ہیں
اہلِ ہوس کو رکھتے ہیں آپ پاؤں کی جوتی پر
جو لوگ دل سے مخلص ہیں ان کا احترام کرتے ہیں
وقف کردی ہے زندگی ہمدردی کے نام پر
خدمت خلق لوگوں کی آپ صبح و شام کرتے ہیں
سیکھا ہے فاروق نے آپ کے طرز عمل سے
کس طرح اچھے اخلاق سے پیدا مقام کرتے ہیں

عمر فاروق ارشد......فورٹ عباس

غزل

تجھے بھلا کے کہاں زندگی گزرتی ہے
یہ دکھ اٹھا کے کہاں زندگی گزرتی ہے
رو حیات ہی ثابت قدم ہی رہنا ہے
یوں ڈگمگا کے کہاں زندگی گزرتی ہے
بلا کا حوصلہ درکار ہے یقین کرلو
کہ تلملا کے کہاں زندگی گزرتی ہے
یہ زندگی کی علامت ہیں جاگتے ارماں
انہیں سلا کے کہاں زندگی گزرتی ہے
غم فراق کا کچھ تو علاج کرنا ہے
یہ چوٹ کھا کے کہاں زندگی گزرتی ہے
یقینی بات ہے دل کے قریب لوگوں سے
یوں دور جا کے کہاں زندگی گزرتی ہے
قمر یہ سچ ہے رہ زندگی میں آشنا کے
دیے بجھا کے کہاں زندگی گزرتی ہے

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

اسے کہنا کہ وہ اب مجھ سے دل لگی نہ کرے
اداسیوں کی کسک میری شبنمی نہ کرے
وہ مجھ سے بات کرے اور زیادتی نہ کرے
کہے جو کہنا ہے لیکن کہی سنی نہ کرے
میں شرمسار ہوں کتنا اسے کہوں گا ضرور
وہ چاہے اتنا خفا ہو کہ بات بھی نہ کرے
اتر نہ آئے کہیں خواب بھی بغاوت پر
وہ اس قدر مری نیندوں کی چوکسی نہ کرے
ہوئی ہیں اوس کی بوندیں کرن کرن افشاں
اداس پھولوں پر یہ ظلم چاندنی نہ کرے
صلیب و دار کا نشہ ہی اس کو لے ڈوبے
کسی پہ اتنا بھروسا بھی یوں کوئی نہ کرے
رہی نہ یاد مجھے صبح رات کی کوئی بات
مذاق مجھ سے تو یوں میر تشنگی نہ کرے
کہاں سمجھتا ہے اس کے لیے بھلا ہے یہی
شہزاد کچھ بھی کرے اب وہ میکشی نہ کرے
نشہ تو اس میں بھی اتنا ہے تم کہو شاید
شہزاد چھوڑ دے اس کو بھی شاعری نہ کرے
دستگیر شہزاد......

غزل

وفا میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں
حسین چہرے رشک غزلاں سب جانے پہچانے ہیں
غم عمر بھر کے یوں بھی دے جاتے ہیں لوگ
شمع کے ساتھ آج بھی جلتے پروانے ہیں
سوچا بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہوگا محبت میں
کسی کی یاد میں بہتے ہوئے آنسوؤں کے نذرانے ہیں
شام کے گہرے سائے تھے یوں زندگی کے ساتھ
جلتی بجھتی ہوئی روشنیوں میں پھر کئی فسانے ہیں
ساتھ کوئی نہیں دیتا کسی کا جہاں میں جاوید
کھلے گی جب آنکھ پھر خواب کئی سہانے ہیں
محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

نظم

اجنبی راستے اس نئے شہر کے
اجنبی ہے زمیں اور نیا آسمان

اک تیرا آسرا اور یہ سارا جہاں
سلطنت ہے تیری یہ زمین آسمان
پوچھے ہوا مجھ سے میرا پتا
کاش ہوتا کوئی میرا کون و مکاں
کہتی ہیں مجھ سے یہ کونجوں کی ڈاریں
بتا ہے کہاں تیرا آشیاں
پرواز میری یہاں اور وہاں
جیسے پنچھی ہو کوئی بھٹکا ہوا
منزل ہے کہاں
پہاڑ اور سمندر ہیں درمیاں
کاش اے عندلیب ملے تجھ کو
تیرا راہ نما
(شازیہ عندلیب)
عبدالجبار رومی انصاری......لاہور

غزل

زندگی میں کچھ ایسا تو قرینہ ہو
ہر کوئی رشک کرے کچھ ایسا ہی جینا ہو
جب بات کرو تو حلاوت ٹپکے
تمہارا ہر قول پھول ہو نگینہ ہو
ہر اک دیوار گراتے چلو آگے بڑھو
شاید کسی دیوار میں چھپا دفینہ ہو
معاف کرنے کی صفت قوی ہے اگر
ملت جاتی ہے عداوت جتنا دیرینہ ہو
کسی بھنور کا خوف آ نہیں سکتا خاکی
جب نجات کے لیے حسینؓ ہی سفینہ ہو
پروفیسر ذوالفقار علی خاکی......کوٹ ادو

غزل

تنہا تیری یاد میں کڑھتا رہتا ہوں میں
ہر پل جدائی میں تڑپتا رہتا ہوں میں
پھٹ پڑتا ہے دل جب یاد آتی ہے تیری
خون کے فواروں میں چھلکتا رہتا ہوں میں
یہ سنسان کالی راتیں برداشت نہیں ہوتیں
ہر گھڑی خوف سے سہا رہتا ہوں میں
چشم روشن کا خیال جب آتا ہے دل میں

تو بڑی دیر تک مسکراتا رہتا ہوں میں
چاہے بھی تو مجھے نکال سکتا نہیں تو
تیرے دل میں جو دھڑکتا رہتا ہوں میں
تیری آنکھوں کی باتیں کیوں نہ کریں لوگ
ان میں جو چمکتا رہتا ہوں میں
کون ہے اپنا کسے اپنا دکھ بتاؤں
تنہا ہی خود روتا رہتا ہوں میں
انجانی آہٹیں تجھے بے چین کیوں نہ کریں چاند
ان میں جو سدا مچلتا رہتا ہوں میں
عامر خان چاند......کوٹ ادو

غزل

میں قربتوں میں بھی یوں فاصلے بڑھا دوں گا
کہ خود کو ان سے بھی بڑھ کر کڑی سزا دوں گا
جو تیرے حسن تیری سادگی پہ لکھی تھی
ہر ایک لفظ میں تحریر کا جلا دوں گا
کبھی نہ لوٹ کے آؤں گا میں تیری گلیوں میں
میں تیرے شہر کے سب راستے بھلا دوں گا
اگر میں لوٹ بھی آیا تو نہ پکارو گی
میں اپنی ذات کو کچھ اس قدر گرا دوں گا
کسی مزار کی چوکھٹ پر جو جلائے تھے
میں تیرے نام کے سارے دیے بجھا دوں گا
شاعر: سید بشارت شاہ
انتخاب: پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

غزل

کھلتے پھولوں کی طرح وہ لڑکیاں اچھی لگیں
میرے سادہ پن کو ان کی شوخیاں اچھی لگیں
عید کا جب چاند دیکھا تو کھڑی تھی پاس وہ
اس کے کانوں کی رو پہلی بالیاں اچھی لگیں
اس نے پہلی بار دیکھا پوری آنکھوں سے مجھے
اپنی جانب کھلنے والی کھڑکیاں اچھی لگیں
پاس جو آنے نہیں دیتی اسے کیونکر عظیم
پھول پر منڈلانے والی تتلیاں اچھی لگیں
احسان سحر......میانوالی

غزل

روٹھ گیا تو مجھ سے نجانے کیونکر
آہ تیری یاد میں یہ دل مچلنے سا لگا
سمجھایا نہیں جاتا اب اس بے دردی کو صنم
تیرے بن اب یہ قلب بھی ہے تڑپنے سا لگا
آنگن میں میرے جو چراغ روشن تھا ہوا
ماہی تیری محبت میں وہ بھی بجھنے سا لگا
کیا یقین دلاؤں اپنے اس بدنصیب دل کو
جو انتظار میں ترے بے قرار رہنے سا لگا
آنکھیں یہ جو شب و روز بہاتی ہیں آنو
میرا چہرہ بھی ان کی شدت سے اب بھیگنے سا لگا
من کرتا ہی نہیں میرا جینے کو اب اے محبوب
میرے سینے پر جو آ کے یہ داغ محبت سا لگا
طلحہ کھرل......شیخو پورہ

غزل

خاک ہوں، خاک میں جانے لگی ہوں
یہ بھی اچھا ہے ٹھکانے لگی ہوں
بھول جاتی ہوں میں دنیا اپنی
سو تری یاد بھلانے لگی ہوں
تُو مرا راز ہے ایسا، جس کو
میں سہیلی سے چھپانے لگی ہوں
ہاتھ پہ کر لے زمانے مجھ کو
میں ترے ہاتھ زمانے، لگی ہوں
آسماں اُس کو بنایا عنبر
اب زمیں جس کو بنانے لگی ہوں
عنبریں عنبر......کراچی



مرشد

ساحر جمیل سید

قسط نمبر7

قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے عشق کی روداد دل گداز
اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی
مسلے، مرجھائے گجرے، باسی پھول اور گھنگرو اس کے کھلونے بنے
بدمعاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر......وہ کسی کا مرید ہو گیا......!!

شاہی محلے کا نمازی بدمعاش جس نے سرکار سے عشق کیا اور عشق کی مریدی کی





ساون اور جعفر کے بعد اماں بھی خیر خیریت سے لوٹ آئی تھی' اور مرشد کے لیے اطمینان اور سکون کی بات یہ تھی کہ اماں کی طبیعت بھی ٹھیک ہی تھی۔

ساون اور جعفر کی نندی پور میں چوہدریوں کے تین بندوں سے ایک معمولی سی جھڑپ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں وہ ان سے ایک جیپ اور اسلحہ چھین لائے تھے۔ البتہ اس بات کی انہوں نے تسلی کر لی تھی کہ اماں نندی پور نہیں پہنچی...... یعنی وہ کہیں اور گئی تھی۔ کہاں...... یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا' مرشد نے اماں سے پوچھا بھی تھا مگر اس کے جواب سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوئی تھی' مرشد نے بھی اس بات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے صرف اماں کی فکر تھی اور وہ واپس آ چکی تھی۔ باقی سب کچھ اس کے نزدیک غیر اہم ہی تھا۔

ذہن اماں والی اس فکر مندی سے آزاد ہوا تو حجاب کا خیال کچھ اور بھی شدت اختیار کر گیا' اس کی مختلف تصویریں رہ رہ کر اس کے اندر چمک رہی تھیں۔

خوف ودہشت سے بھری ہوئی شفاف چمک دار آنکھیں...... سرخ انگور جیسے ہونٹ...... دوپٹے کے ہالے سے جھانکتا ہوا روشن چہرہ...... دایاں گال اور اس گال پر روشنی نچھاور کرتے ہوئے آنسو کا سفر...... ایک ہی چہرہ مختلف زاویوں سے اس کے دماغ میں چمکتا رہا...... اس کے نہ چاہنے کے باوجود...... خود بہ خود...... عجیب تماشا' عجیب اُلجھن آ پڑی تھی۔ وہ واپس بیٹھک پر آیا تو اوپر جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گیا' اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی کیفیت کو بخوبی محسوس کیا مگر وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی...... ان سب کے خیال کے مطابق تو اب مرشد کی فکر و پریشانی ختم ہو جانی چاہیے تھی جب کہ اس کے برعکس اس کا موڈ مزاج کچھ مزید خراب ہو چکا تھا اور یہ بات ان سبھی کے نزدیک خلاف معمول اور خلاف توقع تھی۔ مگر سب اپنی اپنی جگہ خاموش ہی رہے' پھر جب چار پانچ گھنٹے گزر گئے اور مرشد بدستور اوپر اپنے کمرے میں ہی بند رہا تو سبھی تشویش میں مبتلا ہو گئے' ان میں چہ میگوئیاں ہوئیں اور باہمی صلاح مشورے کے بعد مراد اور ساون اٹھ کر اوپر اس کے کمرے میں چلے آئے۔

مرشد اس وقت کمرے میں ٹہل رہا تھا' ایک بے سکونی اور پریشانی اس کے بشرے سے مترشح تھی۔ ساون اور مراد کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ ٹھہر گیا۔

"اب ایسا بھی کیا ہے کہ جس نے بچپن کے یاروں کو آج سوتیلے بنا چھوڑا ہے؟" مراد نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

"کیا بات ہے؟" مرشد نے باری باری دونوں کو گھورا۔

"وہی پوچھنے جاننے آئے ہیں۔"

دونوں آگے بڑھ کر کمرے کے آدھے حصے تک بچھے بستر پر پسر گئے۔

"اب بتا کیا پریشانی ہے تجھے؟"

مرشد کمرے کے وسط میں کھڑا چپ چاپ دونوں کو گھورے گیا۔ وہ دونوں اسے گھور رہے تھے۔

"کیا بات ہے مرشد' کیا چھپا رہے ہو ہم سے؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں ہے تو پھر پانچ گھنٹے سے یہ حجرہ نشینی کیوں اختیار کر رکھی ہے اور...... یہ چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

مرشد ایک گہری سانس لے کر رہ گیا' وہ انہیں بتاتا بھی تو کیا...... بچپن سے آج تک وہ آہنی اعصاب کے ساتھ جیا تھا۔ اس نے ہمیشہ ثابت کیا تھا کہ وہ پتھر کا کلیجہ رکھتا ہے۔ فولاد جیسے سینے میں دل بھی فولاد ہی کا تھا اور آج ایک معمولی سی لڑکی کے خیال نے اس کا اندر تہہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔

دو دن سے ہزار کوشش کے باوجود وہ اس خود سر سے خیال کو اپنے اندر سے نہیں نکال پایا تھا۔

'کوئی خاص پریشانی کی بات نہیں...... بس کچھ تھوڑی سی اُلجھن ہے۔"

مرشد بھی آگے بڑھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

"تھوڑی سی اُلجھن؟" مراد نے بغور اس کی صورت

دیکھی...... وہ آج دن میں بھی مرشد کی اس الجھن کو محسوس کر چکا تھا لیکن اس وقت اس نے یہی خیال کیا تھا کہ مرشد کی یہ الجھن اور پریشانی اماں کے حوالے سے ہے مگر اب تو اماں بھی خیر خیریت سے واپس آ چکی تھی۔

"اماں کی طبیعت وغیرہ تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہی تھی۔"

"کہاں گئی تھیں وہ؟"

"پتا نہیں' پوچھا تھا مگر اماں نے بتایا نہیں اور اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔"

"تو کس سے فرق پڑتا ہے اور مرشد کو کب سے تھوڑی تھوڑی الجھنوں سے فرق پڑنے لگ گیا؟"

"تمہارے بگڑے ہوئے موڈ کی وجہ سے باقی ساتھی بھی پریشان ہیں' کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ نہیں تو اس حجرے سے باہر نکلو۔"

ساون کے سنجیدہ انداز پر مرشد فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے آؤ' نیچے چلتے ہیں۔"

وہ ان کے ساتھ نیچے چبوترے پر آ بیٹھا۔ جعفر وہاں نہیں تھا البتہ اکو اور شبیرا موجود تھے۔ مرشد آ کر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ بیرونی دروازے سے اماں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر تعجب سے اٹھ کھڑا ہوا' رات نصف سے زیادہ ہی گزر چکی تھی' ویسے بھی اماں کے یہاں آنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ مرشد فوراً آگے بڑھا۔ اس کے ساتھی بھی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ چبوترے کے قریب لیٹے ہوئے کتکان نے بھی سر اٹھا لیا تھا۔

"کیا بات ہے اماں؟ آپ یہاں!"

بے چینی اور فکرمندی مرشد کا انداز تھی۔ اماں کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

"ہاں' میں تم سے مدد مانگنے آئی ہوں۔"

"کیا...... کیا کہہ رہی ہیں آپ......؟ آیئے' ادھر آیئے۔"

مرشد اسے بازو سے پکڑ کر چبوترے تک لے آیا۔ اس کے ساتھی فوراً پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ مرشد کی اماں کا یوں اس طرح وہاں آنا سبھی کے لیے غیر معمولی بات تھی۔

"اب کہیے کیا بات ہے' کیا ہوا ہے؟"

مرشد نے اماں کو چبوترے پر بٹھایا اور خود اس کے برابر ٹک گیا۔

"وہ لڑکی' حجاب زخمی ہے' اس کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا ہے اور اماں نے اسے باغیچے والے کمرے میں بند کروا دیا ہے' باہر دو اجنبی مسلح آدمی پہرے پر بھی بٹھائے گئے ہیں' میں اس لڑکی کے لیے تم سے مدد مانگنے آئی ہوں۔ وہ تکلیف میں ہے...... خاصا خون ضائع ہو چکا اس کا۔ خدانخواستہ جان بھی جا سکتی ہے اس کی۔" مرشد کے دل کو کچھ ہوا تھا' پورے وجود میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ پردہ تصور پر چپکا ہوا روشن چہرہ خون میں نہا گیا۔

مرشد چند لمحے بغور اماں کی متفکر صورت دیکھتا رہا' پھر گمبیر لہجے میں بولا۔

"آپ نے مدد مانگنے کی بات ٹھیک نہیں کی۔ آپ مجھے حکم دیتی اچھی لگتی ہیں۔ بے فکر ہو جائیں' میں ابھی جا کر خبر لیتا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"پرزہ......"

مرشد کا اشارہ سمجھتے ہوئے شبیرے نے فوراً ڈب سے پسٹل نکال کر مرشد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ساون! تم اور اکو میرے پیچھے آؤ گے۔ شبیر یہیں رہے گا اور مراد تم جا کر ڈاکٹر ظفر کو پکڑ لاؤ' اسے معاملہ بتا دینا۔"

"مرشد پتر! وہ خاصے خطرناک لوگ ہیں۔"

وہ تینوں بیرونی دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ حسن آرا نے جیسے مطلع کیا۔

"دیکھ لیتے ہیں۔" مرشد نے بغیر رکے کہا تو حسن آرا نے پھر اسے پکارا۔

"مرشد!" اس بار اس کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ مرشد ٹھٹک کر رک گیا۔ ساون اور اکو بھی رک گئے۔ سبھی حسن آرا کی طرف متوجہ ہو گئے جو چہرے پر سکوت سمیٹے مرشد کو تک رہی تھی۔ مرشد متفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا تو

چند لمحوں کی تاخیر کے بعد وہ انتہائی سنجیدگی سے بولی۔

''ایک بات تم سب کے ذہن میں رہے......تم لوگ ایک بڑی دشمنی کی بنیاد رکھنے جا رہے ہو......ایک ایسی دشمنی کی جس کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا ہے...... برے سے برا بھی۔''

''تو......'' مرشد نے بھویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔

''میں نہیں چاہتی تھی کہ اس طرح کی کوئی خرابی پیدا ہو' اسی لیے میں نے کچھ باتوں سے تمہیں لاعلم بھی رکھا ہے' لیکن شاید قدرت کی یہی مرضی ہے' اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس دشمنی کی داغ بیل ڈال دیں۔''

حسن آرا نے ایک ذرا توقف کیا۔

''تم میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایا ہو......اور اس وقت وہ لڑکی مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔''

مرشد چونک پڑا......اماں کی یہ بات اسے حیرت میں مبتلا کر گئی تھی۔ یعنی اس لڑکی سے اماں کو صرف ہمدردی نہیں تھی...... بات اس سے آگے کی تھی......آج تک اس کی زندگی کے صرف دو قطب تھے ...... میر صاحب اور مرشد...... اور اب اس لڑکی کے لیے اماں کے یہ جذبات...... گویا اس کی زندگی میں ایک تکون در آئی تھی اور...... اور خود مرشد بھی تو دو دن سے کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا......آج تک اس کی زندگی کا صرف ایک ہی مدار رہا تھا۔

باجی امی......اماں' اور اب دو دن سے ہر پل' ہر لمحہ وہ اس لڑکی حجاب کو بھی ضروری محسوس کرتا رہا تھا۔ گویا دہ خود مرشد کی زندگی میں بھی ایک تکون ترتیب پانے کا باعث بن رہی تھی...... پتا نہیں ایسا کیا تھا اس میں......مرشد نے سر جھٹکا' اماں بول رہی تھی۔

''اس معاملے میں تمہاری اس وقت کی مداخلت دشمن کے خلاف اعلان جنگ ثابت ہوگی۔ لہٰذا تم لوگ اس جنگ کی شروعات کرنے سے پہلے اپنے ذہنوں کو یہ جنگ لڑنے کے لیے تیار کرلو۔''

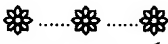
حسن آرا کے الفاظ ان سبھی کو سنگینی کا احساس دلا گئے تھے' مگر ان میں سے کوئی بھی گھبرانے یا پریشان ہونے والا نہیں تھا...... یا پھر شاید انہیں سنگینی کی شدت کا ابھی ٹھیک سے ادراک نہیں تھا۔

''یہ شروعات کر کے ہم لوگ کچھ غلط کرنے جا رہے ہیں یا......درست؟'' مرشد نے گویا تصدیق چاہی تھی۔

''اپنے ہونے کا حق ادا کرنے کی سعادت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی' اس حوالے سے تم لوگ خوش نصیبوں میں سے ہو...... اور غیرت کا تقاضا بھی یہی ہے جو تم کرنے جا رہے ہو۔'' حسن آرا نے مضبوط اور پریقین لہجے میں کہا۔

رات کی خاموشی سن رہی تھی کہ ایک طوائف غیرت کی تشریح کر رہی ہے......آسمان دیکھ رہا تھا کہ ایک بدمعاش غیرت کا تقاضا نبھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

پھر شبیرے کے علاوہ باقی بھی وہاں سے نکلتے چلے گئے اور حسن آرا نامی وہ طوائف اس چبوترے پر بیٹھی رہی۔ فی الوقت اسے کوئی خاص فکر نہیں تھی البتہ آنے والے وقت کے حوالے سے اس کے دماغ میں کئی سوچیں' کئی اندیشے کلبلانے لگے تھے۔



مرشد زینے طے کرتا ہوا سیدھا اوپری منزل کے ہال میں پہنچا تھا جہاں راگ ورنگ کی محفل اس وقت اپنے پورے جوبن پر تھی۔ عشرت جہاں ہال کے وسط میں بیٹھی گا رہی تھی جبکہ شازیہ اور شگفتہ اس کے دائیں بائیں ناچ رہی تھیں۔

مرشد کے اندر داخل ہوتے ہی عشرت کا گلا سر سے اتر گیا۔ شگفتہ اور شازیہ کے قدم بھی ایک ذرا گڑبڑائے تھے مگر انہوں نے ناچ جاری رکھا۔

مرشد نے پورے ہال پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی اور کونے میں موجود نزہت بیگم پر نظر پڑتے ہی وہ سیدھا اس کی طرف بڑھ گیا......نزہت بیگم بھی اسے دیکھ چکی تھی اور مرشد کے تاثرات دیکھتے ہوئے وہ کسمسا کر رہ گئی تھی۔

''چل مائی کھڑی ہوجا...... مجھے تجھ سے ضروری بات کرنی ہے۔''

ساون اور اکو بھی اندر آ کر تماش بینوں کے عقب میں کھڑے ہوگئے تھے۔

سازندے بدستور ساز بجارہے تھے۔ عشرت جہاں گا رہی تھی۔ شازیہ اور شگفتہ ناچ رہی تھیں مگر ان سب کا دھیان بٹ چکا تھا' سماں بکھر بکھر جارہا تھا اور یہ بات تمام تماش بینوں کو بھی بخوبی محسوس ہوگئی تھی۔

''کس بارے میں بات کرنی ہے؟ محفل کا تو خیال کر۔''

نزہت بیگم اندر سے گڑبڑا گئی تھی مگر بظاہر اس نے ناگواری کا اظہار کیا۔

''کیا تجھے بھی دوسری زبان میں سمجھانا پڑے گا...... کھڑی ہوجا۔''

مرشد نے یکا یک درشت انداز میں اسے دبکا تو عشرت جہاں گانا بھول گئی اس کے چپ ہوتے ہی ساز بھی خاموش ہوگئے۔ شگفتہ اور شازیہ کے پاؤں بھی اپنی اپنی جگہ جم کررہ گئے۔

''مرشد! یہ کیا طریقہ ہے؟ اب تم یہاں بھی اپنی بدمعاشی کا مظاہرہ کروگے؟'' عشرت جہاں نے کرخت لہجے میں کہا تو مرشد نے نزہت بیگم کے گھٹنے کے قریب پڑے اگالدان کو اس زور کی ٹھوکر ماری کہ وہ پیک کے چھینٹے اڑاتا ہوا عقبی دیوار سے جاٹکرایا۔ پھر اس نے پلٹ کر یوں عشرت جہاں کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس اگالدان کو دیکھ کر سبق سیکھ لو......!

''چابی تو تیرے پاس ہوگی۔'' مرشد دوبارہ نزہت بیگم کی طرف متوجہ تھا۔ ''چل اٹھ اور چل کے تالا کھول۔''

''کس...... کس تالے کی بات کررہا ہے تو......؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اماں اس وقت میری بیٹھک پر بیٹھی ہے' تو زیادہ ڈرامہ کرے گی تو تجھے بھی ان دشمنوں میں شمار کرلوں گا جن کے میں نے آنے والے دنوں میں پیٹ پھاڑنے ہیں...... چل آ گے لگ۔''

مرشد نے اسے بازو سے پکڑ کر اندرونی حصے کی طرف دھکیلا' پھر پلٹ کر سازندوں سے مخاطب ہوا۔

''تم لوگ جاری رکھو۔''

اگلے ہی پل ساز پھر سے بیدار ہواٹھے تھے۔

حجاب کے حوالے سے مرشد پہلے سے ہی کشمکش کا شکار تھا' اس کے اندر کہیں اس لڑکی کی طرف داری کا خیال موجود رہا تھا لیکن ابھی وہ پوری طرح اس پر آشکار نہیں ہوا تھا۔ اب اماں نے اس کے دروازے تک آ کر......اور خود اس حوالے سے کہہ کر مرشد کے اس خیال کو باقاعدہ شکل دے دی تھی اور اب وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھا۔

عقبی طرف والے زینوں سے ہوکر وہ نیچے برآمدے میں آ گئے۔ نزہت بیگم اندر ہی اندر کھول رہی تھی اور مطمئن بھی تھی کہ عقبی صحن میں موجود جاگیردار کے آدمی ابھی اس کی ساری بدمعاشی نکال کر رکھ دیں گے۔

عقبی صحن میں پہنچتے ہی مرشد نے دیکھا کہ مختصر باغیچے کے قریب دو آدمی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے گپوں میں مصروف تھے' دونوں کے پاس رائفلیں تھیں۔

مرشد اور نزہت بیگم پر نظر پڑتے ہی وہ دونوں چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کیا بات ہے بائی جی! ادھر کیسے؟''

ان میں سے چھریرے بدن والا نزہت بیگم سے مخاطب ہوا۔ البتہ دونوں کی نظریں مرشد پر ٹکی ہوئی تھیں۔ مرشد نے ایک ہی نظر میں دونوں کو جانچ تول لیا۔

''یہ مرشد لے کر آیا ہے مجھے۔''

نزہت بیگم نے مرشد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مرشد نے ان دونوں کے تاثرات میں تناؤ آتے دیکھا۔

''تم لوگ اکبر علی کے کارندے لگتے ہو...... میں کوئی فساد نہیں چاہتا' لہٰذا تم لوگ چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔''

مرشد کی بات پر ان دونوں کے چہروں پر حقارت کے تاثرات اتر آئے۔

''مرشد......تو ہیرامنڈی کا وہ بدمعاش تو ہے......تو مرشد پتر! بات یوں ہے کہ تو فساد نہیں چاہتا پر ہم لوگ فساد کے بڑے شوقین ہیں اور تجھے ابھی پتا نہیں ہے کہ فساد

ہوتا کیا ہے تیری یہاں بدمعاشی چل رہی ہے تو اسے اس چار دیواری سے باہر باہر چلائے رکھ...... جیسے چل کر آیا ہے ویسے ہی چپ چاپ واپس چلا جا' ایک منٹ بھی اور یہاں رکا تو تیری ساری بدمعاشی ہوا کے ساتھ ہی نکال دیں گے ہم...... کیا سمجھا۔"

وہی شخص دوبارہ بولا تھا مگر ابھی اس کی بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ مرشد کی بھرپور ٹھوکر اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان پڑی اور اس کے حلق سے ایک قلق انگیز ہوک کی آواز نکل گئی۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور بے اختیار اس کے دونوں ہاتھ ٹانگوں کے درمیان جا پہنچے۔ دوسرے شخص نے تڑپ کر رائفل سیدھی کرنی چاہی تھی کہ مرشد نے بایاں ہاتھ رائفل کی نال پر ڈالتے ہوئے برق رفتاری سے اس کے سینے پر اس زور کی ٹکر رسید کی کہ وہ اچھل کر عقب میں پڑی کرسیوں پر جا گرا۔ اس کی رائفل مرشد کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ عقب سے فوراً اکو اور ساون آگے بڑھ کر ان دونوں پر مسلط ہو گئے۔

"چل مائی! تالا کھول۔"

مرشد کی آواز پر دبک کھڑی نزہت بیگم فوراً بوکھلائے ہوئے انداز میں اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں حجاب کو قید کیا گیا تھا۔ رائفل مرشد نے ایک طرف پھینک دی۔ اگلے چند منٹ میں ان دونوں کی مشکیں کسی جا چکی تھیں۔ اس کے لیے ان کے ازار بند اور قمیص استعمال کی گئی تھیں۔ مرشد مطمئن ہو کر کمرے کی طرف بڑھ گیا اور نزہت بیگم خاموشی سے کھسک گئی۔

حجاب سامنے ہی پلنگ پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ مرشد اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بے ہوش تو نہیں تھی البتہ ہوش میں بھی نہیں تھی۔ اس کے آدھے چہرے پر خون کی سرخی تھی تو آدھے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ سر اور چہرے کے گرد ایک کپڑا لپٹا ہوا تھا اور وہ بھی خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ قمیص پر خون کے دھبے تھے اور پلنگ کی چادر پر بھی خون کی نمی موجود تھی۔

وہ کمزور اور معصوم لڑکی اس وقت ظلم اور بے چارگی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ مرشد نے اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں میں دکھ اور ہمدردی میں گھلے ملے پیار کو لڈتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر جھک کر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا' اگلے ہی لمحے وہ پلٹ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

"ان دونوں کتوں کو اسی کمرے میں ڈال کر تالا لگا دو' اس کے بعد ایک جا کر اماں کو بلا لائے اور دوسرا مراد کو دیکھے کہ وہ کدھر مر گیا ہے۔"

مرشد نے ایک ذرا رکتے ہوئے اکو اور ساون کو مخاطب کیا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ حجاب کو اٹھائے سیدھا اماں کے کمرے میں آیا تھا۔ حجاب کو آرام سے پلنگ پر لٹانے کے بعد اس نے حجاب کے سر پر لپٹا کپڑا ہٹایا اور اس کے خون آلود بالوں کو ہٹاتے ہوئے زخم کا جائزہ لیا۔ سر کے دائیں حصے میں تقریباً ایک انچ لمبا کٹ تھا اور غالباً خاصا گہرا تھا' کیونکہ زخم سے ابھی تک خون رس رہا تھا' اس کی آنکھیں کبھی بند ہو جاتیں اور کبھی نیم وا۔

"اے لڑکی۔" مرشد نے اس کا گال تھپتھپایا۔

"اے..... حجاب......اے آنکھیں کھول۔"

اس کے بند پپوٹوں میں حرکت ہوئی اس نے ادھ کھلی دھندلائی نظروں سے ایک ذرا مرشد کی طرف دیکھا اور پلکیں جیسے خود بخود پھر سے آپس میں جڑ گئیں۔

مرشد کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ اسی وقت عقب میں آہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مراد اور ڈاکٹر ظفر اندر داخل ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا' اس نے ٹرائزر کے اوپر ایک ڈھیلی ڈھالی سی قمیص پہن رکھی تھی' بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ اڑا اڑا...... مراد غالباً اسے سوتے میں سے اٹھا کر ساتھ گھسیٹ لایا تھا۔

"آ ڈاکٹر! دیکھ اسے' سر میں چوٹ آئی ہے۔"

ان پر نظر پڑتے ہی مرشد نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ڈاکٹر نے فوراً آگے بڑھ کر اپنا میڈیکل باکس پلنگ کے ساتھ رکھا اور خود حجاب پر جھک گیا۔ مرشد نے فوراً تپائی سے

جگ گلاس اٹھایا اور تپائی پلنگ کے سرہاندی کی طرف رکھ دی۔

ڈاکٹر نے ہاتھ سے حجاب کے پپوٹے اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا‘ نبض دیکھی اور پھر اس کے سر کی طرف متوجہ ہوگیا‘ مرشد نے آگے بڑھ کر اسے زخم دکھایا۔

”لگتا ہے خاصی بلیڈنگ ہوچکی ہے۔ زخم بھی گہرا ہے۔“

”یہاں کام ہوتا ہے یا کلینک چلیں؟“

”یہیں کرلیتے ہیں۔ٹانکے لگانے پڑیں گے۔“

”تو لگاتا کیوں نہیں؟“

ڈاکٹر اپنے باکس کی طرف متوجہ ہوگیا۔اس نے ایک چٹ پر کچھ لکھ کر مرشد کو تھمایا۔

”یہ ایک ڈرپ اور کچھ انجیکشنز ہیں فوراً منگوائیں۔“

”میں ابھی لے آتا ہوں۔“ مراد نے آگے بڑھ کر وہ چٹ پکڑلی اور باہر نکل گیا۔ڈاکٹر نے حجاب کو انجکشن دیا‘ پھر اس کے چہرے کا خون اور سر کا زخم صاف کرنے کے بعد بیگ سے قینچی نکالی تو مرشد بول پڑا۔

”کیا کرنے لگا ہے؟“

”ٹانکے لگانے کے لیے بال کاٹنے ہوں گے۔“

”ایسے ہی لگادے نا۔“

”ایسے کیسے......بال بھی ٹانکوں میں آجائیں گے اور یہ بیکٹریل انفیکشن پیدا کریں گے۔“

”تو پھر بس زخم پر ہی سے تھوڑے سے کاٹنا۔“

ڈاکٹر تپائی پر بیٹھتے ہوئے دوبارہ حجاب کی طرف متوجہ ہوگیا۔ٹانکے لگانے کے بعد اس نے پٹی کرنا شروع کردی۔ اسی وقت اماں کمرے میں داخل ہوئی‘ اس کے عقب میں ساون تھا۔اماں نے اندر آتے ہی ایک نظر ان لوگوں کو دیکھا پھر چارپائیوں سے ایک چادر اٹھائی اور آگے بڑھ کر حجاب کے جسم پر اوڑھادی۔مرشد کو ایک لمحے کے لیے اماں سے شرمندگی محسوس ہوئی‘ لیکن اس کے دماغ میں حجاب کے جسم کے حوالے سے کوئی ایسا ویسا خیال آیا ہی نہیں تھا۔

”ڈاکٹر صاحب کیسی حالت ہے اس کی؟“ حسن آرا

نے فکرمندی سے پوچھا۔

"خون کافی بہہ گیا ہے اس کے علاوہ اور کوئی مسئلہ نہیں۔"

"کیا یہ بے ہوش ہے؟"

"نہیں' نقاہت کے زیر اثر ہے ابھی سو جائے گی' میں ڈرپ لگا جاؤں گا' صبح تک بہتر ہو جائے گی' بس آپ لوگ اس کے آرام اور خوراک کا خاص خیال رکھیے گا۔"

اس نے باری باری حسن آرا اور مرشد' دونوں کی طرف دیکھا۔ پٹی مکمل ہو چکی تھی۔ حسن آرا حجاب کی صورت دیکھتی ہوئی پلنگ کے برابر فرش پر بچھے بستر پر بیٹھ گئی۔

مرشد نے ایک نظر ماں کی طرف دیکھا' جس کے چہرے پر دکھ اور تاسف کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیوں ندامت کے تاثرات بھی اتر آئے تھے۔

مراد کے آنے کے بعد ڈاکٹر نے ڈرپ تیار کر کے حجاب کو لگائی اور کچھ مزید میڈیسنز لکھ کر پرچی مرشد کو تھمائی اور ان کے استعمال کا طریقہ سمجھا کر اجازت لیتا ہوا رخصت ہو گیا۔ مرشد بھی اماں کے قریب ہی بیٹھا حجاب کی زرد صورت دیکھ رہا تھا' جب کہ مراد اور ساون ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔



دن میں ساون لوگ نندی پور سے جو جیپ لائے تھے مرشد نے اسی جیپ میں اکبر علی کے دونوں بندوں کو ڈالا اور صبح کی اذانوں سے پہلے پہلے جیپ نندی پور کی حدود میں چھوڑ دی گئی' البتہ ان کی رائفلیں اور جیپ کے ساتھ چھینے گئے پستول سنبھال لیے گئے تھے۔

مرشد اور اس کے ساتھیوں کو بخوبی اندازہ تھا کہ انہوں نے بھوکے اور پاگل بھیڑیوں کے نرغے سے بکری اچکنے کی سی جرات کی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ اب نندی پور سے شدید قسم کا ردعمل سامنے آئے گا' لہٰذا وہ سب اپنی اپنی جگہ چوکنے ہو گئے تھے۔

صبح تک ساون اور مرشد خود کوٹھے کی سیڑھیوں پر بیٹھے رہے تھے' صبح ہوتے ہی وہ دونوں بیٹھک پر آ گئے اور ان کی جگہ جعفر اور شبیرے نے لے لی۔

رات حجاب کی مرہم پٹی کے بعد مرشد کچھ دیر وہیں اماں کے پاس بیٹھا رہا تھا مگر اس دوران نہ تو اس نے کچھ پوچھا تھا اور نہ ہی اماں نے کچھ بتایا تھا۔ اماں تو بس حجاب میں گم تھی۔ اس کے لیے فکرمند اور پریشان تھی۔ حجاب کی صورت دیکھ دیکھ کر اس کے اپنے چہرے پر تاثرات کی عجیب جھلملاہٹ جاری رہی تھی اور مرشد بس اس کے ایسے تاثرات دیکھ کر ہی چپ رہ گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ کسی نامعلوم حوالے سے حجاب اماں کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے...... وہ تو مرشد کو معمولی معمولی لڑائی جھگڑے سے بھی منع کرتی رہتی تھی۔

لیکن اب اس لڑکی حجاب کے لیے اس نے خود ہی ایک بڑی دشمنی کی بنیاد رکھوادی تھی۔ مرشد حجاب کے متعلق اب تک وہی کچھ جانتا تھا جو کل خود حجاب نے اسے بتایا تھا۔ اس مختصر کہانی سے مرشد نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ نندی پور میں اس کے بھائیوں اور چوہدریوں کے درمیان ہونے والا فساد حجاب کے خاندان کے لیے تباہ کن ثابت ہوا ہوگا...... اس کے بھائی وغیرہ یا تو اب چوہدریوں کے کسی ڈیرے پر قید' اذیتیں بھگت رہے ہوں گے یا پھر جیل وغیرہ میں ہوں گے۔ ساون اور جعفر نے کل آ کر بتایا تھا کہ نندی پور میں کوئی بڑا کھڑاگ ہوا تو ہے مگر گاؤں کے لوگ اس قدر دہشت زدہ ہیں کہ کوئی بھی اس حوالے سے کچھ بھی کہنے سننے کو تیار نہیں تھا۔ ویسے بھی انہیں وہاں زیادہ وقت گزارنے یا لوگوں سے ملنے ملانے کا ٹھیک سے موقع نہیں ملا تھا کہ چوہدریوں کے بندوں سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی اور انہیں مجبوراً ہنگامی انداز میں واپس لوٹنا پڑ گیا۔

اب حجاب اماں کو کیوں اتنی عزیز اور اہم تھی یہ تو مرشد نے سوچنا جاننا زیادہ ضروری خیال نہیں کیا تھا...... اس نے تو خود جب سے اسے دیکھا تھا تب سے اس کے اپنے اندر کی دنیا میں ایک انوکھی تبدیلی انگڑائی لے کر بیدار ہوا ئی تھی۔

حجاب کا خیال مسلسل اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا' دھڑکنیں جیسے اس کا نام لے لے کر دل کو گدگدائے جا رہی

تھیں......رات جس تکلیف دہ حالت میں مرشد نے اسے دیکھا تھا وہ منظر ایک بھاری دکھ بن کر جیسے اس کے کلیجے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد جب وہ ساون کے ساتھ سیڑھیوں پر آبیٹھا تو صبح تک یہ خیال اسے سرشار کیے رہا کہ کچھ قدموں کی دوری پر اندر ایک کمرے میں......ایک پلنگ پر وہ موجود ہے......وہ......جو اس ماحول' اس دنیا کی نہیں......جو کسی اور زمانے اور جہان سے اس بستی میں اتری ہے...... بالکل انجان اور اجنبی ...... پھر بھی جیسے صدیوں کی آشنائی......ساری رات وہاں بیٹھے ہوئے اسے اندرونی کمرے کی طرف ایک کھینچ سی پڑتی رہی......ایک کشش سی مسلسل اس کی دھڑکنوں کو زیر وزبر کرتی رہی تھی۔ دو دن سے اس کے اندر کی حالت یہی تھی۔

ان رات بھر اس کا وجدان اسے آگاہ کرتا رہا تھا کہ اس کے ساتھ واردات ہو چکی ہے' اس کے آہنی اعصاب پر ایک نازک' کمزور لڑکی کا خیال حاوی ہو چکا تھا۔ پتھر کا کلیجہ اس لڑکی کی تکلیف کے خیال سے موم بن گیا تھا......اس کے فولاد جیسے سینے میں فولاد ہی کا دل تھا مگر......اب اس فولاد کو جونک لگ چکی تھی۔ محبت کی جونک......اندر کی دنیا میں ایک بڑی تبدیلی آ چکی تھی ......ایک ہلچل تھی مگر بظاہر اس کے تاثرات پتھر ہی تھے...... وہ خاموش تھا......شاید وہ شعوری طور پر اس تبدیلی اس پراسرار حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا' یا شاید ابھی وہ اس حوالے سے پر یقین نہیں تھا۔

صبح نو' ساڑھے نو کا وقت رہا ہوگا' مرشد بیٹھک میں چبوترے پر موجود تھا۔ اکو' مراد اور ساون اس کے ساتھ موجود تھے' جبکہ جعفر اور شبیرا نزہت بیگم کے کوٹھے کی گیلری میں گلی میں کچھ مشکوک چہروں کی آمد کو انہی دونوں نے سب سے پہلے محسوس کیا تھا۔

مرشد لوگ ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے تھے اور ان کے درمیان حجاب کے مستقبل اور نندی پور کے چوہدریوں کے حوالے ہی سے بات چیت اور صلاح مشورہ ہو رہا تھا۔ اکو برتن سمیٹ رہا تھا جب بیرونی دروازے سے یکا یک آٹھ دس آدمی یکے بعد دیگرے للکارے مارتے ہوئے اندر گھستے چلے آئے۔ سب سے آگے آگے جاگیردار اکبر علی کے وہی دو بندے تھے جنہوں نے رات مرشد سے مار کھائی تھی۔ مرشد اور اس کے ساتھیوں کی جوابی کارروائی کی توقع تو تھی مگر انہیں یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ یہ کارروائی نزہت بیگم کے کوٹھے کی بجائے براہ راست ان کے اپنے ٹھکانے پر ہو جائے گی۔ آنے والوں نے آناً فاناً چھرے اور خنجر نکال لیے تھے اور سب ایک ساتھ چبوترے کی طرف دوڑے تھے جہاں وہ چاروں بیٹھے تھے اسلحہ نکالنے سنبھالنے کا وقت نہیں تھا۔

چاروں ایک ساتھ اچھل کر کھڑے ہو گئے ......لٹکان نے ان سے زیادہ پھرتی دکھاتے ہوئے لپک کر ایک کی ٹانگ دبوچ لی۔ مرشد نے ایک چھرے بردار کے منہ پر اسٹیل کی پلیٹ ماری تو ساون نے جگ......!

اسی دوران بیرونی دروازے پر مرشد کو اجو گھوڑے کی ایک جھلک دکھائی دی' مگر اس پر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ بہ یک وقت تین چھرا بدست اس پر حملہ آور تھے' ایک لمحے کی غفلت بھی جان لیوا ہو سکتی تھی۔ اس مختصر سے صحن میں اچانک ایک وحشیانہ ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ غلیظ گالیاں تھیں' غضب ناک للکارے تھے' یوں لگتا تھا جیسے ایک ساتھ کئی جنگلی بھینسے آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ اس بھیانک شور شرابے سے ساری فضا لرز اٹھی تھی۔ سامنے والے کوٹھوں کی کھڑکیوں میں کئی سوئی جاگی حیران پریشان شکلیں آ ٹھہریں۔

حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ بھی جیسے غصے سے پاگل ہو چکے تھے۔ شاید اسی لیے ان کے دو تین ساتھی انہی کے ہتھیاروں سے زخمی ہو گئے تھے۔

مرشد کو اپنے ساتھیوں کا تو اندازہ نہیں تھا ہاں اس کے اپنے کندھے اور سینے پر دو چرکے لگ چکے تھے...... پھر بالکل اتفاقاً ہی ایک حملہ آور کا خنجر والا ہاتھ اس کی گرفت میں آ گیا۔ مرشد نے اسے جھٹکا دیتے ہوئے دوسرے کے وار سے بچنے کی کوشش کی تو حملہ آور کا چھرا اس کے اپنے ہی ساتھیوں کے پہلو میں اتر گیا۔ نشانہ بننے والے کی کرب

ناک دھاڑنے ایک لمحے کے لیے دوسروں کو ٹھٹکایا اور اسی لمحے مرشد کی ایڑی کی زوردار ضرب ایک کے کلیجے میں پڑی اور وہ لڑکھڑا کر مراد پر وار کرتے اپنے ہی دو ساتھیوں سے جاٹکرایا۔ اسی دوران ایک ذرا...... بس ایک نظر مراد اسے دکھائی دیا تھا' اس کا چہرہ اور کپڑے خون آلود تھے۔ یقیناً وہ زخمی تھا' مرشد کے رگ و پے میں ایک سنسناہٹ سی ناچ اٹھی۔ تیسرے شخص نے برق رفتاری سے مرشد پر وار کیا تو وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا' تبھی ایک شخص دائیں طرف سے چیختا ہوا اس پر حملہ آور ہوا مگر مرشد نے اس کی خنجر والی کلائی دبوچ لی۔ یہ اجو گھوڑے کا تلنگا تھا۔ دوسرا حملہ آور اکبر علی کا وہی چھریرے بدن والا بندہ تھا جس کی ٹانگوں کے درمیان رات مرشد نے ٹھوکر ماری تھی۔ وہ ایک بار پھر گالیاں بکتا ہوا مرشد پر حملہ آور ہوا مگر مرشد نے اس کا ہاتھ بھی دبوچ لیا۔ ان دونوں نے اپنے آزاد ہاتھ مرشد کے گلے پر ڈالے اور جوش وحشت میں اسے دھکیلتے ہوئے اکھاڑے والی دیوار تک لے گئے۔

اچانک باہر گلی میں گولی چلنے کی آواز بلند ہوئی' اوپر تلے دو فائر ہوئے تھے ایک ذرا وقفے سے دو تین فائر مزید ہوئے اس کے مقابل دونوں افراد کا دھیان اس چھریرے بدن والے کی ٹانگوں کے درمیان گھٹنے سے ضرب لگائی' اس کا ہاتھ فوراً مرشد کے گلے سے ہٹ گیا۔ آنکھیں پھیل کر پیالہ ہوگئیں' مرشد نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اس کے سینے میں ایک لات رسید کی اور وہ بے جان بوری کی طرح اپنے عقب میں ڈھیر ہوگیا' دوسرا حملہ آور دل چھوڑ بیٹھا تھا' مرشد نے دو حملہ آوروں کو بیرونی جانب دوڑتے بھی دیکھا...... مرشد پر وار کرنے والا اب اس کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے کی فکر میں تھا مگر...... وہ مرشد کی گرفت میں تھی۔ مرشد نے اس کی دوسری کلائی بھی دبوچی اور ایک بھرپور ٹکر اس کے منہ پر رسید کردی' ایک ہی ٹکر سے اس کے حواس مختل ہوگئے تھے۔ مرشد نے اس کا بازو مروڑتے ہوئے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ بغیر چیخے ہی نیچے ڈھیر ہوگیا۔

ٹھیک اسی وقت دروازے پر جعفر اور شبیرے کی شکلیں دکھائی دیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں پسٹل دکھائی دے رہے تھے' باہر چلنے والی گولیاں یقیناً انہوں نے ہی چلائی تھیں۔

مرشد نے صحن کا جائزہ لیا' صحن میں چھ حملہ آور ابتر حالتوں میں ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ دو نڈھال حالت میں اکو' ساون اور مراد سے درگت بنوا رہے تھے' خود اکو اور مراد کی حالت بھی خاصی خراب ہوچکی تھی۔ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ وہ دونوں بری طرح گھائل ہیں' اس کے باوجود دونوں لڑ رہے تھے' صحن میں جابجا خون کے چھینٹے اور دھبے پھیلے ہوئے تھے' فضا میں تازہ خون کی کچی اور ثقیل مہک رچ چکی تھی۔ مار کھانے والے بے دم سے ہوکر ڈھے گئے تو مراد بھی گھٹنوں پر آ گرا' دونوں ہاتھ اس نے سامنے فرش پر ٹکائے اور ہانپنے لگا' جبکہ اکو کو ساون سہارا دے کر بٹھا رہا تھا۔

خود مرشد اور ساون کو بھی زخم آئے تھے مگر اکو اور مراد کی نسبت ان کے زخم معمولی نوعیت کے تھے' جعفر اور شبیرا فوراً ساون کی طرف لپکے تو مرشد آگے بڑھ کر بشیرے کے ہاتھ سے پسٹل جھپٹتے ہوئے جلدی سے بولا۔

ان دونوں کو ظفر کے کلینک پر لے جاؤ۔ خود وہ بیرونی جانب بڑھ گیا' اسے اندیشہ تھا کہ کہیں ان لمحات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی حجاب کو نقصان نہ پہنچا جائے۔

"تین بندے نکل بھاگے ہیں' ان میں اجو گھوڑا بھی تھا' اس کے ہاتھ پر گولی بھی لگی ہے۔"

شبیرے نے فوراً مرشد کو آگاہ کرنا چاہا مگر وہ اتنے میں گلی میں جا پہنچا تھا۔ مرشد نے دیکھا ادھر ادھر کے بالا خانوں کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ گلی میں بھی کچھ سنسنی زدہ صورتیں موجود تھیں' ایک طرف سے بگا اور الیاسا چھوٹی تیزی سے اسی طرف آرہے تھے۔

"باواجی! سب ٹھیک تو ہے نا؟"

بگے کے لہجے میں تشویش اور فکرمندی تھی۔

"اندر جا کر ساون کی مدد کرو۔"

مرشد نے جلدی سے کہا اور خود نزہت بیگم کے کوٹھے کی طرف بڑھ گیا۔ کندھے اور سینے کے زخم سے بہنے والا خون اس کی سفید قمیص کو سامنے سے سرخ بنا چکا تھا۔ پاؤں ننگے تھے اور ہاتھ میں پسٹل' ڈھیروں سراسیمہ اور سنسنی خیز نگاہوں نے اسے اس حالت میں نزہت بیگم کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ لمحوں میں' اس معرکہ کی خبر پورے محلے میں پھیل گئی اور چاروں طرف چہ میگوئیاں بھی شروع ہوگئیں۔

مرشد اماں کے کمرے میں پہنچا تو اماں پہلے ہی پریشان بیٹھی تھی۔ مرشد کی خون آلود قمیص دیکھ کر وہ بے چین ہو اٹھی' لیکن اگلے ہی پل وہ ٹھٹک گئی۔ چہرے کی پریشانی پر فوراً ہی ایک سکوت اتر آیا۔ اس سب کا تو اسے پہلے ہی اندازہ تھا اور ابھی تو یہ بس شروعات تھی۔ اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

مرشد نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا' حجاب پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی' اس کی آنکھیں کھلی تھیں' وہ جاگ رہی تھی' البتہ اس کا روشن چہرہ اس وقت بجھا ہوا تھا۔ صورت پر ایک مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اماں کی متفسرانہ صورت دیکھ کر مرشد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''فکر نہیں کرنی اماں! یہ وقت بھی ہمارا ہے۔''

''ابھی شروعات ہے۔'' حسن آرا خود کلامی کے انداز میں بولی تھی۔

''مرشد انجام تک کھڑا ہوگا' آپ یہاں اپنی مہمان کا خیال رکھیں' باہر کی فلم میں دیکھ لوں گا۔'' اس نے لاپروائی سے کہا پھر ایک نظر حجاب پر ڈالی اور مسکراتے چہرے کے ساتھ پلٹ کر باہر نکل آیا۔ پسٹل اس نے ڈب میں لگایا اور قمیص کے بٹن کھولتا ہوا صدر دالان میں آ گیا۔ تخت پوش پر بیٹھ کر اس نے دونوں زخموں کا معائنہ کیا۔ کندھے کا زخم معمولی نوعیت کا تھا' البتہ سینے کے بائیں حصے پر لگا ڈھائی انچ کا چرکا ذرا گہرا تھا۔ اور اس سے بدستور خون رس رہا تھا۔ اسے ٹانکوں کی ضرورت تھی۔ اس وقت وہ خود ہاسپٹل یا ظفر کے کلینک نہیں جاسکتا تھا' بیٹھک پر فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا' کیونکہ انہیں اس کی ضرورت پڑتی ہی رہتی تھی۔

اسے وہاں بیٹھے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ بیرونی جانب کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی' کچھ آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بیرونی جانب بڑھ گیا۔ دروازے کے قریب تھا کہ دروازے سے خالہ اقبال کوثر اور شبو اندر داخل ہوئے۔ ان کے عقب میں محلے کی اور دو تین عورتیں بھی تھیں۔

''ہائے اللہ اتنا خون۔''

''کیا ہوا مرشد باؤ! کیا چیز لگی ہے؟''

''یہ زنور کے بچے تھے کون؟''

''ڈگر ابتا رہا تھا کہ اجو گھوڑا اور اس کے گرگے تھے۔''

مرشد پر نظر پڑتے ہی جیسے وہ سبھی ایک ساتھ بول پڑے۔

''لگ گیا جو لگنا تھا' جاؤ اندر۔''

مرشد نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اندرونی جانب اشارہ کیا۔

''لیکن میں تو تجھے ملنے آئی ہوں۔''

خالہ اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ ج بکہ اس کے پیچھے آنے والی عورتیں مرشد کی خون آلود قمیص کو تاکتی ہوئی ان کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئیں۔

''اچھی بات ہے' ملاقات ہونی بھی چاہیے تھی۔'' مرشد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اسے اچانک خیال آیا تھا کہ ہو نہ ہو کالہ اقبال سے حجاب کے متعلق تو کچھ نہ کچھ معلوم ہو ہی جائے گا' مگر فی الحال یہ وقت مناسب نہیں تھا۔

''ملتے ہیں کچھ دیر بعد...... گھنٹے آدھے گھنٹے بعد بیٹھک ہی پر آجا۔''

مرشد نے سنجیدگی سے کہا اور خالہ اقبال کی آوازوں کو نظر انداز کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ گلی میں کئی لوگ نکل آئے تھے کچھ یہیں موجود تھے اور کچھ وہ ...... سامنے بیٹھک کے دروازے کے قریب کھڑے تھے۔

مرشد کے گلی میں آتے ہی محلے کے کئی لوگ اس کی طرف لپک آئے' حال احوال...... خیر خیریت اور خدمات کی پیش کش......!

سبھی کچھ نہ کچھ کہہ بول رہے تھے۔ گلی میں موجود رونق دیکھ کر مرشد کو کافی حد تک تسلی ہو گئی کہ اب کم از کم دوبارہ کوئی فوری یا اچانک کارروائی نہیں کر پائے گا۔ پھر بھی اس نے گلی کی چار چھ جوانوں کی وہیں ڈیوٹی لگا دی اور انہیں سمجھا دیا کہ کسی بھی اجنبی کو یہاں رکنے' ٹھہرنے نہ دیا جائے...... اس کے بعد وہ بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔ فیروزہ اور گل ناز کو اس نے دور ہی سے افتاں و خیزاں بیٹھک میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا' البتہ ان کی مرشد پر نظر نہیں پڑی تھی۔

بیٹھک کے دروازے پر موجود لوگ مرشد پر نظر پڑتے ہی ادھر ادھر ہٹ گئے۔ وہ اندر داخل ہوا...... اندر بھی کچھ لوگ موجود تھے...... سب یہیں کے تھے' شبیرا اور الیاسے کے علاوہ' فیاض ڈوگر' جمشید' قادرا اور ہاشو بھی موجود تھے۔ شبیرا اور جعفر یقیناً اکو اور مراد کو کلینک لے جا چکے تھے۔ مرشد ان دونوں کے لیے فکر مند تو تھا لیکن ابھی فوری طور پر وہ ان کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ فی الحال اس کا یہاں موجود رہنا زیادہ ضروری تھا۔

آٹھوں حملہ آور صحن کے وسط میں موجود تھے۔ سات کو ایک ہی رسی میں اچھی طرح جکڑ دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک پوری طرح بے ہوش تھا۔ چار نیم بے ہوش سے تھے جبکہ دو زخمی ہونے کے باوجود بہتر حالت مین تھے اور ان میں ایک جاگیردار کا وہ چھریرے بدن والا کارندہ بھی تھا' آٹھواں حملہ آور ان کے قریب ہی بے سدھ اور ساکت پڑا تھا۔ خون اور مٹی کے کیچڑ میں لت پت یہ وہی شخص تھا جس کے پہلو میں فٹ بھر لمبا چھرا گھسا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ زندہ نہیں' مردہ وجود ہے۔ ڈوگر' اور قادرا دونوں ہوش مندوں کو جوتوں سے پیٹ رہے تھے۔ سامنے چبوترے پر ساون قمیص اتارے بیٹھا تھا' جمشید اور بگا اس کے زخموں کے ساتھ مصروف تھے۔ چبوترے کے عقب میں کھڑا الیاسا 'فیروزہ اور گل ناز کو غالباً خبر نامہ سنا رہا تھا۔

مرشد پر نظر پڑتے ہی فیروزہ کی پر تشویش آنکھوں میں ایک چمک سی عود کر آئی۔ گلی کے کچھ اور افراد بھی وہاں موجود تھے۔ جن کے سنسنائے ہوئے چہرے مرشد کے صحن میں

داخل ہوتے ہی کچھ مزید سنسنی خیز تاثرات کی آماجگاہ بن گئے۔ انہی میں ایک طرف ہاشو خان بھی کھڑا تھا۔

"چلو بھئی! تماشا ختم ہو چکا' رش کم کرو..... شاباش' نکلو۔"

مرشد نے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے چٹکی بجائی تو سبھی فوراً حرکت میں آئے اور جلدی جلدی باہر نکل گئے۔ وہ خود چبوترے کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ دائیں ہاتھ اکھاڑے کے ساتھ ایک منظر پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سفید چادر تھی اور اس چادر کے نیچے جس وجود کی جھلک محسوس ہو رہی تھی وہ کتکان کا تھا۔ اس کے پالتو کتے کا..... جس نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر دشمنوں پر حملہ کیا تھا۔ اس کے سر کی جگہ سے چادر سرخ ہو رہی تھی۔ مرشد کے دل پر پہلی دفعہ ایک گھونسہ سا پڑا' وہ اسی طرف بڑھ گیا' پھر پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے چادر ایک طرف ہٹائی' کتکان کے ادھ کھلے منہ سے زبان لٹک کر زمین پر پڑی تھی۔ ہر وقت چمکتے رہنے والی آنکھیں دھندلا چکی تھیں اس کے سر اور گردن پر موجود گہرے گھاؤ بتا رہے تھے کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی ہے۔ مرشد نے بے اختیار اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور اسے سہلاتے ہوئے اس کے ہونے کو محسوس کرنے لگا۔ تین سال پہلے وہ ایک چھوٹا سا بچہ تھا جو مرشد کی پرورش میں پلا بڑھا تھا۔ جوان ہوا تھا' مرشد سے بے انتہا انسیت اور لگاؤ تھا اسے' اور آج وہ اپنے پالن ہار کے دشمنوں سے لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ قتل ہو گیا تھا' اس نے اپنے ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔

مرشد اور نندی پور کے چوہدریوں کے درمیان پڑنے والی دشمنی میں یہ مرشد کا پہلا نقصان تھا..... پہلا قتل تھا یہ۔

"یہ ہم چاروں سے زیادہ بے باکی سے لڑا آج۔"

ساون اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔ اسے چار پانچ معمولی زخم آئے تھے' جن کی جمشید اور بگے نے مرہم پٹی کر دی تھی۔

"باواجی! مجھے گھوڑے کے سارے ٹھکانوں کی خبر ہے' راتوں رات اٹھا لیتے ہیں حرامی کو۔" یہ قادر تھا۔

"سب سے پہلے کتکان کو دفناؤ۔" مرشد کتکان کی پیٹھ تھپکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہیں اکھاڑے کے قریب ذرا' دیوار کے ساتھ گڑھا کھودو۔"

قادر فوراً اکھاڑے کے ایک گوشے میں رکھی کسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مرشد نے ایک بھرپور نظر سے ساون کا جائزہ لیا' پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے چبوترے کی طرف بڑھ گیا۔ فیروزہ اور گل ناز ابھی تک وہیں چبوترے کے عقب میں کھڑی تھیں' چوٹی بھی وہیں موجود تھا۔ فیروزہ کی فیروزاں آنکھیں جیسے مرشد کے وجود کو پور پور جانچ رہی تھیں..... محسوس کر رہی تھیں۔

"اکو اور مراد مجھے کچھ زیادہ ہی ڈھیلے نظر آئے تھے۔"

مرشد نے ایک تیکھی سی نظر فیروزہ پر ڈالی تھی۔

"ہاں' دونوں کو لگی ہیں..... دو دو تین تین ہفتے تو اب مزے سے گزاریں گے دونوں۔"

"واپس تو آ جائیں گے نا؟"

"ہمارے جیسی ہی ڈھیٹ ہڈیاں ہیں۔ لمبے عرصے تک رگڑے کھائیں گی۔"

ساون کی بے فکری سے اندازہ ہوتا تھا کہ بے شک وہ دونوں اچھے خاصے زخمی ہوئے ہیں مگر کوئی سنگین گھاؤ نہیں لگا انہیں۔ مرشد حملہ آوروں کے سامنے چبوترے پر آ بیٹھا۔

"باواجی! قمیص اتار دیں میں زخم دیکھتا ہوں آپ کے۔"

بگے نے مرشد کو مخاطب کیا مگر..... اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں اپنے سامنے بندھے ہوئے بندوں پر تھیں۔ سب سے آگے وہ چھریرے بدن اور لمبوترے چہرے والا بندہ تھا اور اس کے برابر سیاہ صورت شخص گھوڑے کے گروپ سے تھا۔ چھریرے بدن والے کی دائیں کنپٹی اور گال پر خون جما ہوا تھا جبکہ سیاہ صورت کے ناک اور منہ سے بہنے والے خون نے اس کی قمیص پر لہو کے گہرے دھبے بنا رکھے تھے اس کے پھٹے ہوئے ہونٹوں پر ورم چڑھ آیا تھا اور اس کے سامنے کے دو دانت غائب تھے۔

"دو بندے نئے ہیں' باقی تو گھوڑے کے انڈے

ہیں۔'' ڈوگر بھی پیچھے ہٹتے ہوئے چبوترے کے قریب پہنچ گیا۔

''اس بوچڑ کا کہنا ہے کہ ان زخموں کا مقصد مرشد کو پار کرنا تھا یہ...... کریلے کی شکل والا دیکھتے ہی برسٹ مارنے کی بات کر رہا تھا مگر اس حرامی گھوڑے کی ضد تھی کہ مرشد کو چھروں سے کاٹا جائے ...... کتے کہیں کے۔'' ڈوگرے نے گالیاں بکتے ہوئے حقارت سے کہا۔

''مرشد استاد! قمیص اتارو۔''

''ہاں باوا جی۔ آپ کو بھی لگتا ہے خاصی چوٹ آئی ہے۔''

''ہاں نا مرشد! مرہم پٹی کرالو...... پھر آگے کی تیاری کرتے ہیں۔ تمہارے ان کاؤنٹر کے آرڈر تو نکل ہی چکے ہیں۔''

ساون نے مرشد کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے گردن موڑ کر فیروزہ کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کو تک رہی تھی۔ اسی جگہ چپ چاپ کھڑی، پرشوق نظروں میں کچھ پریشانی اور کچھ فکرمندی لیے...... مرشد کی نظریں اس کی نظروں سے ٹکرائیں تو بھی وہ چپ چاپ کھڑی اس کی آنکھوں کے تاثر کو پڑھتی رہی۔ شاید وہ اپنے طور پر کسی شکوے، کسی شکایت کا اظہار کر رہی تھی۔ کوئی گلہ کر رہی تھی اس سے، گلے تو تھے بھی بہت...... کبھی کبھار موقع ملنے پر وہ اظہار بھی کر دیتی تھی۔ اشارے کنایئے میں کہہ بھی دیا کرتی تھی لیکن...... مرشد نے کبھی سننے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ حالانکہ اچھی اور خوب شکل وصورت تھی بھرپور اور پرکشش وجود تھا پھر بھی...... مرشد نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی تھی، اب بھی فیروزہ کو مسلسل اپنی آنکھوں میں جھانکتے پا کر مرشد کی پیشانی پر بل پڑ گئے، فیرزہ نے بھی جیسے اس کے اندر جھانک کر اس کے غصے اور ناگواری کو دیکھ لیا۔

''ٹھیک ہے جا رہی ہوں۔''

فیروزہ نے اچانک کہا اور پھر وہاں رکی نہیں۔

''اے ہے فیروزہ......'' گل ناز بھی فوراً اس کے پیچھے لپکی تھی، ایک ذرا ٹھٹکتے ہوئے اس نے مرشد سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر گڑبڑا کر جلدی سے فیروزہ کے پیچھے ہی بیرونی دروازے سے باہر نکل گئی۔



اگلے چند گھنٹے انتہائی معروف گزرے تھے...... مرشد کے سینے والے زخم پر تین ٹانکے آئے۔ کنکان کا بے جان وجود اس نے اپنے ہاتھوں سے گڑھے میں اتارا، پورے محلے میں اس جھگڑے کی خبر پھیل چکی تھی۔ بیٹھک کے صحن میں ایک لاش بھی پڑی تھی۔

پولیس کی آمد یقینی تھی۔ پولیس آئی بھی مگر چار چھ کانسٹیبل، اور ایک سب انسپکٹر اور لیس منج۔

مرشد کو ان کے ساتھ تھانے بھی جانا پڑا تھا لیکن اس کی تھانے میں یہ حاضری بس رسمی سی ہی تھی۔ لالا رستم راولپنڈی گیا ہوا تھا، البتہ لالا دلاور اور نصیر چند مزید با اثر افراد کے ساتھ تھانے ہی پہنچ گئے تھے۔

پولیس والوں کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس معاملے سے نندی پور کے چوہدریوں اور حجاب کو الگ رکھنا چاہتے ہیں، انہوں نے اس جھگڑے کو اجو گھوڑے اور مرشد کی پرانی دشمنی کا شاخسانہ قرار دیا تھا۔ صاف طور پر نظر آ رہا تھا کہ وہ خود اس معاملے کو دبانا چاہتے ہیں۔ شاید ایسا جاگیردار اکبر علی کی ایما پر ہو رہا تھا۔ مرشد نے بھی کوئی تعرض نہیں برتا۔

مرنے والے کا قتل اس کے اپنے ہی ساتھیوں کے ذمے ڈالا گیا تھا۔ مرشد کے کسی ساتھی کے بیان کی ضرورت محسوس کی گئی نہ گرفتاری کی۔ البتہ رسمی طور پر مرشد کو پابند کیا گیا کہ بوقت ضرورت وہ خود اور اپنے ساتھیوں کو تھانے حاضر کرنے کا پابند رہے گا۔

واپسی پر مرشد ظفر کے کلینک جا پہنچا جو ایک درمیانے سائز کی دکان میں قائم کیا گیا تھا۔ اکو اور مراد غالباً کسی نیند آور دوا کے زیر اثر بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ دونوں کی رنگت میں زردی کی جھلک نمایاں تھی۔ بچپن سے آج تک انہوں نے بہت سی لڑائیاں ایک ساتھ لڑی تھیں۔ زخم دیئے تھے، زخم کھائے تھے مگر جس بری طرح وہ دونوں آج زخمی ہوئے تھے، اتنے شدید زخم ان میں سے کسی کو بھی کبھی نہیں

آئے تھے۔
شبیر ان دونوں کے پاس موجود تھا' البتہ جعفر بیٹھک پر جاچکا تھا۔ مرشد کچھ دیر شبیرے کے پاس رکا' پھر وہ بھی بیٹھک پر آ گیا' ادھر ادھر بکھرے برتن سمیٹے جاچکے تھے' بگا' جعفر اور قادر اخون کے دھبے صاف کر رہے تھے' مرشد واپس پہنچا ہی تھا کہ اچھو آ دھمکا۔
"مرشد بھائی آپ کو خالہ بلا رہی ہے۔"
"یہ پہلے بھی آیا تھا اور...... خالہ اقبال بھی تمہارا انتظار کر کے گیا ہے۔"
ساون نے اسے مطلع کیا۔ ڈوگر اور جمشید کے علاوہ لالا رستم کے بھی کچھ بندے وہاں موجود تھے۔ مرشد نے ان سب کے ذمے کچھ ڈیوٹیاں لگائیں اور اچھو کے ساتھ نزہت بیگم کے کوٹھے پر آ گیا۔ دوپہر اب ڈھل رہی تھی' مگر یہاں ہنوز وہی خاموشی' وہی سناٹا تھا' سب کے سب جیسے ابھی تک غٹ پڑے سو رہے تھے' اماں کے دروازے پر مرشد ایک ذرا ٹھٹکا...... اندر حجاب بھی تو موجود تھی' اس نے ایک نظر اپنی نئی دھلی سفید قمیص پر ڈالی اور اندر داخل ہو گیا' اندر اماں اور حجاب کے علاوہ شازیہ بھی موجود تھی' شازیہ اور اماں فرش پر بچھے بستر پر بیٹھی تھیں جبکہ حجاب پلنگ پر تکیوں کے سہارے' اس کے ہاتھوں میں تام چینی کا بھاپ اڑاتا پیالہ پکڑا ہوا تھا۔ وہ کافی بہتر دکھائی دے رہی تھی۔ بس ستے ہوئے چہرے پر نقاہت آمیز زردی اور گہرے رنج کے تاثرات جمے ہوئے تھے۔
"کیسی طبیعت ہے اب؟"
مرشد کو خود معلوم نہیں تھا کہ اس نے سوال کس سے کیا ہے۔
حجاب کی گردن کو ایک ذرا سی جنبش ہوئی مگر اس نے مرشد کی طرف دیکھا نہیں' اسے خیال آیا کہ رات نیم غشی کی سی کیفیت میں یہی شخص اسے بازوؤں میں اٹھائے عقبی کمرے سے اس کمرے تک لایا تھا۔
"بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔" شازیہ فوراً چہکی تھی۔
کل سے پھر بھلی چنگی ہوگی' میرے ہاتھ کی یخنی پیتی

مہکتی کلیاں

▬ جس طرح شبنم کے قطرے مرجھائے ہوئے پھول کو تازگی دیتے ہیں اسی طرح اچھے الفاظ مایوس دلوں کو روشنی دیتے ہیں۔

▬

▬ جذباتی لوگ نہ تو خود خوش رہ سکتے اور نہ ہی دوسروں کو خوش رکھ سکتے ہیں۔

▬ اپنی زندگی کا اصول بنا لیجیے کہ کسی سے بُرا کرنے میں کبھی پہل نہ کریں یقین مانیے آپ ہمیشہ سرخرو رہیں گے۔

▬ پہلی ملاقات میں کسی شخص کے متعلق رائے قائم مت کریں' کیا معلوم اس وقت اس کا آپ کے ساتھ اچھا بُرا پیش آنا وقت اور حالات کا تقاضا ہو۔

▬ اپنی رائے ضرور دیں مگر رائے کو دوسروں پر مسلط کرنے سے گریز کریں۔

نادیہ عباس دیا...... موسیٰ خیل

میں اور وہ

☆ میں چار سال کا تھا وہ جب وہ پیدا ہوئی
☆ میں نے اسکول میں داخلہ لیا تو وہ دو سال کی تھی
☆ میں پرائمری میں تھا وہ پریپ میں تھی
☆ میں مڈل میں تھا وہ پرائمری میں تھی
☆ میں میٹرک میں تھا وہ میٹرک میں تھی
☆ میں میٹرک میں تھا وہ FSC میں تھی
☆ میں میٹرک میں ہی تھا وہ BSC میں تھی
☆ میں میٹرک میں ہی تھا وہ MSC میں تھی
☆ میں میٹرک میں ہی تھا وہ PHD کر رہی تھی
☆ میں میٹرک میں ہی تھا وہ ڈاکٹر بن گئی
☆ کل اس کی شادی ہے اور میرا میٹرک کا پیپر ہے
قارئین! میرے حق میں دعا کیجیے گا۔

فوزیہ سلطانہ...... تونسہ شریف

رہے گی تو دو چار دن میں ہی چہرے کی رونق بھی واپس آجائے گی دیکھ لینا۔‘‘

’’مرشد ادھر ہی آجاؤ...... شازیہ بٹیا! تم چائے کا کچھ کرو۔‘‘

حسن آرا نے پہلے مرشد پھر شازیہ کو مخاطب کیا۔

’’ابھی لے آتی ہوں۔‘‘

شازیہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی' اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مرشد کے وجود کا جائزہ لیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

’’آپ نے دوا لی؟‘‘ مرشد وہیں کھڑا تھا۔

’’ہاں لی ہے' تم بیٹھو تو...... مجھے کچھ بات کرنی ہے۔‘‘

’’کریں بات۔‘‘ مرشد دائیں ہاتھ اسٹول پر ٹک گیا۔

حسن آرا نے ایک نظر حجاب پر ڈالی' جس کے سر اور چہرے کے گرد سفید پٹی لپٹی تھی۔ وہ ہاتھوں میں موجود پیالے سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔ مرشد نے شعوری طور پر اس کی طرف دیکھنے سے احتراز برتا۔

حسن آرا چند لمحے متذبذب سی بے چینی کا شکار رہی پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

’’یہ جاگیردار لوگ چین سے نہیں بیٹھیں گے...... کسی صورت ہار بھی نہیں مانیں گے' کئی حوالوں سے وہ طاقت میں بھی تم سے زیادہ ہیں تم...... تم کب تک ان کا مقابلہ کرو گے مرشد!‘‘

’’جب تک میں زندہ ہوں' آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔‘‘ مرشد نے بے پروائی سے کہا۔

’’اور تمہارے بعد......‘‘

مرشد اماں کے اس سوال پر دنگ رہ گیا۔ اسے پہلی بار اماں کے لہجے میں بے رحمی محسوس ہوئی تھی وہ بھی اس کے اپنے لیے ...... اسے فوری طور پر کوئی بھی جواب نہیں سوجھا...... وہ بس اماں کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

’’یہ ختم ہونے والی دشمنی نہیں ہے مرشد بیٹا! جاگیردار ان کے بارے میں انتہائی مکروہ عزائم رکھتا ہے' اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے وہ لوگ ہر حد سے گزریں گے' ہوسکتا ہے...... ہوسکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں سب کچھ ختم ہوجائے' مگر اس سے پہلے میں چاہتی ہوں انہیں محفوظ ہاتھوں تک پہنچادیا جائے۔‘‘

اماں نے ایک بار پھر حجاب کی طرف اشارہ کیا۔ مرشد کو الجھن ہونے لگی۔

حجاب تو خود اس سے بھی چند سال چھوٹی ہی رہی ہوگی اور اماں...... اماں کیسے عزت واحترام سے اس کا ذکر کررہی تھیں۔

مرشد نے حجاب کی طرف دیکھا' وہ سپاٹ چہرہ لیے ہاتھوں میں پکڑے پیالے میں جھانک رہی تھی۔ اماں بول رہی تھیں۔

’’یہاں لمبے عرصے تک ان کی حفاظت کرنا مشکل ہوجائے گا' بلوچستان میں ان کے عزیز رہتے ہیں' اگر انہیں جلد از جلد ان تک پہنچادیا جائے تو وہ یقیناً بہتر طریقے سے ان کی حفاظت کا بندوبست کرلیں گے' وہ کسی صورت بھی جاگیرداروں سے کمزور نہیں ہیں۔‘‘

مرشد خاموش رہا۔

’’تم سن رہے ہونا؟‘‘

’’ہاں جی۔‘‘

’’تو پھر تیاری کرو...... جتنی جلدی ہوسکے انہیں لے کر روانہ ہوجاؤ۔‘‘

’’ٹھیک ہے آپ بھی تیاری کریں پھر۔‘‘

’’میں...... کیسی تیاری کروں؟‘‘

’’آپ کو بھی تو ساتھ چلنا پڑے گا۔‘‘

’’مجھے...... مجھے کیوں چلنا پڑے گا؟ بس انہیں وہاں تک پہنچانا ہے' تم انہیں وہاں چھوڑ کر لوٹ آنا۔‘‘

’’یعنی میں آپ کو یہاں اکیلا چھوڑ کر چلا جاؤں' نہیں...... یہ نہیں ہوسکتا۔‘‘

مرشد کا انداز حتمی تھا۔ حسن آرا کو جاگیردار کے خیال سے مسلسل ایک دھڑکا لگا ہوا تھا تو مرشد بھی ذہنی طور پر اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اور وہ جاگیردار سے کسی بھی کمینگی کی توقع رکھتا تھا۔

حجاب اپنی جگہ خاموش بیٹھی تھی' وہ ان کی باتیں سن بھی

رہی تھی او رنہیں بھی۔ اس کے اندر کل شام سے سناٹے بھرے ہوئے تھے۔ جذبات واحساسات پر ایسا جمود طاری تھا کہ وہ اندر سے خود کو ایک زندہ لاش کی طرح محسوس کرر ہاتھا' اندر کوئی ڈر خوف تھا نہ کوئی پریشانی۔ سب کچھ تو ختم ہو چکا تھا...... مٹ چکا تھا' اب نہ تو کوئی آس امید باقی بچی تھی نہ کوئی خواہش یا آرزو...... بس یہ تھا کہ وہ ان لوگوں کے لیے نہ تو کسی مشکل ومصیبت کا باعث بننا چاہتی تھی اور نہ ان پر بوجھ بن کر یہاں پڑے رہنا چاہتی تھی۔ مرشد کے آنے سے پہلے اس کے اور حسن آرا کے درمیان اس حوالے سے بات چیت ہو چکی تھی اور طے یہی پایا تھا کہ وہ لوگ اسے بلوچستان اس کی پھوپھو کے گھر تک پہنچا دیں بس۔

''یہ ہوسکتا ہے اور ایسا ہی کرنا ہے' میں تمہیں ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا نہیں کہہ رہی...... بس جا کر ایک دو روز میں ہی واپس آ جاؤ۔'' حسن آرا اس سے مخاطب تھی۔

مرشد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں آپ کو یہاں اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جانے والا۔''

''میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے وعدہ پورا ہو جائیگا' میں انتظام کروا دیتا ہوں۔''

''تم خود وہاں تک جاؤ گے' انہیں باحفاظت ان کی منزل تک پہنچانے کی ذمہ داری لے کر۔''

حسن آرا کا انداز دوٹوک ہو گیا۔ مرشد چند لمحے اماں کی سنجیدہ صورت دیکھتا رہا' پھر بغیر کچھ کہے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ حجاب کی آواز نے اسے ٹھٹکا دیا۔

''مرشد جی! آپ ٹکٹ کٹوا کر مجھے گاڑی میں بٹھا دیں میں خود ہی پہنچ جاؤں گی۔''

''مرشد جی...... مرشد جی......''

مرشد نے بے اختیار پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور پیالے کی طرف متوجہ تھی۔ چہرے ہی کی طرح اس کا لہجہ بھی سپاٹ تھا۔ جذبات سے عاری' مگر اس کے ہونٹوں سے اپنا نام سن کر مرشد کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اپنا نام آج پہلی بار سنا ہو...... مرشد جی...... اس طرح تو کبھی کسی نے بھی نہیں پکارا تھا اس کا نام۔ مرشد جی...... مرشد جی...... الفاظ ایک میٹھے ترنم کی طرح اس کی روح میں جا گھلے تھے...... دل کے ساتھ ساتھ تمام رگ وپے میں ایک گدگداہٹ سی انگڑائی لے کر بیدار ہو آئی۔ مرشد نے ایک نظر اماں کے چہرے پر ڈالی...... وہاں خفگی تھی' تھوڑا تاسف بھی' مرشد نے رخ بدلا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اماں کی بات اپنی جگہ درست تھی مگر اچانک ہی مرشد کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ حجاب کو بلوچستان پہنچا دیا جائے...... سیکڑوں میل دور...... اور...... اور ظاہر ہے یوں ہمیشہ کے لیے وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے گی پھر کبھی وہ صورت دکھائی نہیں دے گی...... وہ آواز بھی کبھی سنائی نہیں دے گی...... مرشد جی...... یکایک سینے پر ایک بوجھ سا آ گیا۔

''کیوں......؟''

''کیوں اتنی اپنائیت' اتنی انسیت محسوس ہونے لگی ہے؟''

''کیوں دل اس لڑکی کی طرف کھنچا جاتا ہے؟''

''کیا ہے یہ...... کیوں ہے......''

''کون ہے یہ لڑکی...... کس جہان سے آئی ہے اور...... اور اماں کیوں اس کے لیے اس قدر جذباتی ہو رہی ہیں...... کیوں اس قدر عزت دے رہی ہیں؟'' اور مجھے اس کے متعلق تفصیل کیوں نہیں بتا رہیں؟

وہ خود سے سوال کر رہا تھا' اسے توقع تھی کہ اماں حجاب کے بارے میں کچھ بتائے گی' لیکن جب اماں نے اس حوالے سے کچھ بھی نہیں کہا تو مرشد نے بھی یہی سوچا تھا کہ اماں خود سے بتائے تو بتائے وہ خود کوئی سوال نہیں کرے گا البتہ اب...... اب اسے حجاب کے متعلق کرید محسوس ہونے لگی تھی۔ اماں کے ساتھ ہونے والی اس گفتگو سے واضح ہو چکا تھا کہ حجاب اب زیادہ سے زیادہ یہاں صرف ایک آدھ دن کی مہمان ہے۔ اماں فیصلہ کر چکی تھی اور مرشد کو چاہنے نہ چاہنے کے باوجود وہ فیصلہ نبھانا ہی تھا۔ یہ اس پر لازم ہو آتا تھا۔

حجاب کو یہاں سے سیکڑوں میل دور چلے جانا تھا اور یہ خیال ہی مرشد کو سوہان روح لگنے لگا تھا۔

گلی میں چاچے گوگے کی دکان کے ساتھ تھڑے پر جعفر اور دلشاد بیٹھے ڈیوٹی دے رہے تھے۔ مرشد نے جعفر کو خالہ اقبال کی طرف روانہ کیا کہ اسے لے آؤ اور خود بیٹھک پرآ گیا۔

دل میں اک بے چینی اک بے سکونی آ ٹھہری تھی' کچھ حجاب کی وجہ سے اور کچھ اماں کے اس مودب رویے کی وجہ سے جو اماں نے حجاب کے حوالے سے اپنا رکھا تھا' مرشد نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ حجاب کے لیے اماں کے صرف لفظوں میں ہی نہیں' لہجے میں بھی عزت تھی...... ادب تھا' حالانکہ وہ اماں کے مقابل ابھی کل کی چھوکری تھی۔ اسی سبب اس کے ذہن میں ایک الجھن پیدا ہوگئی تھی اور اب وہ حجاب کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔ ساری تفصیل اس کی مکمل کہانی۔

ساون' جمشید' ڈوگر اور قادرا چبوترے پر موجود تھے۔ رستم لالا کے دو بندے قاسم اور اکمل چھت پر تھے۔ ارشاد اور دلبر گلی کی نکڑ پر دینو چائے والے کی بنچوں پر براجمان تھے۔ جبکہ جعفر اور دلشاد چاچا گوگے کی دکان کے ساتھ بیٹھے ڈیوٹی نبھا رہے تھے' سبھی اپنی اپنی جگہ مسلح تھے۔

مرشد واپس پہنچا ہی تھا کہ کچھ ہی دیر میں جعفر بھی آ گیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔

خالہ اقبال اپنے مکان پر موجود نہیں تھا البتہ جعفر اس کے نام مرشد کا پیغام چھوڑ آیا تھا۔ وہ لوگ چبوترے پر بیٹھے موجودہ صورت حال پر تبادلہ خیال اور آئندہ کے لیے منصوبہ بندیاں کرتے رہے' اس دوران کچھ شناسا لوگ مرشد سے ملنے ملانے بھی آئے۔ عصر کی نماز کے بعد مرشد نے قادرے کے ذمے لگایا کہ وہ لورالائی اور کوئٹہ جانے والی گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل معلوم کرے اور خود ساون کو ساتھ لے کر ڈاکٹر ظفر کے کلینک کی طرف نکل کھڑا ہوا...... رستے میں ساون نے اس سے پوچھا کہ یہ لورالائی اور کوئٹہ کا کیا معاملہ ہے تو مرشد نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔

''بس یونہی...... ہوسکتا ہے گھومنے پھرنے نکل چلیں۔''

ساون سمجھ گیا تھا کہ اسے بس ٹالا گیا ہے۔

اکو اور مراد دونوں جاگ رہے تھے' شبیرا ان کے پاس موجود تھا' کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر ساری صورت حال پر بات چیت اور گپ شپ کرنے کے بعد مرشد ساون کے ساتھ واپس اٹھ آیا۔ دل کی بے قراری ہنوز برقرار تھی۔ حجاب کے علاوہ دھیان توجہ اور کسی طرف آنے کو تیار ہی نہیں تھے۔

ایک دن یا دو دن...... اس کے بعد اسے یہاں نہیں رہنا تھا۔ وہ یہاں بس آج کل ہی کی مہمان تھی اور...... اور یہ بات ٹھیک نہیں تھی۔

زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کی صورت آنکھوں کو اچھی لگی تھی...... کسی چہرے کے خدوخال اس کے ذہن کی گہرائیوں تک اترے تھے' اسے دیکھنے کے بعد پہلی بار دھڑکنوں میں ایک انوکھا آہنگ پیدا ہوا تھا' رگ وپے میں گدگداہٹوں کے سحر خیز ذائقے گھلے تھے اور اب...... اب اسے بلوچستان کے دور دراز علاقے میں چھوڑ آنے کا مطلب تھا کہ کچھ ہی دنوں میں روح پر طاری اس طلسمی کیفیت سے محروم ہوجانا...... جس کے ہونے سے یہ انوکھی اور بے مثال کیفیت اس کے دل وجاں سے پھوٹی تھی۔ اس کے نہ ہونے کے بعد اس کے معدوم ہوجانے کا بھی اندیشہ تھا اور یہ مرشد کو ایک بڑا اخسارہ محسوس ہورہا تھا۔

ازل کا لاپرواہ بے باک اور سرکش مزاج مرشد کشمکش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ آج دوسرا تیسرا روز تھا...... اس کے اندر کی دنیا تہہ وبالا تھی۔ اس دوران وہ تعجب کا شکار ہوا تھا' کیف وسرور کی نئی حالتوں سے رُوشناس ہوا تھا۔ کچھ خوشبودار جذبے آشکار ہوئے تھے تو کچھ نئے اور لطیف احساسات بھی جیسے لہو میں آرچے تھے۔ وہ کسمسایا تھا۔ خود سے الجھا تھا' لڑا تھا' جھنجلاہٹ بھی تعارف دینے آئی تھی اور وحشت بھی...... اس نے ابھی تک اس بارے میں کسی سے ذکر تک نہیں کیا تھا' کسی کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ دو تین دن سے داخلی طور پر کس مصیبت' کس جھگڑے سے دوچار ہے' اس کے دوستوں' ساتھیوں میں سے کسی کو ایسی توقع بھی نہیں تھی کہ

کوئی لڑکی اس طرح مرشد کے اعصاب پر حاوی ہوسکتی ہے۔ مگر ایسا ہو چکا تھا...... خود بخود...... حیرت انگیز طور پر...... اور فی الوقت اس حقیقت سے صرف خود مرشد ہی واقف تھا۔

مغرب کے وقت وہ سیدھا چوتھی منزل کی چھت پر گیا' نماز میں بھی بے سکونی و بے قراری برقرار رہی' وہ اٹھ کر اماں کے کمرے میں چلا آیا۔

مجھ سے بھی غصہ ہیں' کچھ دیر پہلے اماں نے بڑی بے عزتی کی ہے میری۔" شازیہ بھی وہیں موجود تھی' اور اماں کو غالباً دیگر افراد کے متعلق بتارہی تھی۔ نزہت بیگم' عشرت' سندس' شگفتہ' مسلسل چاروں غائب تھیں' یوں جیسے وہ یہاں موجود ہی نہ ہوں...... وہ چاروں رات سے نیچے آئی ہی نہیں تھیں...... اپنے کمروں میں بند تھیں' یقیناً شازیہ کا یہاں آنا بھی انہیں سخت ناگوار گزر رہا ہوگا۔

مرشد کمرے میں داخل ہوا تو ان کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی۔ بدستور اماں اور شازیہ نیچے بستر پر بیٹھی تھیں جبکہ حجاب پلنگ پر نیم دراز تھی۔

"لو آ گئی جناب...... خالہ! ابھی مجھے چائے کا نہ کہنا۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ جن لوگوں کو میری چاء کی قدر نہیں ان کے لیے اب کبھی نہیں بناؤں گی...... چائے۔"

شازیہ نے مصنوعی خفگی سے منہ ٹیڑھا کیا۔

اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور تنگ قمیص کا کھلا گریبان کچھ زیادہ ہی کھلا کھلا دکھائی دے رہا تھا۔ مرشد کی نظر سرک کر پلنگ پر جا پہنچی۔ حجاب نیم دراز تھی' پھر بھی اس نے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا جو مرشد کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے مزید درست کرلیا تھا۔ شازیہ اور حجاب ایک ہی جگہ موجود تھیں پھر بھی مرشد کو ان کے درمیان زمانوں کا فاصلہ دکھائی دے رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ مراد اور اکو اسپتال میں ہیں' کیسی حالت ہے اب ان کی؟" حسن آرا نے شازیہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے مرشد سے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں' معمولی زخم تھے ایک دو روز میں یہیں ہوں

گے۔'' آپ نے دوالی؟'' وہ سنگھار میز کے اسٹول پر ٹک گیا۔

''نہیں' کچھ دیر تک کھانا کھاؤں گی پھر لے لوں گی۔''

''تو یہ مونچھیں کیوں نہیں کٹواتا۔''

شازیہ کی بات پر مرشد نے گھور کر اسے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

''ایسے گھورتا کیا ہے؟ میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی' اچھی خاصی شکل وصورت کو ان مونچھوں نے خوف ناک بنا رکھا ہے۔ صاف نہیں کرانی تو کم از کم چھوٹی ہی کرا لے۔''

''تیری زبان کچھ زیادہ ہی چلنے لگی ہے۔ اس کا کوئی علاج کرا۔''

مرشد کا موڈ برابر نہیں تھا۔ شازیہ نے منہ پھیر لیا۔

''میں نے دن میں کچھ کہا تھا تم سے۔'' حسن آرا نے مرشد کو مخاطب کیا۔

''یاد ہے۔''

''وہ کوئی سبق نہیں تھا' عمل درآمد کب کر رہے ہو؟''

مرشد خاموش رہا' اس کے چہرے پر سوچ اور تذبذب کے تاثرات گہرے ہوآئے تھے۔

''مرشد......''

''اے چڑیل!'' مرشد نے شازیہ کو آواز دی۔

''تیری ماں اور مائی کدھر ہے؟''

شازیہ نے اس کو گھورتے ہوئے اوپر کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا' بولی کچھ نہیں۔

''جا کے ان دونوں سے کہہ دے کہ آج یہاں کوئی محفل نہیں سجے گی۔''

''خود جا کے کہہ دے' مجھے گالیاں نہیں کھانی...... پہلے ہی تم تینوں پر انگارے چبا رہی ہیں وہ' میرے یہاں آنے پر ابھی تھوڑی دیر پہلے اتنی بےعزتی کی ہے میری۔''

''گھوڑی کی شکل والی گدھی...... جو کہا ہے وہ کر۔''

''کیا ہے......'' وہ جیسے چڑ کر بولی۔

''مجھے کیوں ذلیل کرواتا ہے' پہلے ہی وہ تم لوگوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی جھولیاں اٹھا اٹھا کر بددعائیں دے رہی ہیں۔ اب بڑی اماں نے اپنا پاندان ہی میرے منہ پر مار دینا ہے۔''

''مرشد کا پیغام لے کر جانے والے کے منہ پر کچھ مارنے کا مطلب ہوگا کہ مرشد کے منہ پر مارا گیا ہے...... جاتو۔''

شازیہ چند لمحے تیکھی نظروں سے اسے گھورتی رہی' پھر خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''میری بات کا جواب؟''

حسن آرا نے متفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ یہاں محفوظ ہے اماں! آپ بےفکر رہیں۔''

''نہیں رہ سکتی بےفکر...... انہیں جلد از جلد ان کے اپنوں تک پہنچانا ضروری ہے۔''

تو پھر اتنی دور کیوں...... یہ تو نندی پور کی ہے نا' نندی پور پہنچا دیتے ہیں اسے۔ اس کے گھر تک۔''

وہ جانتا تھا کہ حجاب یہاں کی نہیں' اسے ہمیشہ یہاں رہنا بھی نہیں تھا' اس بستی سے دور کہیں اس کا اپنا خاندان' اپنے لوگ تھے' اپنی ایک دنیا تھی' اور وہ اسی دنیا کے لیے موزوں تھی...... ایسا ہی ہونا بھی تھا مگر مرشد کا دل ایسا نہیں چاہ رہا تھا' وہ اس سے اختلاف پر آمادہ تھا۔

''نندی پور میں اب کوئی نہیں' انہیں بلوچستان ہی پہنچانا ہے۔ لورالائی اور کوئٹہ کے راستے میں کہیں آتا ہے قلعہ سیف اللہ۔''

اماں کا لہجہ دھیما پڑ گیا تھا...... حجاب کے نتھنوں سے ایک سسکی سی ابھری تھی مرشد نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔

''نندی پور میں اب کوئی نہیں۔'' اماں کی بات اور حجاب کی سسکی بتا رہی تھی کہ کچھ انتہائی تکلیف دہ اور دکھ دینے والی بات ہے...... مرشد چپ چاپ اماں کی طرف دیکھے گیا کہ شاید وہ اب حجاب اور اس کے گھربار' خاندان کے متعلق کچھ بتائے مگر ایسا نہیں ہوا۔

''قلعہ سیف اللہ کے سبھی لوگ ان کے پھوپھا کو بخوبی جانتے ہیں...... یہ ان کا فون نمبر ہے۔''

حسن آرا نے سرہانے کے غلاف سے ایک پرچی نکال کر مرشد کی طرف بڑھائی تو وہ اسٹول سے اٹھ کر اس کے قریب آ گیا' پرچی پر صرف ایک نمبر درج تھا نام کوئی نہیں لکھا تھا۔ وہ وہیں بستر کے کنارے بیٹھ گیا...... پلنگ پر نیم دراز حجاب فوراً قدرے سیدھی ہو بیٹھی۔ حسن آرا بول رہی تھی۔

نظام الدین نام ہے ان کے پھوپھا کا' بہت عزت اور نام والے ہیں ان کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ یہ اتنے دن یہاں...... کسی کوٹھے پر یا کسی طوائف کے ہاں رہی ہیں......"

حسن آرا نے بستر کی چادر کے نیچے سے ایک خط والا لفافہ نکال کر مرشد کی طرف بڑھایا جو گوند سے چپکا کر بند کیا گیا تھا۔

"یہ خط میری طرف سے ان کو دے دینا' یہاں سے وہاں نظام الدین صاحب کی چوکھٹ تک ان کی حفاظت کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ ان کو وہاں پہنچاتے ہی تم انہی قدموں واپس لوٹ آؤ گے۔"

مرشد نے ایک نظر حجاب پر ڈالی اور لفافہ پکڑتے ہوئے گویا ہوا۔

"میرا خیال ہے اماں کہ یہ فی الحال یہاں زیادہ محفوظ ہے۔"

"کب تک؟"

"جب تک جاگیردار اس سے دشمنی کرنے سے باز نہیں آ جاتا۔"

"نہیں......تم انہیں نظام الدین صاحب کے گھر تک پہنچاؤ۔"

"میں اس کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہوں اماں! ابھی کچھ وقت اسے یہیں......اپنے پاس رکھ۔"

مرشد کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں......آخر حجاب کو یہاں سے جانا تو تھا ہی وہ چاہتا تھا کہ زیادہ عرصہ نہیں تو چند دن مزید وہ یہیں رہ جائے' اماں کی مہمان بن کر......ان دو بندوں کی فیملی میں' فیملی کے تیسرے فرد کی طرح۔

"میں نے جیسا کہا ہے ویسا کرو۔" حسن آرا کے لہجے میں کرختگی آ گئی۔ "انہیں جلد از جلد بہ حفاظت وہاں تک پہنچاؤ' یہ میرا حکم ہے اور میں اس بارے میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتی۔"

اماں کے دوٹوک انداز پر مرشد خاموش رہا۔ حجاب جو اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھی ان دونوں کی تکرار سن رہی تھی' اس کے جمود زدہ ذہن میں اچانک مرشد کا کل والا رویہ اور اس کی ذومعنی باتیں بیدار ہو آئیں۔

ضرور اس کے حوالے سے مرشد کی نیت اور ارادوں میں کچھ گڑبڑ تھی۔

"رہنے دیں خالہ! آپ انہیں مجبور نہیں کریں' بس مجھے قلعہ سیف اللہ والی گاڑی میں بٹھا دیں گے' گھر تک میں خود ہی پہنچ جاؤں گی۔"

حجاب نے سپاٹ لہجے میں کہا تو مرشد نے اس کی طرف دیکھا......وہ پلنگ کی پائنتی کی طرف رکھے کپڑوں والے صندوقوں کو گھور رہی تھی۔

اس چہرے میں وہ پراسرار روشنی اب بھی موجود تھی مگر بہت ماند پڑ چکی تھی' چہرہ بجھا بجھا اور اجڑا اجڑا سا دکھائی دے رہا تھا۔

"آپ کو اکیلے تو میں کبھی بھی نہیں جانے دوں گی' ہاں ایسا کرتے ہیں کہ میں خود وہاں تک آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"

"آپ کو مزید کوئی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں' پہلے ہی میری وجہ سے آپ لوگوں کے لیے کافی مصیبتیں اور مشکلیں پیدا ہو چکی ہیں۔"

"ایسے تو نہ کہیے یہ تو ہمارے بخت' ہمارے نصیب ہیں' میں خود آپ کو آپ کی منزل تک پہنچا آؤں گی تو اس سے میرا آگے کا سفر آسان ہو جائے گا۔"

حسن آرا کے لہجے میں لجاجت تھی' ندامت تھی' مرشد متعجب سا کچھ دیر ان کی صورتیں تکتا رہا پھر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں کوئٹہ اور لورالائی کی گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل معلوم

کرواچکا ہوں' ایک آدھ دن یہ اچھے سے آرام کر لے...... آپ اسے اچھے سے کھلاؤ پلاؤ پھر میں اسے اس کے پھوپھا کے حوالے کر آؤں گا۔"

وہ پلٹ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو حسن آرا اور حجاب دونوں کی نظریں مرشد کی پشت پر جا ٹکیں۔ حسن آرا کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

مرشد نے گلی میں آ کر اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ آج یہاں محفل نہیں ہوگی' لہٰذا کسی کو سیڑھیوں کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جائے' جعفر اور دلشاد باقاعدہ سیڑھیوں میں آ بیٹھے تھے۔

مرشد حجاب کے حوالے سے خود کو جھاڑیں پلاتا بیٹھک کی طرف بڑھ گیا...... اس نے فیصلہ کیا تھا کہ کل رات یا پرسوں کسی وقت حجاب کو لے کر بلوچستان کی طرف روانہ ہو جائے گا...... یہ اس کا فیصلہ تھا اور اس نے یہ فیصلہ اپنی اماں اور حجاب کی مرضی و خواہش کے باعث کیا تھا' لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا...... اور قدرت کا فیصلہ ان تینوں کی مرضی اور خیالوں کے یکسر خلاف تھا۔

رات بارہ' ساڑھے بارہ کا وقت رہا ہوگا' چبوترے پر مرشد' ساون' قادر اور جمشید بیٹھے تھے۔ مرشد کے جسم پر صرف شلوار اور بنیان تھی...... وہ بغل میں گاؤ تکیہ دبائے نیم دراز تھا۔ پسٹل اس کے سامنے دھرا تھا ساون برآمدے والے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ جمشید اس کے برابر بیٹھا تھا اور قادر انہیں کوئی واقعہ سنا رہا تھا' فضا میں سازوں اور گانوں کی آوازیں لہرا رہی تھیں...... گھنگروؤں کی جھنکار رہ رہ کر ڈوب ابھر رہی تھی...... ادھر ادھر سرسراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"مرشد......!"

"مرشد باوا......"

اچانک دلشاد کی ہانپتی گھبرائی سی آواز بیرونی دروازے سے بلند ہوئی تو وہ چاروں بری طرح چونک اٹھے...... مرشد نے فوراً پسٹل سنبھالا تھا...... دلشاد کی حواس باختہ صورت پر نظر پڑتے ہی وہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا...... دل و دماغ میں ایک ساتھ خطرے کی کئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

"وہ...... وہ کچھ لوگ حجاب بی بی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

"کون لوگ...... کیسے؟"

مرشد ننگے پاؤں ہی بیرونی جانب دوڑ پڑا' ساون' جمشید اور قادرے نے بھی فوراً اس کی تقلید کی تھی۔

"معلوم نہیں' سیڑھیوں میں تو ہم بیٹھے تھے' باہر سے کوئی نہیں آیا' گلی والی کھڑکی میں سے اچانک آپ کی اماں کی آوازیں سنائی دیں' وہ آپ کو پکار رہی تھیں' انہوں نے کھڑکی سے ہمیں اتنا ہی بتایا' جعفر اوپر گیا ہے' میں آپ کی طرف بھاگا آیا۔"

دلشاد نے مرشد کے ساتھ دوڑتے دوڑتے صورت حال بیان کی' گلی میں موجود لوگوں اور دکانوں والوں کے چہروں پر کچھ سنسنی سی تھی۔ سبھی کو یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ پھر کچھ گڑبڑ ہے' مگر یہ ان پر واضح نہیں تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گزری ہے یا...... ہونے جا رہی ہے۔

جعفر سیڑھیوں کے اوپر گیلری میں موجود دروازے پر زور آزمائی کر رہا تھا' دروازہ اندر سے بند تھا' مرشد کے جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئیں' اس کے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ اس نے ابھی پہلے زینے پر ہی پاؤں رکھا تھا کہ گولی چلنے کی آواز نے اسے ٹھٹکا دیا۔ اوپر تلے دو فائر ہوئے اور پھر کے بعد دیگرے کئی فائر سنائی دیئے' دو طرفہ فائرنگ شروع ہو گئی تھی' اور فائرنگ کی یہ آواز عقبی طرف سے بلند ہوئی تھی۔

"دروازہ توڑ دو اور اماں کو دیکھو۔"

مرشد نے چیخنے والے انداز میں دلشاد اور جعفر کو مخاطب کر کے کہا اور خود پسٹل سنبھالتا ہوا بغلی طرف والی گلی کی طرف دوڑ پڑا' اس کے رگ و پے میں ایک وحشت ناچ اٹھی تھی۔ آج ہی نماز مغرب کے بعد اس نے حجاب کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی تھی اور اب...... محض چند گھنٹوں کے وقفے سے ہی دشمن نے شب خون مار دیا تھا...... وہ حجاب کو نہیں...... مرشد کے منہ سے اس کی زبان کو نوچ کر لے گیا تھا۔

